

سید



ماہنامہ

سریس

حیدر آباد

مجلس مشاورت

سید علی اکبر
محمد علی عباسی
ڈاکٹر مغنی تبسم

صدر
نائب صدر
معتد

امریکان

پروفیسر گوپی چند نارنگ
سید اشتم علی اختر
من راج سکینہ
عابد علی خاں
محمد اکبر الدین صدیقی
پروفیسر سراج الدین
محمد منظور احمد

ڈاکٹر مغنی تبسم

وقار خلیل

پیراعترامی: عاون ملیر: (۲۰۱) شعلہ

۲ روپے

ست فی پرچہ:

دارۃ ادبیات امداد، پنج مکتبہ روڈ، حیدر آباد

بیسرونی لکھوں

ایسالاتہ

۱ روپے ہوائی ڈاک سے

ب خانوں سے ۲۵ روپے شعلہ ۱۰ ڈالر ۲ ڈالر

ریسہ جبری ۴۵ روپے ہریکھ ۱۰ ڈالر ۶ ڈالر

سٹن، برما، سیلون ۸ ڈالر ۳ ڈالر

گلستان ۳ پونڈ ۳ پونڈ

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدر آباد

اپنی باتیں

عثمانیہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل دانشوروں نے مختلف شعبہ جیات میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار کر حیدرآباد اور مادر جامعہ کا نام ہر دور میں روشن رکھا۔ طبعاً عثمانیہ نے محاکم کے جیہ چیتہ میں سائنس آرٹ، ادب اور کچرے شعبوں کے علاوہ تعلیمی اور تنظیمی عہدوں پر فائزہ کر اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے ملک اور ارباب وطن کی خدمت انجام دی اور غیر معمولی شہرت اور عزت حاصل کی۔ مادر جامعہ کے ایسے ہی چند نامور سچو توں میں جناب سید ہاشم علی اختر آئی اے سس (کاشمار ہوتا ہے، جنھیں حکومت آندھرا پردیش نے ان کی علمی اور تنظیمی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے کے لیے منتخب کیا۔ جناب ہاشم علی اختر کا اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہونا نہ صرف ادارہ ادبیات اردو کے لیے ایک اعزاز ہے بلکہ ریاست کے اردو بولنے والوں کے لیے باعث افتخار و تکیہ ہے۔ موصوف نے حیثیت معتمد عمومی ادارہ، اس انسٹی ٹیوٹ کی ہر جہتی علمی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کو تقویت بخشی اور گولڈن جوبلی تقاریر کا اہتمام کر کے ادبی دنیا سے خراج حاصل کیا۔ امید ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ اور ساتھ جناب ہاشم علی اختر کی دانشورانہ صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے جامعہ کو اس کے سابقہ سہرے دور سے مربوط کرتے ہیں عثمانیہ برادری کے اس نامور فرد سے بھرپور تعاون کریں گے۔ ہم ادارہ سب رس اور ادارہ ادبیات کی جانب سے جناب ہاشم علی اختر صاحب کی خدمت میں دلی مبارکباد اور بڑی تہنیت پیش کرتے ہیں ساری خواہش ہے کہ وہ ادارہ سب رس سے دیرینہ تعلق برقرار رکھیں گے اور

فہرس

۱	فہرست	۲	فہرست
۳	دکٹر لکھن چنچین	۳	دکٹر لکھن چنچین
۲۱	حسن عسکری	۲۱	حسن عسکری
۲۶	افتخار ایمان (ایک مطالعہ)	۲۶	افتخار ایمان (ایک مطالعہ)
	— (شاعری) —		— (شاعری) —
۲۹	فضا ابن فیضی	۲۹	فضا ابن فیضی
۳۰	رفیقہ شبنم عابدی	۳۰	رفیقہ شبنم عابدی
۳۰	دکار و آلفی	۳۰	دکار و آلفی
۳۱	سید علی ظہیر	۳۱	سید علی ظہیر
۳۲	صلاح الدین بیر	۳۲	صلاح الدین بیر
۳۳	علی عباس تہمتہ	۳۳	علی عباس تہمتہ
	— (کہانی) —		— (کہانی) —
۳۴	عوض سعید	۳۴	عوض سعید
	— (اردو نامہ) —		— (اردو نامہ) —
۳۶	دکار غلیل	۳۶	دکار غلیل
۴۰	فیات	۴۰	فیات

لکھن ان ادارہ کو اپنے شعور و ادب باتوں سے مستفیذ فرما رہے ہیں۔

یہ مہم جو یہ ہند کے موقع پر معروف ادبی شخصیتوں کو مدہ ہند نے ہندو شری کے خطاب سے نوازا، جن میں اردو کی صاحبزادہ زلفا نوس مجتہد صاحبہ جین اور ممتاز ڈرامہ نویس جناب جمیٹ تنویر تالپا ذکر ہیں۔ ہم ہر دو اصحاب کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ مرکزی سہتیہ اکیڈمی نے صف اول کے نقاد ڈاکٹر پرو فیسر گیان چند جین (مدہ شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد) کو ان کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات کے اعتراف میں ادبی انعام سے نوازا ہے پرو فیسر جین اپنی تحقیقی رد وین، یعنی اور تنقیدی صلاحیت کی آپ مثال رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اختر جہنم کے ہاشم نقاد سخن اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اشتراک فلسفہ کی جہت میں نمایاں رہے ہیں، آندھرا پردیش اردو اکیڈمی حیدرآباد نے انھیں مدہ دوم ادبی ادارہ کے لیے بہ کثرت آراء منتخب کیا ہے۔ (باقی صفحہ پر دیکھیے)

ڈاکٹر گیان چند جین

دکنی کے لسانی رشتے

ہے جو آج بھی بجا پوری میں سنی جاسکتی ہے۔ یہ زبان اپنی
پڑوس بگنی سے بہت زیادہ ملتی ہے لہ
”مورخین ادب بجا پوری شعرا کے جنس کلام کو
تاریخ ادب میں شامل کر رہے ہیں وہ اردو میں نہیں بجا پوری
زبان میں ہے، لہ

”دریجا پوری کو قدیم کہنے والے شاید اس
حقیقت سے بے خبر ہیں کہ بجا پوری آج بھی وہی
زبان بولی جا رہی ہے جس میں قدیم دکنی شعرا اور ادبا نے
آج سے چار سو سال پہلے اظہار خیال کیا تھا جسے
ہمارے مورخین اردو کے قدیم کلام دے رہے ہیں۔ آج
اسی زبان میں وہاں لوگ گیت گائے جا رہے ہیں اور لوگ
اپنے اپنے گھروں اور بازاروں میں اسی بولی سے کام
چلا رہے ہیں“ لہ

مجھے اس میں بہت شبہ ہے کہ سہیل بخاری
کبھی بجا پور آئے ہوں گے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ دکن
میں آج بھی قدیم دکنی شعرا کی زبان بولی جا رہی ہے۔
ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:-

”۱۵۰۰ دکنی کلاسیکی دکنی کی اکثر خصوصیات
کھو چکی ہے لہ

زمان و مکان کا پھیلاؤ ایک زبان میں بہت
سی بولیوں کو جنم دیتا ہے۔ اگر ایک زبان شلاہندی
بڑے علاقے پر پھیلی ہوگی تو اس میں کافی اعتبار سے
دکنی بولیاں شلاہندی، گھڑی، برج، بنڈیلی وغیرہ پہلو بہ
پہلو افتادہ ہوں گی۔ دوسری طرف ایک زبان کا تعلق میں
طویل ارتقا ہو گا تو کئی سو سال کے بعد اس کا روپ تبدیل
جائے گا کہ قدیم اور جدید روپ دو مختلف بولیوں جیسے
معلوم ہوں گے۔ قدیم فارسی اور جدید فارسی میں یہی رشتہ ہے
دکنی اردو کی ایسی بولی ہے جو زمان اور مکان دونوں کے تفاوت
کی آفریدہ ہے ادبی دکنی اور شمالی ہند کی اردو میں علاقائی
بعد بھی ہے زمانی بھی۔ دکنی مقدم ہے شمالی اردو و
مؤخر۔ اردو اور دکنی کا یہی تعلق ہے کہ دکنی اردو کی
ایک پاورینہ بولی ہے۔

پاکستان میں ڈاکٹر سہیل بخاری اور ہندوستان
میں آمنہ خاتون کو امر ہے کہ دکنی اور شمالی اردو کے فرق کے
پیش نظر دکنی کو اردو سے علاحدہ زبان کہا جائے۔ سہیل
بخاری اپنی خود ساختہ اصطلاح میں دکنی کو بجا پوری
کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

”مدعا کہتے کا یہ ہے کہ دکنی یا بجا پوری اردو ہی
کی طرح لیکن اندو سے الگ۔ ایک آزاد اور مستقل زبان

جدید اردو میں - کیا یہ غزلیں ایک زبان میں نہیں دو
زبانوں میں ہیں -

در اصل دکنی اور اردو میں زبان کی دو منزلوں
(قدیم و جدید) کا تعلق ہے - طبقات الشعر میں قدرت اللہ
شوق نے لکھا ہے کہ شاہ سعد اللہ گلشن نے ولی کو
مشورہ دیا -

”شما زبان دکنی را گزاشتہ ریختہ را موافق اردوئے
معلیٰ شاہ جہاں آباد موزوں بکنید“

اس کے یہ معنی نہیں کہ گلشن نے ولی کو کسی
دوسری زبان میں لکھنے کا مشورہ دیا تھا مثلاً کہ تم
دکنی چھوڑ کر آسامی میں لکھنے لگو بلکہ یہ کہ اسی زبان
کے دوسرے لہجے، اسلوب یا لولی کو اختیار کرنے
کا مشورہ دیا -

مجھے یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ شمالی ہند
کے قدیم شعرا نے دکنی کو کم قدر قرار دیا تھا یا قرآ گاہ
مثنوی گلزار عشق (۱۲۱۱ ہجری) کے دیباچے میں لکھتے ہیں

”اکثر جاہلان بے معنی و ہرزہ داریان لایعنی
زبان دکنی پر اعراض اور گلشن عشق و علی نامہ پر اعراض
کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں مانتے کہ جب تک
ریاست سلاطین دکن کی قائم تھی زبان ان کی درمیانے
ان کے خوب رائج اور طعن و شماتت سے سالم تھی
..... جب شاہان ہند اس گل زمین جنت نظر

کو تسخیر کیے، طرز و زمرہ دکنی نہج محاورہ ہند سے
تبدیل پائے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں
کو شرم آنے لگی“

معیاری زبان کے علاقے سے دور کی بولی

دکن کی موجودہ بولی چال کی اردو میں قدیم و کئی
کے بعض روپ اور الفاظ مل جاتے ہیں لیکن بحیثیت
مجموعی یہ قدیم و کئی سے کافی مختلف اور شمال کی اردو
سے بہت مختلف ہے - سبیل بخاری اپنی تائید میں
باتر آگاہی مثنوی نیہہ در پن (معجزات نبی کریم) ۱۲۷۱ھ
کا یہ شعر درج کرتے ہیں

اگر بھا کے میں اردو کے میں کہتا

کوئی اس کو بھا کے لوگوں سے نہ چھتا ۵
ظاہر ہے کہ یہاں اردو کے بھا کے سے مراد شمالی ہند
کی اردو کا لہجہ ہے - انھوں نے دو لہجوں یا بولیوں
کا ذکر کیا ہو گا دو زبانوں کا نہیں - ”دکنی اور اردو“
دو مختلف ”زبانیں ہیں“ اس کی تردید میں دلائل دینا
تفصیلات اور تحصیل حاصل ہے - ولی کی غزلوں
کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سے پہلا قدیم زبان
میں اور دوسرا اتنی شستہ زبان میں ہے کہ جسے آج
بھی قبول کیا جاسکتا ہے

نیں دکھا کر آپس کے مکھ کی کتاب
علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا
اے ولی سر و قد کو دیکھوں گا
وقت آیا ہے سر فرازی کا

کیسیں آپس انکھیاں نے جوں کجسل جو اہر
عشاق کے گر ہاتھ وہ خاک چرن آوے
سایہ ہو مرا سبزر برگ پر طوطی
گر خواب میں وہ نوخط شیریں چن آوے
ان جوڑوں کا پہلا شعر بالیقین دکنی میں ہے اور دوسرا

کو خیم کم سے دیکھا ہی جاتا ہے لیکن اس کی وجہ سے وہ بولیاں معیاری زبان کے حصار سے نہیں نکل جاتیں۔ دکنی، اردو کی ایک بولی ہے۔ لسانیاتی اصطلاح میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ علاقائی اعتبار سے مغربی ہندی کی پانچ بولیاں کی جاتی ہیں۔ ہریانائی، کھڑی بولی، برج بھاشا، قنوجی، بندیلی ان میں ایک چھٹی یعنی دکنی کا اضافہ بھی کر لیا جائے۔ یا پھر دکنی کو کھڑی بولی ہی کا ایک روپ مان سکتے ہیں۔ اس مضمون میں دکنی کا دوسری زبانوں سے تعلق کھوجا ہے۔ دکنی کی بنیادی زبانوں مثلاً سنسکرت، پراکرتوں، اپ بھرنشوں، مغربی ہندی اور عربی فارسی وغیرہ پر غور نہیں کیا جائے گا بلکہ ملگ کی دوسری زبانوں اور دکنی کے تار ملائے جائیں گے۔ اس سلسلے میں دو کارنامے قابل ذکر ہیں۔

۱۔ محمود شیرانی کی پنجاب میں اردو (۱۹۳۸ء) جس میں انھوں نے پنجابی اور قدیم اردو، بالخصوص دکنی کے اشتراکات کی طرف پہلی بار توجہ دلائی۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اردو اگر پنجابی سے ماخوذ نہیں تو بھی شدت سے متاثر ضرور ہے۔

۲۔ دوسری کتاب عثمانیہ بونی وری کے سابق پروفیسر ڈاکٹر شری رام ششہر کا تحقیقی مقالہ ہے جو اصلاً ہندی میں ہے لیکن جس کا اردو ترجمہ بولی فلام رسول نے ”دکنی زبان کا آغاز اور ارتقاء“ کے نام سے کیا۔ اسے ساہتیہ اکیڈمی آندھرا پردیش نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔ اس میں دکنی کے مختلف گویشوں کی اصل، ارتقاء اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے ان کے کارناموں کی زکوہ ربائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اردو اور دکنی کے تمام بنیادی الفاظ کا سلسلہ اپ بھرنش، پراکرت اور پالی سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر شرمانے اپنی کتاب میں ایک طرف دکنی کے رشتے ہم عصر زبانوں سے تلاش کیے ہیں تو دوسری طرف ماضی میں پیچھے کو سفر کر کے اپ بھرنش، پراکرت اور سنسکرت میں دکنی الفاظ کا اصل کی تلاش کی

سے رشتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک نیا ہیمنہ کارنامہ ہے جسے اگر کسی یورپی متشرق نے جرمن یا انگریزی زبان میں پیش کیا ہوتا تو اس کی دھوم مچ جاتی۔ اردو ترجمے کے مقدمے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے درست لکھا ہے کہ یہ کتاب ”ذول ہلاک کی، مراٹھی زبان، ڈاکٹر سنسکرت کمار چٹرجی کی ”بنگالی کا آغاز و ارتقاء“ اور ڈاکٹر بابورام سکینہ کی ”اردو کی کار ارتقاء“ کے مرتبہ کی کتاب ہے۔ اسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو اور ہندی دونوں میں ڈاکٹر شری رام شرما کے مرتبہ کا دکنی کا عارف و مزاج دان نہ ہوا ہے نہ ہے۔ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی دکنی بولی ہندوستانیت میں یہاں تک شراہور ہے کہ اہل ہندی اسے ہندی کہنے پر مہر ہیں۔ اہل اردو کی یہ کمزوری ہے کہ وہ عربی فارسی کے تو ماہر ہوتے ہیں لیکن اردو سے قبل کے ہندوستان کے لسانی نقشے سے براہ راست واقفیت نہیں رکھتے۔ ان کے لیے یہ ایک بند قلعہ ہے جس کے بارے میں ہندی والوں سے کچھ سن سنا کر لکھ دیتے ہیں۔ گو یا ہم اپنی دھرتی سے اٹھڑے ہوئے ہیں۔ تاریخی لسانیات پر اردو میں جو کچھ لکھا جاتا ہے۔ وہ ہندی سنسکرت

کے سابق پروفیسر ڈاکٹر شری رام ششہر کا تحقیقی مقالہ ہے جو اصلاً ہندی میں ہے لیکن جس کا اردو ترجمہ بولی فلام رسول نے ”دکنی زبان کا آغاز اور ارتقاء“ کے نام سے کیا۔ اسے ساہتیہ اکیڈمی آندھرا پردیش نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔ اس میں دکنی کے مختلف گویشوں کی اصل، ارتقاء اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے ان کے

کی ہے۔ یہ راقم الحروف ۱۹۵۶ء سے تاحال ایک دو سال چھوڑ کر ہمیشہ دکن کی تدریس کرتا رہا ہے۔ شرم کی بات ہے کہ مجھے ۱۹۸۱ء ہی میں اردو کی اس کتاب کے وجود کا علم ہوا۔ میرا یہ مضمون عام طور سے اسی کتاب سے ماخوذ دکنی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی مماثلت کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دکنی اور پنجابی

محمود شہرانی نے قدیم اردو اور پنجابی کی مماثلت لکھتے وقت دکنی اور پنجابی کے لیے مشترک عناصر پر درو دیا۔ ان کا عندیہ ہے کہ یہ دکنی میں پنجابی سے درآمد کیے گئے۔ ذیل میں ان کی اور ڈاکٹر شرم کی کتاب سے لے کر چند مماثلات درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ دکنی میں پنجابی کی طرح لفظوں کے دوسرے طویل مصوتے کو مختصر بنانے کا رجحان ہے مثلاً لک (لاکھ) سنگ (ٹٹنا)۔ (ٹوٹنا)۔ بندنا (باندھنا)۔ بت۔۔۔ ڈبا (ڈرنا)۔ لیکن پنجابی کے برخلاف اس کی تلافی کے لیے اگلا معصمتہ مشد نہیں کیا جاتا۔ پنجابی میں لکے بت و غیرہ کا آخری معصمتہ مشد ہے۔

۲۔ راور ٹھہ کی جگہ بعض اوقات ڈ اور ڈھ لفظ مثلاً بڈیا (بڑا)۔ بڈی (بڑھی)۔ پڈھیا (پڑھا)۔ ۳۔ العاف میں ہکا ربیت (ہائے مخلوط) کو حذف کرنے کا رجحان تلافی۔ بت۔ بڑی۔

۴۔ فارسی عربی الفاظ کے آخر میں حشوئی کا اضافہ مثلاً خاری۔ غروری۔

۵۔ جمع میں 'ای' کا اضافہ مثلاً لوگایں۔

بعض خطاب قیاس جمع کے صیغے پنجابی سے ماخوذ

اور غالباً ماخوذ ہیں مثلاً

سات سے ستیں۔ دو سے دو ہوں۔ برس سے براں۔ غم سے فیس

۶۔ صمیر اشارہ قریب الیہ۔ ای۔ اے اور اشارہ بعید اود۔ او

ان میں ای، اولئند کے مماثل ہیں۔

۷۔ مصدر میں نا کے بجائے محض 'ن' کا خاتمہ

مثلاً 'چلن' یعنی چلنا۔ پھرن۔

مصدر کے آخر میں 'نا' بھی ہو تو اس کی تعریف میں آگرا کر محض 'ن' پر اکتفا کرنا مثلاً کاپننے لگا کے بجائے 'کاپن لگا'۔

۸۔ 'گنا' لے مسمیٰ میں سی لانا مثلاً ہلاسی نا

(نہیں بلائے گا)۔

۹۔ ماضی مطلق میں آ کے بجائے 'یا'۔

کالاحقہ لگانا۔ اس کی ی مخلوط ہوتی ہے اور پنجابی سے مماثل ہے مثلاً بولیا، بوجیا

۱۰۔ ماضی مطلق کے آخر میں بعض اوقات پنجابی

کی طرح 'تا' کالاحقہ لگانا مثلاً

دینا ہو رکتا اب سوں خطاب (احمد دکنی)

برج بد شاہیں اس کے مقابل میں کینا

اور لینا ہے۔

۱۱۔ بعض اوقات امر کے لیے 'میں' کالاحقہ

لگایا جاتا ہے مثلاً آپ کریں، آپ آدیں۔

۱۲۔ بعض فعلی مادے یا مصدر دکنی اور پنجابی

میں مشترک ہیں لیکن شمالی ہند کی اردو میں نہیں ملتے مثلاً

آکھنا (کہنا)۔ اپڑنا (پہننا)۔ لوڑنا (ضرورت ہونا)

سے مشترک ہیں۔ لیکن شمالی ہند کی اردو میں نہیں ملتے۔
فعلی مادوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ چند دوسرے الفاظ یہ ہیں۔
پھوک (جھوٹا)۔ اجنوں (آج تک)۔ بچھے۔
ہور۔ نیڑے۔ نال (ساتھ)۔ لئی (واسطے)۔ چکڑ
(کچھڑ)۔ بھین (بہن)۔ دولال (دونوں طرف)۔ کھیر
(دودھ)۔ لوک (لوگ)۔ جوک (جونک)۔ کانہ (دیوار)
پنجابی کسندھ)۔ نک۔ منجا، پنجابی منجھا۔ لوڑ لوڑی
(ایسی خوشی دوسرے کی خوشی پر جھوڑنا)

علامت 'ے' کے معنی ہیں کہ اس سے پہلے
 کا لفظ مشتق ہے اور بعد کا لفظ مانفذ ہے۔ اس کی
 اٹی علامت 'د' کے معنی ہیں کہ اس سے پہلے کا لفظ مانفذ
 ہے اور اس کے بعد کا لفظ مشتق ہے۔ یعنی زاویے کی
 لوک یا جوڑ مانفذ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کھلے ہوئے
 اضلاع مشتق روپ کی طرف۔

وی دودہریانی۔

محمود شیرانی نے قدیم اردو کی جن خصوصیات کو پنجابی سے مشترک اور ماخوذ بتایا ہے، ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی کوشش ہے کہ ان میں سے بیشتر کو ہرانی سے متعلق اور ماخوذ کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں میرے دو معروضات ہیں۔

۱۔ انھوں نے جن نمونوں مثلاً محبوب عالم شیخ
مولانا عبدی وغیرہ کی مشنریوں کو ہریائی کا ٹانڈہ سمجھا ہے
وہ قطعاً ہریائی نہیں۔ وہ ہریانہ کے اردو مفتیس کی اردو
ہے۔ ہریائی یا بانگر و ذیل کی زباں کو کہتے ہیں۔

کوٹ جاوے تے اکون جاتا ہے
ہور کے جاوے سو۔ ایپ تھارے تے اُتے
بھادول کا ارد کیا چاہتے ہو۔ اب تم سے اس کی طاقت

سننا، رینک، ایجھاننا، بیجھنا، بھولنا، کھانا کرنا)
 ہونا (لگا، یا ما (ڈالنا) لڑنا (سانپ کھوکھو کا ٹٹنا)
 ناسنا (جوانہ - پنجابی سننا) - کھڑنا (کھڑ ہونا)
 ۱۳۔ کہیں کہیں حرف 'ج' نون، 'ب' کو،
 مل جاتا ہے خواہ اس پنجابی سے

نہا۔ نہ کی جگہ نہ اور 'ناں' پنجابی سے
ماثل میں۔

۱۵۔ حالت بحر و بیابان 'وان' کا لاحقہ
 دیکھا مسطور

جی کا دل دیکھا آکے نظروں (محمد امین)
 معنی: اس سے پہلے ہی میں 'بچوں' کے معنی پیچھے
 سے اور 'ماضیوں' کے معنی 'ہاضمت' ہوئے ہیں۔
 ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳

یہ ہے کوئی اس راہیں پاک کوں (محمدین)
راہیں معنی رات میں

۴۔ اس وقت فعل اور حرف وغیرہ میں
معنی کا فرق اس کے ساتھ ہے کہ
کیا ان میں معنی کا فرق ہے یا نہیں
نہ ہونے میں ان میں فرق ہے یا نہیں
پہلے سے یہ فرق ہے یا نہیں
(اس سوال کا جواب)

جمعہ ۱۰ اگست ۱۹۷۲ء کو پورے ملک میں ہنگامہ نماز کے بعد کھانا کھا کر گھر پر لوٹے۔

۱۸۔ دکنی میں اسے منعمہ والی خانم نے جو پنجابی

(کراؤں گا)

تفصیلی میں نئے ہسٹا لکٹرن لاگ رہیا۔ (تفصیل میں سے پسینہ نکل رہا ہے)

مکن ہے ہریانے کے اردو مصنفین کی تخلیق میں کیس ہریانی بولی کے بیٹے ہوں لیکن ہمارے مصنفین کی زبان سے ہریانی کے نمونوں کا استثناء نہیں کر سکتے

۲۔ پنجابی سے میں کہ نہیں۔ کسی مشترک خصوصیت کو پنجابی نہ کہہ ہریانی کہہ دینے سے کوئی ذہنی آسودگی نہیں ملتی۔ پنجابی نسبتاً قدیم، قوی اور بالیدہ زبان ہے اس میں قدیم زمانے سے ادب ملتا ہے۔ ہریانی کم ترقی یافتہ بعد کی بولی ہے جس میں قدیم ادب نہیں۔ خود ہریانی پر پنجابی کا اثر ہے ہر حال ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے دکنی کی جن خصوصیات کو ہریانی سے مشترک بتایا ہے اور ہریانی سے اخوذ کرنا چاہا ہے وہ یہ ہیں۔ ان میں سے بعض پنجابی سے بھی مشترک ہیں۔

۱۔ زارٹھ کی جگہ ڈاڈھ ہونا مثلاً بڑھے 'چڈھنا' (سب رس میں)

۲۔ لفظ کے دوسرے مختصر معنوتے کو طویل کر دینا مثلاً 'راکھے' تائیں، 'ہاڈہ' (ہڈی)۔ 'لوہو' لاگھا۔ 'مائی' چالیں (چلیں)

در اصل یہ برج بھاشا کا بھی خاصہ ہے۔

۳۔ عشوی غنائیت مثلاً سین، کون، ٹول کو بچے، سنٹانا، آدیں، رادی، اُرسا، منت۔ مصدری لاحقہ 'نا' کے بجائے 'ناں'، ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مطابق یہ ہریانی کا اثر ہے۔

۴۔ بعض اوقات ہکاریت کا حذف مثلاً بی (بھی)۔ تچ۔ منج۔

۵۔ فعل معطوف میں یے کا اضافہ۔ آئے کر۔ جائے کر

۶۔ ماضی مطلق میں الف سے پہلے یائے مخلوط کا ہونا مثلاً چلیا

۷۔ بعض ضائری ہریانی سے مماثل ہیں مثلاً ہمن، تنن

۸۔ بعض ضائری کی تعریف دونوں میں مماثل ہے مثلاً ہموں، ہمیں، تموں، تمیں، انھال، انھوں

۹۔ 'سے' کے معنی میں 'تے'، 'تھے'، 'ستی' کا استعمال دونوں میں ہے۔

۱۰۔ ڈاکٹر شری رام شرما کے مطابق 'بنولا' ہریانی کا لفظ ہے۔ یہ دکنی کے علاوہ کھڑی بولی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دکنی اور برج بھاشا

ابتدائی دکنی ادب گارسییت سے متاثر تھا اور ہندی روایات میں شہر اور تھا۔ اس وقت کی ہندی روایات کیا ہیں؟ برج بھاشا کی روایات۔ صوفیہ کے کلام پر نیز ابراہیم عادل شاہ ثانی اور علی عادل شاہ کے یہاں برج کا اتنا اثر ہے کہ بعض اوقات ان کے کلام کو اردو کہیں میں بھی تلفظ ہوتا ہے۔ علی عادل شاہ کی چند سفریں دیکھیے۔

در مقام بحث

ترجیہ بر کو مکتا کچ پھل، بیو
سیام دسن لال آدھریل اپورنگ پور

در مقام طار

۱۔ سبیل راہی سنگ من انکھووری سہیلی
تم جانت نہیں جیہ کی کا ہے موہ، ٹکھووری
دکن اور برج کی چند شتر کی خصوصیات یہ ہیں۔
۱۔ جیسا کہ اوپر ہر پانی کے سلسلے میں لکھا
گیا بعض الفاظ میں دوسرے مقام پر آنے والے
مختصر مصوتے کو طویل کر دینا مثلاً 'زاکھنا' چاکھا، لاگنا
مانی، سانچا (سچا)

۲۔ بعض الفاظ کے آخر میں آکر او سے بدلنا
مثلاً 'کیو' قہارو

۳۔ ل کو 'ر' میں بدلنا۔ شور سینی ر کو
تزوج دیتی تھی اور ماگدھی 'ل' کو۔ ر کو بند کرنا
برج کے مزاج میں بھی ہے۔ دکنی میں بڑ بڑے
(بیلے)، روپہرے، تروار، نکاروں (نکالوں)

نک مل جاتے ہیں ج دکن اپنے دل کے لٹھروں وان لٹروں
(کلیات شاہی)

۴۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کلیات علی قطب شاہ
میں سے ذیل کے دکنی ضامر کی نشان دہی کی ہے

ہوں۔ (میں) تو (تجھ) مو (مجھ)
پیارے نہ کر گھیج۔ ہوں تو یہ داری

۵۔ برج میں جمع کا لاحقہ 'ن' ہے

اس کی مدد سے ہم سے ہیں ہم سے تم سے تم جتا ہے۔
دکنی میں یہ دونوں ضمیر ملتی ہیں۔ ہم بہت
عام ہے۔ تم کی یہ مثال ہے

ہوں تل تل تم پر تھے داری ہو ماری
(علی قطب شاہ)

۶۔ ڈاکٹر شری رام شرمانے دکنی کے ماضی مطلق

کے لاحقہ 'یا' پر غور کیا ہے۔ سنسکرت میں اس
مقام پر 'ات' آتا تھا۔ 'ا' ارتقا پا کر دکنی وغیرہ میں
یائے مخلوط ہو گیا اور 'آ' میں بدل گیا۔ دکنی کی
طرح یہی برج میں بھی محفوظ ہے۔ مارنا سے دکنی
ماضی مطلق ماریا اور دکنی ماریو ہے جب کہ کھڑی
بولی 'مارا' میں 'ی' مفقود ہے۔

۷۔ مصدر میں ناکے بجائے محض 'ن' کا لاحقہ
مثلاً چلن۔ یہ پنجابی میں بھی ہے

۸۔ حالیہ ناتمام کے لیے مادے میں صرف ت
کا اضافہ مثلاً چلت، دیکھتا۔ برج کا یہ معیاری صیغہ

۹۔ بعض حروف برج سے شتر کہ ہیں مثلاً 'سون'
میں 'تے' (تینوں، یعنی سے)۔ کون برج کے کن سے
ماخوذ ہے۔

۱۰۔ فعلی مادہ بانچنا برج سے ماخوذ ہے۔ یہ
'پچھی' یا 'چا' میں موجود ہے۔
دکنی اور پوربی

پوربی کے تحت ہم مشرقی ہندی کی بولی اودھی
اور بہاری کی بولیوں بھوج پوری متصلی اور ٹکھی کو
یک جا لے رہے ہیں۔

سولہویں صدی کے نصف اول میں اودھی شہا
ہند کی اہم ادبی زبان تھی۔ ہندی کے گیان آشری
شاعروں میں کبیر اور ان کے پیروں نے اودھی میں
لکھا۔ پریم بارگیوں میں انفاق سے کئی مسلم شعرا نے
اپنے کارنامے اودھی میں پیش کیے جن میں ملک محمد
جانشی پیش پیش ہیں دوسری طرف رام بھگت پریم مارگ

ماتہ - پائے : اس کی رام حیرت مانس اودھی میں
ہے۔ اودھی کی طویل نظموں میں سے جائسی کی پداو
منجھن کی، ماحہ، مالتی اور داؤد کی چند این کسی نہ سی
شکل میں دکنی مشنوی میں منتقل ہوئی ہیں۔ منغل فوجوں
حب جو نیو ر اور دہلی مشرقی ریاستوں کو فتح کیا
ہو۔ ہاں کے بعض اہل فکر اور ستفا گھرات اور جو
اس لئے جس وجہ سے پوربی زبان و ادب نے
من یومسائر سنا شمالی ہند کی اردو پوربی اثرات
تے آزاد ہیں۔

۱۰۔ پوربی زبانوں کی ماملت حسب ذیل ہے۔

۱۔ مشرقی ہندی سے مستعار الفاظ میں ی کی جلد
ج بولی جانی ہے مثلاً جوگ، دگ، منتر (منتر)۔ اندجای
(انترجائی ہے۔ اور سامر)۔

۲۔ مشرقی ہندی میں لفظ کے ابتدائی ا کو و میں
اور ا کو ی میں بدل کر بولنے کا رجحان ہے۔ دکنی میں
میں اتا کو تا، اس کو ایکس اور ا کو و کو بگا گیا
۔ دکنی کے بعض صائرا کھڑی بولی میں ہیں ملتے
لنکس پوربی میں ہیں مثلاً

۳۔ اکا حال، ادنی کے علاوہ بھی اسٹھان کیا
گیا ہے مثلاً بھرے کو کھنڈا ڈالی (نوسر بار) ہنس بھوج
پوری اور سیھی ہمارے تہ ہے۔ بچھ کے موقع پر تہ
کا استعمال اودھی، بھوج پوری اور منتھلی کے اثر کو ظاہر
کرتا ہے۔

۴۔ تو صوں ہمت چھر کر بک جو پانگ دھیل بن
نور، یعنی تیرے نور نہ دھار تیرے زب را دشا نامہ
اپن، دکنی کے ساتھ پوربی اور دوسری کئی

زبانوں میں ملتا ہے

۵۔ ضمیم، متعارف یو اریہ، یورب کی بولیوں اور
او (وہ) منتھلی سے مماثل ہیں۔

۵۔ ذیل کے حروف پوربی سے مشترک ہیں۔

جے (جو) مشرقی ہندی اور منتھلی میں ہے۔
کی (کیا) مانگھی میں موجود ہے۔ سیتی (سے) مانگھی
'مٹی' سے مماثل ہے۔ کیرا، کیرو، کبرے مشرقی ہندی
اور مانگھی سے مماثل ہیں۔ بانج (بھنجر) اودھی میں بھی
ملتا ہے جہاں چہ جائسی کی پہاوت میں ہے۔

گنگن انت رکھ را کھا بانج کھمب بنو ٹیک

۶۔ دکنی فص جنس، تعداد میں مغربی ہندی کی

نسبت مشرقی ہندی سے قریب ہے۔

۷۔ دکنی کا متہو مصدر اچھنا، (ہونا) اور

اچھے کئی پوربی زبانوں مثلاً تہ مانگھی، اریا، بنگالہ
میں ملتا ہے۔

۸۔ چند : سرے الفاظ بھی پوربی سے آئے
ہیں مثلاً گھور (گھوڑا)، تانڈ (دوہی ہمارے)،
ہیلی (برت مہا، میو کے ہو کر)۔ ہیلی)۔ لفظ جائسی کے
ہاں بھی ہے۔ یا۔ (طوالف) دکنی اور راحتھانی

راجستھانی کی چاروں سماں ہیں صوانی بچے پوربی
اردو، ڈی اور مانوہی۔ جے پوربی مشرقی۔ صھانی ہے
اور مار ڈاری صوبائی راجستھانی۔ راجستھانی حکومت
نیپال میں بھی رہی ہے اس لیے راجستھانی کی ایک
بولی نیپال اور آس پاس کے پہاڑوں میں متی ہے۔
ڈاکٹر شری رام شرما لکھتے ہیں۔

شمال میں نیپال اور کے پانچا برکس جنوب

اچار (اس طرف)۔ پیلاڑ (اس طرف پرے، پھول بن میں۔ راجستھانی پیلاڑی۔ یہ الفاظ مراٹھی میں بھی ہیں) بنا (دولہا)۔ بندڑا (دولہا)۔ (دولہن)۔ مانڈا (منڈپ)۔ راجستھانی میں بھی مانڈا ہے)۔ رک۔ بڑ۔ راجستھانی روکھ۔

نیڑے۔ (پاس)۔

دکنی اور گجراتی

دکن کے مقابلے میں گجرات شمالی ہند سے نزدیک تر ہے۔ بیرونی نیردلی حکومت کے حملہ آور گجرات تک بھی پہنچے رہے۔ ۶۹۷ء تا ۹۸۷ء عیسوی ملاؤ اللہ علی نے گجرات کو سلطنت دہلی کا صوبہ بنالیا لیکن ایک صدی بعد ۱۳۹۶ء میں دہلی پر تیموری حملے کی خبر آئی۔ گجرات کے صوبے دار ظفر خاں نے خود کشی کا اعلان کر دیا اور ظفر شاہ کے نام سے تخت نشین ہو گیا۔ ۱۵۳۱ء میں گجرات کے بادشاہ نے مالوے کو گجرات میں ملا لیا۔

۱۵۶۸ء میں اکبر نے گجرات پر پہلا حملہ کیا اور ۱۵۷۲ء میں دوسرا حملہ کر کے وہاں کی آزاد مکتومت کو ختم کر دیا۔ تیموری حملوں کی وجہ سے دہلی سے کافی بڑی ہجرت گجرات کی طرف ہوئی جہاں چر گجرات کھڑی بولی کی توسیع کی پہلی منزل گجری کا مرکز بنا۔ گجری دکنی اردو کی ایک بولی ہے جو گجراتی سے مشابہ ہے۔ احمد آباد اور پٹن سے لوگ بجا لود اور گوندھ گئے جس کی وجہ سے وہاں کی دکنی میں بھی گجراتی اثرات آ گئے۔ دکنی اور گجراتی کے اشتراک کی تفصیل یہ ہے۔

اشتہاد کی تعمیل مثلاً بھٹی

ہاگر لفظ میں دو معکوس حروف آتے ہیں تو پہلے کو زندانی

میں لوگ کھٹے کی دکنی میں راجستھان کے لفظی روپوں میں کئی مقامات پر حیرت انگیز یک رنگی ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ دہلی پر راجستھانی کا اثر ہے جس طرح بہن جی پر برج، اشرقا۔ دکنی لفظوں کی جمع، فعل، مطلق، فعلوں کی تائیدی شکلوں اور تعلقات فعل پر راجستھانی اثرات ہیں۔ ذیل کی مثالیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ صبح میں آں، کالافتہ راجستھانی میں بھی

۲۔ ماہے مخصوص مارواڑی، میواڑی میں۔ ای، زور، بعض اوقات ہائے غنغنی پر ختم ہونے والے الفاظ میں 'ماں' لکھا جاتا ہے مثلاً ماہاں، بندیاں، ہستناں۔

۳۔ ماں، سیس، یعنی 'میں' ہیں، میواتی

سے اخوذ ہیں۔ ذیل کے الفاظ بھی میواتی سے ماخوذ ہیں

یوانی (پھلا)، 'بکا (کہاوت)، بھیلی

گڑو کی بھیلی (یہ کھڑی بولی میں بھی مستعمل ہے) لوٹری

(چیل حمد)۔ اپنی ضمیر مالوی بندیلی میں بھی ہے)

۳۔ سی سوں یعنی 'میں' لکھا، پنجابی کے علاوہ

مشرقی راجستھانی میں بھی ہے۔

۴۔ سوں (سے) اور اچھنا (یونا)

مارواڑی میں ہیں۔

۵۔ ذیل کے الفاظ بھی مارواڑی سے

ماثل ہیں۔

کھوٹ (بدنامی)۔ چٹری (راجستھانی چٹری)

ڈوں گر (بہار، گلشن عشق)۔ دھن (عورت)۔ قہیم

(راجستھانی میں)۔ دھنی (شوہر)۔ پکھو (اے

راجستھانی پکھو یعنی پکھڑی)۔ پرجو (کلمات)

کر دیا جاتا ہے مثلاً ڈاٹ (بجائے ڈاٹ)
۳۔ جنس کے معاملے میں، کئی کھڑی بولی کی نسبت گجراتی سے زیادہ متاثر ہے۔

۴۔ اسم کی کثرت دکھانے کے لیے گھرے گھر (گھر گھر) بے بل جیسی ترکیبیں گجراتی میں
۵۔ ذیل کے اسم گجراتی سے مستعار ہیں

انجھو (آنسو) بندرا (زیند)۔ گہ حڑاے گجراتی
گھر صاڑو۔ چاڑی (چنلی)۔ ٹیلا (ٹیک)۔ سہارا۔ اہل
ابول۔ نادر (دن)۔ گھنڈ۔ پھانسا (کھلا ہوا) پھولا
ہوا۔ مگس (کھالی)۔ زادے (گھر و سوار) میری
(ایک قسم کی لکڑی)۔ سپر (چمک)۔ پوٹ (طوطا)۔ مگام
(گھاڑی) ڈوسا (بڑھا)۔ ڈوں گر (پھاڑ)
۶۔ ذیل کے غیر گجراتی سے ملتے ہیں

ہوں (ہیں)۔ تم (تم)۔ ہمن، ہمن سے گجراتی
ہنے۔ ہوں نے۔ تموں نے۔ اے (وہ)
۷۔ ذیل کی صفات گجراتی سے ماخوذ ہیں

نیٹ (طے شدہ)۔ پیلا سے گجراتی پیلوں (بغی)
پہلا۔ پھوک (جھوٹا)۔ گھنڈ (بہت) گھیلایا گھیلایا
(سادہ لوح)۔ سگلا (سب)۔ اوڈا (گہرا)۔ اگل
(اگلا)۔

۸۔ ماضی مطلق میں یا بے غلوٹ گجراتی میں بھی مثلاً پڑیا
کینا (بھی کیا)۔ گجراتی میں ہے
۹۔ اتھا (بھی تھا)۔ سی یا سے بھئی گا۔ مثلاً ہے (رہے گا)

اچھے معنی ہے گجراتی چھے
جاڑے کر جیسے میٹھے بھی گجراتی سے ماخوذ ہیں
۱۰۔ ذیل کے افعال گجراتی ہیں۔

دانا (گڑھے کو مٹی سے بھرنا)۔ دٹ دن۔ کچھونا
دل دکھانا، کچھون۔ لونا (فصل کاٹنا)۔ دھارنا۔
(بھاگنا)۔ پاسنا (ہل چلانا)۔ جوتنا (دیکھنا)۔ جوتا
(دیکھا)۔ ماتھنا (ڈالنا)۔ گنا (پسند آنا)۔ دل پہلانا
سوسنا (برداشت کرنا)۔ بیسنا (بیٹھنا)۔ نہاسنا
یانامٹھنا (بھاگنا)۔ مگل (لجھنا)۔ پھینا)۔ کھوٹے
بھنی کھلائے)۔ رہے

۱۱۔ تاکید کے لیے ج یا آج کالافہ گجراتی سے ماخوذ
ہے مثلاً دلچو (دل ہی)
۱۲۔ ذیل کے حروف گجراتی سے مستعار ہیں

پو (پر)۔ سینس، سینس، تے، تھے۔ ستے (پانچ)
بھنی سے)۔ جے (جو)۔ نے (نہیں)۔ ایم اور ایمنا
(اس طرح)

۱۳۔ ذیل کے متعلق فعل یا تیز گجراتی سے ماخوذ ہیں۔
پھنچیں (بعد میں پھر)۔ ہے (اب)۔ ایلٹ
(اس طرف مندی کے اس کنارے)۔ پیلاڑ (اُس طرف)
ندی کے اس کنارے)۔
دکئی اور موٹھی

ایک زمانے میں دیوگیری ہمارا شہر کا پایہ تخت
تھا۔ دکن میں مسلمانوں کا پہلا پٹاؤ وہیں پر ہوا۔ محمد تعلق
نے اسی جگہ دولت آباد آباد کیا جس کے قریب اونٹ
نے اونٹ آباد آباد کیا۔ اس طرح یہاں دکنی اور مراٹھی
کا جڑاں ہوا۔ ہمارا شہر کے مگر ان کی سرکاری زبان فارسی
ہی ہے۔ یہاں کی حکومت میں مراٹھے، اہم عہدوں پر
نائز تھے۔ عرصے تک یہاں کی سرکاری زبان مراٹھی
ہی ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف مراٹھی میں

ہو کہ کھڑی بولی ملا قد میں بھی جیاستی اور دیاستی بولا جاتا ہے
ان کی اصل اردو لفظ زیادتی ہے۔

۴ مراٹھی ڈ۔ دکنی ر۔ پیلاڑ۔ پیلاڑ

۵ مراٹھی زہ۔ دکنی جھ۔ زھانپ۔ جھانپ، زھتی
جھرتی۔

۶ شاذ مراٹھی پ۔ دکنی پ۔ نہڑ۔ ہتر (بیکل)

۷ مراٹھی شس۔ دکنی سس۔ میخوٹ۔ میوٹ

(آخری)

۵۔ مراٹھی کی ہائیت بعض اوقات دکنی میں حذف ہو جاتی ہے
مثلاً دکنی اندلا۔ مراٹھی آندھلا۔ دکنی میٹر۔ مراٹھی میٹر

دکنی کا عام رجحان ہائیت کو زائل کرنے کا ہے۔

ادک، سادنا، لاب، کارٹا جیسے الفاظ مراٹھی

مصرعہ اور ہندی میں ہائے مخلوط کے ساتھ ہیں۔

۱۔ جمع کے لیے ان کا لاحقہ لگانا مثلاً لوکاں۔ جن الفاظ

کے آخر میں ی یا ہ ہے ان کی جمع میں ی ای لگایا جاتا ہے

مثلاً ستاریاں، پکڑیاں۔

۲۔ موصوف کے ساتھ صفت میں افعال کے دونوں

اجزائیں جمع کا لاحقہ لگانا مثلاً بڑیاں شیدتاں۔ لکھتیاں

چلیاں۔

۳۔ بعض اوقات مصدر بغیر کے مثلاً ملن۔

۴۔ تلمیح عمل بنانے کے لیے دوسرے لفظ کے پہلے حرف

کو گ کے بدلے دینا۔ یہ کنڑ میں بھی ہوتا ہے مثلاً باجا

گیجا، روٹی، گئی۔

نحو

۱۔ جنس کے معاملے میں دکنی کھڑی بولی کے بجائے مراٹھی

سے نزدیک تر ہے۔

ثرت سے خامی اور دو الفاظ ہیں دوسری طرف دکنی دارد
پر دوسری ہندوستانی زبانوں کی نسبت مراٹھی کا اثر سب سے

زیادہ ہے۔ اس کی نشان دہی کسی حد تک ڈاکٹر شری رام

شرما نے اپنی کتاب میں کی ہے۔ ان سے بھی زیادہ تفصیل

سے ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ایک مفصل مضمون میں

لکھا ہے۔ ذیل میں ان سے بطور خاص استفادہ کر کے

دکنی اور مراٹھی کے مشترک فاعل کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

صوتیات

۱۔ مراٹھی کے طویل مصوتے کو خفیف کر دینا۔ ذیل میں

پہلے دکنی لفظ دیا ہے بعد میں اس کی اصل مراٹھی

ساٹھ پڑنے۔ اندھلا۔ آندھلا۔ کنولی (عام، نرم)

بولی۔

۲۔ اس کے برعکس مراٹھی میں انو سوار سے پہلے کے

خفیف ا کو دکنی میں بدل کر طویل ا کی مثالیں بھی ملی

ہیں مثلاً مراٹھی ہندی سنسر۔ دکنی سوسار۔ مراٹھی

ڈنگر۔ دکنی ڈونگر۔

۳۔ اگر کسی لفظ میں دو معکوس مصتے ہوتے ہیں تو جنوبی

مراٹھی اور کوئٹھی کی طرح پہلے کو ذہنی بنالیا جاتا ہے مثلاً

واٹ (ڈاٹ) ٹکڑا۔

۴۔ مراٹھی اور دکنی میں ذیل کی آوازوں کا تبادلہ ملتا ہے۔

۱۔ مراٹھی و۔ دکنی ب۔ دانٹے۔ بانٹے (ھٹا)

۲۔ مراٹھی ن۔ دکنی آنٹے۔ آٹنے

لٹانا۔ دسنے۔ دسنے (دیکھنے)

۳۔ مراٹھی ز۔ دکنی ج۔ ازول۔ اچول (بیکل)

زالنے۔ جالنے (دلانے) شاذ مراٹھی ج دکنی زیں بدلی

ہے۔ مراٹھی جیاست۔ دکنی ریاست (زیادہ)۔ وانج

۱۔ صفت منافقہ کو جملہ کاجز و بنا نامر اٹھی نحو کا اثر ہے مثلاً

پیو منا کیا سو پرہیز (معراج العاشقین)
جسے کڑیج نہیں اس کی آستیں میں پیکے تھے
(شکار نامہ)

۲۔ اسی کے معنی میں صج کلا حقہ لگا مثلاً کیرتج۔ یہ گھڑی میں بھی ہے۔

لفظیات۔ ڈاکٹر شری رام شرما اور ڈاکٹر دلوئی دونوں نے دکنی اور مراٹھی کے مشترک لفظوں کی طویل فہرست دی ہے دلوئی نے نسبتاً زیادہ نمونہ حاصل سے۔ دلوئی مراٹھی اہل زبان کی طرح بولتے ہیں اس لیے ان کی نشان دہی پر یوراجھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ دونوں حضرات کی فہرستوں کو ملا کر درج کیا جاتا ہے۔

اصل (نخلت)۔ ابحال (آسمان) اڑی (ایک مقام سے دوسرے مقام پر جلدی سے اچھل کر پہنچنا) یعنی نام کی صلاحیت کا لو (تالاب مانہر) کلاسا (بودے کی قلم)۔ کوسا (جلنا)۔ مراٹھی کوئی سا (گت (خروج) گوئی) کھار۔ شیر کی (کاٹا رگتا) حیار (چینکا) (تھسا)۔ خرا (یاترا)۔ جھلا (جھلسا) (بھولوں) کاجھڑا، ایک قسم کا کھڑا دیو (دھار دیو)۔ مراٹھی ڈھکال (ڈھیک) چٹک (زری کا کڑا) ایک زبور (طاس)۔ ٹھنڈا (مراٹھی تاس)۔ تھوٹرا (صوف کے نیچے تھتے ہوئے)۔ مراٹھی تھوٹ (ٹرائی یا)۔ ہی (تندیت کی طرف سے دلائی گئی قسم)۔ مراٹھی ڈرائی (ہندی ڈھلی)

نڈوا (دراکٹ)۔ مراٹھی ٹڈ (نیٹ) (کوشش، محنت) ہجر، گھڑے سے رسنے، انی ریتی ٹٹے۔

پارمی: برکی دارمی۔ پیک۔ پیداوار۔ پورن، پوریوں کے بیج بھرنے کی مینشی ٹٹے۔ مراٹھی پڑی پیکا: عیسا، چار کوڑی۔ برہموا۔ بلبلہ۔ بوہی۔ ناف۔ ٹڑی: پہاڑ کے نیچے سنبائی کے لیے کھودا ہوا گڑھا مراٹھی، برہمی۔ ماکڑ: مکڑا۔ ہراس: ساتھ رہنا، ہستی۔ راج ڈ: ریاست، راجہ کا طور طریقہ۔ لاوک: خرافات، جھگڑا۔ دیتاگ: پچھتاوا، ترک دنیا۔ ہوڑی: کشتی

ذیل کے تمام مثالیں ڈاکٹر دلوئی کے مضمون سے ماخوذ ہیں۔ انھوں نے کئی ایسے لفظ بھی دیے ہیں جو مراٹھی کے علاوہ کھڑی بولی یا ہندی میں سہل ہیں مثلاً اچکار، بھار، بست (چیز)۔ ماٹ وغیرہ۔ انھیں مراٹھی کے ذمے رکھنے کی ضرورت نہیں۔

اڑباٹ: ماہوار راستہ۔ تغادا: تغافل۔ بیک، بیٹک، نشت۔ جھاڑ: درخت۔ پاٹ، کواڑ، ٹیٹ۔ اودھان: جوار۔ بانٹے، حصے (کھڑی بولی میں بھی آتا ہے)۔ دھالوں: راجہ۔ یکپن: ایکلاپ۔ ٹنگ: ادا۔ اندلا: اندھا۔ اٹس: ٹنگ دھاک: ڈر۔ جھانپ: چھلانگ۔ اوناوا: جلدبازی باؤلاں: قدم (دمع) پادنا: جہان، مراٹھی پاہونا: جھڑا جھڑا، خیمہ۔ چاڑی: چٹلی۔ پور: سیلاب۔ چیشو: وزیر ٹیلک: ٹیلک، ٹیکا۔ نام: میکا ٹیشوی: ٹیڑی، ایک آبی پرندہ۔ ڈونگر: پہاڑ۔ دیوٹی: جھوٹا چرخ

محاورے:

ڈاکٹر دلوئی نے دکنی ادبیات میں بعض مراٹھی

محاورے بھی دریافت کیے ہیں جو یہ ہیں۔

بات بھوڑنا، راز فاش کرنا (غوامی)

سوکھ سوکھ کر کاڑی ہوتا سوکھ سوکھ کر لٹا ہوتا (غوامی)

پایاں پٹر، پاؤں پڑنا (غوامی)

بول لگانا، نام دھڑنا۔ داناں دان ہونا: برباد ہونا۔

ڈڑی مارنا، خاموش رہنا۔ نانوں جگارتا: نام کوٹ

کرنا۔

ذیل کی دو مراٹھی کہاوتیں دہی نے سب رس میں

استعمال کی ہیں۔

۱۔ بیل گیلانی زوپاکیلا، کسی کام کو وقت گزرنے پر کرنا۔

۲۔ سافے وہ نہاے، سٹھیا نا۔

مراٹھی اثرات کی طویل داستان قائم ہوئی۔ اس سے واضح

ہوا ہو گا کہ دکنی پر جتنا مراٹھی کا اثر ہے اتنا کسی دوسری

ہندوستانی زبان کا نہیں۔

دکنی اور کوکنی:

کوکنی مراٹھی کی ایک بولی ہے جو گوا سے لے کر کنگ

اور کیرلا کے ساحل تک بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے

والوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے جن میں سے بیشتر

گوا میں ہیں۔ گوا کے باشندے بالخصوص ہسانی کوکنی

کو مراٹھی سے علاحدہ زبان کہنے پر مصر ہیں۔ ڈاکٹر سہیل

بخاری نے دکنی پر اپنے طویل مضمون میں دکنی کی کوکنی سے

مانگٹ پر زور دیا ہے۔ ذیل کی سطور کا ماخذ انھیں کا

مضمون ہے۔ دقت یہ ہے کہ ہم ان کا ماخذ معلوم

نہیں۔ میں نے ایک کوکنی بولنے والے سے ان محاورات

کی تصدیق چاہی تو غنائیت کے علاوہ بقیہ سے اس نے

ناواقفیت کا اظہار کیا۔ وہ کرناٹک کا رہنے والا ہے۔

واللہ اعلم حقیقت کیا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر سہیل بخاری کے

حوالے سے ذیل کے محاورات درج کرتا ہوں۔

۱۔ مراٹھی کا 'اے' کوکنی اور دکنی میں آہو جاتا ہے مثلاً

دکنی لٹارا، اندھارا، کسالا۔ ہندی میں یہ لٹیرا،

اندھیرا، کھیلا ہیں۔

۲۔ لفظ کے شروع میں 'ا' کو ی میں اور 'آ' کو و میں بدلنے

کا رجحان جو اودھی سے ملتا ہے جتنا (اٹا) کیس

(ایکس)۔ ووٹ (اوٹ)۔ دیتا (اٹا)

۳۔ پو (پر)۔ کو (کے)۔ چل کو، پنی کو

۴۔ طویل مصوتے کو مختصر کرنا۔

۵۔ تشدید کی تفصیل لیکن تلالی کے لیے کسی مصمتے کو کھینچا

نہیں جاتا مثلاً پت۔ ہت

۶۔ ہائیت کو حذف کرنا مثلاً بات، بی۔ شاذ ہائیت

کا اضافہ مثلاً دور کی جگہ دھور۔

۷۔ نون فتنہ کی کثرت خصوصاً طویل مصوتے کے بعد

مثلاً کون، سوں۔ غنائیت کوکنی میں بہت

کثرت سے ہے۔

۸۔ مراٹھی وغیرہ کی طرح دو معکوسی مصمتوں میں پہلے

کو دہرائی کر دینا مثلاً تھلٹ۔ تھلگ

۹۔ جمع میں آن کا لاحقہ

۱۰۔ حالیہ ناتمام میں ت کا لاحقہ مثلاً دیکھت بچلت

۱۱۔ لفظ کھلگا، بھینسا کوکنی ہے۔

دکنی اور کٹنر۔

حالانکہ دکنی کرناٹک میں خوب بھلی بھلی ہے

اور گوکندہ تھے گوکندہ تیلگو علاقہ تھا۔ چوں کہ کٹر اور
تیلگو دروازہ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے ادبی
دکئی میں ان کے الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہاں جیٹکا
کرنول وغیرہ کی بول چال کی موجودہ دکئی میں ضرور کئی
تیلگو لفظ ملتے ہیں۔ واضح ہو کہ دروازہ زبانون میں
تیلگو سنسکرت سے کافی نزدیک ہیں۔ اس میں سنسکرت
الفاظ کی کثرت ہے۔ دکئی نے کئی سنسکرت تسم و
تبدیلوں الفاظ پر اور راست سنسکرت سے نہ لے کر تیلگو سے
لیے مثلاً کوپ، غنہ (کلیات قلی قطب شاہ)۔ تیلگو گوپم
اگر سنسکرت سے مستعار لیتی تو کروہہ سامنے کا لفظ تھا۔
دوسری طرف بعض سنسکرت الفاظ اصل دروازہ
ہیں۔ ان میں سے ذیل کے لفظ تیلگو میں بھی ہیں۔ ڈاکٹر
شری رام شہنا نے ایسے چند الفاظ کی فہرست دی ہے۔
آی۔ سنسکرت آلی، ایسی۔ تیلگو آل، یوی
کوٹ، قطعہ۔ سنسکرت اور تیلگو کوٹ

نیر، پانی۔ سنسکرت نیر۔ تیلگو نی،
اسی طرح پٹن، شہر، گھاٹوں، مارنگی اور ٹکابگی اور اور
الفاظ ہیں جو دکئی ادب میں ملتے ہیں۔ کتابی دکئی ادب
میں تیلگو کے مرن حسب ذیل الفاظ ملتے ہیں۔
بھکار، سونا۔ تیلگو بھکار۔ سکل کوٹ چوگرہ بھنگلو کے
(قطب مشری)
نجل، اتار پھیل۔ تیلگو منج، جمع منجل۔ میٹھے کئی یہ کے
چٹھے سنی بھرا ہے منجل (کلیات شاہی)
ڈاکٹر راج بہادر گھنٹے دکئی ادب سے تیلگو کے
دو تین الفاظ کی نشان دہی کی ہے (قلی قطب شاہ)
لاوے، تالہ، نہر، پانی نے کاوے جو کے بہا کے
حال مرادوئی، نادال، ہند کوپ، رقیب (قلی قطب شاہ)

در بجا بود، بیدر، بگر، میسور دکئی کے ملازم ہیں
لیکن ادبی دکئی پر کٹر کا کوئی اثر نہیں۔ ڈاکٹر شری
رام شہنا نے دکئی ادبیات سے ۱۹ الفاظ تلاش
کیے جو کٹر میں بھی ملتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔
اڑ، رکاوٹ۔ کٹر اڈا (ارشاد نامہ)۔ آوا،
نکھار کا آوا۔ ہندی آوا، کٹر آوی۔

پھول بن

کھڑی۔ کٹر کوڑو، سیٹھا۔ ہندی کھڑی (قطب مشری)
چاری کٹر چاری۔ مراٹھی چاری (پھول بن)
واٹ۔ مراٹھی واٹ۔ کٹر واٹ، بھیر، کچ، بچ۔
ظاہر ہے کہ دکئی نے مراٹھی سے لیا ہوگا ان کے علاوہ
چار الفاظ آوا، (کٹر آوی)۔ گڈری (کٹر گڈ کھونڈنا)
بکڑ، (کٹر بکڑی، ہندی بکڑا)۔ جھونپڑی (کٹر جھونپڑی)
دکئی ادبیات میں آئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہاں کٹر
سے نہیں لیے گئے۔

بول چال کی موجودہ دکئی میں ذیل کے الفاظ کٹر

سے ماٹھ ہیں

گھڑی، جھونپڑی۔ کٹر گڈوی۔ تانبل، کچھوا
کوٹ، قطعہ۔ سنسکرت کوٹ۔ کٹر کوٹے
گول، جلنا۔ کٹر گول ٹی

بجا بود کی بول چال میں مسوتوں اور ہایت کو ادا

گھنٹے وقت کٹر بھج کا اثر ملتا ہے۔ تیلج بھل بنانے
کے لیے دو سرے لفظ کے شروع میں ک لگانا بھی
کٹر سے ماٹھ ہے مثلاً باجا گجیا، میانا گینا، روٹی گئی
دکئی اور تیلگو

دکئی کے دو سب سے بڑے مرکز بجا بود

ان کے نزدیک دوئی ماخوذ ہے دو راجب:
راجہ، زمیندار سے لیکن ڈاکٹر شری رام شرمانے لکھا
ہے کہ ڈاکٹر لدکا یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ لفظ تیلگو دراج
بڑا سے بنا ہے۔ دکنی میں کئی نے اس لفظ کا استعمال
بڑے پن یا حکومت کے معنی میں نہیں کیا۔ دراصل یہ
مراٹھی لفظ ہے۔ سب رس اور کلیات شاہی میں یہ سرکاری
حکم کے لیے مستعمل ہے۔ مندرجہ بالا مصرع میں کوپ مشتق
ہے تیلگو کوپم سے

بکٹ تیج منج کرتے کٹ منے پیرت بکٹ، پنسر یا بکٹ
(قلمی قطب شاہ)

ڈاکٹر گوڑ کے مطابق اس میں بکٹ بمعنی 'ایک' ہے اور
تیلگو لفظ 'داکٹی' سے ماخوذ ہے

تیلگنا کی بول چال کی دکنی میں کافی تیلگو الفاظ
ہیں۔ کچھ الفاظ کی فہرست ڈاکٹر شری رام شرمانے دی ہے مثلاً
کتا، جھاڑو یا تالاب کا باندھ۔ گھڑسی، جھوپڑی، تیلگو
گڑاس

تانبیل، کھجوا، تیلگو، تانبیل، مندا، بیڑوں کا ریڑ
ایٹی، بیگار، گپا، ڈبیر، گپا، ٹوکر، ڈپٹا، ٹوپی
ڈٹا، موبا، پوتھا، لڑکا، بندھی، بیل گاڑی، جٹنا،
گوڑی، مندم، موٹائی

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بول چال کی زبان میں ذیل
کے مزید تیلگو الفاظ کی نشان دہی کی کہ یہ بات بکری پتا۔
کریا پاک، بڑا کاٹ، ایک قسم کی چھوٹی ٹھکڑی، چکورا،
ایک سبزی، تیلگو جیم کورہ، ایرو، کھاد، گڈا، کڑا،
گینگل، کسٹھا، قصبہ، کاڑھی، بھنگی، ڈنڈ، بیکار،
فجھول، کورہ، کھانا، کووی، بھنوں کو کھلائی جاتی ہے۔

کوڑنڈ: ایسا شخص جسے کھانا فضول ہے۔ گنڈم
محسبیت۔ چکر: اہلی کا نیا پتا۔ کٹا: تالاب۔ گٹا: کتھ
باس کے سرے پر بندھی ہوئی چھری جس سے پیر کے پتے
توڑتے ہیں۔

روپ رائی: دال پیسنے کا گول پتھر۔ بخردوڑی: جانورو
کو باندھنے کی جگہ۔ تیلگو بندل دوڑی۔ ٹٹا: ٹیلا۔
لگ لگ: ڈھیلا۔ گلارا: پلاسٹر۔ چروندی: چڑوا۔
چبانے کی ایسی چیزیں جو چلتے پھرتے کھائی جائیں۔ مدہ:
کندھن۔ مودلا: درخت کا ٹانہ ہوا موٹا ٹکڑا۔ مڑکل:
بیسن کی چمکیاں۔ بٹو: میکا۔ گمبا: گھر۔ پچرا: اہلی
کا شربت۔ گٹا: ٹھیکا۔ پچی پلسو: اہلی کا کھانا رسم۔
کٹا پلسو: بہت کٹا۔ تیلگو پلسو: کٹا۔ پکا پنڈو: بہت
پکا ہوا پھل۔

چھوٹے بچوں سے بات کرنے میں بہت سے
تیلگو الفاظ استعمال ہوتے ہیں مثلاً
بوراج، سندریست، گھٹا ہوا، ہندی، توند۔ بوجا،
پیٹ۔ آپا: روٹی۔ چیا: بوٹی۔

ذیل کے محاورے بھی تیلگو الفاظ پر مبنی ہیں۔
گمبا گتہ لے لینا: سارا مال خرید لینا۔ جٹا بنا: سبق سکھانا
کر کر کر کرنا، حجت کرنا۔ چٹے مارنا: گپیں ہانکنا۔ ٹرسنا:
خوش ہونا۔ کٹ کٹ کرنا: جھگڑا کرنا۔ ترگی ترگی پھرنا:
آدراہ گردی کرنا۔ رسکے لے جانا: وزن بادل ناخواستہ
دھوننا۔ دک میں ہے: سہارا نہیں ہے۔ تیلگو دیکو۔
کائے میں کچھ نہیں گلے میں روپ رائی، جس خاتون کے
پاس اہلیت نہ ہو صرف دکھاوے کا ٹھکانا ہو۔ مینا
ڈاکٹر شری رام شرمانے کے مطابق دکنی کا فعل

زبانیں ہیں اس لیے زیادہ امکان یہ ہے کہ دکنی نے
ان سے فیض اٹھایا ہے۔ بعض خصوصیات ایک سے زیادہ
زبانوں کے ساتھ مشترک ہیں مثلاً جمع میں اُن کا لاحقہ
پنجابی، ہریانی، راجستھانی، مراٹھی اور کئی زبانوں میں
ہے۔ کئی دکنی الفاظ اور لاحقے مثلاً تاکید، گجراتی
اور مراٹھی دونوں میں ہیں۔ قرب مکانی کے سبب اگر
ایک طرف گجراتی کا اشتراک مراٹھی سے ہے تو نسلِ قرب
کے سبب گجراتی، راجستھانی اور برج میں بہت کچھ
مانگت ہے۔ ہندو آریائی بولی ہونے کے سبب دکنی ان
سب سے متاثر ہوئی ہے۔

اُردو کو مخلوط زبان کہا جاتا ہے جو سانی اعتبار
سے صحیح نہیں۔ دکنی اس کی ایسی بولی ہے جس نے ذیل
الفاظ کے علاوہ قواعد کے اصولوں میں بھی پاس پڑوس
کی زبانوں سے اخذ و استفادہ کیا۔ دکنی پر دوسری
ہندوستانی زبانوں کا اثر ایک متقل تحقیق کا موضوع
ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اُردو اکیڈمی کی اعانت سے
میری لونی مدسٹی میں اس پر تلاش و تدقیق ہو رہی ہے۔
حوالے اور حواشی:۔

۱۔ ہیل بخاری: قدیم دکنی اور اُردو زبان کا تقابلی
مطالعہ۔ اُردو نامہ، شمارہ ۱۸۔ بابت اکتوبر تا دسمبر
۱۹۶۴ء ص ۶۹۔

۲۔ دتہ ہیل بخاری: اُردو کا قدیم ترین ادب۔
نقوش ۱۰۳، مئی ۱۹۶۵ء ص ۸۲

۳۔ ڈاکٹر شری رام شرما: دکنی زبان کا آغاز اور ارتقاء۔
اُردو ترجمہ از غلام رسول۔ مقدمہ از مسعود حسین خان
ص ۹۔

تیلگو سے ماخوذ ہے۔ اس کو 'بول کو' یا بول کر کے
اضافے سے ادا کیا جاتا ہے۔ یہ تیلگو کا لفظی ترجمہ
ہے مثلاً انوں کھانا بول کر کھالیا۔

دکنی میں وہ جاناکتے۔ وہ جانے کو کہتے ہیں مگر
نحوی ساخت تیلگو نحو کا ترجمہ ہے۔
دکنی اور متفرق زبانیں

دکنی کی صفتِ عددی بر ا کرت اور اپ بھرنش سے
منطقی ہے۔ صفات اپ بھرنشوں سے نزدیک ہیں
لیکن بعض عددی صفات اپ بھرنشوں میں بھی نیں
میتیں۔ وہ کسی نامعلوم بر ا کرت سے متعلق رہی ہوں گی
دکنی میں تشدید سے ہیل سندھی کی طرح
ہے مثلاً پنچھو، اول، بھٹی

بار، تلوار کی دھار بندی ہے پوتا، اونٹ کا بچہ۔
امیری پوٹ ڈا، آلی، یوی۔ گونڈی آلی، کوٹ؛
سنکرت کوٹ۔ تامل کوٹ نے۔ پن، شہر۔
دراوڑی پٹی، نارنگی۔ دراوڑی نار؛ سونگھنا۔
ہیلم ناوان ٹکٹے، پھل۔ ٹکا۔ دراوڑی جزیرہ۔
مندہ جہ بالا سطحوں میں دکنی اور دوسری زبانوں

کے ماثلات کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ دوزبانوں اور
ب میں بعض مشترک خصوصیات و عناصر ہوں تو اس
دزبانہ معنی نہیں کہانے انھیں ب سے لیا ہے۔ یہ

بھی ممکن ہے کہ ب نے وہ عناصر و سے لیے ہوں۔
ایک تیسرا امکان یہ ہے کہ ا وہ ب دونوں نے اپنے
خترک مدت سے لیے ہوں۔ چون کہ دکنی بالذات
ایک متقل زبان نہیں بلکہ کھڑی بولی کی ایک ذیلی بولی ہے
جب کہ مراٹھی، گجراتی، پنجابی وغیرہ متقل مستحکم

اپریل ۱۹۵۷ء کا سوویٹز مرتب عابد علی خاں
۵۱۱ ڈاکٹر شری شرما کی کتاب م ۲۵۲
۵۱۲ یہ جزو ڈاکٹر شرما کی کتاب م ۲۹۳ سے ماخوذ ہے۔

[اخترا ایمان ۲۵۱ سے آگے]

کی نمائندہ نظیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ ان نظموں میں
ان کا پختہ رومانی شعور ملتا ہے۔

تجھ سے وابستہ وہ اک عہد وہ پیمانِ وفا
رات کے آخری آنسو کی طرح ڈوب گیا
خواب انگیز نگاہیں وہ لبِ فسیاد
اک فسانہ ہے جو کچھ یاد رہا کچھ نہ رہا
میرے دامن میں نہ کلیاں ہیں، نہ کانٹے نہ غبار
شام کے سائے میں دامادہ سحر، نہ گئی
کارواں لوٹ گیا مل نہ سکی منزلِ شوق
ایک امید تھی سو خاکِ سرِ میہ گئی

(محمودی)

مختصر یہ کہ موجودہ نسلِ اختر الایمان کے کارناموں
کی کبھی فراموش نہیں کر سکتی وہ نئے اسلوب، اور نئے
انداز فکر کے مروج کرنے میں اہم حصہ لیا ہے۔ انھوں نے
تجدیدی عنصر کا جادو جگایا ہے۔ اختر الایمان کی شاعر
عہدِ جدید کے ادبی سرمایے میں ایک اہم اضافہ ہے۔
اسلوبِ بیان - فکر انگیزی، احساس کی ندرت،
ایمانی انداز کی وجہ سے ان کی شاعری میں خاص طرح
کی انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ انھیں اپنے معاصرین
سے ممتاز بناتی ہے۔

حیدرآباد ۱۹۶۷ء -

۵۱۱ بحوالہ سہیل بخاری: اردو کا قدیم ترین ادب - لغوی
۵۱۲ نئی ۱۹۶۵ء - نیز گنج ہائے گراں مایہ از افسر امروزی۔

قوی زبان کراچی - جنوری ۱۹۶۳ء م ۲۹ -

۵۱۱ نگزار عشقِ قطعی محرومِ ذہن ترقی اردو پاکستان بحوالہ
مارتھ ادب اردو جلد اول از جمیل جالبی م ۵۴۳۔ طبع
اول دہلی۔

۵۱۲ یہ حصہ زیادہ تر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی مقدمہ
مارتھ زبان اردو اور ڈاکٹر شری رام شرما کی کتاب سے
ماخوذ ہے۔

۵۱۳ شریا: دکنی زبان کا آغاز اور ارتقاء م ۲۴۳ -

۵۱۴ یہ حصہ ڈاکٹر شرما سے ماخوذ ہے

۵۱۵ شریا: م ۲۶۵

۵۱۶ شریا: م ۲۸۱

۵۱۷ گجراتی کے باب میں نے تین تحریروں سے فائدہ
اٹھایا ہے۔

۱- حفظ اللہ انصاری: مضمون گجری، گجری یا بولی

گجرات - شاعر شمار ۶۵-۶۸ و ۸۰

۲- ڈاکٹر عبدالستار دہلوی: دکنی پر مراثی کا اثر -

زبانِ بستی - اکتوبر ۱۹۶۰ء

۳- ڈاکٹر شری رام شرما کی کتاب

۵۱۸ ڈاکٹر دہلوی بحوالہ بالا مضمون

۵۱۹ تیلگو کا باب دو کتابوں سے ماخوذ ہے

۱- ڈاکٹر شرما کی کتاب

۲- ڈاکٹر راج مہاد گوڈ: مضمون دکنی اردو

پرنٹنگ کے اثرات - مشمولہ تیلگو دانی عالمی تیلگو کانفرنس

حسن عسکری

ایک تجرید سے دوسری تجرید تک

ہی نہیں رکھتے۔

یہ مفروضات ایک طرح حقائق ہی ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ یہ چیزیں تو اب اتنی بدیہی بن چکی ہیں کہ اندر سے کوئی نظر آجائیں مگر دوسری طرح دیکھیے تو یہ تینوں رجحانات انیسویں صدی کے ہیں، بیسویں صدی کے نہیں۔ بیسویں صدی نے صرف اتنا اضافہ کیا ہے کہ رجحانات چند ملکوں اور چند طبقوں تک محدود تھی اسے بڑھا کر عالمگیر بنا دیا ہے، اور اب یہ رجحانات اپنی اندرونی منطق کی آخری صدوں تک پہنچ رہے ہیں۔ اس عمل کا لازمی نتیجہ ہے کہ جب ایک طرح کے امکانات ختم ہونے لگیں تو دوسرے رجحانات پیدا ہوئے۔ اب ہماری دنیا اس نئے دور میں داخل ہو چکی ہے۔

اس نئے عمل کو یورپ کے بعض شاعر اداویب آج سے تیس چالیس سال پہلے ہی بھانپ گئے تھے۔ انرا پائونڈ نے یوں تو زیادہ تر مذکورہ بالا تین رجحانات کی اپنی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مگر نئے عمل کی طرف اشارے اس کے پہلے ہی موجود ہیں نئے رجحانات کا ادبی وادبی تصور ڈی، ایچ لاونس کے یہاں ملتا ہے اور سترہویں صدی کے گینوں نے تو اس عمل کا پورا تجزیہ پیش کیا ہے لیکن اب

ایسی دور میں ادب زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر زندہ رہ سکتا ہے تو ان حالات میں آخر اس کا فریضہ اور سانسٹر میں اس کی جگہ کیا ہوگی؟ یہ سوالات ایسے ہیں جو اب تک ادب اور ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ ان مسائل پر نظریہ سازی اور خیال آرائی تو خیر دھڑلے سے ہی رہی ہے۔ لیکن جو بڑا بھلا ادب اور جس نوعیت کا بھی ادب آج کل پیدا ہوتا ہے اس پر بھی انہیں مسائل کا منحوس اور تخریبی سایہ پڑتا ہے۔ مفکر ہوں یا ادیب! ان مسائل پر جس انداز سے غور کرتے ہیں اس کے پیچھے تین مفروضات ہوتے ہیں جنہیں یہ لوگ سلمت کا درجہ دیتے ہیں۔ (۱) کائنات کی تسخیر میں ادب نہیں بلکہ سائنس انسان کا مدد کر رہا ہے، اس لیے ادب کی اہمیت بالکل گھٹ گئی ہے اور سائنس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے (۲) پوری دنیا نے صرف مادی ترقی کو اپنا مسلحہ نظر بنالیا ہے، اور غیر مادی مشاغل سے بے گانہ ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہر ملک کی جدوجہد کا حاصل یہ ہے کہ پیداوار کی شرح میں اضافہ ہو (۳) اس دنیا میں رہنے والے افراد کا ذہنی اُفتی بھی اتنا سکر گیا ہے کہ وہ مادی آسائشوں کے سوا اور کسی چیز کی طلب

رجحانات اس منزل میں داخل ہو چکے ہیں کہ انہیں دیکھنے کے لیے شاعرانہ بعیرت کی خاص ضرورت باقی نہیں رہی اب تو یہ اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ معاشیات اور عمرانیات کی رو سے بھی ان کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔

اس قسم کے دو تجزیے امریکہ کے دو عالموں نے شائع کئے ہیں۔ معاشیات کی رو سے گیل برتھ نے اپنی کتاب "دی ایفلوئنٹ سوسائٹی" میں اور عمرانیات کی رو سے ولیم وائٹ نے "دی آرگنائزیشن" میں یہ دونوں کتابیں بیسویں صدی کے دوسرے حصے کی دنیا کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہیں، اور چونکہ ادب بھی اس دنیا کے عوامل میں پھنسا ہوا ہے۔ اس لیے ادب کی موجودہ حیثیت متعین کرنے کے لیے بھی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

ان کتابوں میں امریکی معاشرے کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے لیکن ایک اعتبار سے امریکہ کی خاص ملک کا نام نہیں۔ امریکہ تو چند عوامل اور مظاہر کا نام ہے مغربی یورپ میں چند نظریات چودھویں صدی میں، اور وضاحتاً سولہویں صدی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان رجحانات کی پوری اور مسلطی نشوونما امریکہ میں ہوئی ہے اور یہ آخری شکل اب امریکہ کے اثر سے پوری دنیا میں پھیلی جا رہی ہے۔ چنانچہ یہ اصول صرف امریکہ ہی سے مخصوص نہیں ان کا دائرہ عالم بڑا ہے۔ جو باتیں امریکہ میں ظاہر ہو چکی ہیں وہ دوسرے ملکوں میں آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی ہیں مل کا آغاز مغربی یورپ سے ہوا ہے، اور انجام میں کم و بیش ساری دنیا شامل ہے۔

اس پورے مل کے سچے یہ نظریہ کام کر رہا کہ حقیقت دراصل مادہ ہے اور مادے کے سوا

کوئی حقیقت نہیں۔ چنانچہ انسان کا فرض یہ قرار پایا کہ جو کچھ کہے آدمی دنیا کے اندر رہ کے کہے، اور اس کے افعال کے نتائج مادی شکل میں نمودار ہوں۔ اصل کام جسمانی کام ٹھیکرا۔ لیکن چونکہ انسان کے پاس ذہن بھی ہوتا ہے اور ذہن جسمانی افعال میں مدد بھی دیتا ہے۔ اس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ اپنی توجہ صرف مادے تک محدود رکھے۔ ان اصولوں کے ماتحت یورپ نے مشرق کے فکر کو بھی رد کیا اور خود اپنے یہاں کے ازمنہ وسطیٰ دانی فکر کو بھی۔ یورپ کو شکایت یہ تھی کہ اس قسم کا فکر بالکل مطلق اور مجرد ہوتا ہے اور مادی دنیا سے واسطہ نہیں رکھتا چنانچہ عمل اور فکر دونوں سے یورپ نے مطالبہ کیا کہ انہیں تجرید سے بچنا چاہیے اور ٹھوس بننا چاہیے۔ تجریدی فکر سے کنارہ کشی اختیار کر کے یورٹ نے ساڑھے تین سو سال تک جو کارنامے سرانجام دیے ہیں وہ یہ ہیں۔ قوموں نے سیاسی اعتبار سے سلطنتیں قائم کیں، اور معاشی اعتبار سے ایک طرف تو مشینیں پیدا واریں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا اور دوسری طرف اس پیداوار کو زیادہ سے زیادہ علاقے میں بچھنے کی کوشش کی۔ اس جدوجہد میں وہ چیز بھی رونما ہوئی جسے سائنس کی ترقی یا تسخیر کائنات کہتے ہیں۔ افراد نے اپنا شیوہ یہ بنایا کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ اور آسائش کی چیزیں جمع کی جائیں۔ یہ کام بھی میں یا بڑے، اس سے مجھے یہاں مطلبہ نہیں۔ میں اس وقت اخلاقی نقطہ نظر سے غور نہیں کر رہا ہوں، بلکہ انسانی سرگرمیوں کا ایک نقشہ بنا رہا ہوں۔ اور یہ نقشہ بالکل

زندگی بلند کرنے کی فکر میں آسائش کی چیزیں بہت جمع کرتا ہے۔ یہ بھی درست۔ لیکن چیزیں چوں کہ قسطوں پر خریدی جاتی ہیں۔ اس لیے قانونی طور پر آدمی کی ملکیت نہیں ہوتی۔ پھر چونکہ ہر سال ہر چیز کا نیا ماڈل آ جاتا ہے۔ اس لیے فیشن کے مطابق ہر سال بدل بھی دی جاتی ہیں۔ لہذا گھر میں جو چیزیں ہوتی ہیں، ان سے آدمی کا کوئی جذباتی رشتہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ چیزیں لازمی طور پر کسی ضرورت کے ماتحت نہیں خریدی جاتیں۔ یہ چیزیں عموماً سماجی رتبے کی علامتیں ہوتی ہیں۔ اور یہ علامتیں محلے اور علاقے کے ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ چنانچہ آدمی ضرورت یا آسائش کی چیزیں نہیں خریدتا۔ بلکہ سماجی رتبے کی علامتیں یوں سمجھے کہ جس طرح انیسویں صدی میں انگلستان کے تاجر خطابات خرید کر تے تھے۔ آج کل مغرب کے عام آدمی اسی طرح وہ فیشن کی چیزیں خریدتے ہیں جن سے ان کا سماجی رتبہ ظاہر ہو سکے۔ ان کے گھر میں چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ سماجی علامتیں یہ ٹھوس زندگی نہیں، خالص تجرید ہے۔

اسی طرح مغرب میں آدمی کے عادات و اطوار، سماجی تعلقات، سیاسی رائے، ادبی مذاق، بلکہ بعض اوقات مذہب تک چند اتفاقات کا مرکب ہوں منت ہوتا ہے، اور جماعتی تبدیلیوں کے ساتھ ہر چیز بدلتی جاتی ہے۔ ان سب چیزوں کا یقین ایک ایسے نوکھے نظام کے ماتحت ہوتا ہے جس کی نہ تو کوئی عقلی توجیہ ہو سکتی ہے نہ جذباتی۔ چند نہ معلوم یا نیم معلوم حادثات ہر حال میں زندگی کا ایک نظام مرتب کر دیتے ہیں جس کی پیروی اس علاقے کے لوگ کرتے رہتے ہیں، چاہے ان کی جذباتی ذہنی، بلکہ جماعتی ضرورتوں سے بھی اس نظام کا کوئی واسطہ

سیدھا سادا ہے۔ مغرب کے عمل و فکر تجرید چھوڑ کر فوس بننے کی کوشش کی۔ اور اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ سلسلہ ہمیشہ یوں ہی چلتا رہے گا۔

یہ امید کہاں تک پوری ہو رہی ہے۔ اس کا حال ہمیں ان دو کتابوں سے معلوم ہوتا ہے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا۔ جو لوگ ادب پڑھتے ہیں انہیں تو ان کتابوں میں کوئی نئے انکشافات نہیں ملیں گے۔ مگر ان کتابوں کی خوبی یہ ہے کہ انہیں آپ انفرادی رد و عمل اور داخلی تاثر کہہ کے نہیں ٹلا سکتے۔ ان کا تجزیہ خارجی نوعیت کا ہے اور انھوں نے مادی عوامل سے بحث کی ہے۔ ان دو کتابوں کی بنیاد پر بیسویں صدی کے دوسرے حصے میں انسانی زندگی کی تازہ ترین ہیئت کو سمجھنے کے لیے فرد سے شروع کیجیے۔

آج کل کے نام آدمی کے بارے میں مقبول ترین مفروضہ یہ ہے کہ وہ پیسے کمانے کے جنون میں مبتلا ہے۔ اور اس کے اندر یہ خواہش باقی سب خواہشوں پر غالب آچکی ہے۔ جنون کی حد تک تو یہ بات درست ہے، لیکن جہاں تک پیسہ جوڑنے کا سوال ہے، یہ کام مغرب میں انیسویں صدی کا آدمی کرتا تھا۔ آج کل کا مغربی انسان پیسہ جوڑتا نہیں خرچ کرتا ہے۔ بلکہ اکثر تو خرچ پہلے کر دیتا ہے، کماتا بعد میں ہے، کیوں کہ وہ ہر چیز قسطوں پر خریدتا ہے۔ چنانچہ لافظ پرواس کی آمدنی بہت ہوتی ہے، لیکن پاس کچھ نہیں ہوتا۔ یعنی وہ صرف تجریدی شکل میں پیسہ کماتا ہے۔ اسکی کمائی ٹھوس نہیں ہوتی۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ آج کل کا انسان مایا

ہو یا نہ ہو۔ مثلاً اگر کسی محلے میں یہ دستور قائم ہو گیا کہ مکان نمبر والے مکان والوں سے دوستی کریں گے اور مٹے والے مٹے والوں سے تو چلے رہے ہوں گے۔ بدلتے رہتے ہیں مگر مکانوں کی جوڑی اسی طرح قائم رہے گی۔ غرض روزمرہ کی زندگی میں بھی تجریدی نظام ہر قسم کی انسانی ضرورتوں پر حاوی آچکا ہے۔

اب فرد سے آگے اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیے۔

امریکہ میں تو پوری طرح اور مغربی یورپ میں ذرا کم درجے پر قسطوں پر چیزیں خریدنے کا رواج اتنا بڑھا ہے کہ قرضہ پورے معاشی نظام کی بنیاد بن گیا ہے۔ نہ صرف افراد کے معاملے میں، بلکہ تجارتی اور صنعتی اداروں کے معاملے میں بھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشی نظام پر صنعت کاروں کا نہیں بلکہ بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کا راج ہے۔ یعنی سارا لین دین محض کاغذی کارروائی میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔ انیسویں صدی میں سرمایہ ایک خصوصیت جزئی تھی۔ آج کل سرمایہ ایک تجریدی چیز ہے۔

کہتے ہیں کہ آج کل ہر ملک پورا زور پیداوار بڑھانے میں صرف کر رہا ہے۔ مگر جو ملک صنعتی اعتبار سے دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہاں ہر ادارے نے اپنا ایک نظام عمل (بلکہ نظام اخلاق بھی کہنا رکھ لیا ہے۔ امراس بات پر ہوتا ہے کہ اس نظام کی چھوٹی سی چھوٹی شرائط پر سختی سے عمل کیا جائے۔ چاہے پیداوار بڑھے یا گھٹے۔ ان اداروں کو سب سے زیادہ تشویش یہ رہتی ہے کہ ان کے نظام میں خلل نہ آنے پائے۔ اگر کوئی کارخانہ قائم کیا جائے تو اس کا مقصد بظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ یہاں کوئی چیز بنے گی۔ لیکن ترقی کی آخری منزل یہ ہے کہ چیزیں بنانا اتنا ضروری

نہیں جتنا ایک مجرد نظام کو قائم رکھنا..... اور اس نظام کو یہ تقدس کا درجہ کسی افادیت کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ صرف اس لیے کہ یہ ایک نظام ہے۔ یہ حال تو صنعت کا ہے۔ اب سائنس کو دیکھیے جس کے ہمارے مغربی تہذیب قائم ہے اور جس سے ابھی آسے بڑی بڑی امیدیں ہیں۔ آج کل سائنس کا جتنا دھندہ دراپٹا جا رہا ہے اس سے تو یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ مغرب میں سائنس کی تحقیقات کے لیے بڑی تاسانیات ہوں گی۔ اور سائنس دانوں کی بڑی قدر کی جاتی ہوگی۔ لیکن ولیم وائیٹ نے بڑی تفصیل سے دکھایا ہے کہ تحقیقی اداروں میں سب سے اہم شخص سائنس دان نہیں ہوتا بلکہ وہ شخص جو قدرتی نظام چلا رہا ہو۔ ان اداروں میں سائنس دان کا اولین فرض یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی تحقیق میں ڈوب جائے۔ اس سے پہلا مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ ادارے کے نظام کی پابندی کرے۔ صرف اپنے کام کے سلسلے میں نہیں بلکہ اٹھنے بیٹھنے اور ساتھیوں سے ملنے جلنے کے معاملے میں بھی۔ وائیٹ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ سائنس دان اپنے کام میں جتنا اچھا ہو گا اس کے لیے ان اداروں میں کام کرنا بلکہ وہاں داخل ہونا بھی اتنا ہی مشکل ہوتا جائے گا کیوں کہ ان اداروں میں سب سے مقدس چیز سائنس نہیں بلکہ نظام ہے۔ یعنی موجودہ مادیت اب سائنس دان کے لیے وہی حالات پیدا کر رہی ہے جو قرون وسطیٰ میں مذہب نے گیلیلیو کے لیے پیدا کیے تھے۔ ہماری دنیا ادب کو تو خیر رد کر رہی چکی ہے لیکن پوری طرح قبول سائنس کو بھی نہیں کر رہی۔ موجودہ حالات سے ادیب

فضول ہی گھبراہ ہے، ہیں۔ درنہ دراصل ادیب اور سائنس دان دونوں میں ایک ہی مد میں۔

سولہویں صدی میں مغرب نے ابعاد الطبیعات اور مجرد فکر کو اس لیے چھوڑا تھا کہ انسان مادی دنیا کے وسائل سے کام لے کر جذبہ باقی، حیاتی اور جسمانی تسکین حاصل کر سکے، مگر مادی وسائل سے کام لینے کی صلاحیت جیسے جیسے بڑھتی گئی ہے، کسی چیز سے تسکین حاصل کرنے کی اہلیت اُسی حساب سے کم ہوتی گئی ہے۔ اور اب انسانی، زندگی پر ایک نئی تجرید مادی ہوتی جا رہی ہے پرانی تجرید چوں کہ انسانی جذبے اور حیات کو اپنے دائرے میں لے لیتی تھی، بلکہ جذبے اور حیات کا مخرج ہی سمجھی جاتی تھی، اس لیے اس تجرید میں بھی حیاتی تسکین کا سامان موجود تھا مگر نئی تجرید ایک طرف تو مادے سے آگے کسی حقیقت کو نہیں مانتی۔ دوسری طرف انسان کے جذباتی اور حیاتی تجربے کو بھی قبول نہیں کرتی۔ یہ تو پیدا ہی ہوئی ہے۔

ان دونوں چیزوں کی نفی ہے۔ چنانچہ اس نئی تجرید میں نہ تو روحانی تسکین کی گنجائش ہے نہ جسمانی تسکین کی۔ اس میں وہ تخلیقی صلاحیت بھی نہیں جو تجرید کا عقل میں ہے کہوں کہ تجرید کا عقل کم سے کم مادے سے تو اپنا رشتہ قائم رکھنی ہے۔ لیکن یہ تجرید روح سے بھی کش کے الگ ہو گئی ہے اور مادے سے بھی۔ یہ نہ روحانی چیز ہے نہ جسمانی۔ اس کا اختصاص یہ ہے کہ یہ کسی حقیقت سے بھی رشتہ قائم نہیں رکھنا چاہتی۔ بلکہ اپنے آپ کو حادہ حقیقت سمجھتی ہے، اور قائم بالذات۔

یہ نئی تجرید سب سے پہلے پرنٹسٹنٹ ممالک

میں پیدا ہوئی ہے اور وہیں روز بروز شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ جو لوگ اس تجرید کے کھنچوں کی چکے میں ان سے توخیر کیا، پرنٹسٹنٹ علمائے دین سے البتہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اس نئی تجرید کی مخالفت کریں گے، یا کم سے کم پرانی اور نئی تجرید کا فرق واضح کریں گے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ جرمنی اور امریکہ کے علمائے دین اس تجرید کی حمایت میں سب سے آگے ہیں، اور وہ اسے نہ صرف تقویت دینا چاہتے ہیں بلکہ اسے حقیقی مذہب بنا رہے ہیں یا اس کی بنیاد پر ایک نیا مذہب ایجاد کر رہے ہیں۔

یہ ہیں وہ حالات جن کے درمیان کھج کے ادب کو زندہ رہنا ہے، اور اپنا راستہ ڈھونڈنا ہے۔ روپیہ کا لالچ اور سائنس کا رعبان دونوں سے تو ادب کو انیسویں صدی میں بھی سابقہ رہا ہے، اب یہ ایک تیسرا دشمن نکلا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہے۔

(اپنی باتیں ص ۳ سے آگے)

ڈاکٹر اختر، حیدرآبادی روایت اور تہذیب کا دعویٰ اظہار بھی ہیں اور انھیں محترم سے بگڑا تعلق ظاہر بھی رہا ہے۔

پروفیسر عین اور پروفیسر وحید اختر کا سب رس اور ادارہ ادبیات اردو کی سرگرمیوں سے دل چسپی دیتے رہتے ہیں۔ ہم ہر دو اصحاب کی خدمت میں ہدیہ تحنیں و مبارکباد پیش کرتے ہیں (د، غ)

رفعت عنان

اختر الایمان

نئی شاعری میں بیسویں صدی کے فہم و اندوہ، المناکیاں اور اس کے المیہ تجربے ملتے ہیں، نئی شاعری زندگی سے مضبوط رشتہ رکھتی ہے، اس جہد کے بنیادی مسائل سے شعر کا گہرا تعلق ہے۔ سماج اور سماجی زندگی کی گھٹن، اونچے طبقے کی الجھنیں، فرد کے داخلی رجحانات، ماضی پسندی، مستقبل کی دھندلی تصویر کشیدیں، آرزوئیں، احساسِ تنہائی، مجروح اور ٹوٹی ہوئی شخصیت، قدروں کا بحران اور انتشار اور تہذیب کا کھوکھلا پن — یہ آج کی زندگی کے چند نمایاں پہلو ہیں جن کا عکس نئی شاعری میں جھلکتا ہے، نئی شاعری محسوسات کی شاعری ہے، ضروری نہیں کہ اس میں کوئی پیام بھی ہو، نئی شاعری کو نئی زندگی کے حوالے ہی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ نئی شاعری پر کئی سمتوں پر سخت تنقید کی گئی اور یہ کہا گیا کہ یہ شاعری زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اس میں مایوسی، گھٹن اور ماضی پرستی کا رجحان ملتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ نئی زندگی کے رجحانات سے نئی شاعری کا رشتہ

بہت گہرا ہے۔ نئی شاعری میں انفرادی شعور کے ذریعے اجتماعی شعور تک رسائی ہوتی ہے۔ نئی شاعری میں ماضی سے دل چسپی ملتی بھی ہے تو وہ دراصل آج کے دور کی میکانیکی اور مینسنی زندگی کا ردِ عمل ہے۔ انسانیت کے حال کے آئینے میں مستقبل کا جو عکس نظر آتا ہے وہ جُذیب اور مایوس کن ہے۔ شاعر جب ناکامیوں، محرومیوں اور مایوسیوں سے دوچار ہوتا ہے تو اسے مستقبل کا ایک نظر آنے لگتا ہے وہ ماضی پسند بن جاتا ہے گزرے ہوئے لمحوں کی یادیں اُسے سہارا دیتی ہیں، یہ ایک نفسیاتی عمل ہے۔ نئی شاعری کا آہنگ حلقہٴ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کے شاعروں سے مختلف ہے وہ موضوعات کے انتخاب میں عام طور پر برنجی اور داخلی قسم کے چھوٹے اور نازک تاثرات اور تجربات کو پسند کرتے ہیں یہ موضوعات خاصے اجتماعی انداز خارجی ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ نئی شاعری میں پُرانی نقشبندوں اور استعاروں سے کام لیا

کی بجائے نئے ملام اور پیکر وجود میں آئے ہیں، ان میں کچھ مغربی طرز پر ڈھالے تاثر پارے بھی ہیں نئی شاعری میں سرگوشیوں کا سا انداز بھی ہے ربودگی، سپردگی اور داخلیت بھی۔ انفرادیت پر زور اور اظہار ذات کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں حقیقت سے گریز اور فرار بھی پایا جاتا ہے غم سے پیار، گداز، عشق، ماضی سے گھاؤ، فطرت سے قربت کا احساس بھی ہے۔

میں اسی پس منظر میں اختر الایمان کی شاعری کے چند مخصوص پہلوں کا تجزیہ کرنا چاہوں گی۔ نئی شاعری میں اختر الایمان ایک مستقل عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں، اختر الایمان کی ماضی پسندی گزیرے ہوئے لمحوں سے ان کی دل چسپی، ان کی تنہائی، ملامت سازی، ذہنی الجھن، کرب، تنہائی اور انفرادیت پسندی یہ سب چیزیں نئی شاعری کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اختر الایمان نے اردو شاعری کو پُر وقار سنبھالی ہوئی خود کلامی اور سچی حقیقت نگاری سے نوازا ہے۔ وہ زخم کھلیا ہوا دل ہی نہیں فلسفیانہ دماغ بھی رکھتے ہیں، وہ سماج کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے، بھوک اور اغلاس پر غور و فکر کرتے ہیں اور سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ "ماکر محمد حسن نے" جدید ادب" میں

"اختر الایمان نے ہماری شاعری کو نئی ٹکری

کھینچنے سے آستان کیا ہے۔ اس میں فردا سر چھنے والا

اختر الایمان جذباتی اور ذہنی زندگی کی کھاسی بھی کرتے ہیں، اس سے ان کے رومانی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ نظم "تغیر" کے چند اشعار پیش ہیں۔

میں بھی تغیر اک جہاں کروں
بتیاں چند غم کے مارے چند
مرد و خورشید اور تارے چند
ٹوٹنے والے ہوں سہا چند

روشنی تیرگی میں کھو جائے
زندگی روتے روتے سو جائے
یہ حکایت دراز ہو جائے
بے کسی کا چسرا غم ملتا ہو
موت کے غم سے جی بہلتا ہو

ڈاکٹر فکیل الرحمن "لاوے کا سمندر" میں لکھتے ہیں۔
"جو کویشتر نقاد، اختر الایمان کی فنونیت، گہری
افسردگی اور گھٹسی کہتے ہیں اس میں مجھے ابی کا پختہ رومانی
شعور ملتا ہے۔"

اختر الایمان کے یہاں صدیوں کی شکست و ریخت، زندگی کی گھٹن، ایوسی غامبی اور داخلی حالات کی کشمکش میں بھی ان کا رومانی ذہن کام کرتا ہے۔ اختر الایمان کی شاعری میں درد، تڑپ اور غم کا عنصر زیادہ ہے لیکن ان میں پسپائی اور زندگی سے بیزاری نہیں۔ وہ اپنے تصور حیات میں غم کو اس لیے اہمیت دیتے ہیں کہ یہ ایک روشن حقیقت ہے۔ ان کی شاعری میں غم کی جذباتیت نہیں ہے بلکہ

غم فلسفیانہ وقار اور عمل کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ وہ غم میں ڈوب نہیں جاتے بلکہ ڈوب کے ابھرتے ہی ہیں تاکہ

یہاں جو صلہ و ہمت ہے اور وہ ایک روشن صبح کا خواب
جی دیکھتے ہیں

موتوں کی تاریکی
روشنی سے مٹ جاتے
چشمہ بقا چھوٹے!

آسمان تازہ پر
آفتاب تازہ ہو
زندگی کے شانوں پر
موت کا جنازہ ہو

(قیامت)

حقیقت کی ہو ہو عکاسی اور حقیقت کو دکھارنا
طور پر پیش کرنے میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے اکثر شعرا کے
یہاں حقیقت کی سپارہ تصویر کشی ہوتی ہے، شمریت
ہیں ہوتی لیکن، اختر الایمان حقیقی زندگی کے تاثرات کو نکلا
طرح پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے تاثرات داخلیت میں جذب
ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اختر الایمان کی نظموں کا ڈرامائی
انداز متاثر کرتا ہے، بڑی خوبی یہ ہے کہ نظم کے مطالعہ کے
وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کہانی سن رہے ہیں، کہانی
ختم ہوتی ہے اور تاثر پورے حواس پر چھا جاتا ہے یہی
وہ خصوصیت ہے جو اختر الایمان کو دوسرے شعرا سے
تمیز کرتی ہے۔ وہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے

ہیں جو زمانے کی تیز رفتاری کا شکار نہ ہو جائیں، ایک
زمانے کے بعد بھی ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہی
شگفتگی اور شادابی نظر آتی ہے جب کہ وہ تخلیق پائی تھیں
انہوں نے نظم کے فارم میں کئی تجربے کیے ہیں۔ اختر الایمان
نے یہ حیثیت انسان رہنا اور شاعر شخصیت کے گہرے

نفوش چھوڑے ہیں۔ ان کے یہاں فن کارانہ حسن کے بڑے
مغوب صورت اور اصلی نمونے ملتے ہیں۔ انہوں نے حقیقت
کے عرفان کی وہ سرحد چھو لی ہے جہاں پہنچ جانا شاعر کے
فخر کی بات ہوتی ہے اس کا اقرار انہوں نے خود نظم
”اجنبی“ میں کیا ہے:-

میں نے وہ سرحد چھو لی ہے جہاں امر ہو جائیں پران
لے آنکھوں میں کھلنے والی جانے کون کہاں رہ جاتے
جیوں کا اس دور میں نگاہ ہم دونوں ہیں آج انجان
اے سچوں کی دنیا تو چاہے تو روگ مٹیں
میں نے دنیا دیکھی ہے تو میری باتیں جھوٹ نہ جان
جیوں کی اس اس دور میں ناداں یاد اگر کچھ رہتا ہے
دو آنسو، ایک دبی ہنسی، دور درجوں کی پہلی پہچان!

اختر الایمان کی آواز اس لحاظ سے بھی منفرد ہے
کہ انہوں نے داخلیت کے سوز کو بھر پور انداز کے ساتھ
پیش کیا ہے اس آواز میں بڑا ضبط و نظم ہے، وہ تحت الشعاع
اور لاشعور کی باتیں نہیں کرتے، وہ ایسی باتیں کرتے ہیں
جو اپنی اپنی دنیا میں ہوتی ہیں، ان کی نظموں میں ایک
جانی پہچانی لئے سنائی دیتے ہیں۔ ان کے درد میں کھولی
ہوئی سہمی آواز ذہنوں کو بیدار کرتی ہے۔ ان کی شاعری
میں چاندنی کی سی ٹھنڈک اور دھوپ کی سی شدت
بھی ہے۔ اختر الایمان کے اس مخصوص شعری رجحان
متاثر ہو کر ایک پوری نسل نے ان کی تقلید اور تہ
میں شاعری کا آغاز کیا لیکن ان کے مخصوص شاعر
مزاج سے مایوس ہو کر انہوں نے بھی ہار مان لی
”تنہائی میں“ ”مسجد“ ”ایک لڑکا“ :-
”پرائی فیسل“ اور ”موت“ وغیرہ اختر الایمان
(۱۹۸۱ء ص ۲۱)

فضا میں قیسی

ایک حرفِ اعتراف بھی نکلا زباں سے کب
 معروب وہ ہوا، ہنر و دیگران سے کب
 دیکھا تو زرد شعلوں میں پلٹے ہوئے قیسی
 کس کو خبر یہ آگ گری آسمان سے کب
 بوجھِ آخری ستارے سے بجھ کو بتائے گا
 بجھ اٹھا اک مسافر شب، کارواں سے کب
 اب سوچتا ہوں ہاتھ میں سورج لیے ہوئے
 آخر اتر کے دھوپ گئی سائباں سے کب
 آئینے ریزہ ریزہ ہوئے، چاند تختِ لخت
 چونکے میں اہل شہر بھی، خواب زیاں سے کب
 ہے برگِ گل سے ہم کو چٹائیں تراشنا
 یکسو ہوئے سیاست باز دیگران سے کب
 دل کے بڑے سہی وہ، زباں کے بڑے نہ تھے
 شرمندہ میں رہا، سخنِ دوستان سے کب
 کھویا رہا میں قرب میں اس کے، پتہ نہیں
 وہ لے اڑا مجھے، مرے آغوشِ جاں سے کب
 میں نے تو احتیاط سے لکھا تھا حرفِ حرف
 وابستہ ہو گیا وہ مری داستان سے کب
 لفظوں کی بندشیں ہیں، معانی کی الجھنیں
 ہم لوگ بھی سبک ہوئے بارگراں سے کب
 چپ رہ کے بھی سنا ہے فضا طعنِ ناشناس
 پاٹے کسی نے پھلِ شجرِ رائیگاں سے کب

●●

کے ہنٹ، مگر آخر فنا ہوئے یارب
 ایک قرض تھے خود پر اور ہوئے یارب
 کئی کئی دہریں، شفقِ شفقِ راینیں
 صبح ایک بھولا ہوا ماجرا ہوئے یارب
 صبح آگ بھی، فل جہم ل کے رکھ ہو
 شجرِ ہر او بی کتھ آتنا ہوئے یارب
 میں غفہ غفہ، ربوئی کش معانی ہسم
 یسوں غدا میں ہم مہم ہلا ہوئے یارب
 ہنٹ ہنٹ سے خود ایسا وجود چاک ہوا
 لکھی نقس کی ہم بھی رد ہوئے یارب
 بنامِ معجزہ فن، ذرا سنبھال کہ ہسم
 طبع ہونے ہوئے بے عصا ہوئے یارب
 تخیلاتِ معر میں، جذبے بے تر سبیل
 شعور و دانش و ابلاغ کیا ہوئے یارب
 اب مٹی راس انہیں زر ہوسموں کی ہوا
 یہ اودیات، شجر بے قبا ہوئے یارب
 انہیں شعور عطا کر، کہ اپنی راہ چلیں
 تمام لوگ، مرا نقس پا ہوئے یارب
 نہیں بھٹ، کہ ہے کون ذمہ دار ان کا
 وہ سب بھی مرے سر، تو قضا ہوئے یارب
 فنا لکھتے بوجھ اب کہ وہ بقول کئے
 شجرِ راس کا آئوٹ ہوئے یارب

●●

رفیع شبنم قادی

وقار و اتقی



اُسے تو میرا بھی ذرہ دکھائی دیتا ہے
نہ نہ واقعی اندھا دکھائی دیتا ہے
نہ جانے کتنے محنت کی پیاس میں
وہ ایک شخص جو رہا دکھائی دیتا ہے
میرے وجود ہی کا ایک ٹکس ہے شاید
اس آئینے میں جو ہر دکھائی دیتا ہے
نہ جانے کس لیے کرتے ہیں لوگ اس کا گلا
وہ دیکھنے میں تو اچھا دکھائی دیتا ہے
نظر ہے شرط و گردنہ جہاں میں کچھ بھی نہیں
جو دیکھنے کا تو کیا کیا دکھائی دیتا ہے
ہر ایک جس گراں ہے ہر ایک جسے انور
بس اک شر ہے جو ستا دکھائی دیتا ہے
اس انلقائے تمدن کے دور میں شبنم
دلوں پر یاس کا پہرا دکھائی دیتا ہے



آزاد تھا، کہ قیدِ زلزل و مگلاں میں تھا
جب وہ ملا، خیر میں کس جہاں میں تھا
تیز رخسار و گل میں نہ کر پائے اب کے لوگ
اک مشترک سازنگ، بہارِ غریب میں تھا
پہنسنے والا سر پہ گریبان تھا کس لیے
کیا کل جہاں کمالِ مری و احساں میں تھا
لٹے رہے ہیں کارواں، لیکن نہ اس طرح
اب کیا تاؤں، میں بھی اسی کارواں میں تھا
بھلی ہزار بار گری، وہ نہ جل سکا
ایسا بھی ایک تنکا مرے آشیاں میں تھا
گورا ہے ایک ایسا زمانہ بھی دوستو
جب نام ہی کا فرق بہار و خزاں میں تھا
نزلِ ملی تو سمجھا مجھ میں خیل ہے
اب کھل چکا آفاقین و مگلاں میں تھا



کھلنے لگی ہے دوستو، اصلیت بہار
آپے میں گم ہے، دیکھیے محویت بہار
ہاتھوں سے چھوٹا نہیں دامنِ باغباں
اب کے مگر بدل گئی خاصیت بہار
اب رنگ و بو نے مدھی کاٹنے بھی ہو گئے
خود آشکارا ہو گئی عصیت بہار
کتا ہوا اک زمانہ بہارِ افریں جسے
اس کی نظر میں خاک ہوا ہیبت بہار
کھنسنے سے پہلے سوچ رہا ہوں کہ کیا کھلو؟
تہنیت بہار، کہ تعزیت بہار
اہلِ مگلاں کہتے ہیں جن کو بہارِ زراہ
عکس کر رہے ہیں وہ غیریت بہار
شخصِ گل بدست نظر آئے گا وقار
کل تک اگر بدل گئی نیت بہار



سید علی ظہیر

نظمیں

○

خبر اور ظلم کی دودھاری تلوار

مکوئی نئی چیسز تو نہیں

لیکن جب بھی چمکتی ہے نئی لگتی ہے

○

اس کی زبان میں عجیب پہچھاٹ ہے

راتوں میں یہ زبان آسمان سے ٹکرتی رہتی ہے

اور دن کے مالے میں صاف چھپ جاتی ہے

اس کی نوک پر چپکے ہوئے ہزاروں ہاتھ پاؤں

بھی پھلتے ہوئے لمحے کے منتظر ہیں

لیکن پھلتا ہوا کوئی لمحہ

ان کو نہیں بچا سکتا

ریت کے ماحول میں خامشی

خاک کی وردیوں کی طلایہ گردی کا ماتم کرتی ہے

چاقو، تلوار، بندوق سے

گائیڈڈ مرائیلز تک

اور معمولی جاسوسی سے لے کر

(HYPER SENSITIVE) ہائپر سینیٹیو لیسنگ اور کارڈنگ ڈیوائس تک

بہت لمبا سفر ہے

اور کافی واضح تبدیلی ہے

صرف آواز کی نہیں

بلکہ خون کی بھی

خون لفظ و معنی سے گزر کر

اندھی اور روشن جسم کی خانقاہوں میں گونجتا ہے

مٹوس اور ابلتا ہوا وقت ہی اتنا اللہ انہیں بچائے گا

○

کتنے ہی ساتھی

سید ان جنگ میں

بازو ہی باز و ختم ہو جاتے ہیں

صلاح الدین نیر

○

رہتی ابھی مراد دستِ سوال رہنے دو
مدِ نظر میں ہے صن و جمال رہنے دو
ابھی تو آئی کہاں ہے وہ فیصلے کی گھڑی
دل و نظر کو ابھی ہم خیال رہنے دو
بہت عزیز ہیں دن رات میری پانی کے

تم اپنا فیصلہ اب اگلے سال رہنے دو
ہمارا پیار ہے رشتوں کی قید سے آزاد
ہمارے پیار کو یوں لازوال رہنے دو
بہو خج ہی جاؤں گا کہ میں سرحد غم تک
اسی طرح سے مجھے پائمال رہنے دو
مٹی کیس کو یہاں ٹوٹنے کی لذت بھی
اگر ہے آئینہ دل میں بجا بال رہنے دو
میں ٹوٹ ٹوٹ کے اصلاح اپنی کروں گا
نظر میں اپنی مجھے باکمال رہنے دو
کبھی تو آئیں گے حسن و وفا کے سوداگر
ہمارے زخموں کو بے اندال رہنے دو
وہ اب نہیں تو کسی دن تو آئے گا نیر
نظر میں اپنی وہ پہلا سوال رہنے دو

○○

افسوس نہیں مجھ کو تری حرف زنی کا
جاں لیوا ہے لیکن ترا غم، کم سخی کا
رکھ دوں گا تری نرم تپیلی پہیل نکھیں
احساس ملتے تھے جب بے وطنی کا
بہر تو ہی تھا کبھی گھر سے نہ نکلے
خدا شہ جو تھا رہبر سے تھیں راہِ فنی کا
اک قطبِ شبنم نہ ملا تھنے لبوں کو
کوئی انداز ہے خاطر شکنی کا
گلشن میں کوئی پھول تہم کو نہ ترے
گر عکس بھی پڑ جائے تری نگاہی کا
غربت میں ہے جب خاکِ وطن ہی پچا
افسوس نہیں ہو گا مجھے بے کفنی کا
لب کھلنے نہ پائے تھے زباں کی گنگائی
انعام یہ کیا ہے تری ہم سخی کا
اب کون یہاں تیشہ بکفائے گائیر
اک نام رہ گیا ہے بس اب کوہِ کئی کا

○○

یہ سچ ہے کہ اب شہر سے وہ دور گھر میں ہے
لکنا ہے گھر اب بھی میرے گھر میں مکیں ہے
نا خواستہ مہاں کی طرح قافلہ دل کا
تم نے جہاں چھوڑا تھا ابھی تک بھی وہیں ہے
جس کو مرے ہونٹوں نے چھوا تھا وہ صدمہ غماں
اب تک مری آنکھوں میں ہسکتی وہ جیس ہے
کھوے ہوئے وہ گھر نہیں پانے کی تمنا
یہ وہم سہی میرا مگر تم سے حسیں ہے
حصہ نہ بنا زیت کا خوشبو کا وہ لمحہ
اُس بزم تہ اٹھ جانے کا افسوس نہیں ہے
رضاروں پہ بکھری ہوئی زلفوں کا تقو
یا کیزہ نگاہوں کی طرح کتنا حسیں ہے
چلنے لگیں پڑ وائیاں بے موسم باراں
شاید کسی دیوانے کے متعل کی زیں ہے
رک جاتے ہیں مجھ جیسے گنہ گار بھی نیر
جو نہ زیں کون یہاں خاک نشیں ہے

○○

علی عباس امیند نایافت

نہ منزل کا تیس نہ راستوں کا پتہ
سُنگتی دھول، تپتے پتھروں کے سینے پر
کبھی ملا نہ ملے گا کسی کا نقش پا ۵

○

فروغ شمع کو شعلے سے اجتناب تو ہو
اسے میرے ذہن رسا بند تیرا باب تو ہو
جو آنے والا ہے اُس عہد کا بھی حال لکھیں
ہمارے نام کسی پل کا انتساب تو ہو
یہ ریزہ ریزہ اکائی تو سمجھ سکتی ہے
فقط یہ شرط ہے دینروں میں بیچ قبا تو ہو
بھٹکتے ذہنوں کی یہ جستجوئے لامعا حاصل
بہت عظیم ہے بردا خل نصاب تو ہو
بہت ہے زندہ خفاقی دلوں میں گھر کر لیں
میرے اُداس زمانے کا احتساب تو ہو
تلم کے حین میں پنہاں ہے رنگ قوس تیز ج
فضائے ہجر کبھی اس سے فیض یاب تو ہو
زکرب چہرے پہ ہواور نہ آنکھ میں ٹپکے
خود اپنے نفس سے ہٹ کر کوئی خطاب تو ہو
یہ روز و شب کی مصورت سزا سہی امیند
ہے جس گنہہ کی سزا اس کا ارتکاب تو ہو

○○

ایسیریل نگاں ہے عروسِ عمرِ رواں
لباس تنگ — ہو رنگ
موجِ عکسِ پیاپی
صدابِ صحرایہ جن جن میں دریا بہہ رہا
تمام دلِ نندہ چہرے، بجھتی بھی نظریں
تمام بکھرے امدادے، دھواں دھواں یادیں
فرکانِ دوید کا سایہ لہو کی گردش پر
پیشیاں دشمنِ آدمِ خود اپنی ساز و گار پر
ہو! میں آگ میں، پانی میں ٹوٹتے رشتے
شکستہ قہرِ محبت اُداس سلوں کا ۵
شکستہ سانس کی آہ سوزِ شمیم
وجودِ دھونڈنے کی — حادثوں کے صحرائیں
وجودِ دھونڈنے کی — فصلوں کی دانگیاں

شکستہ سانس کی سچی گراں — گراں مایہ
شکستہ سانس کی سچی گراں کا سہ مایہ
اک اضطراب، بے تحاش، فسر و گی، الجھن
خیالِ خواب کی لذت، حقیقتوں کی جلن
نئی نئی سی مسرت، اُداسیوں کی وجھن
شکستہ سانس کی سچی گراں کا سہ مایہ

نہ منزل کا تیس نہ راستوں کا پتہ
سُنگتی دھول، تپتے پتھروں کے سینے پر
کبھی ملا نہ ملے گا کسی کا نقش پا !!

●●

عوض سعید

خالی مینہ

اسے ایک لمحے کے لیے احساس ہوا جیسے وہ غلط جگہ آ گیا ہے۔ وہ ضرور راستہ بھٹک گیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ جس کمرے میں داخل ہوا تھا وہ اسی کی ملکیت تھا۔ اور تو اسے گزرتے جاڑوں کی وہ راہی اسی کی گلی جسے وہ اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

پھر وہ سہری پر چپ چاپ سوئی ہوئی سر نش کے قریب پہنچ کر آرام سے سو گیا۔

اور جب وہ مینہ کی گرم آغوش سے باہر نکلا تو ہر طرف سحر کا پرتو تھا۔ اس نے دیکھے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ دو گواہ سر بردہ دھکی بائیاں لیے دھیرے دھیرے قدم ڈالتے ہوئے راستہ طے کر رہے تھے۔ ایک جاڑوب کش شرک صاف کرنے میں مشغول تھا اور اس کے ساتھ بھرے بھرے جم دانی ایک فوجوان عورت بھی تھی جو اس کا ہاتھ بٹانے میں مصروف دکھائی دے رہی تھی۔

اب درپچے سے جھانکتے ہوئے اسے بڑی کینچی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے یلت کر سہری کی طرف دیکھا۔ وہ عورت ابھی تک پہلے سہرے پر تھی۔ جیسے وہ جاگئے

اور سونے کے عذاب میں رات بھر مبتلا رہی ہو۔ وہ پھر ایک بار درپچے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب شرک پر چل پھل شروع ہو گئی تھی۔ ایک نائے قد کا آدمی ایرانی ہوٹل کے کونٹر پر کھڑا سینڈ سے باتیں کرتا ہوا اطمینان سے چائے پی رہا تھا۔ ہوٹل کی کرسیوں میں دھنسنے ہوئے دو چار آدمی اور بھی تھے جو شاید اخبار کی سرخیوں میں ڈوبے ہوئے حالات حاضرہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ جاڑوب کش ابھی تک اسی ثورٹ کے ساتھ کھڑا تھا اور وہ اسے ہاتھ کے اشارے سے کوئی بات سمجھا رہی تھی اور وہ بے ساختہ ہنس رہا تھا۔

اس نے سوچا۔ شاید اس عورت نے کوئی دلچسپ واقعہ اسے سنایا ہو۔

لیکن ان ساری باتوں سے اس کا کیا واسطہ؟ وہ پھر ایک بار درپچے سے اٹھا کر دراندھے میں آ کر ٹپنے لگا۔

اب اس کا وہ بیان سہری پر بے سندھوٹری ہوئی نقش کی طرف نہیں تھا کہیں اور تھا ان پر پہنچ

پھنسا ہوا تھا۔ شاید اخبار والے نے آواز دی ہو اور
اور جواب نہ پا کر عجلت میں اخبار کو دروازے ہی میں
پھنسا دیا ہو۔

وہ بھی کتنا بے وقوف آدمی ہے۔ ان جھوٹی ہجو
فضول سی باتوں ہی پر غصہ کرتا ہے!

اور

پھر شاید اسے ناشتے کا خیال آیا۔ اس نے
اسٹور دوم ہینچ کر پیٹھوں کی تلاش شروع کر دی۔ بنسیر
باجھی ہوئی پیٹھوں کے ساتھ اسے جمبوٹے بڑے کئی کپورے
بھی دکھائی دیے۔ جس پر گرد آئی ہوئی تھی۔

وہ پھر ایک بار ماضی کی دھند لاشوں میں ڈوب
سا گیا۔ اب ناشتہ بھی اسے ایک فضول سا فعل لگا۔
آدمی بغیر ناشتہ کئے ہی رہ سکتا ہے۔

اس کے لیے ہی طمانیت کافی تھی کہ اس کے پرس
میں اس کی حیثیت سے کہیں زیادہ نوٹ تھے۔ وہ ان
نوٹوں کو ایک ایک کر کے گننے لگا۔

”صاحب ناشتہ“ اچانک اس کے کانوں میں ایک
عجیب و غریب آواز ابھری۔ اس نے دروازہ کھول کر
دیکھا ایک نوجوان بیرہ ہاتھ میں کھانے کی کٹتی تھا
کھڑا تھا۔

”۲۴ نمبر“

”مگر یہ تو ۲۲ نمبر ہے۔“ اس نے بیرے کی غلط فہمی دور
کر دی۔ اور نیچے کمرے میں داخل ہو کر پھر ایک بار اس
عورت کو دیکھا جو ابھی تک سہری پر بے سدھ سو رہی تھی۔
وہ کچھ دیر کھانے کی خالی میز کے اطراف یوں ہی بے معنی
انداز میں ہلکتا رہا۔ اس کا جی جا با کہ جانے سے پہلے
اسے خیند سے جگا کر یہ کہہ دے کہ وہ جا رہا ہے اور وہ آٹھ
اس کی کپکپاتی ہوئی آواز گھر کے ہولناک سناتے میں دب کر رہ گئی!!

گھائیوں میں جہاں وہ اپنے وجود کو اپنے ہی ہاتھوں
دفن کر آیا تھا۔

وہ اب ایک عجیب و غریب اضطراب کی کیفیت
سے دوچار تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے تھوڑی
دیر بعد ایک ہولناک، طوفان آنے لگا اور وہ اس
طوفان میں شخص و خاشاک کی طرح بتا ہوا بہت
دور نکل جائے گا۔ اتنی دور کہ اس کی نقش کو شناخت
کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ نقش بھی
نہیں چمے اس نے سہری پر.....

پھر ایک بار اسے وہ پُرہنچ گھاٹیاں
یاد آنے لگیں۔

وہ بد صورت پہاڑ اور اس سے ذرا پرے
ٹیرے میٹر سے پتھروں سے لدی ہوئی وہ تنہا قبر۔
اس نے ایک بھر جھری سی لی۔ اسے حیرانی ہوئی
کہ دُشمن میں لٹی ہوئی مسج ابھی تک چپ چاپ اس کی
دہلیز پر کھڑی ہے۔

مگر وہ طوفان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ شاید
دبے پاؤں آکر چپ چاپ چلا بھی گیا ہو۔

وہ ایک سحر زدہ آدمی کی طرح پھر ایک بار دریچے
کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی مدھال آنکھیں سڑک
کے اُس پار پھیلا دیں۔

اُس نے سڑک پر کیا دیکھا۔ کن کن چہروں سے
اُس کی آنکھیں چار ہوئیں اُسے کچھ یاد نہ تھا۔

اسے احساس ہو رہا تھا اس کے وجود کی طرح
اب یہ درد و یار بھی زخمی ہو گئے ہوں۔ اچانک اس کی نگاہ

دروازے پر پڑی جہاں صبح کا تازہ اخبار دروازے سے
اسے خیند سے جگا کر یہ کہہ دے کہ وہ جا رہا ہے اور وہ آٹھ
اس کی کپکپاتی ہوئی آواز گھر کے ہولناک سناتے میں دب کر رہ گئی!!

اردو نامہ

علی ادبی اور تہذیبی تجربات

بشرِ دہائی، مصین بزمی، جوہر ہاشم
ڈاکٹر راہی، وید پرکاش ساون، نیپیا
حکیم دریا، وجے، تانہ سکیٹہ درو
ہلال آغاٹی اور دیگر شاعروں نے نظموں
اور غزلوں سنائیں۔ خوشید جنبہ
نے نظامت کی۔

۲۱ نومبر: اردو گھر ٹرسٹ کے زیرِ اہم
نامور فنریشن اور بزرگ رباعی گوشتاغر
شاعر ڈاکٹر دگھونندن راج سکسینہ
الہام کے محبوبہ رباعیات "کشکول" کو
برسم اجراء کر دی۔ زیرِ پرِ دلیم سریشو شنگ
نے انجام دی۔ مسٹر اکبر علی خاں ساہو
گو در یوپی نے صدارت کی۔ جناب
عابد علی خاں بانی اردو گھر ٹرسٹ، ڈاکٹر
منفی تبسم، ڈاکٹر یس، نے سنائی۔ ڈاکٹر
الہام کی شخصیت اور شاعری پر اظہارِ خیال
کیا۔ مسر منوہر راج سکسینہ نے خیر مقدمی
خطاب کیا۔ قدرِ یعنی اور ڈاکٹر محفل انجلی
نے نذرانہ سخن پیش کیا۔ صلاح الدین نیر
نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

○ زندہ دلاں حیدر آباد اور ماہنامہ
شکوہ کی طرف سے۔ صدارت مسٹر
نریندر ناتھ کھنن کا محفل ادب آراستہ ہوئی
جہاں انجیب ڈاکٹر حامد حسین (بھوپال) کے
علاوہ مسر زحمیت اللہ، مسج، انجم، طالب
خونہ بھری، مصطفیٰ علی بیگ، شعیب ظریف

یکم نومبر: نظامت اور ورسٹ لائبریری
اسٹیڈی سرکل حلقہٴ ارباب ذوق کی طرف
سے منعقدہ اجلاس میں جناب سیتھو
پگڑی ریٹائرڈ آئی ایس اہل دانش
نے اردو ادب میں آپ بیتیاں کے
موضوع پر مسموعہ کچھ دیا۔ پرویز فیروز سلطان
ذین علی آف آؤٹس عثمانیہ بیچوٹی نے
صدات کی کا بعد اسقہ حلقہٴ جناب محمد
منظور احمد نے سرپرستی کا تعارف کر دیا۔

۸ نومبر: انڈو اسوسی ایشن سنٹرل
یونیورسٹی آف حیدر آباد کا ادبی اجلاس
پرویز فیروز چندی میں صد شنبہ اردو
کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب انجیب
ڈاکٹر پیام علی نے اردو سرشیر پر مقالہ
سنایا۔ جناب حبیب شاعر نے جدید
اردو غزل پر اپنے خیالات ظاہر کیے۔
فاکرم مجاہد حسین فریدی نے ڈاکٹر اعظمی
کی ملی، ادبی خدمات پر روشنی ڈالی
۸ نومبر: ہفتہ کتب خانہ کے
سلسلے میں اسٹیڈ سنٹرل لائبریری
کے احاطے میں سالانہ مشاعرہ ملک الشعراء
اورچیشوٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

ابتدا جناب عبدالغفور بھیرائی
خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے
ہفتہ مطالعہ کا خدایت کو روشن
کیا۔ اس مشاعرہ میں تاج بھور
علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیز
رئیس اختر، فیض الرحمن خیال،
عزیز النساء صبا اور روشن خیال نے
کلام سنایا۔ جناب سرینواس طاہر
جہاں خصوصی تھے۔

۲۰ نومبر: اردو گھر میں مسراج
ادب کی طرف سے دیوانی ٹاپ کی
شعری و ادبی تقریب کا اہتمام کیا
گیا۔ نواب میر احمد علی خاں سابق
وزیر داخلہ نے صدارت کی، مسر
من راج سکسینہ شریکِ معتمد
ادارہ ادبیات اردو، محبوب حسین
جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست نے
حیدر آبادی کچھ کے پس منظر میں بولی
کے روایتی اہام پر اپنے زبیر کیا
کا اظہار کیا۔ محفل شعری علی احمد
جلیلی، صاحب حیدر آبادی، منوہر
بہار، وقار عیسیٰ، خوشید جنبہ

سر پٹ، رشید جلیل، یعقوب عمر، عظیم
نے شعری و نثری تخلیقات سے نوازا۔
جناب سید مصطفیٰ کمال نے خیر مقصدی تقریر

۲۳ نومبر، سنٹرل یونیورسٹی
حیدرآباد میں اردو تنقید پر ایک مینار
پروفیسر گیلان چندین کی صدارت میں
استفادہ کا باعث ہوا۔ ڈاکٹر مفتی نجم
ڈاکٹر ثمنہ شوکت اور ڈاکٹر حامد حسین
نے مخاطب کیا۔ جناب حبیب نشاد
نے نظامت کی۔

۲۵ نومبر: حلقہٴ آداب ذوق (نظما)
اردو ٹرسٹ لاہور میں اکامانہ ادبی
اجلاس جناب حسن الدین احمد کی صدارت
میں خسر و شناسی کا سبب بنا۔ جناب
ابوالفیض سحر اسپیش آفیسر گجرات اردو
کمیٹی نے امیر خسر و اردو تہذیب کا
نقیب کے موضوع پر سیر حاصل مقام
سنایا جناب محمد منظور احمد نے نظامت
کی اور ہر دو اصحاب کا علمی و ادبی کا ناموں
کے پس منظر میں تعارف کرایا۔

○ حیدرآباد کرناٹک فرینڈس کلب
کی طرف سے بصدات جناب فرینڈ
و تھر شعری محفل میں جہان شاعر روٹی
سونی (نانن) کا خیر مقدم کیا گیا۔ صدر
محفل نے ان کی شعری خدمات کو روشن
کیا۔ امیر احمد خسرو، علی احمد جلیسی

افتخار احمد اقبال، لوتھر، سونی،

صلاح الدین نیر، رئیس اختر (صدر)
کلب) فیض الحسن خیال، عزیز الشا
صبا نے کلام سنایا۔ جناب محمد حسین
چند نے شکر یہ ادا کیا۔

۲۶ نومبر: بزرگ اردو شاعر
جناب ابوالحماد سید عبدالرزاق
عرشی مختصر ملاقات کے بعد رحلت
کے گئے۔ حق معفرت کرے و ضمدار
اور قادر الکلام سفید تھے۔

۲۸ نومبر: اردو مجلس کا ادبی
اجلاس جناب سید ہاشم علی اختر
سکرٹری ادارہ ادبیات اردو کی
صدارت میں بمقام اردو ہال
آراستہ ہوا۔ ڈاکٹر اکبر علی بیگ
نے اکبر آبادی کی شاعری پر اور
جناب تراب الحسن نے حیدرآبادی
کلچر پر مقالے سنائے۔ آخر میں شعر
نے محکم سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر
محمداغوازی نے نظامت کی۔

○ اردو گھر میں بزرگ شاعر جناب
نحرہ، رشید، نکر کے مجموعہ کلام
”یادِ شہد“ کی پیمائش کا اہتمام
جناب عبدالحی صاحب ایڈیٹر سیاست
کے اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر سحیح
کی شاعری اور ان کی حیدرآبادیت

کو محبوب حسین بگم، میر احمد علی خاں، اوج
یعقوبی، علی احمد علی امیر مشتراحمد نے
خراج ادا کیا۔

دسمبر ۱۹۸۲ء

۲ دسمبر: حلقہٴ آداب ذوق کا ادبی اجلاس
نظام اردو ٹرسٹ لاہور میں
بصدات جناب اختر حسن منعقد ہوا۔ ڈاکٹر
حامد حسین اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی بھوپا
نے گاندھی جی اور حسرت موہانی کی قومی خدمات
پر لکچر دیا۔ محمد منظور احمد صاحب نے نظامت کی۔
○ بزمِ ترین ادب کی طرف سے صدر اجتماع
اردو اکیڈمی ڈاکٹر محمد علی زیدی اور پروفیسر
وجید اشرف (مدیر اس یونیورسٹی) کا مشترکہ
خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر غلام عمر گل صدر شعبہ
اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ ابتداً
جناب مبشر احمد نے ہر دو جہانوں کا طائفہ کو لایا
ڈاکٹر زیدی نے ادب کے جدید رجحانات
اور اکیڈمی کی کارکردگی پر اظہارِ خیال کیا۔
محفل شعر میں پروفیسر اشرف، علی احمد جلیسی،
محمد شہید جمیدی، بشیر وارثی، داؤد نصیب،
یعقوب عمر، عقیل ہاشمی، زور آغا، صاحب
جہاں آبادی نے کلام سنایا۔

۴ دسمبر: انور زہرا شہر کی بیگم محمود بیس
لطیف نے عثمانیہ یونیورسٹی میں علی وارثی
گلشنِ روم کا سمانہ کیا اور اپنی نثر پر ترتیب

کتاب حیدرآبادی کلچر کے سلسلے میں ذخیرہ
کتاب خانہ سے استفادہ کیا۔

۵۔ ۱۵ ستمبر: ادارہ تنظیم اردو کے
زیر اہتمام ”اردو گھر“ میں ڈاکٹر ذی

کے مجموعہ کلام ”دستک“ کی جناب
محبوب حسین جگجوٹھائٹ ایڈیٹر ریاست

نے رسم اجرا انجام دی۔ جناب منوہر
سکینہ صد انجمن ترقی اردو حیدرآباد

نے صدارت کی۔ نواب میر احمد علی خاں
سابق وزیر داخلہ جناب ابوالفیض محمد

اسپیشل آفیسر گجرات اور ڈپٹی
جناب اکرام جاوید اور رحمن جانی نے

راہی کی شہری صلاحیتوں کو روشن کیا۔
خورشید حمیدی نے نظامت کیے فرائض

انجام دیے۔
۶۔ ۱۵ ستمبر: استاد سخن حضرت

نصاحت جنگ جلیل کے مکتب پر
مبنی کتاب مرتبہ جناب علی احمد جلیلی

ادبی ٹرسٹ اور فخر الدین علی احمد میٹری
کیشی کی اعانت سے شائع ہوئی۔ یہ

کتاب جلیل منزل نور خاں بازار حیدرآباد
۲۴ سے خریدی جاسکتی ہے۔

۸۔ ۱۵ ستمبر: روزنامہ طاب حیدرآباد
دلی اور جالندھر کے ایڈیٹر نجیب

آزادی اور نامور صحافی سٹرنبیر کا
دہلی میں انتقال ہوا۔ حیدرآباد کے

صحافتی اور ادبی حلقوں میں اظہار
الم کیا گیا اور ان کے بھائی مسٹر

یدہ دیو کو تعزیتی پیامات بہ کثرت
روانہ کیے گئے۔

۹۔ ۱۵ ستمبر: پروفیسر غلام عمر خاں
صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی

کی اطلاع کے بموجب شعبہ اردو
کی طرف سے مخطوطہ شناسی کا ایک

سالہ ڈپلوما کورس شروع کیا گیا ہے۔
۱۰۔ ۱۵ ستمبر: ریاستی تحکمہ الملائعہ

و تعلقات عامہ کی طرف سے
سہ ماہی قومی کچھتی مشاعرہ تلگو

ملک الشعراء ڈاکٹر داسرھی کی
صدارت میں منعقد ہوا مسرہ

خواجہ شوق، کنول پر شاد کنول
خیرات ندیم، صلاح الدین تیر

رئیس اختر اور نوب النساء تسکین
اردو کی نمائندگی کی۔

۱۱۔ ۱۵ ستمبر: عثمانیہ لٹریٹری سوسائٹی کی طرف
سے صاحبزادہ محمد علی خاں کلیم محمد

کے مجموعہ کلام ”جلوہ طوطہ“ کی
قائد جنگ نے رسم اجرا انجام دی۔

ڈاکٹر غیاث صدیقی، جناب جہانزاد
افسر، صاحبزادہ احمد الدین علی خاں

ریسرچ اسکالر، رضا مصطفیٰ اویس
حیدرآبادی نے کلیم کی شاعری

اور ان کی شخصی صلاحیتوں کو خراج
ادا کیا۔ ہلال آغا نے شکر یہ ادا کیا۔

۱۵۔ ۱۵ ستمبر: ریاستی اردو اکیڈمی
نے جلسہ تعزیت منعقد کر کے شہر صحافی

ربنیز جی کی صحافتی اور جدوجہد آزادی
میں ان کی گراں قدر خدمات کو زبردست

خراج ادا کیا اور ان کی یاد میں صحافت
کے لیے میموریل گولڈنڈل اکیڈمی کی

طرف سے جامعہ عثمانیہ کو ہر سال دیے
جانے کا صد اکیڈمی مولانا حافظ ابویوسف

نے اعلان کیا۔ جناب اختر حسن مدوکار
مقصد اکیڈمی اور جناب اعجاز قمر شیلائیٹر

بھارت نیوز اور مسرہ منوہر راج سکینہ
نے ربنیز جی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

یوسف ندیم صاحب نے نظم سنائی۔
۱۲۔ ۱۵ ستمبر: جناب یعقوب عمر کلچر اور فارسی نظام کالج

کو ان کے مقالہ ”اردو غزل کی ترقی میں
فارسی غزل کا حصہ“ پر عثمانیہ یونیورسٹی

نے بی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار
دیا۔ ڈاکٹر عمر نے پروفیسر غلام عمر خاں

صدر شعبہ اردو کی انگلہ فی میں مقالہ طلبہ
۱۸۔ ۱۵ ستمبر: ریاستی اردو اکیڈمی نے

ریاست کے ۳۵ کتب خانوں اور مطا
گھروں کو ۵۰ روپے فی کتب خانہ

کتابوں کی خریدی کے لیے رقمی اعانت
کی منظوری دی ہے۔ ادارہ ادبیات

مکتب خانہ بھی اس میں شامل ہے۔

اس اعانت پر ادارہ اکیڈمی سے اظہار تشکر کرتا ہے۔

۱۹ دسمبر: گولڈن جوبلی تقاریب

ادارہ ادبیات اردو کے سلسلے میں

محفل خواتین کا ایوان اردو میں انعقاد

عمل میں آیا۔ ڈاکٹر زینت صاحبہ نے

افتتاحی خطاب کیا اور ادارہ ادبیات

اردو کی خدمات اور اہل قلم خواتین

کی اس ادارہ سے حوصلہ افزائی کو

ڈاکٹر زور کا علمی کارنامہ قرار دیا۔ مخیر

ڈاکٹر عامر کمال نے صدارت کی۔

مخیر عظمت عبد القیوم نے ڈاکٹر

مخیر اور ادارہ پر مقالہ سنایا۔

مخیر ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے

اردو کی خواتین شعراء پر مفید مقالہ

سنایا۔ مخیر شفیقہ قادری نے

محفل خواتین حیدرآباد کی خدمات

پر مہمون سنایا۔ محفل خواتین کی اس

شعری محفل میں مخیر میر عیلائی بانو

سلطانہ شرف الدین احمد قمر جلی

نے اور بانو طاہرہ سعید عظمت

مظفر انصاری، ناز، ناز حیدر

اس، نسیم نیازی، فیض النساء

اور زبیدہ نجین نے کلام سنایا۔

حیدرآباد لٹریچر فورم کے زیر اہتمام

شعری محفل پروفیسر حسن عسکری

کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔

ڈاکٹر مفتی تبسم، راشد آف، تاج

ہجور، معطر مجاز، روف خیر علی دین

نوبہ، غیاث تین، رضا وصفی، احماد

مدتی، ڈاکٹر یوسف کمال اور

ماہر علیم نے نگر و شعور کی حاصل

تخلیقات پیش کیں۔ جناب غیاث

تین نے نظامت کے فرائض انجام

دیے اور جناب یوسف اعظمی نے

شکریہ ادا کیا۔

۲۴ دسمبر: تنگودیشم کے صدر

مشرین بی رامادو نے اسمبلی

انتخابات کے موقع پر اس امر کا

یقین دیا کہ ان کی پارٹی ریاستی

انتخابات میں برسرِ اقتدار آئے گی

نوار دو کو دوسری سرکاری زبان کا

درجہ دیا جائے گا۔

○ جناب عبد الحمود سکریٹری نظام

اردو ٹرسٹ کے اعلان کے موجب

ٹرسٹ کی طرف سے حیدرآباد شہر

میں تعلیم بالغان اسکیم کے تحت ۳۰

مراکز کو اعانت دی جائے گی۔

۲۵ دسمبر: علمی و ادبی محفل

میں یہ خبر نہایت مسرت سے پڑھی

جائے گی کہ ممتاز دانشور اور

ریٹائرڈ آئی اے ایس عہدہ دار جناب

سید ہاشم علی اختر معتمد اعزازی ادارہ

ادبیات اردو کو ریاستی گورنر نے ایک

حکم نامہ کے ذریعہ عثمانیہ یونیورسٹی کا

وائس چانسلر نامزد کیا ہے اور جناب

اختر نے اس عہدہ حلیہ کا جائزہ لے

لیا ہے۔ ادارہ کی گولڈن جوبلی تقاریب

کے سال میں جناب اختر کا اس عہدہ پر

فائز کیا جانا اردو کے علمی و ادبی حلقوں

کے نزدیک باعث افتخار سمجھا جا رہا ہے۔

۲۸ دسمبر: سالانہ کل ہند نعتیہ شاعر

جناب حامد علی خاں ابابریہ ست کی نگرانی

میں بہ مقام دار السلام جمعہ باتان طریقے

پر منعقد ہوا۔ جہان شعراء والی اسی عالم

فتح پوری، اور ڈاکٹر بدنا منظر کے علاوہ

زائر جمعہ، زائر محکور بیگ، شاذ تملنت،

کتول پر شاد تنول، علی جلیلی، سعید شہید

ہاشم جاہ، خورشید جنیدی، بشیر وارثی،

امیر احمد خسرو، منوہر لال بہار، وقار جلیلی،

صلاح الدین نیر، پرشورام پرشاد، مبین

بنی، سیف حموی، جوہر ہاشمی، رحمن جانی،

ریس اختر، فیض الحسن نیل، راز مابدی،

جوہر ہاشمی، داود نصیب، صادق نقوی،

ڈاکٹر گوڈ شاہی، بیہوش، صبر آغائی،

زور آغائی اور ضمیر الزماں میر نے نعتیہ کلام

سنایا۔ اقبال حسین اقبال کے نعتیہ کلام کی

جس شرف الدین احمد نے رسم اجرا انجام دی

وفیات

۱۹۸۲ء اردو والدین کے لیے صبر
آزما اور جانگاہ ثابت ہوا، خوش
فراق اور غنیط جانہ صری کی وفیات
نے اردو شعر و ادب کی تہذیب کو
جھنجھوڑ کر رکھا۔ ”زمین کھا گئی
آسمان کیسے کیسے“ کے صدق اس
صدے کو برداشت کرنا ہی اردو والوں
کا مقصد بن گیا ہے۔ ۱۹۸۲ء رحلت
تو ہو گیا مگر جانتے جانتے جناب میر سنگھ
(متوفی ۸ دسمبر، ایسے جاہل آزادی
بے باک صحافی اور روزنامہ ملاپ
دہلی/حیدرآباد اور جانہ صری کے ہم
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جھین لیا، یہی غلبہ
فراق اہل نے دسمبر کو ممتا، نرئی
پسند ادیب اور شاہراہ (دہلی) کے ادبی
ایڈیٹر جناب پرکاش چندت کو مارا۔
۸ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو ادارہ ادبیات اردو
کے لائبریرین اور محب اردو مولانا محمد
حمید الدین انصاری بعارضہ قلب
رحلت کر گئے۔ بانی ادارہ ڈاکٹر روز
کی انکمیس دیکھنے اور انھیں ٹرچہ کر
اپنے بی اور زبان و ادب کی خدمت
کا دلور اور جذبہ روشن کرنے والوں

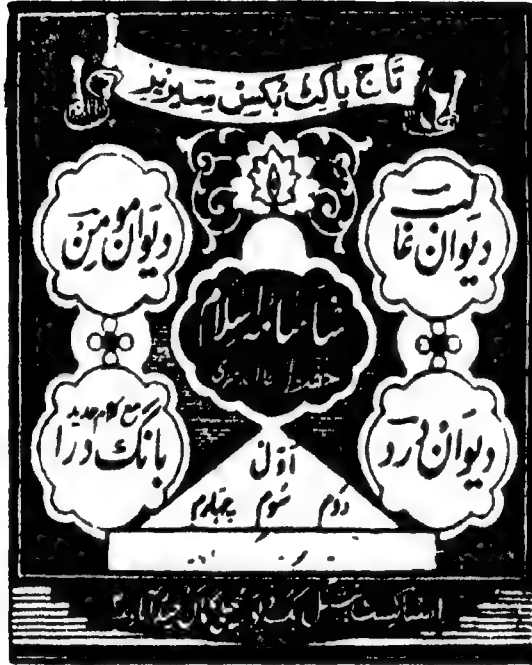
میں مرحوم انصاری صاحب بھی ایک
خدا بخشے بہت سی عموالی تھیں غرض کہ
۱۹۸۲ء کی شہر و ملک عشرہ اہل ہی
میں اردو شاعری کو اپنے دو مقدمہ شعراء
کی وفیات کا سوگ منانا پڑا۔ م جنوری
کو کاجوید میں غزلیہ شاعری کے بزرگ
سخنور حضرت نشو و امدی رحلت کر گئے
آٹھ شری جھومے ان کی یادگار ہیں، انکے
ترن کی ہنگ اور طرل کے معطر لہجے کا پس
بتوں یاد رہے گی۔ نشور واحدی، وضار
تھیں مرحوم وطن شاعر تھے۔ حیدرآباد کے
مشاء و اس کی ہی مگر وہ مدھو کئے
جاتے رہے اور اپنی غزل سرائی سے
تشنگان سخن کی پیمان بھائی۔ م جنوری
کو مرزا پور (دیوبند) میں سرفراز
جناب سید صمت الاکرام بعارضہ قلب
اللہ کو سارے ہو گئے۔ حرمت الاکرام
تیار راغلام شانہ، ایسے نہ بکار وہ
تجسس و مسمانی تھے۔ اقتصاد
بہائی کی وجہ سے فارغ البالی کا زور
ہوا رہت۔ برصغیر کے ادبی حلقوں میں انکی
رحلت کا احساس ہم دیدہ کرے گا۔ دوشم
مجموعہ اور ایک شہنشاہی ملکوتہ: ”ویک بابا“
حرمت الاکرام کے فکر و فن کو دنیائے ادب
میں وزاں رکھیں گے۔ سب رس
سے بھی مرحوم کا دیرینہ قلمی ربط مضبوط تھا
ان پر خدا کی مغفرت ہو اور سپہاندگان

کو حکومت یو، پی کی طرف سے معاشی
سکون کے اسباب فراہم ہوں۔
برصغیر کے ناول نویس اور کہانی
کار جناب غلام عباس کی پاکستان میں
رحلت سند و پاک کے ادبی حلقوں کو
نم دیدہ کر گئی۔
تلگو کے شہسور شاعر جناب غلام
نیس، ان کی بیگم اور کم عمر لڑکے کو خونی
کے عشرہ اول (۱۰ مارچ جنوری) میں فرقہ وارانہ
فسادات نے قتلہ اہل بنایا۔ گھر کا گھر
تباہ و تاراج ہو گیا، آدش اور عقیدے
تھیں نہیں کر دیے گئے، فکر اور قلم نظر پاشا
اور زبانوں کی تقدیس و طہارت کی
پاسداری اب کیسے ہو، انسانی اقدار
اور بھائی چارگی کی دہائی دیتے ہوئے
ضمیر تھلاہٹ محسوس کرتا ہے۔ آرٹسٹ
اور قلم کار تو ملک اور قوم کی روشن تقدیر
ہوتے ہیں، نہ امر جرم نہیں، انکی بیگم
ارکیم، سمرت کو جو ارجمت میں جگہ دے
اور سپہاندہ روز بچوں کا انجیلہ شہنشاہ
اردو کے ذکی انور کے بعد غلام حسین کا نقل
سانی ہم آہنگیوں کا دعویٰ کرنے والوں
کے ظرف و ضمیر کو چیلنج کرنے کا باعث
بنے گا یا نہیں، حیدرآباد کے تلگو اردو
ہندی ادیبوں، شاعروں اور اڈاٹوں
نے غلام حسین کے قتل پر امن مارچ کا
منظاہرہ کر کے فرقہ وارانہ فسادات کے غلا
آواز بلند کی ہے، اسکو صد انجیلہ بنانا چاہیے

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Awan-e-Urdu, Hyderabad 500 004. (A. P.)

اسلوب اور انتقاد



بال حبشیرین

ضرر بکیم

مکاتیب اللہ

سید

ف. ا. و
25/83



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

مسبب میں

حیدرآباد



مجلس مشاورت

صدر: سید علی اکبر
نائب صدر: محمد علی عباسی
مختار: ڈاکٹر مغنی بستم



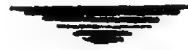
ارکان

پروفیسر گوپی چند رائے
سید ہاشم علی اختر
من ایج سکا
عبدعسی خاں
محمد اکبر الدین صدیقی
پروفیسر سراج الدین
محمد منقوی

مدیر احکامات: ڈاکٹر مغنی بستم
معاون مدیر: وقار خلیل
بلد (پاکستان) مارچ ۱۹۸۳ء شمارہ (۳)
ہمت فی پرچہ: ۲ روپے

دارۃ ادبیات دو پنج گتہ روڈ حیدرآباد ۵

نہ سالانہ
۲۰ روپے ہوائی ڈاک سے بحری ڈاک سے
تنب خاں سے ۲۵ روپے شرق وسطیٰ ڈالر ۴ ڈالر
بذریعہ بحری ۴۵ روپے امریکہ ۱۴ ڈالر ۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر ۳ ڈالر
انڈیا ۶ پونڈ ۳ پونڈ



مطبوعہ: نیشنل پرنٹنگ پریس چار کمان جیل، آباد ۲۰

اپنی باتیں

ادارہ ادبیات اردو کی گولڈن جوبلی تقاریب کا ۱۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو گنبد ان قطب شاہی گولڈن جوبلی پر جناب محمد ہدایت اللہ نائب صدر جمہوریہ سندھ نے افتتاح کیا تھا ادارہ کی یہ تقاریب سال بعد ایک وقفہ وقفہ سے منعقد ہوتی رہیں، سیمینار، مباحث اور شعرواف نے کی محفل کے ذریعہ ادب آرٹ اور کچھ کی ترقی میں حیدرآباد اور اردو کے حصے کو روشن کیا گیا۔ ادارہ کی چند مطبوعات کے طبع دوم کا نفاذ اردو نرسٹ کی طرف سے انہما کیا گیا۔ گولڈن جوبلی انٹرنیٹ کا اختتام ۲۴ مارچ ۱۹۸۳ء کو ۲۱ ویں یوم ملی قطب شاد کے اجلاس پر ہوگا۔ ہمیشہ کی طرح حیدرآبادی عوام کے اس قبولِ جن اردو یوم محمد قلی کو جسے ادارہ ادبیات اردو کے سالانہ کاموں کا جائزہ بھی کہا جاتا ہے، جناب رن راج ملکینہ صاحبہ معتمد تقاریب کی شخصی دل چسپی کے باعث شایاں شان طریقہ پر انعامات کئے گئے ہیں۔ چیف جسٹس آف ہراپریش جناب کے۔ دھو۔ یہ بھی افتتاحی تقریب کی صدارت کرنے سے اتفاق کر لیں۔ یوم محمد قلی کے موقع پر ۳ مارچ کو ایوان اردو میں ادبی اجلاس بعد ازاں جناب امجد علی منعقد ہوگا۔ حیدرآباد کے سکالر اہل قلم اصحاب و خواتین نے قطب شاہی تہذیب و ثقافت پر مقالے سننے سے اتفاق کر لیا ہے معلوم ہوا ہے کہ اس اجلاس کو پاکستان کے ناسور دکنی اور اردو اب کے نقاد اور مورخ ڈاکٹر جمیل جالبی بھی خطاب کریں گے جنھیں سیاست تو سبھی لکھ کرے جلیلہ میں حیدرآباد آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ڈاکٹر مفتی تقسیم ادبی اجلاس

فہرست

اپنی باتیں	دقار خلیل ۲
ڈاکٹر زور کی شخصیت	گوشہ دو اکڑ زورہ
ڈاکٹر صاحب کی افتاد نگاری	ڈاکٹر یوسف بک ۸
ڈاکٹر زور کا دکن سے عشق	فیاض صدیقی ۱۲
میر کاروان دکن: زور	صادق نقوی ۱۵
ہرگز نہ میر و آنکھ...	احمد علی ادیب ۱۹
	شاعری
۴ دو بیتاں	قدیر عینی ۲۲
۲ تراخیلے	قطب سرشار ۲۲
۳ غزلیں	وفابراہی ۲۳
۲ غزلیں	فرحت قادری ۲۴
۳ نظمیں	صابر نخلین ۲۴
غزلیں	قاضی انصار، رشید ظفر، طارق ۲۵
	کہانی
ماں	سوانح حیدرآبادی ۲۶
	انفرد و نظر
نئی کتابوں پر تبصر	دقار خلیل قہر راقیہ ۳۲
اردو نامہ	دقار خلیل ۳۶

کے نام ہیں، اسی شب سالانہ مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہی آرامستان ہوگا۔ جس کی صدارت جناب محمود بن محمد کریں گے اور جناب منظور احمد جوائٹ سکریٹری گولڈن جوبلی تقاریب ادارہ نظامت کے فرائض انجام دیں گے۔ ادارہ ادبیات اردو کے صدر جناب محمد علی عباسی، سرپرست جناب پروین سید عیسیٰ اکبر اور معتمد اعزازی جناب میدا ثم علی اختر نے عمومی طور پر شرکت کی اپیل کی (دقار خلیل)

علی احمد حبیبی

ڈاکٹر زور کی شخصیت

پنئی تھریر، آخر اگر میں ہوں، رولز کہ میری آج
 وہ کامرہ، اور وہ ابیت، تو آپ
 شہنشاہی، کیوں کہ ادارہ ایماں اور کے
 میں ہی ڈاکٹر زور لے ہیں۔ وہ وہی بات اس قلوب کے
 عازب مجھے یہ سننے کی اس تقریب، کہ جو ڈاکٹر زور
 دلا، اس نے کہ یہ منہ کی کئی بنے شخصیت، یہ سسی پر
 مول، یہ بیان ہے۔ یہ شخصیت پرستی نہیں انفرادی شخصیت
 شخصیت کی اصطلاح آج بہت عام ہو گئی ہے
 رہا، اس کا استعمال بہت سنا ہو گیا ہے۔ جہاں تک
 اس محترم مول، یہ مذوری نہیں کہ یہ شہور، ناع و ادیب
 کسی شخصیت کا بھی ماحول ہو۔ یہ وہ ادب کی تخلیق ہی سے
 شخصیت، یہ امتیازی اس کی تعمیر میں اور بہت سے عوامل
 کارروا ہوتے ہیں اس لیے شخصیت کے حامل مہر کا اعزاز
 خاص خاص لوگوں ہی کے حصے میں آتا ہے۔ جناب زور کا
 شمار میں ایسی ہی مخصوص مستندوں میں کرتا ہوں جو اپنی
 مسکنات ہی سے نہیں بلکہ اپنی شخصیت سے ہم پر چھائے

ہوتے ہیں۔
 وہ دھارم کے ایک نقاد کا خیال ہے کہ شخصیت

کی تکمیل کے لیے انسان کہ تین بار جنم لین پڑتا ہے، پہلا بار
 اپنی ماں کے پیٹ سے۔ دوسری بار ماحول کی کوکھ سے،
 اور تیسری بار اپنے وجود کے شکم سے۔ پہلے جنم سے تیسرے
 جنم تک حور سے ہیں، وہ جنم ہیں اور ان کی تلاش
 انسان، وہ سرے جنم ہی کے بعد سے کرنے لگتا ہے۔ یہ
 جنم میں کم ہو کر اپنے آپ کو بغیر سے الگ کرنے کا عمل ہے
 لیکن تیسرے جنم کا، وہ اپنی پہلے اور وہ سرے جنم کی مائیں
 اتفاقات کے بجائے شعوری کوششوں سے حاصل کیا جاتا
 یہ ایک لڑائی ہے جو فرد اپنی ذات کے مہد ان میں اپنے
 ماحول سے لڑتا ہے۔

ابھار ادب شخصیت کی تکمیل سے عبارت ہے جس
 تخلیق کے لیے ادیب کو اپنے خود اپنے آپ کو پیدا کرنا پڑتا
 ہے۔ ڈاکٹر سید نجمی الدین قادری زور کے ادبی ماحول، ابتدا
 بھی شخصیت کی تکمیل کی اس تیسری منزل سے بہت پہلے
 موجداتی ہے جب وہ ادب کا علم ہوئے۔ اس لیے اپنے
 آپ کو افسانہ نویس، تنقید کے کی حیثیت سے روشناس
 کرانے، یہ ادبی اسکے کرنے سے پہلے ہی اس کی نیوں
 کا مہموش معہ ہوا اور وہ اس کے ساتھ ہی زور

نہرہ پرانی۔

جناب زمرہ کی اس شخصیت کی بحث آگے
 نہ گئے تھے۔ پہلے ان کے سامنے یہ اعتراض ہے
 کہ ان کا شمار درجہ اول اور بی۔ اے
 میں ان سے دوسرے لینے اور ان کے سامنے
 زائفے اب تہ کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔
 اس وقت نے ان کی ذات و شخصیت کے جو گوشے یہ
 سامنے آئے انقباض لیے اس لیے استاد مجید پر ظلم اٹھانے
 اور کچھ کہنے کی جرأت پیدا کی میں نے یہ بات غمگین
 کی جو شخص جناب زمرہ سے جہت قریب ہوا اسے
 اتنا ہی ان کی برائی کا احساس ہوا۔ ان کی شخصیت
 جو اس وقت تک تکمیل پا چکی تھی واقعی بڑی بڑی
 محبوب کن تھی۔ بعد ازاں ہم یہ یاد رکھنی چکتی تھیں
 کہ ان پر جموٹ ہو۔ دراز بالی۔ ڈھیلی ڈھالی
 شہ انی امنہ میں بان کی گوری، ہجہ میں گونج اور آواز
 میں تکانست تھی۔ جب میں اس کو میں پڑھتا تھا زور
 صاحب کا نام برابر سنتا چلا آیا تھا۔ دوچار حبسوں
 میں انھیں دوسرے دیکھ بھی تھا۔ پھر ٹی کارنج سے انہ
 کرنے کے بعد جب میں نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا
 اور مضمون اختیاری اردو فارسی لیا تو دو سال تک
 بی۔ اے میں اور اس کے بعد ام۔ اے کی کلاسوں میں
 ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، ربات کرنے کی صورتیں بار
 بار پیدا ہوئیں۔ سال اول میں یہ کلاسیں پھر پھر تھیں
 جس ہوتی تھیں بعد ازاں دوسرے بی۔ اے جب آؤں
 کلچ کی تعمیر مکمل ہو گئی تو یہ کلاسیں وہاں منتقل ہو گئیں۔
 اس وقت اردو افتاء بھی ڈپارٹمنٹ میں چھٹی شخصیت جمع

تھیں۔ شلایہ سجاد، عبدالقدوس وری، عبدالمقیم باقی
 قاری کلیم اللہ اور ڈاکٹر نظام الدین وغیرہ۔ ان میں میں
 جن اساتذہ سے متاثر ہوا وہ سید سجاد اور ڈاکٹر زور
 تھے۔ بی۔ اے کی کلاسوں کی حد تک ان اساتذہ کو
 کلاس روم میں آکر لکھ دینا پڑتا تھا۔ ایم اے کے طالب علم
 اساتذہ کے گھر میں ہی میں اردو کا درس لیتے تھے۔ ان
 دنوں طلباء کی تعداد بہت کم رہتی تھی اس لیے سلسلہ
 اور شاگردوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی مدد
 ملتی تھی۔ ہمارے نتیجے میں رشید قریشی، خواجہ حمید الدین
 شاہ اور حفیظ فقیر قابل ذکر ہیں۔ ہم مضمون پر ان کی خاص
 نظر تھی اور ہماری موجودگی میں ان کے پڑھانے کی دل چسپی
 بہت بڑھ جاتی تھی۔

ایک دن ایک عبارت کی تشریح کر رہے تھے
 اس میں لفظ آتش آگیا۔ کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ پھر
 مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اپنے والد یعنی استاد جلیل سے
 پوچھ آئیے کہ صحیح لفظ آتش بالفتح ہے یا آتش بالکسر۔
 دوسرے دن میں دربارتہ آگیا اب تھا کہ آتش
 تائے دراز پر زبر ہے اور سند میں ایک شعر بھی لکھا
 تھا جس میں آتش اور میکش کو ہم قافیہ بتایا گیا تھا۔ ہاں تو
 جوابات یہاں غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ لغت کی مدد سے
 بھی وہ تلفظ کی صحت معلوم کر سکتے تھے لیکن وہ اس کی
 تصدیق مستند ذریعہ سے کرنا چاہتے تھے۔ اردو کے تعلیمی
 سے تحقیق و جستجو کا یہ رویہ ان کی فطرت میں تھا خصوصاً
 ذکر کی اردو سے ڈاکٹر معاحب کو جو لگاؤ اور پیار تھا
 اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اسی تعلق
 ایک اور واقعہ کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ ایک

میں ایک سے زیادہ راہیں ہو سکتی ہوں۔ جناب زور دیکھ تو ہر اس لیے بھی مجھ پر خاص تھی کہ ان کی ادارت میں نکلنے والے سب رس میں میری نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ حمید الدین شاہ جو سب رس کے حلقہ ادارت میں تھے وہ اکثر مجھ سے نظم اور رشید قریشی سے مضمون مانگ لے جاتے اور سب رس میں چھپوا دیتے۔

غرض میں نے جناب زور کو پڑھانے دیکھا لکھتے دیکھا اور گناہ کام کرنے دیکھا اور اس طرح ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی گئی۔ ان کی ساری زندگی اردو کے اطراف اپنا دائرہ بناتی ہے۔ اردو کے تحفظ اور ترقی کے وسائل کے سوا کسی اور کاروبار سے انہیں شخصیت نہ تھا۔ وہ اردو کے محسن اور اس کے عظیم خدمت گزار ہیں۔ صرف اردو زبان و ادب کی خدمت کی بلکہ اس کی بقا کا سامان بھی جیسا کیا۔ اور اس لحاظ سے بقول مولانا عبد المجاہد دریابادی۔ — بابا مے اردو کی جائیمنی کا شقی اگر کوئی فرد واحد ہو سکتا تھا تو وہ مرحوم زور ہی تھے۔ ان کی ذات ایک ادارہ تھی، انجمن تھی۔ ان کے علم و عمل کا حیرت انگیز امتزاج کہیں ادارہ ادبیات اردو کی تنظیم کی صورت میں ظاہر ہوا کہیں ایوان اردو کی تعمیر کی شکل اختیار کی۔ ایوان اردو ان کے خواب کی تعمیر تھی۔ اس کی تعمیر میں زور صاحب کے خون جگر کا وافر آب و رنگ ہے۔ اتنا بڑا کام کس طرح انجام پایا۔ بالیہ کس طرح فراہم ہوا اس کی تفصیل میں گئے بغیر صرف ایک واقعہ کے ذکر پر اکتفا کرنا ہوں کہ غلام محمد زید رینسانس نے (جو بعد میں پاکستان کے گورنر ہوئے) جب اس کا معائنہ کیا تھا تو اس کی تنظیم و ترتیب سے متاثر ہو کر فرمایا تھا۔

زور صاحب نے والد مرحوم سے تحریراً دریافت فرمایا۔ یہاں دکن کو اہل زبان قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بات کے سامنے واضح کر دوں کہ والد مرحوم حضرت علیہ السلام ادبی استفسارات کے جواب بہت کھل کر دیتے بلکہ جہاں کہیں کوئی ایسا سوال آجاتا جس کے جواب میں اختلافی صورت پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا تو جواب بہت دامن بچا کر دیتے۔ مثلاً

ایک بار نور الحسن بیگم کا کوری مولف نور اللغات نے جناب داغ دہلوی کا یہ مشہور شعر لکھا ہے

ادامتہ منہ سے پاؤں نکال چھائی ہوئی
اُن تری کافر جو جانی جو شہ پر آئی ہوئی

اور دریافت کیا کہ ادا چھانا کا استعمال درست ہے یا نہیں اس کا جواب جناب حلیل نے یوں دیا۔ ادا چھانا مذہب چھانا اور نام چھانا درست نہیں ہے داغ نے ادا چھائی جو کہا ہے۔ ان کی گویائی ہے۔ اسی نوعیت کا ایک تحریر حجاب اسمحیل کی ہے۔ ان کی تحریر کے سلوب سے بہت سادے حضرات واقف ہوں گے۔ انہوں نے اپنی ایک مطبوعہ کتاب والد مرحوم کے پاس بھیجی اور رائے طلب کی۔ اس کا جواب یوں دے کر دامن چھڑایا۔ — آپ کا رمالہ بچر کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔ میں اس کی کیا مہارت کر سکتا ہوں۔ ہاں تو آدم برہر مطلب چناں چہ جب استاد زور صاحب نے دکن والوں کی زبان سے متعلق والد مرحوم رائے جاننا چاہی تو جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے اتنی ہی تحریر پر اکتفا کیا تھا۔ کہ ایسے مسائل اظہار خیال مناسب نہیں سمجھتا جس کے بارے

کتنے ادیبوں اور شاعروں کو گمنامی کی تاریکی سے باہر نکالا۔ وہ دکنی ادب کا سہمیل تھے۔ آج کی ذہنی بیداری کا پوزو صاحب ہی کی رہبری کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے اپنے حلقہ اثر سے ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔

اس سلسلے کی ایک اور بات جس کا ذکر میں ضرور سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زور کو اس بات کا شائبہ احساس تھا کہ شمالی ہندوستان والوں کے فطری احساس بزرگ کو براؤہ کی ادبی تاریخ میں اور ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں دکن کے کارناموں کو ان کا جائزہ مقام دلانا ہے۔ معرب ذہنیت کا خاتمہ کرنا ہے۔ احساس کمتری کی زنجیروں کو توڑ کر دکن والوں میں خود اعتماد پیدا کرنا ہے چنانچہ انھوں نے خود لکھا اردو سہروں سے لکھوانا اور اس جنکاری کو شعلہ بنانے میں لگے رہے ڈاکٹر زور کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں ان کے اردو نساٹھو پیڈیا کا وہ مکمل منصوبہ بھی ہے جو انھوں نے سب سے پہلے ادارہ معارف اسلامیہ کے دوسرے اجلاس میں پیش کیا تھا۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کی اپنے طور پر انھوں نے طرح بھی ڈال دی تھی اور اس کے کچھ ابتدائی صفحات تیار بھی کر لیے تھے۔ بادشاہ حسین کو انھوں نے اس کام میں اپنا شریک بنالیا تھا۔ بڑا جامع اور وسیع پیمانہ تھا ان کا۔ مثال کے طور پر لفظ آزادی پنڈت جواہر لال نہرو کے سپرد تھا۔ گاندھی جی کو لفظ اہم سمونیا گیا تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے اعدت پر لکھنا منظور کر لیا تھا۔ سر جی نائیڈو نے بھی اس کا ہوا گئے بڑھانے میں بڑی بہت افزائی کی تھی۔ لیکن حیدرآباد کی تقسیم کے بعد حالات نے ایسا سوڑیا

زور صاحب جی پتا ہے کہ آپ کو خزانہ عامہ لے چلوں اور کہوں کہ جتنا روپیہ لے جاسکتے ہو لے جاؤ۔ ایک اور بات اس ایوان کی تعمیر سے متعلق ہے اور بطور خاص ملحق ذکر ہے کہ ایوان اردو کے سامنے کے حصے میں ایک گنبد بھی بنایا گیا ہے جو دور سے دعوت نظر دیتا ہے۔ میرٹھین علی خاں کے بیان کے مطابق جب انھوں نے اس گنبد کی غیر ضروری تعمیر کی طرف توجہ دلائی تو اس کا پس منظر زور صاحب کی تشریح کے مطابق بڑا دور اندیشانہ تھا۔ انھوں نے اس کی توجہ یہیوں کی — شاید آج سے سو برس بعد با اس سے پہلے ہی یہ ادارہ بھولے بسرے عجیب خانے بن جائیں گے اگر یہ گنبد قائم رہا تو متجسس نگاہیں اس پر ٹریں گی اور لوگ اسے کوئی مندر مسجد یا مقبرہ سمجھ کر دیکھنے آئیں گے۔ اس دکن کی تاریخ پھر زندہ ہوگی۔

جناب زور کی شخصیت کا ایک اور روشن پہلو، ان کی ادبی تاریخ سے ان کی گہری دلچسپی ہے دکنی ادب کے فتنہ کی حیثیت سے زور مرحوم اس کے نہاد اثر ہیں۔ دکنیت کے نام تھے جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کا تصور بستیہ کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح دکنی ادبیات اردو کی خدمت کا تصور زور صاحب کے بغیر ممکن نہیں۔ دکنی زبان پر انھیں اتنا ہی فخر تھا جتنا دہلی والوں کو اردو سے ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دکنیت پر کام کی ابتداء مولوی عبدالحق صاحب کی تحریروں سے شروع ہوئی تھی۔ زور صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ملکی سطح پر ان قدیم ادبی جواہریاروں کی بازیافت کی۔

اور اس لیے ادب ان کے لیے بالترتیب کا مشغلہ نہیں
کل وقتی کام بن گیا تھا۔ نتیجتاً وہ اپنی تخلیقات کے معیار
کی سطح کو برقرار نہ رکھ سکے۔ ایک ADVANTAGE
انہیں یہ بھی تھا کہ مغربی ادبیات کے مطالعہ نے انہیں کہانی
اور وسعت پیدا کر دی تھی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ادبی
تنقید و ادبی تاریخ پر قلم اٹھاتے وقت زور دینے اس بات کو
پیش نظر رکھا کہ ادبی تنقید، ادبی تاریخ کا نیمہ نہیں بلکہ
ایک دوسرے کا مکمل ہیں مثلاً نکلیات محمد قلی قطب شاہ
میں حیات علی صرف حیات ہی نہیں اس وقت کی بسوسط
تاریخ بھی ہے جس میں قطب شاہی تمدن کی واضح
تصویریں بھی ہیں۔

حرف آخر یہ کہ ڈاکٹر زور زمانہ طالب علمی
نیلام یورپ، جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری، چادر گھاٹ
کالج کی پرنسپل اور کشمیر میں زندگی کے آخری لمحے تک صرف
اردو اور اردو ہی کے لیے سانس لیتے رہے۔ اردو
تاریخ ان کی عظیم خدمات کو فراموش نہیں کر سکتی۔ آج
صورت حال یہ ہے کہ اردو پر ترس کھانے والوں کی
تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ ایسے وقت زور صاحب کی یاد
میں شدت سے آتی ہے۔ ان کی باقیات الصالحات ہر کام
کرنے کی ضرورت ہے اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی
ناکچراغ سے چراغ جلتے رہیں۔ اردو کے مستقبل سے
اگرچہ ہم بالوس نہیں ہیں لیکن ہوا کا رخ بدلا ہوا ہے
حالات سازگار نہیں ہیں۔ خدا نہ کرے کہ اردو پر وہ وقت
آئے کہ ہم اس شاعر کے ہمنوا ہو جائیں جس کی گنجائی
سے بڑی مالوسی کے عالم میں یہ شعر نکل گیا تھا۔

ذرا بڑھ کر اسے کندھا تو نینا۔ وہ اردو کا جنازہ چل رہا ہے
(یوم زور ۲۲ میں پڑھا تھا)

کہ جو زور کا یہ پلان آگے نہ بڑھ سکا۔ لیکن حقیقت
ہے کہ انہی کے بنائے ہوئے خطوط کی رہنمائی میں بعد میں
ہی کام اردو ان سائیکلو پیڈیا، پراجیکٹ کی صورت
میں حکومت ہند کے ترقی اردو بورڈ کے ماتحت انجام
ایا۔ میں نے بھی دو سال تک بحیثیت اسسٹنٹ چیف
ایڈیٹر اس ان سائیکلو پیڈیا کی ترتیب و تدوین میں حصہ
لیا ہے اور میری موجودگی ہی میں اس عظیم کام کی تکمیل
ہوئی۔ آج اس انسائیکلو پیڈیا کے ۱۲ جلدوں کے
ستبدات ترقی اردو بورڈ کی نگرانی میں زیر شاعت ہیں
در جلد ہی منظر عام پر آیا جائے گا۔ ہم اس دن کے
منتظر ہیں جب یہ جلدیں ارباب ذوق کے ہاتھ میں
ہوں گی اور اس اظہار عقیدت سے ان کے سر بلند
ہو جائیں گے کہ اس کی آبیاری میں ڈاکٹر زور نے
سالمو بھی شامل کیا ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر زور کی تصنیفات کا تعلق ہے
نعت اور بکثرت دونوں اعتبار سے انہوں نے
ناب زور کی شخصیت کو بہت اُبھارا ہے۔ بالعموم
رے لکھنے والے خواہ وہ تنقید نگار ہوں یا انسا
ن چند تخلیقات کے بعد اپنے آپ کو دہرانے لگتے
ہے یا پھر قلم رکھ دیتے ہیں۔ جناب زور کی تصنیفات
یہ الزام وار نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے
ضنیف معاشی حالات کا شکار ہیں اور بچوں کے زندہ
ہونے کے لیے ادب سہارا نہیں بن سکتا اس لیے اکثر
میرے لیے تصنیف و تالیف کل وقتی یعنی WHOLE TIME
م نہیں بن سکا ہے۔ لیکن ڈاکٹر زور اس اعتبار سے
بے خوش قسمت تھے کہ فکر روزگار سے وہ آزاد تھے

ڈاکٹر یوسف مسرت

زور صاحب کی افسانہ نگاری

زور صاحب کا افسانہ نگاری کی حیثیت سے مقام اور مرنے کو متعین کرنے سے پہلے خود اس بات کے تعین کی ضرورت پیش آتی ہے کہ افسانہ کیا ہوتا ہے؟ تاریخ اور افسانے میں کیا فرق ہوتا ہے؟ حقیقت تاریخ اور افسانہ میں کیا ربط ہے؟ جب تک یہ تمام باتیں پیش نظر نہ ہوں نقد صاحب کی افسانہ نگاری کی حقیقت اور اہمیت ہماری نظر میں اوچھل رہے گی۔ افسانہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا مختصر جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو حقیقت نہیں ہوتی ہے وہ افسانہ ہوتا ہے لیکن یہ بات پوری طرح صحیح اور قابل قبول اس لیے نہیں ہے کہ افسانے میں حقیقت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ افسانے میں حقیقت نگاری کی اصطلاح سے کون واقف نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب افسانے اور حقیقت میں گہرا ربط ہوتا ہے تب افسانے اور حقیقت میں فرق کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ اصل میں اس نے کسی بھی افسانے نگار کی بڑائی اور اہمیت صرف اسی بات پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ حقیقت کو کس حد تک افسانہ بنا سکتا ہے اور افسانے کو کس حد تک حقیقت بنا دینے پر قادر ہے۔ افسانہ نگاری کا سارا کمال حقیقت کو افسانہ اور افسانہ کو حقیقت بنا دینے

میں منہم ہوتا ہے۔ اچھا یا برا اور کامیاب افسانہ نگار کسی بھی بات کو کسی بھی واقعہ کو خواہ وہ کتنی ہی خیالی کیوں نہ ہو اس انداز اور اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ ہمارے لیے بے حد حقیقی اور واقعی بن جاتی ہے۔ وہ حقیقت سے زیادہ ہم کو متاثر کرتی ہے اچھا افسانہ ہمارے لیے اسی بنا پر حقیقت سے زیادہ متاثر کن ہوتا ہے۔ ہم حقیقی واقعات کو جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں اخباروں کی بڑی بڑی سرخیاں بنتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر قبول جاتے ہیں لیکن ایک کامیاب افسانے کے واقعات کو آسانی سے بھلا نہیں سکتے افسانہ نگار ان کو ہمارے لیے تجویز اور مشاہدہ کا جزو بنا دیتا ہے اور ہم اس کے تخلیقی تاثر میں گم ہو جاتے ہیں اسی طرح افسانہ نگاری ایک خیالی بات کو ہمارے لیے حقیقی بنا دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ حقیقی بات کو ہمارے لیے افسانوی اور خیالی بنا دیتا ہے۔ کیوں کہ ہم ایک اچھے افسانے میں یہ نہیں جانتے کہ حقیقت کتنی ہے اور افسانہ طرازی کتنی ہے۔ حقیقت اور افسانہ یہاں اس طرح ملے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہم ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ہمارے لیے افسانہ حقیقت

جب کہ وہ تاریخی واقعات یا شخصیات کو موضوع بنا رہا ہوں تاریخ کو کس حد تک ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تاریخ اور افسانے کے بارے میں اسطو نے سب سے پہلے روشنی ڈالی ہے۔ اس نے شاعری اور ادب کو تاریخ سے زیادہ اہم قرار دیا ہے کیوں کہ تاریخ محدود ہوتی ہے یعنی جو کچھ ہو چکا ہے اس تک۔ اپنے آپ کو محدود رکھتی ہے جب کہ شاعری اور ادب جو کچھ ہو سکتا ہے اس سے بھی بحث کرتی ہے۔ یہی شاعری اور ادب کی قوت اور اہمیت کا باعث ہوتی ہے تاریخ میں حقیقت یہ ہے کہ تخیل کو کھلا اور آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا اس کو حقیقت اور واقعات کی زنجیریں جکڑی ہوئی ہیں جب کہ ادب اور شاعری میں اور افسانہ نگاری میں تخیل کھلی فضا میں پرواز کر سکتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب افسانہ نگار تاریخی واقعات یا شخصیات کو موضوع بناتا ہے تو وہ تاریخ اور حقیقت سے کس حد تک تجاوز کر سکتا ہے۔ یہاں تاریخ حقیقت اور افسانے کا ربط بھی زیر بحث آجاتے ہیں۔ افسانے اور تاریخ کا موضوع حقیقی انسان ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حقیقی انسان تاریخی انسان کب اور کس طرح بنتا ہے اور افسانوی انسان کس طور پر بنایا جاتا ہے تاریخ حقیقی انسان کے ظاہری عوامل سے بحث کرتی ہے۔ وہ انسان کے خارجی روپ تک عام طور پر پہنچنے آپ کو محدود رکھتی ہے۔ ان احوال و عوامل کے پیچھے جو جذباتی، ذہنی کششیں چھپی ہوئی ہیں وہاں تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ گویا انسان

درحقیقت افسانہ بن جاتی ہے۔ افسانہ نگار اپنے اثر کو قاری کا تاثر بنا دینے کا کمال جانتا ہے۔ اس کے موافق افسانہ نگاری کچھ نہیں رہی افسانے کی تکنیک۔ اور اس کے مختلف عناصر کی بحث تو یہ بھی تمام اسی بنیادی اور محوری بات کی تکمیل کے لیے وجود میں آتی ہیں۔ اب یہاں یہ بتانے اور کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس اعتبار سے زور صاحب کتنے بڑے افسانہ نگار تھے۔ یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے انھوں نے کہاں تک حقیقت بیان کی ہے اور کہاں۔ افسانہ طرازی سے کام لیا ہے۔ یہ الگ بحث ہے اور اس پر آگے روشنی ڈالی جائے گی۔ زور صاحب افسانہ نگاری کا اس سے بڑا کمال کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے سیر گو کھنڈہ اور گو کھنڈے کے ہیرو بن جو باتیں بیان کی ہیں وہ ہمارے لیے بالکل حقیقی درو اقی بن گئی ہیں۔ آج گو کھنڈے کی تاریخ اور اس دور کی تہذیبی زندگی کو زور صاحب نے اتنا حقیقی اور واقعی بنا دیا ہے کہ یہ افسانے ہمارے لیے حقیقت بن چکے ہیں۔ آج لاکھ تاریخی تحقیق و روشنگاری زور صاحب کی باتوں کو جھٹلائے لیکن اس اثر میں کوئی کمی نہیں آسکتی جو زور صاحب کا تخیل کر رہا ہے۔ زور صاحب نے اپنے افسانوں کے ذریعہ نطب شاہی دور کو اس قدر زندہ اور تابندہ کر دیا ہے کہ وہ آج ہمیں سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے زور صاحب کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ تاریخ اور افسانے میں کیا ربط ہوتا ہے؟ کسی بھی افسانہ نگار کے لیے

کر سکتا بلکہ اپنے تخیل کے زور پر بعض اور بھی کرداروں کی تخلیق کرتا ہے جن کا تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا جو صرف اس کے تخیل کی پیداوار ہوتے ہیں اس طرح سے وہ ایک ایسا ماحول تخلیق کرتا ہے جہاں اس کے کردار زیادہ حقیقی اور زندگی سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔

زور صاحب کی افسانہ نگاری کی تمام تر کامیابی اصل میں ان تاریخی، نیم تاریخی اور خیالی شخصیتوں کو حقیقی زندگی عطا کرنے پر ہی منحصر ہے وہ اپنے کرداروں کو اس قدر زندگی سے بھر پور مینا جاتا جتنے پھر تاد کھاتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے مائل رہیں اور واقعی بن جاتے ہیں۔ بھاگ متی کے کردار لوہی لیجے، بروفیسر ہاروں خاں شروانی نے اس کو بالکل غیر تاریخی قرار دیا ہے۔ اب حد تک تاریخی اعتبار سے حقیقت میں زوری ہونہ زوری ہو۔

زور صاحب نے اس کو حقیقی اور واقعی بنا دیا ہے۔ تاریخی تحقیق کا بڑے سے بڑا کارنامہ بھاگ متی کے کردار اور شخصیت کو ہمارے دل سے محو کرنے میں

کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بھاگ متی اب ہمارے جماعی لاشعور کا جزو بن چکی ہے۔ زور صاحب نے جو زندگی سے عطا کی ہے اس کو اب کوئی بھی جھین نہیں سکتا۔ زور صاحب کی افسانہ نگاری کی یہی معراج ہے۔

زور صاحب نے جب "سیر کو لکندہ" لکھو تو اس وقت انھوں نے ان واقعات اور شخصیات کے تاریخی یا غیر تاریخی ہونے پر کوئی بحث نہیں کی تھی بلکہ انھوں نے اپنے ان افسانوں کو مضامین کا نام

کی باطنی زندگی تاریخ کے احاطے میں نہیں آ سکتے۔ یہاں کہ اگر وہ انسان کی باطنی زندگی یا جذباتی زندگی کی بھول بھلیوں میں گم ہونے کی کوشش کرے تو پھر ٹھوس حقائق سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس کو صرف تخیل پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ تاریخ بننا سکتی ہے کہ نقلی قطب شاہ نے کوئی کونسی جنگیں لڑیں اور کون سے اہم کام انجام دیے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ ان کارنامے کے پیچھے لوہی سے جذباتی اور مذہبی عوامل کا روبرو ہے۔ وہ نجی شخصیات کے اعلیٰ رتبہ کو پیش کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ افسانہ اس کے برخلاف حقیقی دنیا کے باطنی رویہ کو اپنی جولان گاہ بناتا ہے اگر وہ تاریخی شخصیت کو بھی لیتا ہے تو وہ اس کے ظاہری اعمال اور افعال کی پیش کشی کرتا ہے انہیں کتنا بلند ان کے پیچھے جو سماجی اور جذباتی خروٹ دم کر رہے ہیں ان سے بحث کرنا ہے اور ان کے اندر اپنے اندر سے دور سے ہمہ وجہ جان بخت ہے اور ایم۔ فاروقی نے تاریخی اور افسانوی شخصیت کے اسی فرق

سے بحث کرتے ہوئے یہ بات کہہ رکھی ہے کہ اگر کوئی شخص نہ کہ ملکہ و کٹوریہ کو بالکل اسی طرح پیش کرتا ہے جس طرح کے وہ تاریخی میں تھی تو وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہوا اگر وہ ملکہ و کٹوریہ کی ظاہری زندگی ہی نہیں باطنی زندگی کو پیش کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو پھر وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے کامیاب ہوتا ہے۔ افسانہ نگار صرف تاریخی شخصیات اور واقعات پر اس لیے اکتفا نہیں

دیا ہے۔ لیکن اگر ان افسانوں کو غور سے پڑھا جائے تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ انھوں نے صرف تاریخ پر اکتفا نہیں کیا ہے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

”صاحب القلعہ اور اہل قلعہ سے متعلق اتنی معلومات آپ کو کن کن ذریعوں سے حاصل ہوئیں۔

انھوں نے جواب دیا کہ جناب یہ نہ پوچھیے۔ یہ بوق محض درشہ میں ملا ہے۔“ حقیقت یہ ہے

۔ زور صاحب کا بھی ذوق ان کے سارے افسانوں کو حقیقت سے قریب کر دیتا ہے ایسا معلوم ہوتا

ہے جب ان افسانوں کے تاریخی یا غیر تاریخی ہونے کی بحث چلی ہے تب زور صاحب نے گوگلکندے

کی ہیرے کے دباج میں ان کی وضاحت کی ہے اور ان کو افسانہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :-

”گوگلکندے ان نظم تاریخی افسانوں کا مواد قدم پائتوں، یورپی سیاحوں کے سفرناموں اور

بازداشتوں اور گوگلکندہ اور سچا پور میں لکھی ہوئی دینی کتابوں کے علاوہ ان روایات سے بھی حاصل

کیا گیا ہے جو اس ملک کے عہد حاضر کے باشندوں کے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آرہی ہیں۔ ان تلامذہ

سے ”مستفید ہونے کے بعد مصنف نے اپنے تجمل کے مدد سے ان افسانوں کو قلم بند کیا ہے۔ اس کی

مسل خواہش بھی ہے کہ اس طرح دکن کی زندگی بے خراب ہو جائے اور اگر ان افسانوں کا مطالبہ

رہنے والوں کے لیے دل چسپی کے سامان پیدا ہو جائے تو مصنف کی اس سے بڑھ کر کامیابی

کو کوئی پیش نہیں ہو سکتی۔“

زور صاحب کی افانہ نگاری کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ انھوں نے دکن کی قدیم زندگی کو اپنے افسانوں میں اس طرح بے نقاب کر دیا ہے کہ وہ اس زندگی سے دل چسپی ان کی توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر آج پوری ہندوستان میں عام ہو چکی ہے۔

زور صاحب کے افسانوں کے سلسلے میں جن کی نوعیت تاریخی ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری

ہے کہ تاریخی واقعات یا شخصیات اس وقت تک واقعی اور حقیقی نظر نہیں آتیں جب تک کہ اس

سے منظر کی باز تعمیر نہ کی جائے جس میں کہ وہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ تاریخی واقعات اور شخصیات

اپنے حقیقی پس منظر ہی میں زندگی سے معمور ہو جاتے ہیں۔ زور صاحب کے ان تاریخی افسانوں کی سب سے

بڑی خوبی اور ان کی افانہ نگاری کا کمال اس میں بھی نظر آتا ہے کہ انھوں نے دکن کی فہم تہذیب اور

زندگی کی چلتی پھرتی بولتی چالنی تصویریں پیش کی ہیں یہاں مثالیں دے کر اس مضمون کو طویل کرنا غیر ضروری

ہو گا۔ آپ ان کی کسی بھی تاریخی افسانے کو پڑھ جائیے۔ محکم کی وقائد ہو۔ مکتبہ مسجد ملک خوشنود ہو یا انار کے

چودہ کاندی برج ہو۔ انیس ادا اودھ کوئی بھی افسانہ ہو انھوں نے مطلب شاہی دور کے ماحول کی بازیا

اس طرح سے کی ہے کہ وہ یورما حوالہ حقیقی زندگی سے سرشار نظر آتا ہے۔ اس دور کی پوری سماجی اور تہذیبی

زندگی ہمارے سامنے نمودار ہوتی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحی نے سیر گوگلکندے کے بارے میں بڑی

(باقی صفحہ پر دیکھیے)

غیاث الدین

ڈاکٹر زور کا دکن سے عشق

ڈاکٹر سید محمد الدین قادری زور دکن سے —
 اس طرح پیار کرتے تھے جس طرح کچھ اپنی محبوبہ سے
 کہتا ہے - WITH ALL THY FAULTS I
 LOVE THE STILL -
 تھیں تمام کمزوریوں کے
 باوجود میں تجھ سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ اسی کو عشق
 کہتے ہیں۔ عجب شاعر گل پر پھول بھی میرا غزا بھی میرے۔
 جب اردو زبان علم و فن کے چٹخاروں سے واقف ہوئی
 عوام کے ذہنوں اور دلوں پر حکمرانی کی لہر سے نا آشنا
 صنی تو دتی اور لکھنؤ کے اردو داں اہل زبان کہلاتے
 تھے۔ اس میں کیا شک ہے کہ انھوں نے ادب کے
 بڑے ان میں اپنے جوہر دکھائے اور خوب دکھائے۔
 لیکن کسی عظیم زبان کی منزل، داستان، تمثیل، ناول
 افسانہ، کہانی، مثنوی، قصیدہ، وحید اور نظم و نثر
 کے ادبی سرمائے تک ہی محدود نہیں رہتی۔ اور اگر
 ایسا ہو تو وہ زبان عظیم زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔
 جس طرح حیات و کائنات کی وسعت متناہی ہے کہ
 ہزاروں علوم و فنون کی آنکھوں سے دیکھا جائے
 ان گنت انگلیوں سے چھو کر اسے محسوس کیا جائے۔
 لاتعداد احساسات و جذبات اسے سمجھنے کی کوشش
 کریں بیشش جہت سے اس پر روشنی کے جھماکے

نوٹے پڑیں اور ان کے ہر پہلو کا عکس ایک نئے تجسس کا
 متقاضی ہو۔ بالکل اسی طرح ایک عظیم زبان ادبی مصما
 سے نکل کر مختلف علوم و فنون کو اپنی آغوش میں لے لیتی
 ہے اور وہ ایک عظیم ادبی زبان کہائی جاتی ہے۔
 تخلیق ادب کے گلشن میں اگر دتی اور لکھنؤ کے
 محسنوں نے رنگ رنگ کے چھوٹے گلے سے
 اردو کے دامن میں اردو دکن سے بھی علوم و فنون
 کے خزانے بھر دیے۔ چاند مٹھانیہ نے الجھوٹ
 اردو کو گاشن ادب کے عداوہ تاریخ، سائنس
 فلسفہ، معاشیات، سیاسیات اور علم ارتقا
 وغیرہ کے گاشنوں کی بھی سیر کروائی ہے۔
 فن ترجمہ کے حکمرانوں نے کئی عظیم
 زبانوں کے خزانے اردو زبان کو عطا
 کر کے اسے عالمی سطح پر ایک علمی زبان بنادیا
 اب وہ گل و بلبل اور حسن و عشق کی واڈ
 طے کر کے، ہمالہ کی چوٹی پر کھڑی ہے اور دنیا
 کی کسی بھی عظیم زبان سے آنکھیں ملانے کے
 قابل ہے اور اہل دکن کو اس کا رنا ہے پر
 فخر ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ کیا اور اب
 بھی کر رہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ نے کئی نامور

نظر آس پاس سے آگے نہیں بڑھتی۔
 ”من تر حاجی بکھر، توہ احاجی بگو“ کی آنکھیں کبھی
 دکن پر نہیں اٹھیں اور کبھی ایک نگاہ غلط انداز دلی
 بھی تو ستوا احسانات جتائے۔ ڈاکٹر زور نے اس طلسم
 کو توڑا۔ ادارہ ادبیات اردو کے لیے قابل شخصیتوں
 کا انتخاب کیا۔ ایوان اردو تعمیر کر کے اُس میں دکن
 کے اہل علم و دانش کو اُن کے اعزاز کے مطابق تخت
 و تاج عطا کیے اور دکن کی زبان کو سیرِ ذہن و قلب
 کا وہ جادو عطا کیا جو آج عظیم بھارت کے ہر شعبہ جیات
 میں سرِ موڑ کر بول رہا ہے۔ میں اردو کا نہ تحقیق ہوں
 نہ مورخ۔ میں اردو کا ایک طالب علم ہوں۔ میں نے
 ڈاکٹر زور کو قریب سے بھی دیکھا ہے۔ دور سے بھی
 ان کے جاننا زوں کی مغل میں پیچ کر بھی ان کے مخالفین
 کی صفوں میں گھس کر بھی۔ اردو کی داری حق کو پٹی
 دے بان اپنی آنکھیں بھییں۔ وسعت قلب و وسعت
 کے باہم تعصب کے پر۔ وہاں کو اُٹھا دیں تو یہ حقیقت
 نظر آئے گی کہ ڈاکٹر زور دکن کی آبرو بچانے کے لیے
 پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے دکن کی آبرو کو زور
 بچایا بلکہ چار چاند لگا دیے جس کی روشنی سے ساری
 دنیا اے اردو آج منور ہے۔

ڈاکٹر زور اردو کے مورخ بھی ہیں، محقق
 بھی ہیں، تنقید نگار بھی ہیں۔ ادیب بھی ہیں۔ ستار
 بھی اور دکن کے قابل وزندوں کے سالار بھی ہیں۔
 اُن کا جسدِ خاکی، کشمیر کی برف میں مدفون ہے لیکن
 ان کی روح کے ہاتھ ایوان اردو میں غیبتِ مظلوظوں
 کی ورق گردانی کرتے ہیں اور اہل علم، اہل زر

ہوت پیدا کیے جن کے نقوش ہانکے میں الاقوامی
 شہرت کے چاند شرماتے ہیں۔ لیکن یہاں ماہرِ جامعہ
 کے ان سارے فرزندوں کے نام نہیں گنواؤں گا جن
 کی پیشانیوں کو بین الاقوامی شہرت مل چکی اور ان کے
 سر پر تفصیلتِ علم کے تاج رکھے بلکہ ایک ایسے عاشق
 کا نام پیش کروں گا جو محبوبہ دکن کی ہر اوپر مہم
 کیا شاعری کیا نثر، دکن کی تاریخ و تہذیب کے ہر پہلو
 کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور بعدِ انخار میں کیا جھجک
 شرم، مذمت اور احساسِ کمتری کے سپاہیوں نے
 ڈھالیں تلواریں پھینک کر گمنامی کے غاروں میں
 اپنے منہ چھپا لیے اور اہل زبان کے گھسے پٹے
 چند مہینوں میں رہ گئے۔ اس نئی سلطنت کا پتہ
 ڈاکٹر زور تھا جس نے اہل دکن کو نئی زبان دکھانی
 غم و مہمت کے اسب و شتر و قیل و عیل کیے، تحقیق
 و تنقید کی چھیمیاں دیں، ہمیشہ بخشش، فوجوانوں کے
 بازوؤں کو ہر پردہ ازل کا رمنال کی رہیں دکھائیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ اگر
 غالب نہ ہوتے تو اقبال پیدا نہ ہوتے۔ میں کہتا ہوں
 کہ اگر ڈاکٹر زور نہ ہوتے تو اہل دکن اپنے سینوں میں
 تمام علوم و فنون کو چھپا لے دکن ہی کی مٹی میں دفن
 ہو جاتا۔ کم نخت دکن کی مٹی ہی ایسی ہے۔ کم سخن
 شہر ہے۔ اُوروں کی طرح اشتہار بازی آتی ہے نہ
 باتوں کے طوطا مینا بنا آتا ہے۔ دوسری ہدایتوں
 میں تو ایک معتدی فن کار کو بھی اس کے ساتھی سڑن
 پر بٹھائے پھرتے ہیں۔ باہمی تو میسٹ و تفوق کے
 شعار سے بچاتے ہیں۔ تحقیق و تنقید میں اُن کی

حفاظت سلا بعد سلا کی جائے گی یہ جان کر مجھے کس قدر سرت ہوتی ہے میں کیا بناؤں کچھ اور دن جی لیتا تو ادارے کے مایہ کو مستحکم بنا دیتا۔ اپنے ساتھیوں سے معذرت خواہ ہوں کہ میں خاطر خواہ ان کی خدمت نہ کر سکا لیکن مجھے امید ہے کہ دکن کے جیلے میری مانت کی حفاظت کریں گے۔

ہاں، ہاں، زور صاحب، ہم اہل دکن بیدار ہو چکے ہیں۔ ہم نے اپنیوں کی قدر کرنا سیکھ لیا ہے دیکھئے نا آپ نے جتن اچھا منایا تھا بڑی دھیم سے ہم نے بھی جتن محذورم منایا ہے اور آج اہل زبان مندوم اور اڑی صل کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ زور صاحب، ہم وعدہ کرتے ہیں، انشاء اللہ دکن پر تحقیق کرنے والوں کو ہر سال زوردار اور طبی دیا کریں گے۔

(یوم زور منعقدہ ۳ اکتوبر ۱۹۸۲ء کے موقع پر پڑھا گیا)
صلی علیہ وسلم آئے۔

جی نکمیں کے ساتھ زور صاحب کے افانوں کی اس خوبی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

”یہ بہت دل چسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمجھا ہے کہ طلب شاہی دور کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی نایگوں کو پڑھنے سے وہ مصطلحات حاصل نہیں یہ تفریح اور اس جھوٹی ہر کتاب میں اس اور نہ وہ لطف و کیفیت ہے۔“

کو مخالب کرتے ہیں کہ دیکھو کیسی کیسی نایاب قلمی کتاب میں میں نے جمع کیا ہیں اگر تم اپنے تئیں میں سے کچھ روئے بنا سکا تو ان انمول کتابوں کی جلد بندی ہو سکتی ہے ان کی آنکھیں ایوان اردو کے میوزیم میں نایاب اشیاء کے گرد گھومتی ہیں۔ رذاب عزایت جنگ ببادرت کہتی ہیں کہ آپ کو تو اس وقت ایوان اردو کے میوزیم میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ آپ میرے ہاں کیوں چلے آئے۔ آپ کے عطا کردہ اور دیگر مجبان، کن کے عطا کردہ واد رکھاؤں کی تعلیموں میں بانٹ ڈیوں میں پڑے ہیں آپ وہاں ہوتے تو کم از کم ان نوادر کے لیے خوب مصور شوکیس ڈاٹم کرتے۔ ان کے ہونٹ ایوان اردو میں اپنے ساتھ کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ معمبلی معاوضوں پر تم لوگ مجھ سے کہے ہوئے عہد و پیمان کو اب تک نباہ رہے ہو۔ ادارے اور ایوان کی خدمت کر رہے ہو۔ کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ کیا کروں میں شہر کی برف میں بے بس پڑا ہوں۔ مرتے مرتے بھڑا۔ چک میں نے تم لوگوں کے لیے بھیجا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اہل دکن کے جیلے نہ صرف میرے خزانوں کی حفاظت کریں گے بلکہ ان میں اضافہ لینے رہیں گے میرا جلد خاکی شہر میں ہے لیکن میری روح یہاں سے روزناموں، ہفتہ واروں، ماہ ناموں میں دکن کے اہل قلم و جوانوں کے کارناموں کو تلاش کرتی رہتی

میں جو ان شہر شہر میں لکھ رہا ہوں اس کے لیے

میں اس کے لیے لکھ رہا ہوں اس کے لیے

پڑھا جا رہا ہو۔ وہ فروا اپنے میں الجھن لگے۔ اپنے آپ میں اُس کی قوتِ جذبہ اتنی شدید ہو کہ اُس کے دائرہ اثر میں آنے والی ہر شے خود بھی جذب دکھائی دینے لگے۔ وہ روایت کے احترام تلے اُن ذہنوں کی تربیت کرے جو ابھی منزلِ سفر میں ہوں۔ وہ ایک شمع کے مانند لگے جو خود جلتی رہے لیکن اندھیرے راستوں کے راہی کو روشنی عطا کرے۔ اُس کے عزت، دولت اور حکومت کے پرکشش مقام ہوں لیکن وہ انہیں ٹھکرا کر آگے بڑھ جائے تو میں ایسے انسان کو عظیم بھی کہوں گا اور غیر فانی بھی۔ میرے ذہن میں ایسے افسانوں کی جو فہرست مرتب ہے ان میں کایا اُڈا کر سید علی الدین قادری زور ہے۔ زور صاحب پر بہت کچھ لکھا جا چکا۔ عطیہ رحمانی کے مقالے کا عنوان ہے ڈاکٹر زور شخصیت اور کلرنامے مقالہ زیور طباحت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سارے مضامین میں سے چند ایک یہ ہیں ڈاکٹر زور مرحوم۔ ڈاکٹر ایس۔ آر کلرنی، تاریخ اردو میں ڈاکٹر زور کی شخصیت کا قیاس۔ ضیاء الدین شکیب سید علی الدین قادری زور کی اہم شخصیت، ڈاکٹر زور معظم ڈاکٹر زور اردو کے عظیم خدمت گزار۔ پنڈت دشی دھروویا لنگار، ڈاکٹر زور۔ ڈاکٹر عمر خاں، ڈاکٹر زور سے یادگار ملاقات، شیخ محمد۔ ڈاکٹر زور میری نظر میں، غلام جیلانی ڈاکٹر زور کے ادبی خدمات، نسیم صلاح۔ لیکن آپ آپ یقین جانیے ڈاکٹر زور پر اتنا ہی اور لکھا جاسکتا ہے اور لکھا جائے گا۔ مجھے اپنے مضمون میں ان تذکروں کو نہیں دہرانا ہے جو لکھے جا چکے۔ میں انہیں آپ کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے صرف گنتا چلا جاؤں گا

زور صاحب کے ابتدائی دو نیم تاریخی افسانے طہیم تھا اور فائدہ تازیانہ تھے۔ طہیم تقدیر ۱۹۱۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ بی۔ اے کی تعلیم کے دوران زور صاحب کی وہ تصنیف شائع ہوئی جس نے زور کو دنیا کے ادب میں متعارف کروایا۔ راج تنقید کا بعد طہیم شمس، نیاز فتح پوری، پروفیسر محمود شیرانی، مرزا اس محمود اور عظمت اللہ خاں نے سراہا۔ اگر زور صاحب اپنی زندگی میں کچھ نہ لکھتے بھی تو اُن کی عظمت کے لیے اتنا کافی تھا کہ بی۔ اے کے ایک طالب علم نے اردو کے اُس دور کے صاحبانِ نگار کو اپنی کتاب پر رائے زنی کرنے پر مائل کیا۔

مجلد عثمانیہ کے پہلے مدیر کی حیثیت سے زور نے عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو ادب کی لائبریری خدمات کا سنگِ بنیاد رکھا۔

پھر زور صاحب کی تین کتابیں ”تنقیدی مقالے“ محمود غزنوی کی بزمِ ادب اور تین شاعر کے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک زور صاحب یورپ میں رہے اور ہندوستانی صوتیات پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یورپ سے واپس ہوتے ہی ”اردو شہ پارے“ شائع کی۔ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر زور نے ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالی ان تصانیف کے علاوہ ۱۹۴۹ء تک ڈاکٹر صاحب کی حسبِ ذیل کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں (۱) قصصِ خوب ترنگ (۲) عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی (۳) گلزارِ ابراہیم (۴) جو اس شخص (۵) فیاض آباد (۶)

۱، مرتق سخن (۷)، متاع سخن (۸)، کیف سخن (۹)، بادہ سخن (۱۰)، سیر کوکندہ (۱۱)، فیض سخن (۱۲)، محرم نامہ (۱۳)، روح غالب (۱۴)، سرگزشت مالب (۱۵)، مکتوبات شاہ عظیم آبادی (۱۶)، اردو بے اسالیب بیان (۱۷)، سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۸)، کلیات محمد قلی قطب شاہ (۱۹)، گارسان دماسی (۲۰)، تاریخ ادب اردو (۲۱)، میر محمد مومن۔

زور صاحب کی زندگی کا یہ ایک رُخ ہے، دوسرے رُخ پر زور صاحب کی تنظیمی اور عملی کاوشوں، اتنی ہی ایک طویل فہرست ہے۔ جس میں مہر فہرست دارہ ادبیات اردو اور ایوان اردو کی تعمیر و ترقی، تاریخ لکھی ہے۔

کسی بھی فرد کو ذہن انسانی میں زندہ رہنے کے لیے اتنا کچھ کافی ہے لیکن مجھے زور صاحب کے عمل سے نہیں روح عمل سے دل چسپی ہے۔ عمل میں و منت صرف ہوا ہے جب محرابِ محنت مند ہو۔ یہ اردو ادب کے صاحب نظر نقادوں کا وطیرہ رہا ہے کہ وہ جب کسی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی نظریں غلو کا سینہ چاک کر کے اُن جذباتوں تک نہیں پہنچتیں جو فن کار کی روح سے عبارت ہوتے ہیں فن جب شخصیت سے جدا ہو تو فن کار غیر فنان ہو جاتا ہے۔ فن کو شخصیت ماننے کے لیے فن کار کو بہن راستوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ طوفانوں کی زد پر اور آندھیلوں کی گزرگاہوں کے طے ہوتے ہیں تجربوں کی تیز دھوپ سے جلتے اور بیکراؤ گودی سے ہوتے ہوئے جلتے ہیں۔ ان راستوں پر گامزن ہونا ہونا ہونا ہونا ہے۔ اس کی فکر ریزہ ریزہ

بھرتی ہے۔ ٹوٹتے ہوئے لمحوں کا کرب اس کی قسمت بن جاتا ہے۔ اور پھر شخصیت فن کا پسیر دھار لیتی ہے پھر اس کی آواز دقت کی سنگلاخ دیوار کا سرینہ چیرنی ہوئی ان ذہنوں کو جسے بیدار کرتی ہے جن کی صحت جمود سے عبارت ہوتی ہے اسی لیے کسی عظیم شخصیت کا جائزہ اس کی تخلیقات کی گنتی سے نہیں لگایا جانا چاہیے بلکہ اس محک کو تلاش کیا جانا چاہیے جو اس کی تخلیقات کے سائے میں کار فرما رہا۔ زور صاحب دو ایک خصوصیات میں مجھے منفرد نظر آتے ہیں۔ اُن کے عمل کے نئے محک عمل ان کا، کن کی تاریخ تہذیب اور زبان سے بے پناہ نمونہ تھا۔ غم انہی دن کی تہذیب کو جلا دی دکنی تہذیب کے خطوط کو اجاگر کیا اور دکن کے صاحبانِ قلم کو سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنایا۔ اردو ادب کی تاریخ کو اُن کا تصنیف نے ایک صدی عطا کی اور اس کے دامن میں ان صاحبانِ کمال کی فکری کاوشوں کو جگہ دوائی بنجیس زمانہ نے ناقدری اور لاعلمی کی خاک تلے دفن کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ تہا زور صاحب اگر کر کے گزر جاتے تو وہ انفرادیت انھیں نہ ملتی جسے آج ان کا اثر کہہ رہا ہوں۔ انھوں نے اپنے اطراف صاحبانِ فکر و نظر کا ایک حلقہ بنایا۔ اس انجمن میں شامل کرنے کے لیے انھوں نے صاحبانِ فکر کو یوں چٹا بیسے کوئی جوہر ہی پتھروں کے انبار سے جواہر الگ کرتا ہے۔ ان غیر تراشیدہ ہیروں کو انھوں نے کاٹا چھانٹا اور یوں جلا دی کہ وہ دکن سے پکنے لگے۔ زور صاحب کا یہ کارنامہ ان کی لافانی زندگی ہی وجہ بنا۔ وہ اردو ادب ہو کہ ہندوستانی تاریخ آج کے نئے تقوٰی کے لیے دین غمان

سیر گوگنڈہ وغیرہ زور صاحب کو تاریخ دانوں کے درمیان اونچی مقام دلانے کے لیے کافی تھی۔
مزید سرایہ ہے۔

زور صاحب ادارہ ادبیات کے بانی ایوان اردو کے معمار اور سب دس کے نگران تھے۔ یہ تو آپ سب نے بار بار پڑھا اور سنا ہو گا۔ لیکن یہ تینوں عنوان ہیں ان کے لیے جنہیں حالات کے پس منظر میں حرکات کا جائزہ لینے کا چکا ہے۔ یہ سارے کام اُس دور میں ہوئے جب اردو کی تاریخ کا رُخ روایت پسندی سے انحراف پسندی کی طرف تھا۔ کبھی شخصیتیں تحریک سے بنتی ہیں اور اردو کے سہارے پروان چڑھتی ہیں اور کبھی شخصیتیں تحریک بناتی اور اردو کو جنم دیتی ہیں۔ پہلا راستہ وہ اپناتے ہیں جنہیں اپنی فکر اور اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی تحریک سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور کسی ادارے کو سہارا بنا کر سماج میں اپنے نئے مقام بنانے پر کوشاں رہتے ہیں۔ جس دور میں زور صاحب کا قلم قلماس پر رواں دواں تھا اس دور میں یہ راستہ کھلا ہوا بھی تھا اور آسان بھی اگر زور صاحب نے اُسے اپنایا ہوتا تو وہ اُس دور میں شاید اُجاگر ہو جاتے انہیں شاید مرتبہ بھی ملتا، دولت بھی اور عزت بھی لیکن وہ فن کار تھے انہیں راہ رو نہیں رہی ہونا تھا۔ انہوں نے یہ عام راستہ ترک کیا۔ اپنی راہ بنائی اور اس پر چل نکلے لیکن یہ بغاوت تھی اس لیے ان کا راستہ وہ کا گیا انہیں رجعت پسند سمجھا گیا۔ طنز کے تیر چلنے گئے لیکن زور صاحب نے (بقیہ صفحہ پر دیکھئے)

ہے جس پر کام کیا جا سکتا ہے۔ کام کیا گیا اور انہیں ہم دکن والوں نے فخر کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جن کی نظروں کے حدود وندھیا کی چٹانوں اور نربد کے دھاروں سے آگے بڑھ نہیں پاتے تھے۔ جن کی نظر میں ہندوستان کے دور وسطیٰ کی تاریخ مغلوں سے آگے نہیں تھی۔ قطب شامیوں کو جب زور صاحب اور ان کے رفیقوں نے ماضی کے اندھیروں سے حال کی روشنی تک پہنچایا تو ان تاریخ دانوں نے آنکھیں مل مل کر انہیں دیکھا۔ وہ بے اساس نظریہ جس کے تحت دلی کی زبان اور دکنی نثر کو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ تاریخ کے برق کی طرح سطح مرتفع دکن کی سنگلاخ زمینوں پر گر کر ٹوٹ گئے۔ یہ زور صاحب کا کارنامہ تھا۔ جس سے انہیں کہوں گا بلکہ ہے جسے دکن کا کوئی بھی انصاف داغ فراموش نہیں کر سکتا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کیوں اب تک کسی نے زور صاحب کی دکنی تاریخ کے لیے خطاب پر قلم نہیں اٹھایا۔ میں نے زور صاحب کی بہت ساری تخلیقات ایک تاریخ دان کی حیثیت سے پڑھی ہیں بلکہ ان میں سے کثرت سے حوالے دیئے ہیں۔ میں یہ بات بڑے بھروسہ سے کہوں گا کہ زور صاحب ادب اور تاریخ کے سنگم کا نام تھا۔ انہوں نے داغ ایک تاریخ دان کا پایا تھا جس نے اردو ادب کو اپنایا۔ ان کے پہلے دواخانہ جو نیم تاریخی ہیں میری بات کا جواز ہیں پھر ان کی اکثر تصنیفات میں ادب اور تاریخ کا باہمی ربط نمایاں ہے۔ کلیات محمد علی قطب شاہ میں علی قطب کے حالات زندگی، محمد علی قطب شاہ کی تاریخ، میر مومن

(احمد علی خاں ادیب)

ہرگز نہ میر داں کہ دلشن زندہ شد بہ عشق

سُن کے مجھے پھر بے نعلِ مرام لوٹا پڑا اور لوٹتے
میں بے ساختہ زبان پر آیا۔
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کوں!
جوں توں کر کے ایک بیمنہ اور کاٹا امداب کی دفعہ
دل میں یہ ٹھان کے گیا کہ مطلوبہ مقدمہ دستِ باب نہ
ہو تو اپنا مسودہ واپس لے لوں گا پھر بھی ہنور روزِ ازل
والا معاملہ پیش آیا اور میں نے یہ سبب بتا کے مسودہ
لے لیا کہ اُس کی کتابت کروا دیجئے، چنانچہ کچھ ہی
دنوں میں کتابت مع تصحیح مکمل ہو گئی۔ اب جو متبادل
صورت درپیش ہوئی تو ایک دن سید صاحبِ دارالعلوم
پہنچا جس کے پرنسپل ان دنوں ڈاکٹر غلام محی الدین
زور تھے اور میر سے ہم جماعت دوست خواجہ
حمید الدین شاہ اردو کے کچھ اہل حق تھے۔ میں نے شاہ
صاحب کو آغا صاحب کا قلم سنا کے اپنے مستوی
کے کتابت شدہ اوراق دکھائے اور کہا رسالہ فوراً
مجھ سے متعارف نہیں ہیں، اسی صورت میں آیا یہ
ملن ہے کہ میر کا کتاب کے یہ منتشر اوراق انھیں دکھا
کے دو ایک دن میں ان سے اس کا پیشِ غلط گفتگو
کہا اسی وقت وہ منہ پر ہنسی ذرا دیر آپ تسلیم کیجئے

۱۹۷۹ء کا ذکر ہے کہ راقم الحروف نے اپنی تالیف
نقدی نظر سے ”کامسودہ“ پر وائس آغا حیدر سُن کر
خدمت میں اس غرض سے پیش کیا تھا کہ وہ اس پر
بمستطوط مقدمہ تحریر فرمائیں، چونکہ آغا صاحب
بے زبردانہ مراسم برسوں رہے، اس لیے
اس وقت دینا پایا جاتا تھا۔ اس کے ایک ماہ بعد
باب میں اُن سے ملا تو فرمانے لگے ”میں نے آپ کے
قلم پر سرخ پنس سے نشان لگادیا ہے کہ مجھے
کاڈیا بچہ لکھنا ہے، مگر ابھی تک اُسے چھو ابھی
ماڈر اکیچر اور مہلت دیجئے“ ہنسنے دیڑھ بیٹھنے
۲۰۰۰ عرصہ گزار کے ایک دن صبح سویرے میں پھر
صاحب کے دولت کدے پر پہنچا اور ان سے
حسبِ عادت دو گھنٹے تک ان کی چھتے دار باتیں
اور بھاری دہن کی ہوا کھاتا رہا مگر جس غرض سے
یہ تھا وہ اب کے بھی پوری نہ ہوئی، عندیہ کیا
اس یونیورسٹی سے بی۔ اے کے امتحانِ اردو
بی۔ اے پیال، سوال ہوئی ہیں انھیں کی جانچ
لگا ہوا ہوں، اس کام سے فراغت پانے
انشاء اللہ آپ کا کام کر دوں گا۔ یہ معقولِ عذر

اندرا اور ماہارادھو کی مسلسل خدمت گزاری کی تیز باہست
 رفتار، سالانہ یوم قلی قطب شاہ کے روایات استوار
 غرض یہ سب چیزیں اردو کے ساتھ ان کے والہانہ جذبہ
 ایثار کی یاد تازہ کرتی رہتی ہیں۔

ان کے ہم پیشہ معاصرین میں بابائے اردو مولوی
 عبدالحق کا نام ہمیں سرفہرست نظر آتا ہے جن کا شیوہ تھا
 کہ اندرون و بیرون ہند معیاری اردو کی مسلسل
 توسیع و اشاعت ہوتی رہے اور ڈاکٹر زور کا مطلع نظر
 کر معیاری اردو سے دکنی زبان و ادب کے ڈانڈے
 ملا کے اردو کی شد بد رکھنے والوں کو اردو زبان و
 ادب اور مشرقی ثقافت کی منڈھے چڑھنے والی پیل سے
 روشناس کیا جائے۔ ہم اردو والوں کا یہ فرض عین
 ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی راہ عمل پر گامزن رہ کر
 اپنی منزلیاں مقصود کو جالیں تاکہ کسی وقت بھی ملک میں ایک
 سے زیادہ عبدالحق اور زور پیدا ہوں۔

میں نے زور صاحب کی بعض تصانیف دیکھیں
 ان کی متعدد تقریریں سنیں اور انھیں دو ایک مشاعرے
 بھی پڑھتے سنا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ شعر و شاعری
 کے بالمقابل وہ نثر اور خاص کر تحقیقی نثر نگاری کے
 میدان تھے۔ ان کی تمام عبارتوں میں کہیں کوئی
 نام کو بھی نہیں، ان کی نگارش کا سب سے بڑا
 صف سادہ بیانی ہے جس کے حصول کے لیے ایہوں
 رسوں پاڑے بیلنے پڑتے ہیں۔

ان کے ایک مضمون ”اردو اور قومی یک جہتی“
 اقباس ذیل سے سادگی و تحریر کا اندازہ لگایا جاسکتا
 ہے وہ تحریر فرماتے ہیں وہ اردو کے اس صدیوں کے

روادارانہ انداز ہی میں اس کے آغاز و ارتقا کا راز
 چھپا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کی ابتدا ہی قومی
 یکجہتی کے اساس اور باہمی ہم آہنگی کی ضرورت کا نتیجہ
 تھی۔ اس کی بنیاد ایک ایسے زمانے میں پڑی جب

پورا ہندوستان مختلف ریاستوں اور علاقوں کی شکل
 میں بٹا ہوا تھا، ایک نئی قوم ہندوستان میں داخل ہو کر
 اس سرزمین کو اپنا وطن بنانے لگی تھی اور اپنے ساتھ
 ایران و توران اور عراق و عرب کے تہذیبی اور لسانی
 اثرات بھی لا رہی تھی اس قوم کے افراد پہلے پنجاب
 اور سندھ میں آباد ہوئے پھر بارہویں صدی
 کے آخر میں دہلی اور دہلی کے آس پاس دہلی میں داخل ہوئے اور
 اس کے بعد انھوں نے گنگا و جمن کی زرخیز وادی
 میں اس نئی ہند ایرانی تہذیب کی بنیاد ڈالی جس کا
 عروج امیر خسرو کی شاعری اور تاج محل کی مناسی
 میں دیکھا جاسکتا ہے“ (یوم زور ۸۲ء میں پڑھا گیا)

بقیہ مضامین کے لئے
 ان سب کا مقابلہ کیا جیتیں آئیں زبان کی ہمت اور
 بڑھی طنز کیے گئے تو انھوں نے اپنے قلم کو اور انہی
 ادارہ ادبیات کو انھوں نے ایک سایہ دار درخت بنا دیا
 جس کے تلے وہ صاحبان قلم جمع ہوئے جنھیں حالات کی
 دھوپ نے جھلس دیا تھا آج ہم میں زور صاحب
 نہیں رہے لیکن دکن کی مکرر تازہ وادب کو ان کے
 قلم و عمل نے جو زور بخشا تھا وہ آج بھی قائم ہے۔

وہ مشعل جو انھوں نے جلدی تھی آج بھی ان طلب
 علموں کے راستہ پر روشنی کا چمک رہا ہے جو دکن کی تاریخ
 تہذیب اور ادب پر کام کر رہے ہیں۔

۴ دو تہیاں . دو ترائیلے

(یہ دو تہیاں ایسی ہیں جن کے تین مصرع صرف قافیہ ردیف کے کلمات پر)

(۱)

آفات کے منوں کرم ہیں ہم لوگ
صدات کے منوں کرم ہیں ہم لوگ
دیتے ہوئے وقت کے تقاضوں کلمات
حالات کے منوں کرم ہیں ہم لوگ

(۲)

سااں حیات ہے تو پھر کیا غم ہے
امکان حیات ہے تو پھر کیا غم ہے
کرتے رہو واردات کا گردِ عمل
عرقان حیات ہے تو پھر کیا غم ہے

(۳)

عقدہ کی منزل بھی عجب منزل ہے
ایشاہ کی منزل بھی عجب منزل ہے
انسان کی شخصیت ابھرتی ہے یہاں
کردار کی منزل بھی عجب منزل ہے

(۴)

مغرد کی زندگی بھی اک آفت ہے
مجمود کی زندگی بھی اک آفت ہے
کرنا پڑتا ہے اس کو مرتے ہوئے کام
مزدود کی زندگی بھی اک آفت ہے

▲▲

①

تہذیب پیش و پس میں ابھرتے رہے مگر
ساحلوں کے زیر و بم بھی سنبھالے نہیں گئے
اقدار کے چسراغ بھی بجھتے رہے مگر
تہذیب پیش و پس میں ابھرتے رہے مگر
آنکھوں میں ریگزار سے چمکتے رہے مگر
جذاب بے حجاب بھی مالے نہیں گئے
تہذیب پیش و پس میں ابھرتے رہے مگر
ساحلوں کے زیر و بم بھی سنبھالے نہیں گئے

②

گہری بصیرتوں سے ہوا وضع فلسفہ
فکرِ صحیح مورد الزام کیوں ہوئی
اسرارِ ہست و بود شعورِ فنا بقا
گہری بصیرتوں سے ہوا وضع فلسفہ
سب پر محیط اب بھی ہے سوچوں کا دائرہ
لیکن تلاشِ رادِ مفرغام کیوں ہوئی
گہری بصیرتوں سے ہوا وضع فلسفہ
فکرِ صحیح مورد الزام کیوں ہوئی

▲

وفا براہی

وہ مقاماتِ این و ان سمجھیں
جو مکاں کو بھی لامکاں سمجھیں
آپ اپنے کو ہسراں سمجھیں
نورِ نہکت کی پھر زباں سمجھیں
فاروس کو اگر سمجھنا ہے
غیہ و گل کی داستاں سمجھیں
ہے نگاہوں کے سامنے منزل
لذتِ کرب درمیاں سمجھیں
بے خبر ہیں صفاتِ آدم سے
آدمی کو جو ناتواں سمجھیں
ہے جینِ خلوص کیوں مجروح
واقفِ سنگِ آستان سمجھیں
نہ نظائرِ خموش رہتے ہیں
لُجنتوں کی بھی کچھ زباں سمجھیں
غل رہے ہیں جو آتشِ گل سے
بیابانیں برقِ گلِ فشاں سمجھیں
س میں کچھ بھی نظر نہیں آئے
س تقوید کو راہِ ایگاں سمجھیں
غلِ سبزہ لے جو رستے میں
بول اُسے میر کارواں سمجھیں

اے وفا جنسِ معتبر کب ہیں
نئے گل کو جو فشاں سمجھیں
۵۵

خدا را نہ پوچھو مری بُود و باش
نہاں اس میں ہے قصہ دلخراش
کرے کس طرح اپنی وہ جستجو
جسے ہر نفس ہو کسی کی تلاش
ستائیں کسی کو مگر اس طرح
نہ چوٹ آئے دل پر نہ کوئی خراش
زمین کی کشش کے جو قائل نہ تھے
گرے وہ فلک سے ہوئے پاش پاش
جسے دیکھنے کی نہیں مجھ میں تاب
ہے چشمِ تمنا کو اس کی تلاش
بڑھا میرا سایہ تو آیا نظیر
کہ جیسے اٹھائے ہے وہ میری تلاش
وہ بیٹھے ہوئے ہیں مرے سامنے
مگر پھر بھی دل کو ہے ان کی تلاش
ہوی دید سے دل کی رفتار تیسر
میں ہر چیز ہم اے وفا کی تلاش
۵۵

آیا جو لب پہ نام خزاں دیدہ فار کا
چہرہ ہوا اداس عروسِ ہسار کا
اب آدمی کو آدمی آئے گا کیا نظر
قبضہ ہے چہرہ ماہِ یہ ظلمتِ شعار کا
جو بارگاہِ فکر و نظر میں ہیں بے نصیب
لینا پڑے گا درسِ انہیں نورِ نار کا
جن کی نظر میں کفر تھا اظہارِ آرزو
وہ نام لے رہے ہیں اسی سوگوار کا
وہ آتشِ نفاق کو دینے لگے ہوا
رونا جو رو رہے تھے غریبِ الدیار کا
دشت نے چاک چاک گریباں کیا مگر
دینا پڑا حساب مجھے تار تار کا
جو مقصدِ حیات سے واقف نہیں وفا
مطلب وہ خاک سمجھیں گے تحریر کا

۵۵

صابر فخر الدین

فرحت قادری

نظمیں



مٹی کے گھر وندے
بازاروں میں برائے فروخت رکھے ہیں
ان کو ہمارے جاؤں گا
میں،
گھر نہیں بنا سکتا



سیاہ بورڈ پر
تحریریں
نمایاں
ہوتی ہیں



سُورج کچے پکے
مکانوں سے گزر کر
اونچی اونچی کوٹھیل تک
آگیا تو،
زرد ہو گیا تھا..

۰۰

کوئی پیش، کوئی خلش، شہر و فابکچہ بھی تو ہو
کوئی ستم، دردِ کرم، غم کا سلا کچھ بھی تو ہو
اب جسم غم نا آشنا مانگے ہے زخم بے بسا
لحوں کی زہریلی جوا، گردِ بلا کچھ بھی تو ہو
ایسی بھیاں کب خامشی کب مٹی تھا اے شہر میں
میتے لیے شہر انا، سنگِ صدا کچھ بھی تو ہو
برگِ شکستہ کی طرح احساسِ آری ہے دل
کوئی ہوا شکنم صفت، شعلہ نما کچھ بھی تو ہو
طوفانِ اٹھے رستے کتنے خیمے تعلق کے ٹریں
تنہائیوں کے دشت میں ہنگامہ زاکچھ بھی تو ہو
سُحی میں ہو کوہِ گراں، بالو پہ بھی قابو چلے !
پانی سے بھی اٹھے دُھواں، بدنہا کچھ بھی تو ہو
لب بند ہوں، پرزیت کے آئینہ تو ملتے رہیں
دل کے دھڑکنے کی صدا، آوازِ پا کچھ بھی تو ہو
دیوانگی کا شور ہوتا روں بھری ہرات میں
گھر کی کھلے، پتھر چلے، میرے خدا کچھ بھی تو ہو

۰۰

ن جرم کی آخری سزا کاٹ رہے ہیں
انہوں سے ہما پناہی گلا کٹ رہے ہیں
رنگ تراشی سے کہ آواز تراشی
روز ہم اک کوہِ ندا کاٹ رہے ہیں
م کاغیتِ شہر انداز نہیں ہے !
شام و سحر فصلِ انا کاٹ رہے ہیں
بد کوئی سورج ہے نہاں نگر و نظریں
نم کو بھی ہم شعلہ نما کاٹ رہے ہیں
دم ہے پرواز کا انجام، مگر ہم...
سوچ کے اند کی ہی ہوا کاٹ رہے ہیں
خوف کے عقیقہ توں کج کر کے جان دوں
پیرے گھر کا سدا کاٹ رہے ہیں
تیرے دشمن ہیں ٹھٹھرتے ہو کھٹا
ملکی دل کی بنا کاٹ رہے ہیں

۰۰

امام شہدائے غفر

قاضی انصاری

ذکی طارق



کتنا ہی غل چمے کہ ٹھہر جائیے جناب
چپ چاپ اس گلی سے گزر جائیے جناب
کاغذ کے منکھ راہ میں جلنے لگیں اگر
اشکوں کی دایلوں میں اتر جائیے جناب
سنتے ہیں رات بھر کا ہے اس سیکڑے کا وقت
کنے لگے ابھی سے کہ ٹھہر جائیے جناب
لوگوں کے سامنے نہ بتاؤں نشانیاں
یہ جان لیگی ان کی نظر جائیے جناب
ہم سے تو طے بھی شب کی ہلک تکی دوستی
چلنے لگی تبسم سحر جائیے جناب
سہ رکھ کر سو ہی جائیں گے یا زوں کی گودی میں
کر لیں گے ہم بھی رات بسر جائیے جناب



کب تک بھٹکتے زخم لیے ہم ہرے ہرے
ہم تھے جن میں موسم گل سے ڈرے ڈرے
بیمبھی ہوئی تھی صبح میرے انتظار میں
میں سو گیا تھا ہاتھ سر لانے دھڑکے
دل بھی دھڑک رہا ہے کسی آہنار کا
اکھڑوں میں ان کی دیکھ کے آنسو پھر پھر
سگ ہوس کی زد میں ہیں سب اپنے بے لیا
پہرے ہیں تیرے شہر میں ہم بھی ڈرے ڈرے
تینوں چہنچہ ہیں آہ نال غزال دشت
آہٹ کے سلسلوں میں جنگل بھر بھرے
موج خرام ناز کا نعت ہو اتمام
کتنا ہمارے گیارہ ستم گرا رہے اسے
کیسے چھپائیں شہر ستم کی نساہاں
جسموں کے پیر میں ہیں ہلویت بھر بھرے
خوشبو بھی ساتھ دہی نہیں کھانے دھو
جب تک ہمارے ساتھ وفا دہ کرے کرے
دیکھیں قیج کیا ہو ہواؤں کی جناب کا
پتے کو کر لے ہے ہیں بزدلے ڈرے ڈرے
شہر سخن کے واسطے ضرب کلیم تھی
اشعار جب بھی میں سنتے تھے کہ بے
کیوں زندگی کے ساتھ وہاں تک نے جس کو
غم اور خوشی جہاں یہ چلے ہیں درے درے

میں نے دیکھا ایک سپنا بار بار
ایک ریگستان ہوں پتتا ہوا
کنا کہیں نازہ ہوئی ہے واردات
بچ کر کوئی پرندہ پھر اڑا
دسموں میں بڑھ رہی ہے دوستی
آج بھی زندہ ہے بغض معاویہ
جاد تو دن میں نظر آتا نہیں
نوریت میں تمہیں دیکھا کیا
میں یہ کیا تنقید ہو گی دوستو!
انہیں سکتا پرندہ پرکٹا
سے مظفر تیری صحبت کے طفیل
ہرم نوا انصار بھی لے کر اٹھا
ڈاکٹر مظفر حنفی



گزرے ہیں ایسے دورے ہم بھی نہیں سمجھی
تھام سے دشت دہرے ریگستان پر پرے



مال

ساتھ روپے ماہوار میں گھر کا چلن کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اگر شانتا بھی روز کا ایک آدھ روپیہ کمانہ لاتی تو فاقے کرنے پڑتے۔ رمنیا ایک خانگی دوکان پر ملازم ہے۔ بیس سال کی ایماندارانہ نوکری کے بعد اس کی تنخواہ اب ساتھ تک پہنچی ہے۔ وہ اس کی بیوی، دو بچے اور خود شانتا، پانچ کھانے والے اور ایک کمانے والا۔ گزارا کیسے ہوتا ہے؟ اسی لیے تو شانتا کو یہ محنت کرنی پڑ رہی ہے۔

بھوڑی سیدھی سادی لڑکی ہے۔ پندرہ سال سے بلا کسی کچے شکوے کے گزرتی چلا رہی ہے۔ نہ جانے رمنیا کو ماں کے بارے میں اتنی فکر کیوں ہو چلی ہے۔ شانتا کی نوید انگش ہی سے دکھ بھری زندگی تھی۔ وہ اتنی سکھی کبھی نہ تھی جتنی کہ اب ہے۔ مگر نادان رمنیا سمجھتا ہی نہیں۔ بار بار کہتا ہے: "دھند چھوڑ دو ماں! چھوڑ دو"

چاہو تو یہ ماری عیبت یوں مل سکتی ہے۔ شانتا کا دوسرا لڑکا راما اور ایک اچھے عہدے پر فائز ہے، عین سات آٹھ سو روپے پاتا ہے۔ "ہاں" کہنے کی دیر ہے کہ مذکورہ روپے ماہانہ ضرور بھیجے گا، جس سے رمنیا کی زندگی میں سہولت بہم پہنچ سکتی ہیں۔

سینما کا دوسرا شو بھی چھوٹ گیا۔ دھیرے دھیرے بیکرم ہوئی گئی۔ سینما گھر کے قریب اولی دو۔ بیچنے والے کچھ دیر تک چلاتے رہے۔ ایک آنے میں تین، ایک آنے میں تین اور پھر خاموش ہو گئے۔

شانتا آہستہ سے اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ چولہا جو کبھی کبھار جکھڑتا بھی ہوئی لکڑی اور چولہا لیمبو کر پھواری کے حوالے کر کے ہانڈیاں نوکرے میں لا دینے لگی۔

آج صرف تیس روپے کی بکری ہوئی تھی۔ گیلاتا بھی بچ گیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں، کل اسی میں چنا ملا کر کھٹے چار کی طرح بچا جا سکتا ہے۔ ہاں آجھ اولی بھی بچ گئے تھے۔ ٹھنڈ کے مارے ہو کھگے گئے تھے۔ پردا نہیں بچے چبا چبا کر کھالیں گے۔

پارک کی بڑی گھڑی میں دو بج رہے تھے۔ شام کے پانچ بجے سے ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے شانتا کی کمر کھ اکڑ سی گئی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے نوکر اس پر اٹھالیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

گھر بیٹے کا اتفاقاً روز بروز بڑھ رہا ہے۔ کہتا ہے: "اب بڑھاپے میں بھی یہ عیبت کیوں اٹھاتی ہو ماں؟" بے چارہ رمنیا! اسے کیا معلوم کہ اس کے

رہیں گے۔ یہ دیکھ کر لوگ مجھ پر تھوکیں گے۔ کم از کم اس کا تو خیال کرو ماں! میں بار بار کہتا ہوں کہ تم یہ کام چھوڑ دو۔ جو کچھ میں ملتا ہے اس میں گزارا کر لیں گے، مگر تم مانجی نہیں ہو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو ماں؟ میں اس گھر میں رہوں کہ نہیں؟ ” رمنیا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”بیٹے! شانتا نے بڑی شافی سے کہا ”تم دکھی نہ ہو بیٹے! میرے لیے یہ کیا کوئی شکل کام ہے؟ دن بھر تو میں گھر میں سوٹی پڑی رہتی ہوں گھر کا سارا کام اکیلی ہو کر لیتی ہے پھر میں کیا کروں؟ سبھی بیٹھے کھاتے رہیں تو اتنے بسکھوں کا پیٹ کیسے بھرے گا؟ کہنے کو تو تم بھی بستے ہو مگر ان بڑھنچوں کو دیکھ کر میرا کلیجہ منہ پر کھڑا ہے۔“

رمنیا خاموش رہا، کم سم دھڑ سے دروازہ کھول کر باہر چوترب پر جا بیٹھا۔ شانتا نے سوچا یہ تو روز روز کی جھاک جھک ہے ہی، سوکھا ناکھلیا اور سوکھی۔

رمنیا ضد کا پکا تھا دوسرے روز جب رات گئے شانتا کھ لوتی تو کہیں کہہ ہو رہی ہے۔ کہنے لگی ”ماں جی! یہ لیجے رو پیے، آپ کے بیٹے نے دیے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کہ آپ کے چھوٹے بھائی تقاضا کر رہے ہیں کہ آپ کو ان کے ہاں بھجوائیں۔ آپ علی جانیں اور اگر آپ نہ نکلیں تو پھر وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھیں گے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر روئے لگی۔

شانتا کہہ نہ سکی کہ بے چاری ہو پر بڑا ترس آیا۔ وہ اتنی بھولی بھالی لڑکی ہے کہ ساس کی صلاح

لیکن یہ ہے بڑھنچہ، بھوک سے مر جائے مگر بھائی کا پیسہ چھوٹے کا نہیں۔ صرف اس لیے کہ اس نے بڑے بھائی کی مرضی کے خلاف ایک غیر ذات کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ بارہ کس سے جس بیوی کے ساتھ گھر سناں چلا رہا ہے کیا اُسے بھائی اور ماں کی خاطر آج چھوڑنے کا ہا سنا ہے کہ وہ بھی بڑی اچھی لڑکی ہے۔ گاؤں کے مکھیا کا کہنا ہے کہ ہوا اور میٹا نکستی نارین دکھائی دیتے ہیں۔

پچھن ہی سے رمنیا کو چھوٹے بھائی سے بڑا لگاؤ تھا۔ جب اس کی تنخواہ صرف چالیس روپے تھی، میں روپے بھائی کی پڑ بھائی کے لیے بھیجا کرتا تھا۔ بھائی لکھتا بھی تھا کہ ”آپ تکلیف نہ کریں، میں گزارا کروں گا“ مگر رمنیا سنا نہ تھا۔ آخر کار شادی نے سب کچھ لگاڑ دیا۔ دونوں میں قطع تعلق ہو گیا۔ راما راؤ نے ایک دو مرتبہ مئی آرڈر بھی بھیجے تھے، مگر رمنیا نے اسے چھوٹے سے بھی انکار کر دیا۔ مجبوراً چھوٹے بھائی کو خاموش رہ جانا پڑا۔

رمنیا کے نیچے بڑے ہو چلے ہیں۔ لڑکا کاناچ میں شریک ہونے کی خواہش ظاہر کر رہا ہے۔ لڑکی شادی کے قابل ہو رہی ہے۔ ان سب کے لیے یہ کی ضرورت ہے۔ مگر رمنیا اپنی ضد سے ہٹنے کو بالکل تیار نہیں ہے۔

شانتا گھونچتی تو دیکھا کہ میٹا ہو پر لگا رہا ہے کہ ابھی تک ماں گھونچیں نہیں لوتی۔ جب ماں پر لفظ بڑی تو چلا اٹھا ”ماں! تو رات بھر وہاں سر دی میں مرنی رہے گی اور ہم یہاں گھر میں آرام سے سوتے

کی۔ کہنے لگا۔ "ماں! میں تو سمجھا کہ تم مجھے بھول ہی گئی ہو۔" یہ بھی بالوں میں لگ گئی۔ جیسی، جیجی اور بچوں کے بارے میں کھرچ کھرچ کر بوجھنے لگی۔ اور بولی "ماں جی! کتنا اچھا ہونا آپ بچوں کو بھی ساتھ لائیں۔۔۔۔۔ اور ماں جی! آپ جانتی ہیں؟ ہمارے ہاں آپ کا ایک فوٹو ہے جسے یہ ہر روز پر نام کرتے ہیں۔ شانتا کا دل پیار سے بھر گیا۔ ہو کے سر پر ہاتھ پیرتے ہوئے بولی "بیٹی! میرا بیٹا بڑا ہی بھاگوں ہے تم جیسی سنگھڑی ہوئی ملی ہے۔"

دو دن گزر گئے۔ شانتا کو یہاں کے حالات کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔ بیٹا واقعی بڑا آفسر ہے۔ ایک بڑا سا جنگل، اطراف باغیچہ گھر بھر نوکر جا کر قدم ہلاتے ہی موٹر کار۔۔۔۔۔ غرور سے سر اوجھا ہو گیا۔۔۔۔۔ کمر یکایک ایک کالا سا بادل اس کے چہرے پر چھا گیا، بڑا بیٹا دنیا یاد آ گیا۔ وہ صبح سویرے جیسے بچے اٹھ کر دوکان پر چلا جاتا ہے۔ دوسرے کو بڑی جلدی میں زہر مار کر کے پھر بھاگتا ہے تو رات کے فوجی ہی لڑتا ہے۔ اتنی محنت کے باوجود پورا پیٹ نہیں بھرنا۔ دو فون ٹول کی متفاد تصویریں ایک ساتھ سامنے آتے ہی ماں کا دل غم سے لبریز ہو گیا۔

راما راؤ کے بڑے افسر کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ اس نے رات اپنے گھر پر ڈنر کی دعوت دی۔ کئی لوگ مدعو تھے جن میں عورتیں بھی تھیں۔ ان کے ساتھ میٹھ کر کھانا کھانے کے لیے شانتا راضی نہیں ہوئی۔ سب کے چلے جانے بعد وہ کھانے پر بیٹھی۔

دعوت کے پکوانوں کو دیکھ کر شانتا کی آنکھیں

بہنہ بنایا۔ مام بھی کہ نہیں پاتی۔ پھر اکیلی یہ گھر کیسے نبھائیے؟۔۔۔۔۔ مگر بیٹے کی ضد سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اس لیے اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ کہنے لگی "بیٹی! رو نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ اگر اس کی یہ مدنی ہے تو میں ضرور چلی جاؤں گی۔۔۔۔۔ لیکن ہاں! بچوں کا اور امس کا خیال رکھنا۔"

صبح سویرے ہی شانتا کھر سے نکل پڑی۔

راما راؤ تنگبھدرا پر ایک ٹیم پر ایک انجینئر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ جب شانتا بس سے اتری اور رام راؤ کا نام لیا تو کچھ کھلبلی سی مچی۔ دو پیار لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے فوراً دوڑ کر کہیں سے ایک جیب حاصل کر لی اور شانتا کو اس میں سوار کر دیا۔ ماں کو دیکھتے ہی رام راؤ ہکا بکا رہ گیا۔ ایک منٹ کے لیے تو گونگا سا کھڑا رہا۔ اور پھر بھرائی آواز میں "اودہ ماں! کتنے عرصے کے بعد ملی ہو ماں!" کہتے ہوئے ماں سے لپٹ گیا۔

چھوٹی ہو، سمجھ گئی کہ کون آیا ہے۔ جھٹ سے جھٹ کر ساس کے یہ چھوے۔ شانتا نے ہو کو اٹھا کر نگے لگالیا۔

ہونے فوراً نوکرانی کے ذریعہ گرم پانی کا بند بست کیا اور اپنی ساڑھیوں میں سے ایک سفید ساڑھی نکال کر ساس کے بہنے کو دی۔ بعد میں ماں کو چوکی پر بٹھا کر دونوں نے کھانا کھلایا۔

کم گوراما راؤ جیسے ایک دم دیوانہ ہو گیا ہے بہت بہت بولنے لگا۔ بھائی کی، بھادریج کی اور بچوں کی خیرین پوچھی، اور گاؤں کے ہر شخص کی کیفیت دریافت

چھوٹے بیٹے کو دیکھنے آئی ہوں۔ یہی ہے میرا بیٹا“
راماراؤ کی طرف تخریہ اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

راماراؤ ہکاسہ مارے شرم کے جھکا گیا۔ وہ
ایک مزدور تھا۔ اس کا اپنی ماں سے اس بے تکلفانہ
انداز میں مخاطب ہونا اور ماں کا اس ملنساری سے
جواب دینا راماراؤ کے لیے ذہن سے کم نہ تھا۔ ایسا
محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا سر اڑا دیا ہو۔ غصہ
کی حالت میں وہ جیب میں بیٹھ گیا۔

شناختا کچھ دیر تک کشتا سے باتیں کرتی رہی
اور پھر جا کر جیب میں بیٹھ گئی۔ راماراؤ نے فوراً جیب
اٹارٹ کر لی اور ماں سے ایک بات نہیں کی۔

ماں نے پوچھا کیوں بیٹے خاموش کیوں ہو؟
راماراؤ ماں کی طرف دیکھ کر بڑی بولا ”ماں!
ان چھوٹے آدمیوں کو اس طرح منہ نہیں لگاتے۔“

شناختا کے دل کو... ہلکا سا لگا۔ وہ چند لمحوں
نے لیے کچھ نہیں بول سکی۔ وہ دھاتی رسی۔ میرا ہتھ
سے کتنی لگی“ میں نے، تو کہ شاید وہ نہیں ہوگا، پچھن میں
تم گاؤں میں پھر پھر کر کو برا لکھا کر کے لاتے تھے جس سے
میں اُلیاں بناتی تھی، اور تم انھیں... ہی کر بڑے گھر والوں
میں بیچتے تھے۔ اٹلی کے درختوں پر بیٹھ کر تم جگہ
توڑ لاتے تھے اور میں اُسے بازار میں بیچا کرتی تھی...

بیٹے! اب ہماری قسمت بدل گئی ہے۔ ذرا سوچو تو اگر
تمہاری ذہانت اور ہوشیاری دیکھ کر ریڈی ٹائیڈ وٹا
نے مدد کی ہوتی تو کیا تم آج اتنے بڑے آدمی ہو سکتے
تھے؟..... اُن دنوں ہم ایک وقت کھاتے تو دوسرے
وقت بھوکے سوتے۔ تمہارے تباہی گزر جانے پر ہمارے

چند صبا گئیں۔ کئی قسم کے کھانے، سالن اور میٹھے!۔
مگر یہ سب دیکھ کر اس کام خوش نہیں ہوا۔ نوالہ منہ
میں رکھتے وقت رمنیا کا خیال آیا، بچے یاد آئے،
وہ جو کچھ کھاتے ہیں اس کا خیال آتے ہی شناختا کی
آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ ایک ہی ماں کے دو بیٹوں
میں اتنا فرق کیوں؟ بھگوان نے ایسا کیوں کیا؟ کیا
رمنیا بُرا آدمی ہے؟ بے چارے کے منہ میں تو زبان
لک نہیں ہے۔ پھر اس کے ساتھ بھگوان نے اتنی ناانصافی
کیوں کی؟.... اور بڑی ہو، بالکل باؤلی ہے۔ نہ جانے
راج اس نے کھانا پکایا بھی یا نہیں۔ بچے بھوکے ہی سو گئے
بول گئے؟

شناختا فوراً کھانے پر سے اٹھ گئی اور ہاتھ
دھونے لگی۔ چھوٹی ہونے پر پوچھا تو جواب دیا کہ طبیعت
لیما نہیں ہے۔

دوسرے دن راماراؤ ماں کو جیب میں بیٹھا
ہم دیکھنے لے گیا۔ پیار کی چوٹی پر بنا ہوا بنگلہ اور
سائے اطراف کے باغ دیکھ کر شناختا دنگ رہ گئی
، بچائی پر تے نیچے زیر تعمیر ڈیم کو دیکھ کر اس کا سر
پکڑنے لگا۔ اُسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ سب
انسان کے ہاتھوں ہی جو رہا ہے۔ نیچے اتر کر باور
ہوز کے پاس گئے۔ وہاں سے نکلتی ہوئی نہروں کے
رے میں تار بارتھا بیٹا۔

اتنے میں پیچھے سے کسی نے آواز دی ”اسے
شناختا! تم یہاں؟“ شناختا چونک پڑی۔ سامنے
شناختا کھڑا تھا، اپنے ہی گاؤں کا کشتا۔
”ادہ کشتا! تم ہو؟.... ماں میں یہاں اپنے

سنسار کی نادرینج منجھ ساریں ڈوب رہی تھی۔
 باتیں کرتے کرتے شانتا ایک دم رک گئی۔ دیکھا
 کیٹے کے منہ کا رنگ فق ہو گیا ہے۔ شاید اس کے لیے
 پچھلی زندگی ایک بُرا خواب تھی جسے وہ بھول جانا چاہتا
 ہے۔ وہ اور کچھ بول سکی۔

ای رات ایک افسر کے گھر میں ڈنر کی دعوت تھی
 مناسبے کے بڑے افسر کے تبادلہ پر ہر ماتحت افسر کو
 اس طرح کی دعوتیں دینے کا ایک رواج چلا رہا ہے
 شانتا نے دعوت میں شریک ہونے سے انکار کیا لیکن
 بیٹے اور بہن نے جھوٹا نہیں، ساتھ لے ہی گئے۔

جس گھر میں دعوت ہو رہی تھی، وہاں رنگ برنگے
 قیمتی روشن تھے۔ عورتیں باغیچوں میں ایک طرف کرسیوں
 پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ قیمتی سارے حصوں میں بلوس، زیورات
 میں لدی پھنڈی۔ ان میں دو قسم کی عورتیں نظر آ رہی تھیں۔
 چند تو نچوت بھری متانت سے خاموش بیٹھی ہوئی تھیں،
 اور چند بالکل بچوں کی طرح چل رہی تھیں۔ ان کے
 لباسوں کی طرح ان کی باتیں بھی، سنان کو چھو رہی تھیں۔
 ایک کہہ رہی تھی کہ اس کے پیاجی کروڑ پتی ہیں۔ دوسری
 فاطمہ تھی کہ اس کے پیاجی کا نام بیٹے ہی منتر تک تم غر
 اپنے ہیں اباب اور گویا تھی کہ اس کے شوہر کا خواہ سار صلو
 کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی، اس لیے سہ ماہ اسکے سے سبندوں
 رو پیٹنگوا لیتی ہے۔ بس اسی ڈھنگ کی باتیں مل رہی تھیں
 شانتا کو ان سب میں پانچ سو بیٹہ سی لگی جھوٹا
 بیٹھے سب کی س۔ جی نہیں۔

ایک نے شانتا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
 ہوئے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ کہہ رہی تھی کہ

جیسے موسلا دار بارش ٹھم گئی ہو۔ ہوئے کہا۔ یہ
 میری ماس ہیں۔ حال ہی میں آئی ہیں۔
 کہاں رہتی ہیں؟
 ہوئے بتایا۔

”وہاں کون ہے؟“
 ہمارے چچا جی، ان کے بیٹے۔
 وہ کیا کام کرتے ہیں؟

ہو کا چہرہ ذرا سا اتر گیا۔ میں بھر خاموش
 رہ کر بولی ”کرانہ کا بیوپار ہے، ہولی سیل مرچیں ہیں۔“
 ”کرانہ کا بیوپار؟ کیا اس میں بھی فائدہ ہوتا ہے؟“
 اس عورت نے عجیب سا منہ بنا کر پوچھا۔

ہو چڑھی گئی۔ کہنے لگی ”فائدہ کا کیا پوچھتی ہو
 ہیں! ہماری تنخواہیں اس کے سامنے بیچ ہیں۔“ یہ کہتے
 ہوئے اٹھ کر گئی اور سے باتیں کرنے کے بہانے دوسری
 طرف چل پڑی۔

شانتا بہت مچھی رہی۔ ہو کو اتنا سفید
 جھوٹ بوسے کا کیک ضرورت تھی؟ غصہ مٹی دیر کے
 سوچ بچانے کے بعد شانتا کی سمجھ میں آ گیا کہ یہاں کا ماحول
 ہی کچھ ایسا غیر فطری ہے کہ ڈینگ ہانچے بغیر کسی کی ساکھ
 باقی نہیں رہتی۔ بے چاری، ہو بھی کیا کرتی؟ جھوٹ
 بیٹے کا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

گھر لوٹنے کے بعد بھی شانتا اور گری سو
 میا ڈوبی رہی اس کے سامنے چند تلخ حقیقتیں تھیں
 جس ماحول میں اس کا جنم اور پرورش ہوئی اس کا
 یہاں کے مصنوعی ماحول سے کوئی سمبندھ ہی نہیں ہے۔
 یہاں اس کی موجودگی جھوٹے بیٹے اور بہن کے لیے ٹھکانہ

”نہیں بیٹے! مجھے نہ دو۔ ان روپوں کے ساتھ وہاں
بہنچوں گی تو وہ میری صورت بھی نہیں دیکھے گا۔“
اما راؤ کی آنکھوں میں آنسو بھرائے۔ بس
چل پڑی۔

جب رات کو رخصت گھر لوٹا تو دیکھا کہ ماں ہاٹ پر
سوئی ہوئی ہے۔ بہو نے ڈرتے ڈرتے کہا ”دیکھو جی! ماں
کو کچھ نہ کنا۔“ اگر ان کا دل دکھاؤ گے تو ہمیں
یہ چار دانے بھی نصیب نہیں ہوں گے۔“

رخصت چند لمحے خاموش رہا اور پھر بولا ”اری
پنگی! کیا تم سمجھتی ہو کہ میرے لیے ماں کا بوجھ زیادہ ہے؟
میں تو ان کا دل دکھا کر ہی سہی بھائی کے پاس اس لیے
بہج رہا تھا کہ چند دن تو وہاں آرام سے گزارے
... ماں کے بغیر تو یہ سنا سنا سنا لگ رہا تھا
... میرا دل تو یہی ہے کہ جو شخص اپنی ماں کو ٹھیک سے
نہ دیکھے، وہ بھی خدا کا عذاب ہے۔“

کہیں گے وہ ایک آدھ بھر کر میٹھا
نہ جانے شائدا اس وقت سوری خنی یا جاگ
رہی تھی۔ مگر اس کا کلیہ سارا بھیک گیا تھا۔

شعروادب سے اپنی دل چسپی کے پیش نظر
سب رس کی توسیع اشاعت میں تعاون
کیجیے اور احباب کو اس کا خریدار بنائیے
زر سالانہ (۲۰) روپیہ مئی ارڈر کیجیے

ہاں بی بی ہے۔ اپنی پچھلی زندگی اور اپنے بڑے
بیٹے کو بالکل سی فراموش کیے بغیر وہ یہاں کے پروار میں
غسل مل نہیں سکتی۔

لیکن نہیں، اسے یہ خوشیاں نہیں چاہیں یہ
میں نہیں چاہیے۔ وہاں اس کا ایک اور بیٹا بھوک
سے تڑپ رہا ہے۔ چھوٹے بیٹے کو کسی قسم کی نہیں ہے
سے ماں کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اگر وہ کسی
کے کچھ کام آ سکتی ہے تو صرف بڑے بیٹے کی۔ وہیں اس کا
مقام ہے، یہاں نہیں۔

دوسرے دن صبح ہی شائدا اپنا مختصر سا سامان
سبٹ کر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ بیٹے اور بہو نے
بہت منت سماجت کی کہ ٹرک جائے۔ لیکن وہ نہ مانی۔
”تو بڑے بیٹے نے در دہرے لہجے میں پوچھا ”کیوں ماں!
کیا میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں؟“

”کیوں نہیں بیٹے! تم میرے بیٹے ہو۔“
باخبر بیٹے ہو۔ لیکن بیٹے! میں تمہارے کسی کام
نہیں۔ میرا فرض ہے میں وہیں رہوں جہاں میری
وہ ضرورت ہے۔“

”یعنی تم میرے ساتھ اسی وقت رہ سکتی ہو
بہیں جی ایک کنگال کی زندگی بسر کروں یہ بھی ہے نا۔“

”نہیں بیٹے! تم نہیں سمجھ سکتے ماں کا دل کیسا
بے ... میں تمہیں سمجھانے کی قابلیت بھی
نہ رکھتی ... مجھے جانے دو۔“

اما راؤ نے ماں کے ہاتھ میں دو سو روپے
نہ کر کشش کی، مگر شائدا نے لینے سے انکار کیا۔

وقار حلیل
قدیر امتیاز

نقد و نظر

تبصرے کے لیے ہر کتاب کی ۷ جلدیں آزاد دہی ہے۔ ۱۱ اردو کتب گھر کی رائے سے اتفاق نہ ہو رہا ہو۔

نام کتاب "نفسیات" (مطالعہ کرو) مصنف: غیث الدین احمد ایمانی (سائز صفحہ ۱۰۰) قیمت: ۱۵ روپے، اشاعت: ۱۹۸۲ء، تعداد: ۵۰۰)۔
پے کا پتہ: ریورنیر محمد اکبر الدین صدیقی، آغا پور امید آباد۔
سائنس اور فکٹا لوجی کے اس دور میں انسانی جبلتوں اور ان کی نفسیات پر مبنی رویوں میں مختصر یا مسودہ کتاب کی اشاعت کو کارنامہ سے تعبیر کیا جائے گا۔
شعروا ب پر آئے دن سینکڑوں کتابوں کی اشاعت کے اس دور میں فنی اور تکنیکل کسی کتاب کی اشاعت کو عصری حیثیت نہا جائے گا جناب غیث الدین احمد نے اپنے علم اور تجربے کو اساس بناتے ہوئے چھ ابواب میں انسانی نفسیات کے پچھیدہ اور فلسفیانہ مسائل کو سلجھانے کی سعی مشکور انجام دی ہے اور اپنے نظریات کی وضاحت کے لیے قابل قبول اصطلاحات توضیحی

اور اشکال کی، دیا ہے، یورپ اور امریکہ کے ماہرین نفسیات کی تحقیقات سے بھی فاضل مصنف نے جن استفادہ کیا ہے۔ نفسیات پر یہ کتاب علم فہم قرار دی جاسکتی ہے اور کالج کے طلباء کے ساتھ ساتھ

معموم سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مفید ترویجی شے کا درجہ رکھتی ہے۔ نظام

اردو پڑھنے اشاعت میں اعانتہ کر کے مفید خدمت انجام دی ہے۔ یونیورسٹی کے لیے اس کتاب کو ادبی انعام دے کر اس موضوع پر توجہ کی اشاعت کی تسبیح حوصلہ افزائی کی ہے۔
نام کتاب "خاموشی آواز کرے گی" (۱۹۷۹ء) رعنا سحری، ڈیکانی سائز جلد معہ گرڈ پوش صفحہ ۸۰ قیمت ۱۵ روپے، اشاعت: ۱۹۸۲ء، تعداد: ۵۰۰ ناشر آئرس گلڈ پی کیشرز ۸/۲۷۵/۸۱ لارنس روڈ دہلی۔
جوان عمر طالب علم شاعر رعنا سحری کا یہ مجموعہ سندھ با مسمیٰ معلوم ہوتا ہے۔ کلام میں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ عصر کی ذہانت بھی روشن نظر آتی ہے، رعنا کی شاعری میں سادگی کے آواز کی بازگشت اور غزلوں میں روایت اور کلاسیک کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ جدید طرز فکر کی جھلکیاں بتاتی ہیں کہ شعور زندگی کے سفر پر چل پڑا ہے اور قرب و جوار کی آوازیں اُسے اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ ایک کم عمر شاعر کا یہ مجموعہ دعوتِ فکر و نظر ہی نہیں دیتا بلکہ اس انداز متقاضی ہے کہ اس کا مطالعہ قاری کو اس کے اندر سے آگاہی بخشتا ہے۔ رعنا سحری کسی خوش فہم نہ ہوں اور اپنی آواز کو جہ سے استوار کرنے

میں (مشاعروں کی فضا سے بچ کر) ہنسیک ہوں علم کی تلاش کا سفر جاری رکھ سکیں تو منزل آشنا ہو سکتے ہیں۔ کتاب قرینے سے چھپی ہے اور مطالعہ کا باب : آکرتی ہے۔

نام کتاب: ”دشک کوہکن“ (مجموعہ کلام) : ڈاکٹر فشر الدین سائل، ڈیمائی سائز جلد موگرو پوش صفحات ۹۲ سن اشاعت ۱۹۸۳ء قیمت ۱۰ روپے، طے کا پتہ: ڈاکٹر سائل، محمد علی روڈ۔ موہن پورہ، ناگپور۔

شرف الدین سائل جانے مانے شاعر ہیں، خوب کہتے ہیں، ان کی غزلیہ شاعری میں روایت سے عصرت کا احساس اپنا تاثر چھوڑتا ہے۔ مجموعہ میں شامل نظموں کا افق قومی اور ملی نظریات کو روشن کرتا ہے، وطن دوستی اور انسانی تہذیب کے ارتقاء کو سائل نے اپنے فکر و فن کا مرکز بنایا ہے۔ مجموعہ سلیف سے مطبوع ہوا ہے اور جو صلا فرائی کا مستحق نام کتاب: ”نکھی کتاب“ شاعر: بدیع الزماں خاں، ڈیمائی سائز، صفحات ۴۸، قیمت: ۶ روپے ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج۔ دہلی مصنف کے پتے E۹۴۳، نزد مارکٹ پوسٹ در پول ضلع دناگری (مہاراشٹر) سے بھی خریدی جاسکتی ہے۔

جناب خاور کا شمار عہد جدید کے صاحب طرز شعراء اور پرگو سخنوروں میں ہوتا ہے۔ مرطبی، کوکنی، اردو پر یکساں عبور حاصل ہے۔ تحریر اور تخلیق، مطالعہ و تدبیر اس کی زندگی کا وظیفہ بن گیا ہے۔ بچوں کے لیے نظمیں زیر نظر ”نکھی کتاب“ میں شامل ہیں جن کے

مطالعہ سے جی خوش ہو گیا اور حالی کا شعر زبان پر بے ساختہ آگیا۔

یوں تو چھوٹی ہے قوت بکری کی، دل کو لگتی ہے بات بکری کی خاور صاحب نے ننھے بچوں کی نفیت، ان کی ذہانت، تجسس کی فطرت کو پیش نظر رکھ کر ان نظموں کی تخلیق کی ہے۔ بیشتر نظمیں اور غزلیں اپنے اسلوب اور طرز کی محاسن اور خوشبو کے باعث بچوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی بھرپور اہلیت رکھتی ہیں۔ ابتدائی درجوں کے نصاب بنانے والوں کو اس بھی کتاب

سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہیے قیمت زیادہ ضرور ہے مگر خوبصورت پیش کش کے لیے درکار مصارف کا اندازہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ خرید کر ننھوں کو تحفہ میں دیا جاسکتا ہے۔

نام کتاب: ”افادات ادیب“ مصنف ادیب حیدر آبادی، صفحات ۹۲ قیمت: ۵ روپے اشاعت: ۱۹۸۱ء تعداد: ۵۰۰ طے کا پتہ، صانی بک ڈپو، چھلی کمان، حیدرآباد-۲

ادیب صاحب بزرگ شاعر اور ادیبان

و ادب کے بے لوث خدمت گار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں الفاظ کی اہمیت اور اس کے استعمال، زبان اور اہل زبان کی فیصلت

اشاپروازی اور ادب، شعر و شاعری کے فلسفیانہ رموز و نکات، اردو و ہندو اور علم عروض کے مسائل و

مبادیات کو طالب علموں کے لیے سلیس پیرایہ میں

قلم بند کر کے ادبی بے راہ روی کے اس دور میں احسن خدمت انجام دی ہے۔ ثانوی اور کالجوں کے طلباء

کے لیے یہ کتاب ہر آئینہ مفید اور قابل مطالعہ قرار دیتی ہے۔

نام کتاب: ”سجدۂ اخلاص“ (رمضان اور اسلام) شاعر ساجد رضوی، صفحات ۹۶، اشاعت: اپریل ۸۲ء قیمت: ۵ روپے طے کا پتہ: تراغیثی کتب خانہ چوریا دیوانی بلڈ، حیدرآباد۔

جناب صاحبہ رضوی، حیدرآباد کے برگزیدہ شاعر ہیں اور اصحابِ اہل بیت اطہار کے حلقہ بگوشوں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ”سجدۂ اخلاص“ کا مآخذ انیس اور سلام ساجد کے فکر و فن و عبارت اور صلابت کا روشن انداز ہے، حق کی تفسیر اور بندگی کو ترابہ و ذبیحہ از دل و زور و دل خیز کے مصداق ساجد رضوی نے ادا کیا ہے۔ در حلقہ موت کی تفہیم کو اپنی پراثر شاعری کے ذریعہ آسان بنا دیا ہے۔

نام کتاب: ”پریم چند“ مصنف: امت۔ اسے صفحات ۹۶ قیمت: ۵۰/۱۰۰ اشاعت: ۱۹۸۱ء ناشر نیشنل بک ڈسٹریبیوٹرز، ۵۵ گرین پارک نئی دہلی ۱۶۔

ہمز پال پستکالیہ کے اشاعتی پروگرام کے تحت نیشنل بک ڈسٹریبیوٹرز نے ۱۵ زبانوں میں ادب اطفال کے لیے مفید فوری مجموعہ کی اور سائنسی کتابیں بالخصوص شائع کی ہیں۔ ”سجدۂ اخلاص“ اردو کے عظیم المرتبت کہانی نویس پریم چند کی سوانح پر مشتمل ہے، جسے ان کے صاحبزادہ جناب امت رائے نے سہل اور دلچسپ اسلوب و عبارت میں سپردِ قلم کیا ہے۔ نفاذ و بردیدہ زیب اور موثر ہیں۔ پریم چند کی شخصیت ان کی وطن دوستی اور ان کی اردو زبان و ادب سے وابستگی

سادہ زندگی کو امت رائے نے اس انداز میں روشن کیا ہے کہ کیا بچے اور کیا بڑے سبھی کے لیے یہ کتاب مطالعہ کی ترغیب دیتی ہے۔ (د، خ) نام کتاب: ”کرناٹک کا اصلاحی ادب“

زیر نظر تعریف دراصل ایم فل کا مقالہ ہے جو فہم انساؤ نے ڈاکٹر فہمیدہ عظیم کی نگرانی میں بنگلور یونیورسٹی کے لیے ۱۹۸۵ء میں تحریر کیا تھا جواب کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس موضوع پر مواد جمع کرتے ہوئے مصنف نے محنت اور جستجو سے کام لیا ہے۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں اصلاحی ادب اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں کرناٹک کے اصلاحی مصنفین کا مختصر سا تعارف، تیسرے باب میں پیدائش کے بعد کی تقریبات جو تحفے باب میں شادی بیاہ کی تقریبات اور پانچویں باب میں موت کے بعد کی مروجہ تقریبات کا ذکر ملتا ہے۔

ہر باب میں رسومات اور تقاریب کی تفصیل کے بعد ان رسومات کی اصلاح کے بارے میں بھی تحفہ نوٹ ملتا ہے جب کہ تقاریب کی تفصیل کو مختصر اور اصلاحی نقطہ نظر کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی بہتر ہوتا مصنفین کے اقتباسات و اشعار کے حوالوں کو بنیادی اہمیت دی جاتی اور اس پر کھل کر بحث کی جاتی کیوں کہ کہیں کہیں یہ گمان گزرتا ہے کہ آیا یہ کتاب اصلاحی ادب پر ہے یا رسومات پر تو ہر گز نہیں۔ کرناٹک کا اصلاحی ادب ”فہم انساؤ کی دینی کوشش ہے۔ اس کوشش اور جستجو کو دیکھتے ہوئے

مستقبل میں ان سے اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں امید کہ ادب کی جانب ان کی یہ مراجعت جاری رہے گی اور وہ زبان و بیان پر قابو پالیں گی وہ کوتاہیاں جو اس کتاب میں راہ یانگی ہیں اور جس کی جانب انھوں نے اشارہ بھی کیا ہے جاتی رہیں گی توقع ہے کہ وہ مستقبل میں بھی اردو ادب کو مالا مال کرتی رہیں گی اور بہت جلد اپنا مقام بنالیں گی۔ ان کی تحریروں میں ان کے روشن مستقبل کی ضمانت میں مجھے توقع ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو سراہا جائے گا اور ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اس کتاب کی اشاعت پر میں بھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

یہ کتاب بارہ روئے کے عوض نمبر ۱۱ اسکندریہ محمد بانک ٹینشورم، بنگلور ۳ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔
(تدبیر امتیاز)

نرب کا نام "غبار حاضر" مصنف "رؤف خوشتر" اشاعت ۸۷ء قیمت ۱۰ روپے، سائز کراون ۱۱ جلد مع گرد پوش صفحات (۱۲۰) زیر مباحثہ: مشکوفہ بیلی کیشنرز، منظم جاہی مارکٹ حیدر آباد۔

مادنامر مشکوفہ اور زندہ دلاں حیدر آباد نے عصر حاضر میں طنز و مزاح کو صنفِ ادب کا مقام دلانے میں اپنی اپنی سعی مشکور انجام دی ہے۔ زوال پذیر انداز کے۔ ماسرہ میں اس صنف کو عوامی مقبولیت میں ل رہی ہے۔ طنز و مزاح کے نام پر آئے ہوں کتابیں، مضامین اور شاعری زوروں پر ضرور ہے مگر کیفیت اور کیت میں بہتر و کتر کا ہنوز فقدان نظر آتا ہے۔ اس میں منظر جوان فکر اور حساس نظر قلم کار رؤف

خوشتر کے (۱۸) نکاحی مضامین کے مجموعہ "غبار حاضر" کو پڑھتے ہوئے انسا ط اور فرحت کا مثبت احساس افزوں ہوتا ہے۔ معاشرہ اور ماحول کے نقض اور گھٹن کو رؤف خوشتر نے سنبھل سنبھل کر اپنے تیکھے اسلوب اور چمکتے ہوئے لفظوں کے دروبست کے سہارے ترسیل کا ہنر انجام دیا ہے۔ جہاں کہیں اشعار کی پیروڈی کا تجربہ کیا ہے۔ نفس مضمون کو باوقار بنایا ہے۔ دکن کے ماحول کو رؤف نے اپنی ان تحریروں کے طنز و مزاح کا نشانہ بنانے ہوئے دکنی روایات کی شکست و بخت پر مزاح کی طرح نشر زنی کی ہے پہلا مضمون "پان" کا یہ اقتباس پڑھیے "قومی سمجھوتہ کی تصویر میں سیاست دانوں کی زبان سے زیادہ پان کی دوکانوں پر ملی۔ پان والا نہایت حسن خوبی اور نفاہت سے کلتہ، بنارس، مدراس، دہلی، کانپور، بمبئی اور دوسرے شہروں کے پان ایک بڑے برتن میں اس انداز سے سجاتا ہے کہ وہ آپس میں بغل گیر ہو کر ایک عجیب تاثر پیش کرتے ہیں، کاش ہمارے قائدین پان الٹ قومی سمجھوتہ کا سبق سیکھتے اور تمام ہندوستانیوں کو اسی طرح محبت و رفاقت سے بغل گیر ہونے کا راستہ بتاتے۔ آخری مضمون "یہ دن" میں رؤف کا قلم اپنے نقوش یوں روشن کرتا ہے۔ ویسے ہی ہندوستانی پہلے سے پہلے ہی سماں کی غذائی قدر اور کثیر الاولاد پالنے کی ہمت نے اکثر شہروں کو سیلابا دیا اس لیے ہیں پیلے رنگ کا قومی رنگ اور برقان کو قومی یا جاتی کا درجہ دینا چاہیے اور ملک کو سیلابا لگا۔ جس طرح مسخ معین اور سیاہ افریقہ "عبادت مختصر: رؤف خوشتر کا غبار" نکاحی ادب کے مجموعہ "دافن" کی اعتبار سے قابل مطالعہ کتاب ہے۔ رباعی کے فن کی طرف خفتہ نے اس کے حسن کو انفرادیت بخشی ہے۔

اردو نامہ

وقار خلیل

اردو کی علمی ادبی تہذیبی خبریں

یکم جنوری: ارباب شرونگم کے زیر اہتمام سالانہ طرحی مشاعرہ سال نو جناب شاد ملکنت کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سیف حموی، غیاث صدیقی، نذیر علی عدیل، وقار خلیل، تاج بھجڑ، رحمن جانی، رضا مصطفیٰ، بشیر وارثی اور دیگر شاعروں نے اک برہنہ کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے۔ پر طبع آزمائی کی۔ اختر جہاںی نے خیر مقدم کیا اور وقار خلیل نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۷ جنوری: رہاسنی اسمبلی کے انتخابات کے بعد قدیم شہر کے فرقہ وارانہ فسادات میں نوجوان ملکوت شاعر مہر غلام حسین (مچھر) ان کی شہرک حیات اور سالہ لڑکا شہر پسندوں کے حملہ سے جاں بحق ہوئے۔ ۹ جنوری: ڈاکٹر حبیبی شاہد سکریٹری زرقی پسند مصنفین نے غلام حسین اور ان کے افراد خاندان کے قتل پر تقررتی بیان میں جارحانہ فرقہ پرستوں کے خلاف پراسن اور سیکولر شہریوں کو متحدہ منہجک ہونے کی دہمکہ انہ اہیل کرتے ہوئے دانشور ادیبوں اور شاعروں کو فرقہ پرستی کی بھڑکائی طور پر مذمت کی طرف متوجہ کیا۔

۱۳ جنوری: تلکو، اردو ہندی کسٹری اور مرہٹی کے اہل قلم اصحاب اور دانشوروں کا ایک اجتماع عمرہ جیلانی بانو کی صدارت میں ہوا اور فرقہ وارانہ فسادات کے انسداد اور بھائی چارگی کے ماحول کو بنائے رکھنے میں ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کے فعال کردار پر غور کیا جا کر ایک تنظیم کے قیام کا فیصلہ لیا گیا۔

۱۷ جنوری: تلکو کے زرقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کا ایک اجلاس ڈاکٹر سی نارین ریڈی کی صدارت میں ہوا۔ غلام حسین اور ان کی بیگم اور لڑکے کو جن سفاقت سے قتل کیا گیا اس کی پُر زور مذمت کی گئی اور مخالف فرقہ وادیت تحریک میں فلم کاروں کے پلٹ فارم کا عہد کیا گیا۔ اس جلسہ کو ملک الشعراء ڈاکٹر داسرہی، ڈاکٹر راج بہادر گوڈ، کالوجی نارائن راؤ، ڈاکٹر حبیبی شاہد، احسن علی مرزا، بانو طہرہ سعید اور

ماتق شاہ نے خطاب کیا۔ مختلف زبانوں کے اہل قلم اصحاب کی تنظیم غم کے وفد نے چیف منسٹر سریندی رام راؤ سے ملاقات کرتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے انسداد اور بھائی چارگی کے ماحول کو روشن کئے جانے میں اہل قلم کے تعاون کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک سمور مذم حوالے کیا۔

۱۸ جنوری: مہر محمد شاہد ریاستی وزیر امور اکیڈمی نے اچانک اکیڈمی کا معاہدہ کیا۔ مہر چندر سرپوایتیو سکریٹری/ڈائریکٹر اردو اکیڈمی سے مشاورت کی۔

جناب سید ہاشم علی اختر، دانش عثمانیہ بونی دہشتی نے جناب صادق نقوی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ کی کتاب قطب شاہی عاشور خانے (انگریزی) کی رسم اجرا تقریب کی صدارت کی۔ مولانا اختر زیدی، ڈاکٹر ایم بی ملگم، ڈاکٹر مصدق علی بیگ اور جناب سعد حسن نے جناب نقوی کی کتاب پر اظہار خیال کیا اور مصنف کو مبارکباد پیش کی۔

۲۲ جنوری: ادارہ ادبیا اور دو اور ادارہ سب رس کی طرف سے

ادارہ کے معتمد عمومی جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے سیس ریٹائرڈ) کے وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ ہونے کی سہرت میں جلسہ ہئیت صدارت بروفسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ادارہ کی طرف سے تریاک معتمد جناب رمن راج سکینہ اور سب رس کی طرف سے ڈاکٹر مفتی نسیم نے جناب اختر کی گنجشوی کی۔ دیوان اردو کے اسٹاف اور مرکز خوشنویسی کی جانب سے علی الترتیب جناب میر سراج الدین علی خاں اور جناب عبدالقادر زرتین قلم نے بحول مالائیس نذر کیں۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، بروفسر سراج الدین، ڈاکٹر مفتی ہشتم، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے جناب اختر کی دانشورانہ صلاحیتوں اور ان کی ہمہ جہت شخصیت کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے نیک توقعات وابستہ کیں۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید اور صاحبہ حیدر آبادی نے منظوم خراج تحسین ادا کیا۔ جناب رمن راج سکینہ نے نظامت کے فرائض انجام دیے جسے ہئیت کے بعد ادارہ کی گولڈن جوبلی تقاریب کے سلسلے شام نظامیہ

کا اہتمام جناب ہاشم علی اختر کی صدارت میں کیا گیا۔ ابتداً ڈاکٹر ہشتم نے نے مخاطب کیا۔ ڈاکٹر یوسف مرست نے اردو میں انشاء نویسی کے ارتقاء پر عالمانہ مقالہ پیش کیا۔ محترمہ جیلانی بانو، محترمہ سلطانہ نعمت الدین محترمہ بانو طاہرہ سعید، محترمہ سیدہ طیبہ بیگم، ڈاکٹر سید عبدالمتان اور جناب سراج ہاشم نے انشائیہ منسلک وقار خلیل نے معتمدی کی۔ ۲۳ جنوری: ملگو دیشم پارتی کے صدر اور ریاستی چیف منسٹر میں ڈا ماراؤ نے ارباب صحافت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ریاست کے قابل لحاظ اردو آبادی والے علاقوں میں دوسری سرکاری زبان کا قیام حاصل رہے گا۔ ۲۶ جنوری: ہمدانی اہل قلم اصحاب، خواتین اور آرٹسٹوں کی اس پسند تنظیم حکم کے زیر اہتمام چارمینار سے عالیہ فساد زوہ محلو تک اس مارچ ہوا جس کی قیادت بزرگ قلمو شاعر مرزا لوبی نارایاؤ نے کی، اس مارچ میں جیلانی بانو، ڈاکٹر اور معظم، ڈاکٹر لونتیدی (آئی اے ایس) جوالہ معنی، منوہر لال

بہار، نیپال سنگھ ورما، وقار خلیل، جہانہ ارفاز، راج لال راجہ اور یم کی خاں قابل ذکر ہیں۔ مفید الانام جوینر لالچ میں جلوس نے جلسہ عام کی صورت اختیار کی، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں نے فقر و دارانہ فساد پر اظہار مذمت کرتے ہوئے سیکولر روایات اور بھائی چارگی کے استحکام پر مخاطب کیا۔

۲۸ جنوری: اردو گھر میں ادارہ سراج ادب کی طرف سے جناب خورشید جنیدی کے مجموعہ کلام آتش گفتار کی رسم اجرا جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کے ہاتھوں انجام پائی۔ پروفیسر غلام محمد خاں نے صدارت کی، ڈاکٹر مفتی ہشتم، ڈاکٹر یعقوب عمر، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، جناب منوہر راج سکینہ اور جناب بشیر احمد نے جناب جنیدی کی شاعری پر اظہار خیال کیا اور مبارک باد دی۔ جناب بشیر وارثی نے خیر مقدم کیا۔

۲۹ جنوری: عثمانیہ لٹری سرکل کا مشاعرہ بعد ازاں جناب مظفر مجاز منعقد ہوا۔ قدیم و جدید طرز فکر کے شعراء نے کلام سنانا۔ صاحبزادہ کلیم اللہ نے نظامت کی۔

فروری ۱۹۸۳ء

یکم فروری: آڈھرا پردیش اردو اکیڈمی نے ۱۹۸۲ء کی اردو مطبوعات پر ادبی انعامات کی فہرست جاری کی ہے جن میں ۲ ہزار روپے کا بھلا انعام شاد تمکنت (دورق انتخاب) مجنوبی حسین (آدمی مہما) سیر کر نولی (نغیر شوق) ریاست علی تاج کریم نگری (نجیب شریف ندوی: شخصیت اور کارنامے) اور دادو اشتر (اور کچھ بیان اپنا) نے حاصل کیا۔ ایک ہزار روپے کا دوسرا ادبی انعام بانے والوں میں علی احمد جلیلی، غیاث مین، نسیم صلاح، حسن فرخ، دو باغ عبدالباقی اعظم راہی، ڈاکٹر صفدر علی بیگ، راہی خدائی، قیصر سرست، نظام الدین منوہری، طیب انصاری، عابدہ انسا اور برق آشیانی کی تصانیف قابل ذکر ہیں۔ ۵۰۰ روپے کا انعام سوم ڈاکٹر طالب شاہ آبادی، محمد عبد القادر ادیب، ڈاکٹر راہی، موسیٰ خاں شوق، منسا، طہر، فاطمہ پروین، مجید سلیم، منوہر لال مبار، افتخار احمد بشیر، بومس حیدر آبادی، رشید الدین، میر احمد الدین علی خاں، اور برق یوسفی کی مطبوعات کو دیا گیا۔ ہم نامہ مصنفوں کو دلی مبارکباد پیش

کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اکیڈمی کو ۹۹ کتابیں دیوار ڈکے لیے موصول ہوئیں جن میں سے ۵۴ مطبوعات کو حکم صاحبان کے فیصلوں کی روشنی میں ادبی انعام کا حقدار قرار دیا گیا ان میں ۱۴ بیرون ریاست کے مصنفین بھی شامل ہیں۔

۲ فروری: سر طہر دہریا نے ڈاکٹر کٹر اسکرپٹری اردو اکیڈمی نے چیف مسٹر سرینتی رام راؤ کو ایک مکتوب کے ذریعہ ریاست میں اردو کو اس کا مستحق قانونی موقف اور مراعات دے جانے کا مطالبہ کیا۔ ریاستی اردو اکیڈمی کے صدر مولانا حافظ اتویوسف اور حیرمن انتظامی کمیٹی سر بہ دہریا کی سربراہی میں ریاستی حکومت کی تہہ بی کے پیش نظر وزیر اعلیٰ کو اپنے استعفیٰ پیش کر دیے۔

۳ فروری: چیف مسٹر سرینتی آر نے پریس کلب آف انڈیا دہلی کو بتایا کہ گوریلا ریاست کی پہلی زبان ہوگی اور قومی زبان ہندی کی اہمیت بھی ریاست میں باقی رہے گی البتہ اردو کو اس کے

موقف اور مقام کے لحاظ سے ریاست کے مختلف ضلعوں اور تعلقوں میں ثانوی زبان کا درجہ حاصل رہے گا۔

۴ فروری: مولانا حافظ اتویوسف صدر اردو اکیڈمی نے ۴۴ کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے مطالبہ دہرایسے کہ اردو کو نئی حکومت ریاست کی ایک سرکاری زبان کا واضح موقف عطا کرے۔

۶ فروری: غزل کے مقبول شاعر حضرت سحید شہیدی کے تیسرے مجموعہ کلام "آفتاب غزل" کی رجم چرا کا جلسہ اردو گھر میں بعد ازاں علامہ

اختر زیدی آراستہ ہوا جناب عابد علی خاں ایڈیٹر ریاست نے دونوں ایجنڈا انجام دی۔ حضرت سعید کی غزلیہ شاعری کے حسن کو سرز ڈاکٹر منشی تبسم، ڈاکٹر صفدر علی بیگ، سر نیواس لاہوتی، علی احمد جلیلی، باقر امانت خانی اور مصباح گوہر نے روش کیا اور مبارک باد دی، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے کاروائی انجام دی۔ ۸ فروری: ریاست میں اردو کے نمائندہ اداروں کے سربراہوں نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی قیادت میں

چیف مسٹر مرین ٹی رامارائو سے ملاقات کی اور ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے اور دفعہ ۷ میں ترمیم کے ذریعہ مسئلہ پر میمورنڈم حوالے کیا۔ اس وفد کے سرکار میں ڈاکٹر منان، ڈاکٹر حسینی شاہد، مسٹر منوہراج سکینہ، مسٹر منوہراس لاہوٹی، مسٹر چندر سرکوتو، مسٹر کے یل ہندرا اور جناب سید علی کوٹی قابل ذکر ہیں۔

۱۱ فروری: انجمن جرس اردو کی ۱۱ویں سالانہ کانفرنس جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

نواب میر احمد علی خاں سابق وزیر داخلہ نے افتتاح کیا۔ مسر غلام صادق الدین صدر انجمن، مسر منوہراس ریڈی اور دیگر مقررین نے اردو ذریعہ تعلیم کی درس گاہوں کو درپیش مشکلات پر نظر ثانی کیا اور اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے

بچوں کو مادری زبان میں تعلیم کی طرف اولین توجہ کریں۔ محترمہ فوزیہ بیگم پرنسپل اردو ماڈل اسکول نے فکریہ ادا کیا۔

۱۲ فروری: محفل خواتین کا مابانہ ادبی اجلاس محترمہ زبیدہ ضیاء الدین احمد کی صدارت میں ہوا۔ محترمہ عظمت بیوم نے مضمین سنایا۔ خواتین شعرا و فن کارامیں کیا اور داو پائی۔

۱۳ فروری: بلبل ہند مسر سروجنی نائڈو کے ۱۰۰ واں یوم پیدائش کے موقع پر سروجنی دیوی میموریل ٹرسٹ کی طرف سے اسکی اپنی عمارت میں جہاں سروجنی دیوی نے انکھیں کھولی تھیں، ایک چلائیبریری اور دیسریچ سنٹر کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر سید علی اکبر صدور ادارہ ادبیات

اردو نے کی نواب میر اکبر علی خاں سابق گورنریوپی، محترمہ معصومہ بیگم سابق ریاستی وزیر اور تلنگانہ، اردو نیز انگریزی کے شعرا و نے سروجنی دیوی کو نذرانہ تسخیں پیش کیا۔

۱۴ فروری: بزرگ شاعر حکیم شاہ اکبر حسینی اور کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ خدا مغفرت فرما

○ شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے سالانہ ڈاکٹر زور میموریل

کمپین کھیلائی تھی۔ تقریری مقالے منعقد ہوئے۔ ۱۸ فروری: انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی طرف سے جناب سید ہاشم علی اختر واس جاسر عثمانیہ یونیورسٹی کو تلبسہ تنہیت جس پر تپاک مبارک باد پیش کی گئی صدر انجمن ڈاکٹر سید عبد المنان کے علاوہ

جناب شاہ عالم خاں صدر انوار العلوی تعلیمی کمیٹی، جناب منوہراج سکینہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے مخاطب کیا۔ مسر منوہراس لاہوٹی نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔ جناب رحمن جانی نے نظم تنہیت سنائی۔

○ کانٹش کلب کے سالانہ مشاعرہ میں مسر ز علی احمد جلیلی، ہاشم جاہ، میر عبد خسرو، کنول پرشاد کنول، صلح الدین رحمن جانی، علی الدین نوید، رئیس ختر، فیض الرحمن خیال، استہزاء تنجر اور عزیز النساء، جہانے کلام سنایا۔

۲۳ فروری: جناب محمد شاکر میاخی وزیر امور اردو اکیڈمی مسلم اوقاف نے ارباب مصیافت کو بتایا کہ اردو اکیڈمی کی نون قریشی کس و تنظیم جدید کی جائے گی اور ایسے افراد کا تعاون حاصل کیا جائے گا جن میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کا بے لوث جذبہ ہو۔

۲۴ فروری: حلقہ ارباب ذوق (نظام مس اور ٹرسٹ لائبریری) کا مابانہ ادبی مجلس ڈاکٹر عبد الستار خاں مدد شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر اشرف رفیع غامی ریڈر شعبہ اردو نے نئی کتاب ”نظریۃ الحادہ“

صنفہ رؤف امرہوی پر فاضلانہ تہنیت
سنایا۔ جناب محمد منظور احمد سکریٹری نے
کاروائی انجام دی اور ہر دو اصحاب
کی علمی خدمات کو آئینہ دکھایا۔
۲۶ فروری: اردو گھر میں بزرگ
شاعر جناب جسونت رائے ضیا استخا
کے مجموعہ کلام "قوس قزح" کی رسم
اجرا نواب میر احمد علی خاں کے ہاتھوں
انجام پائی۔ جناب عابد علی خاں نے
صدادت کی۔ جناب محبوب حسین جگجگٹ
ایڈیٹر سیاست، جناب منوہر راج
سکینہ، جناب صادق نقوی اور جناب
دین راج سکینہ نے حضرت ضیا کے
فکرو فن اور ان کی شخصیت کی جوہنی
پر اظہار خیال کرتے ہوئے اور دشورو
ادب سے ان کی دیرینہ رفاقت
کو خراج ادا کیا۔ کنول پرشا دکنول
اور قدح عریضی صاحبان نے منظوم تاثر
سائے۔ حضرت ضیا کے فرزند مجید
استحانہ سحر نے دلنواز ترنم میں کلام
ضیا کو پیش کیا۔

○ اردو اسوسی ایشن سنٹرل یونیورسٹی
آن حیدرآباد کی طرف سے نامور
نقاد پروفیسر گیان چند جین صاحب
شعبہ اردو کو سہ ماہیہ اکیڈمی کا ایوارڈ
ملنے کی مسرت میں جلتہ تہنیت

صدر اسوسی ایشن محترمہ اودیش
مائی گورڈ کی صدارت میں منعقد ہوا۔
طلباء اور احاذہ نے پروفیسر جین کو
مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر مجاہد حسین
رضوی نے منظوم نذرانہ علوم پیش کیا
محفل شعریں ڈاکٹر منشی بقیہ اور جین صاحب
نے کلام سنایا۔

۲۷ فروری: اردو مجلس کا ماہانہ
ادبی و شعری اجلاس اردو ہال میں
بصدارت ڈاکٹر سید عبد المتان
صدر ریاستی انجمن آراستہ ہوا۔
جناب سرہنواس لاہوٹی نے سید
شہیدی کے مجموعہ سخن آفتاب غزل
پر مضمون اور نواب غلام محمد مرزا
نے قومی بھٹی اور اردو پر اپنا نثر
پاؤہ سنایا۔ شعراء نے کلام پیش
کر کے داد پائی۔ جناب صلاح الدین
مستعد اور مجلس نے کاروائی چلاتی
اور شکریہ ادا کیا۔

باقی حصہ صفحہ ۴۱ سے آئے گا

فکرو نقوی، مجتبیٰ حسین اور یوسف انور
نے بھی غبار حاضر کو فتنہ و مزاج کے
ادب کا "ہوا شافی" نحو بتایا ہے
رؤف و خوشتر میں ہی اب خوشتر
خوشتر مصنف بھی بن ہیں اس سفر
جہاں کہانے حق قرار پاتے ہیں (وعدہ)

اعلان

بحکم پریس رجسٹرار
حکومت ہند
فارم ۱۰۱ رول نمبر

ایڈیٹر نثر اور پبلشر کا نام: سید علی اکبر
توسیت: ہندوستانی
پتہ: ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد
نام پستالک: ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد

میں سید علی اکبر تصدیق
کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر
دی گئی ہیں، وہ میرے علم میں
صحیح ہیں۔

شرح دستخط

سید علی اکبر

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad 500 001 (A. P.

"SABRAS" Urdu Monthly, Hyderabad 500 001 (A. P.)

اسلوب اور انقار



بال حبشیر

فہرست کلیم

مکاتیب لہذیب

سید

۱۱/۴
۱۲/۴
۳۰/۵/۳



ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد

•

•

•

•

•

•

•

ماہنامہ

سب سے پہلے

حیدرآباد

مجلس مشاورت

محافظ علی عباسی
باشم علی اختر
ڈاکٹر امجدی قیسم

صلہ
نائب صلہ
معتدل

مغنی تبسم
وقار حلیل

مدیر اعزازی
معاون مدیر

جلد (۴۴) اپریل ۱۹۸۳ شماره (۴)
قیمت فی پرچہ ۲ روپے

احسان کا احباب اردو پنجہ گہ روڈ حیدرآباد...

ارکان

پروفیسر سید علی اکبر
عابد علی خاں
پروفیسر گوپی چند نارنگ
محمد اکبر الدین صدیقی
رن راج سکینہ
پروفیسر سراج الدین
محمد منظور احمد

زیر سالانہ
۲۰ روپے
کتابخانوں سے
۲۵ روپے
بذریعہ جبری ۴۵ روپے
پاکستان براہ سیلون ۸ ڈالر
انگلستان ۷ پونڈ
ہوائی ڈاک سے بحری ڈاک سے
مشرق وسطیٰ ڈالر ۴ ڈالر
امریکہ ۱۶ ڈالر ۶ ڈالر
۳ ڈالر ۳ پونڈ

فہرست

- ۱۶ حیدرآبادی تہذیب : میر معظم حسین
- ۲۰ نواب میر محبوب علی خاں کے دکنی حسن الدین احمد کے چند ادیب و شاعر
- ۲۹ دکنی ادب و تہذیبی اقدار : صادق نقوی
- ۳۲ عہد آصفی کے علمی و ادبی کام : ڈاکٹر حبیب ضیاء
- ۳۵ عہد آصفی : غیب علی
- ۳۶ عہد آصفی : نقی عظیم

- ۲ ڈاکٹر مغنی تبسم
- ۳ ڈاکٹر نواز اکبر علی بیگ
- ۱۲ رحمن جاتی
- ۱۳ صاحب حیدر آبادی
- ۱۴ شہید آزادی بھگت سنگھ اور اردو کے کھیل

سیٹل اکریڈیٹر پرنٹر پبلشر منیر میمنٹل خان پریشنگ پریس چار کمان حیدرآباد - ۲ سے شائع کیا

اپنی باتیں

ادبی ٹرسٹ "ریاست آندھرا پردیش میں اردو زبان و ادب کا ایک فعال ادارہ ہے۔ ۱۹۶۶ء میں جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کی کاوشوں نواب مہدی نواز جنگ اور جناب محمد و محمد محی الدین کی مشاہد سے اردو کے ادیبوں شاعروں کی وقتی آمد اور اردو زبان و ادب اور تعلیم کی ترقی کی غرض سے اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ٹرسٹ کی جانب سے ہر سال ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے اور اس مشاعرے کی آمدنی کسی بڑے پروجیکٹ پر صرف کی جاتی ہے۔ چنانچہ اردو آرٹس ایوننگ کالج کو زیادہ از ایک لاکھ کی رقم دی گئی قریب ساڑھے سینتیس ہزار روپے اردو تعلیمی ٹرسٹ کو دیے گئے۔ اسی طرح ۱۹۸۰ء میں اردو گھر کی تعمیر کے لیے مشاعرے ہی کے ذریعے ایک لاکھ روپے کی رقم فراہم کی گئی۔ علاوہ ازیں کئی ادیبوں اور شاعروں کو ان کی تعانیف کی اشاعت کے لیے ہر سال مالی اعانت دی جاتی ہے۔

۱۹۸۲ء میں ادارہ ادبیات اردو کی گولڈن جوبلی تقاریر منائی گئیں۔ اس موقع پر ادارہ کی عمارت کی توسیع کیتب خانے کی حالت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں اسکیمیں بنائی گئی تھیں ایک اشاعتی پروگرام بھی تشکیل دیا گیا تھا لیکن ان کاموں کے لیے ضروری مالیہ فراہم نہیں ہو سکا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ادبی ٹرسٹ کے ارباب حل و عقد نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سال مشاعرہ سے ہونے والی آمدنی ادارہ ادبیات اردو کے ترقیاتی کاموں کے لیے مختص کی جائے۔ اس سال یہ مشاعرہ "وزیر سلطان ٹوبا کو کمپنی" کے تعاون سے زیادہ وسیع پیمانے پر منعقد ہو رہا ہے اور امید ہے کہ مشاعرے کی آمدنی سے ادارہ ادبیات اردو کے لیے کوئی ایسا ٹرسٹ قائم کیا جاسکے جس سے اس کو مستقل آمدنی ہوتی رہے۔

ادارہ ادبیات اردو برصغیر کا ایک اہم تحقیقی اور علمی ادارہ ہے۔ اس کو ترقی دینے کے لیے ادبی ٹرسٹ نے جو اقدام کیا ہے وہ لائق مدح ہیں و سپاس ہے۔ ہم ادبی ٹرسٹ کے عہدہ داروں بالخصوص جناب عابد علی خاں سکریٹری ادبی ٹرسٹ و رکن مجلس انتظامی ادارہ ادبیات اردو کے خاص طور پر ممنون ہیں کہ ان کی توجہ اور دل چسپی کی وجہ سے بانی ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے لگائے ہوئے اس پودے کو با در صر سے محفوظ و مامون رکھنے کی ایک صورت پیدا ہوئی ہے۔

معنی تبسم

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ پیچر سے واس چانسلیر تک

اور ناظر تعلیمات کی حیثیت سے وظیفہ صحت خدمت پر سکبدوش ہوئے۔ ہاشم علی صاحب کے دادا جناب سید شاہ محی الدین صاحب ایک عرب نژاد صاحبِ دل بزرگ تھے۔ اپنا زیادہ وقت رشد و ہدایت میں لگاتے تھے۔ انہوں نے ٹراونکور اسٹیٹ میں رہائش اختیار کر لی تھی ان کے فرزند جناب سید حنیف صاحب ٹراونکور سے حیدرآباد تشریف لائے۔ حیدرآباد میں ان کی شادی ڈاکٹر سید ہاشم علی صاحب میڈیکل آفیسر برطانوی فوج کی صاحبزادی فاطمہ بیگم صاحبہ سے ہوئی۔ سید حنیف صاحب ایک نیک دل، صاحبِ کردار اور بے خوف انسان تھے۔ انھیں علم و ادب سے گہری دل چسپی تھی وہ بحیثیت مدرس اور ناظر تعلیمات بہت مقبول رہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی۔

ہاشم علی اختر صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی نو سال کی عمر میں مڈر مل اسکول، ضلع ننگرہ میں چھٹے درجے میں داخلہ حاصل کیا۔ ان کے انگریزی کے استاد رام راؤ صاحب تھے انہوں نے طلباء کو پابند کیا تھا کہ وہ ہر روز انگریزی کی کتاب سے ایک صفحہ خوش خط لکھ کر لائیں۔ ہاشم علی صاحب نے ایک مرتبہ

یہ بات ہمارے لیے مسرت و افتخار کا باعث ہے کہ ادارہ ادبیات اردو کے معتد عمومی جناب سید ہاشم علی اختر صاحب (آئی۔ اے۔ اس) ریٹائرڈ) کا تقرر جامعہ عثمانیہ کے واس چانسلیر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ہاشم علی اختر صاحب کی شخصیت حیدرآباد کے علمی، ادبی اور ثقافتی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ اردو زبان و ادب سے انہیں گہری دل چسپی اور لگاؤ رہا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے پرنسپل سکریٹری حکومت آندھرا پردیش کے عہدہ کی اہم ذمہ داریوں اور مصروفیات کے باوجود ادارہ ادبیات اردو کے معتمدی کی ذمہ داری قبول فرمائی اور اس ادارہ کی علمی، ادبی سرگرمیوں کو زندہ رکھنے اور نوسنہ دینے کی بھرپور کوشش کی۔

ہاشم علی اختر صاحب غیر معمولی ذہانت رکھنے والی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس پر بجا طور پر نابغہ اور جینس (GENIUS) کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد کے خلد قلعی گورہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب سید حنیف صاحب مرحوم اردو اور فارسی کے استاد تھے

لکھ کر پیش کیا تو ان کا خط دیکھ کر اماراؤ صاحب نے
 انہیں بیڑم ورک سے مستثنیٰ کر دیا اور کہا کہ اب وہ
 خوش نویسی میں اپنا وقت ضائع نہ کریں اور یہی
 وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف کریں۔ اس تحریک
 سے ان میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا اور انھوں نے
 اسکول کے کتب خانے کی ساری کتابیں ایک ایک کر کے
 پڑھ ڈالیں۔ ان ہی دنوں جناب فیض محمد صاحب
 صدر مہتمم تعلیمات (جو بعد میں ناظم تعلیمات حکومت
 حیدرآباد ہوئے) اسکول کے سائنس کے لیے آئے
 ہاشم علی صاحب کی جماعت میں پہنچ کر بچوں سے مختلف
 سوالات کیے لیکن ہاشم علی صاحب کے سوا کسی طالب علم
 نے جوابات نہیں دیے۔ اس کے بعد انھوں نے کتب
 خانے کا معائنہ کیا اور رجسٹر دیکھا تو معلوم ہوا کہ صرف
 ایک طالب علم کتب خانے سے استفادہ کرتا رہا ہے۔ انھوں
 نے اس طالب علم کو طلب کیا وہ ہاشم علی ہی تھے۔
 انھوں نے پوچھا کیا تم نے یہ ساری کتابیں حقیقتاً
 پڑھی ہیں۔ ہاشم علی صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔
 تو انھوں نے ایک کتاب نکال کر امتحان سوال کیا کہ
 اس میں کیا لکھا ہے۔ ہاشم علی صاحب نے اس
 کتاب کے موضوع کی تفصیل سنانی شروع کی۔ مہتمم
 تعلیمات بہت خوش ہوئے اور انھوں نے "انپکشن
 نوٹ" میں لکھ کر اس اسکول میں ایک طالب علم
 سید ہاشم علی کے سوا کوئی اور کتابیں نہیں پڑھتا۔
 ہاشم علی صاحب کے والد کا تبادولہ نظام آباد
 ہو گیا تو وہ بھی ان کے ساتھ نظام آباد چلے گئے
 اور ساتویں سے نویں جماعت تک وہیں کے

ہائی اسکول میں تعلیم پائی۔ اسکول کے صدر مدرس
 نادر خورشید مرزا تھے پھر ان کی جگہ عبدالسلام صاحب
 آ گئے۔ یہ دونوں صدر مدرس نہایت باورعب تھے
 اسکول کے سارے لڑکے ان سے خوف زدہ رہتے
 تھے۔ والد کے تبادولے کی وجہ سے وہ محبوب نگر
 چلے گئے اور وہیں سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔
 اسکول کے ہیڈ ماسٹر وینکٹ راؤ مانوی کر تھے
 جن کا ڈسپن اچھا تھا۔ اسکول کے اساتذہ میں
 قابل ذکر کاظم علی صاحب (سائنس) ناراین راؤ جٹا
 (انگریزی) حبیب احمد صاحب (ریاضی) ہدایت علی
 صاحب (جغرافیہ) تھے۔ ہاشم علی صاحب کی فطری
 ذہانت اور حصول علم کے شوق پر قابل ذکر اساتذہ
 کے فیض تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔
 میٹرک کامیاب کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں
 ہاشم علی صاحب نے جامعہ عثمانیہ میں انٹر میڈیٹ
 (سائنس) میں داخلہ لیا۔ وہ "سی" ہاسٹل کے
 چھ سال تک بورڈ رہ چکے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں صدر
 عریف طہام (سینئر فوڈ مانیٹر) اور ۱۹۴۴ء میں
 صدر عریف مکان (سینئر ہوز مانیٹر) رہے۔ جامعہ
 عثمانیہ ۱۹۴۴ء میں انٹر میڈیٹ، ۱۹۴۵ء میں
 بی۔ ایس۔ سی اور ۱۹۴۶ء میں ایم۔ ایس۔ سی
 حیوانیات (زواہجی) سے کامیاب کیا۔ اس
 زمانے میں داخلے کے لیے پرووائس چانسلر اور
 پرنسپل انٹرویو لیتے تھے۔ ہاسٹل کا خرچ صرف ۱۵
 روپیہ ماہانہ تھا جس میں سے ۵ روپیہ کھانے
 کے لیے اور بقیہ دو روپیہ میں کمرہ کار یاہ بھگت

جناب محبوب حسین بکری جو انٹینٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست منظور مصطفیٰ صاحب، سردار الہام صاحب اور رکن الدین حقان صاحب قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ قنیل صاحب نے اس زمانے کے ساتھیوں کے کیریکچر کھینچے ہیں یہ محسوس انھوں نے ہاشم علی اختر صاحب کے لیے کہا تھا:۔

چھلکتا ہے نگاہوں سے مری جودت کا پیام
ہے میری عمر سے آگے مرے اشغال زندان
نگاہِ سطح میں اکالے کھوٹے رنگ پر رت جا
میں ہر جھل کی شمع ہوں میں ہر شمع کا پروانہ
نزاع عقل و دل کی انجھنیں ہیں میرا فسانہ
یونیورسٹی چھوڑنے کے تیس سال بعد بھی وہ اس
زمانے کی یادوں کے جھروکوں میں سے جھانکتے
ہیں تو ڈاکٹر حفیظ قنیل کے یہ شعر انھیں یاد آتے ہیں:-

آہ کالج کی رنگیں زندگی
ایسے موندیوں کی ہر آشفستگی
اُن کا دل کش لطف جانے بے رخی
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

ایم۔ ایس۔ سی کامیاب کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ
سی کالج حیدرآباد میں زوالوجی کے لیکچرر مقرر ہوئے
میں نے ہاشم علی صاحب سے دریافت کیا کہ پھر کی
حیثیت سے آپ کا کیا تجربہ رہا ہے؟

ہاشم علی صاحب نے مسکراتے ہوئے ارشاد
فرمایا تجربہ کی نشیبت سے اُن کو اپنے ناکاروں کے
بار سے میں بہت اچھا تجربہ رہا ہے۔ ان میں بعض
اب بھی اُن کے سرکاری عہدے کی وجہ سے نہیں

ہیں۔ دھوبی اور حجام کی خدمات شامل تھیں اور گرم
پانی ملا کرتا تھا۔ اقامت خانے (ہاسٹل) کا فرنیچر
اور انتظامات بہت اعلیٰ درجے کے تھے۔ ہاسٹل
کے موب (دور ٹون) جناب شیو موہن لال صاحب
پروفیسر ہندو فلسفہ جامعہ عثمانیہ تھے۔ اُس زمانے
میں لڑکے شرارتیں بھی کیا کرتے تھے لیکن غنڈہ گردی
نہیں ہوتی تھی۔ کوئی ایک آدھ بے نگا سالہ لڑکا بھی
جاتا تو سینئر لڑکے اُس کو درست کر دیتے تھے۔

ڈانٹنگ ہال اتنا صاف ستھرا اور باسیلف تھا کہ
اُس پر کسی اعلیٰ درجہ کی رسٹورنٹ کا شبہ ہو سکتا تھا۔
دارالترجمہ کے باقاعدہ کام کرنے کی وجہ سے تقریباً
ہر مضمون کی اصطلاحات کا ترجمہ ہو چکا تھا۔

یونیورسٹی میں ہاشم علی صاحب جن اساتذہ
سے فیض یاب ہوئے اُن میں ڈاکٹر بی۔ کے۔ داس
صدر شعبہ حیوانات، ڈاکٹر ستیہ نارائن سنگھ
ڈاکٹر مہدی علی لکچرر زوالوجی، نباتات کے صدر
شعبہ پروفیسر سعید الدین، نباتات کے ریڈیو لبار
صاحب، ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر مہندر راج سکینہ
طبعیات کے پروفیسر وحید الرحمن صاحب، ڈاکٹر
این۔ رام لال، سید احمد قادری صاحب شعبہ کیمیا
کے اساتذہ ہیں۔ ڈاکٹر مظفر الدین (صدر شعبہ) کے
علاوہ محمود احمد خاں صاحب، شاہ محمد صاحب
اور خلیل الرحمن صاحب قابل ذکر ہیں۔

ہاشم علی صاحب نے ہاسٹل کے ساتھیوں میں
قابل ذکر اشفاق حسین صاحب، ڈاکٹر حفیظ قنیل
میر عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر روزنامہ سیاست

بلکہ شاگرد ہونے کی حیثیت سے ملتے ہیں۔

سعادت مندی اور گہری عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔

ڈھائی سال تک وہ اس خدمت پر فائز رہے۔ اس زمانے میں ہائی اسکول اور کالج میں ایسے اساتذہ جمع تھے جنہیں اپنے مضامین پر کامل عبور حاصل تھا۔ احمد حسین خاں صاحب اور ڈاکٹر حسین ظہیر جیسے نامور و ممتاز ماہران تعلیم پرنسپلوں کے دور میں آپ نے اپنی ڈھائی سالہ ملازمت نہایت وقار کے ساتھ انجام دی اور تمام اساتذہ و طلبہ میں مقبول رہے ان کے ہم عصر اساتذہ میں پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد صاحب، پروفیسر سید محمد صاحب، احمد عثمانی صاحب، احمد عبداللہ صاحب، میٹواری صاحب، غلام محمود صاحب، پروفیسر سراج الدین، ڈاکٹر ہمدی علی، ڈاکٹر عبداللہ، مسٹر سباحین اور ہوش دار خاں صاحب قابل ذکر ہیں۔ مولوی غلام رسول صاحب لائبریرین تھے جنہوں نے ہاشم علی صاحب کو لاتعداد کتبیں برائے کے لیے دیں۔

استاد کی حیثیت سے وہ اپنے طالب علموں میں بہت مقبول تھے لیکن وہ اس پیشے سے زیادہ

عرصہ تک وابستہ نہیں رہے اور ۱۹۴۷ء میں جیڈا بایئول سروسز رائج سہی۔ اس کے سابقہ امتحان شرکت کا اور بہ وجہ امتیاز کامیابی حاصل کی۔ یہاں بنا پر آپ کو "سیرکریجیری" کو لڈ ٹل دیانگ۔ ۱۹۴۸ء میں آپ کو آئی۔ اے۔ ایس کے

زمرے میں شامل کر لیا گیا۔

ایچ۔ سی۔ ایس کی تربیت تین سال کی مدت

میں ہوتی تھی۔ پہلا سال سیول سروسز ہاؤز میں بسر

ہوتا تھا اور ٹریننگ کلاسیں صبح چھ بجے سے

شام کے آٹھ بجے تک مسلسل ہوتی رہتی تھیں جس میں

قانون کے بارہ مضامین، بی۔ اے کے معیار کی معاشی

اور ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے سال چہارم کی کتاب

صحت عامہ (HYGIENE) کے علاوہ

گھوڑ سواری، رائفل پریکٹس اور پیر کی شامل تھے

ایک سال بعد ان سب مضامین کا امتحان ہوتا تھا۔

دوسرے سال ریاست حیدرآباد کے ان تمام محکموں

کی علی ٹریننگ ہوتی تھی جن میں سیول سروسز کے عہدہ داروں

کو آئندہ زندگی میں کام کرنے کا موقع دیا جاتا تھا اور

تمام متعلقہ محکمہ جاتی امتحان کامیاب کرنے ہوتے تھے

دو سال کی ٹریننگ کے بعد پروفیشنرز (PROBATIONERS)

(IONERS) کا مختلف محکموں کے لیے انتخاب عمل میں

آتا تھا جن میں مال، فنانس، آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس،

پولس، عدالت اور محکمہ ٹریڈ شامل تھے اس انتخاب

کے بعد پروفیشنرز کو برطانوی ہند کے کسی صوبے

میں مزید ٹریننگ کے لیے بھیجا جاتا تھا اور مال اور

پولس کی ٹریننگ آئی۔ پی۔ ایس اور آئی۔ بی عہدہ داروں

کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس سال بھی برطانوی ہند کے

وہ امتحان کامیاب کرنے پڑتے تھے جو حکومت ہند

کے متعلقہ عہدہ داروں کے لیے ضروری ہوں۔ تین

سال کے بعد ان کا تقرر عمل میں آتا تھا جہاں چ

ٹریننگ کے بعد ہاشم علی صاحب کا تقرر محکمہ کرورٹری

کے تہم (Custom Superintendent) (حیدر آباد اور بیٹر) دوم تعلقدار (اورنگ آباد) کتہ گورنمنٹ (نروڈ) اسپیشل سروس آفیسر برائے قبائلی اور بریجن ترقی (ملندو) کلکٹر حصول اراضی (حیدر آباد) کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (سریکا کلم اور تھم) معتمد گورنر (جناب مہیم سین سچر صاحب اور جنرل شری نگیس صاحب) ڈپٹی سکریٹری (محکمہ جات بلدیہ، اور جی۔ اے۔ ڈی پولیٹیکل) ناظم محکمہ جات پروٹوکول، سیول ڈیفنس، محکمہ توافح HOSPITALITY اور محکمہ شکر SUGAR رجسٹرار کو اپریٹو سوسائٹیز، کشتی (پوچھ پاؤ پر اجکٹ اور کمائڈ ایریا ڈیولپمنٹ) پرنسپل سکریٹری اور انچارج پروڈکشن کشتی اور پیرس کیشن استعمال آب پاشی جیسے جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے۔

۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی مساعی سے ادارہ ادبیات اردو کا قیام عمل میں آیا تھا۔ جس زمانے میں ہاشم علی صاحب گورنر آندھرا پردیش کے معتمد تھے ڈاکٹر زور کے پاس حاضر ہوا کہتے تھے۔ ڈاکٹر زور کی رحلت کے بعد ڈاکٹر مہندر راج سکینہ کی خواہش پر آپ نے ۲۸ جون ۱۹۷۵ء کو ادارہ ادبیات اردو کی اعزازی سفیدی قبول کی اور اس وقت سے اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔ گزشتہ سال ادارہ ادبیات اردو کی گولڈن جوبلی تقاریب ہاشم علی صاحب کی شخصی دل چسپی کی وجہ سے نہایت شاندار پیمانہ پر منائی گئیں۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو آپ بحیثیت چیئرمین برائے استعمال آب پاشی حکومت آندھرا پردیش کی جلیل القدر خدمت سے وظیفہ حسن خدمت پر سکے و ش ہوئے یہ عہدہ اڈیشنل سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے رتبہ کا تھا۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ "حیدر آباد سیول سروس" کے آپ آخری نمائندے ہیں۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۲ء کو ہاشم علی صاحب وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی خدمت پر فائز ہوئے۔ جائزہ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے قدیم اساتذہ پروفیسر شوموس لال صاحب مرحوم، پروفیسر جلیل الرحمن صاحب پروفیسر جہاں علی صاحب اور پروفیسر مہندر راج سکینہ صاحب کی قیام گاہوں پر پہنچ کر ان کی عائش حاصل کیں۔ ان سے ہاشم علی صاحب کی اساتذہ کے ساتھ گہری عقیدت اور سعادت مندی کا پتہ چلتا ہے۔ وائس چانسلر شپ کے جائزہ کے بعد کی ملاقات پروفیسر شوموس لال صاحب سے ہوئی تھی اس کے دس دن کے اندر شوموس لال صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ہاشم علی صاحب نے فرمایا "پروفیسر شوموس لال بڑے نیک آدمی تھے اگر میں ان سے ملاقات نہ کرتا تو زندگی بھر مجھ کو اس کا ملال رہتا۔"

سید ہاشم علی صاحب کے نام کا جزو اختر ہے میرے استفسار پر کہ کیا اختر آپ کا تخلص ہے؟ ہاشم علی صاحب نے چونکہ فرمایا میں یہ میرا عرف ہے میں نے کبھی شامی نہیں کی ہے۔ غالب علی

دو لڑکیاں اور ایک لڑکا عطا کیا ہے۔ بڑی لڑکی سلمہ ہاشم صاحبہ بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ایڈ ہیں ان کی شادی فاروق سلطان صاحب سے ہوئی جو عثمانیہ یونیورسٹی کے بی۔ اے ہیں۔ امریکہ سے انھوں نے ایم۔ بی اے کامیاب کیا ہے موصوف امریکہ میں بحیثیت انجینئر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سارہ صاحبہ بھی ایک امریکی اسکول میں پڑھاتی ہیں اور اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ امریکہ ہی میں مقیم ہیں۔

دوسری صاحبزادی سیما ہاشم صاحبہ بی۔ ایس سی (ہوم سائنس) ہیں ان کی شادی سید خواجہ شمیم صاحبہ بی۔ اے عثمانیہ سے ہوئی ہے۔ سید خواجہ رحیم اللہ صاحب نے امریکہ جا کر ایم۔ ایس کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اب امریکہ میں بحیثیت انجینئر کاروبار میں۔ سیما صاحبہ بھی ملازم ہیں وہ ایک امریکی دوغازہ میں بحیثیت ڈائیٹیشن (DIETITIAN) فہ انجام دے رہی ہیں۔

ہاشم علی اختر صاحب کے فرزند صدیق اور رضا نے ۱۹۷۳ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ امریکہ کی برکلی یونیورسٹی سے ایم۔ ایس کیا اور وہیں ایک بڑی فرم میں بحیثیت پراجیکٹ انجینئر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ہاشم علی اختر صاحب ساوگی پسند، خوش ذوق اور زندہ دل انسان ہیں ان میں افسرانہ رعوت باک نہیں ہے۔ محفلوں میں ان کی وجہ سے زندگی اور رونق آجاتی ہے ان کی گفتگو شائستہ، دل چپا معلومات آفرین ہوتی ہے۔ اپنے لطیفوں اور مزاح

اور محبوب میں مگر صاحبان نے اس حرف کو میرے نام کے ساتھ چسپاں کر دیا تب سے اختر میرے نام کا جزو بن گیا ہے۔

ہاشم علی اختر صاحب کی شادی ۱۹۴۸ء کو پیرسر اکبر علی خاں صاحب کے بڑے بھائی احمد علی خاں صاحب مرحوم انجینئر کی صاحبزادی افتخار النساء بیگم صاحبہ (عرفہ وجد) سے ہوئی۔

شادی کے بعد انگریزی مقولہ (AND LEVE EVER AFTER) کی

زندگی پر صادق آتا ہے۔ آپ کی ازدواجی زندگی مثالی کہی جاسکتی ہے۔ ہر بڑے انسان کی زندگی کو کامیاب اور بامعنی بنانے میں اس کی شریک

حیات اہم رول ادا کرتی ہے۔ ہاشم علی اختر صاحب کی سرکاری زندگی کی سخت مصروفیات اور لمبے لمبے دوروں کے باوجود ان کی رفیقہ حیات نہایت

خوش دلی کے ساتھ گھر کے سارے مسائل کو خود بنثاقی رہیں جس کی وجہ سے ہاشم علی صاحب کو کھوئی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض کو ادا کرنے کا موقع

مل سکا۔ ان کی رفیقہ حیات کی زبان پر کبھی خرف نکالیں نہیں آیا۔ گھر کی انتظامات میں شاید ہی

ہاشم علی صاحب کو دخل دینے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ ہاشم علی صاحب کے اوقات کار صبح ۵ تا ۱۲ بجے ہیں۔ شام ۵ بجے سے رات

کے ۱۲ بجے تک آپ اہل خاندان کے لیے وقت نکال لیا کرتے ہیں۔

ہاشم علی اختر صاحب کو خداوند کریم نے

حیدر آباد میں رہ گئے ہیں۔ "قومی کمیٹی" ایک قومی ضرورت کے عنوان سے ہاشم علی اختر صاحب نے ایک کتاب لکھی جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ یہی مضمون انگریزی میں بھی لکھا گیا ہے۔

کمانڈ ایریا اور آب پاشی (زرعی ترقی) کے بارے میں آپ کے کئی علمی اور تحقیقی مضامین ہندوستان اور بیرون ہند انگریزی جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ کمانڈ ایریا ڈولپمنٹ اور آب پاشی کے موضوعات پر آپ کی دو کتابوں کے مسودے تیار ہیں۔ ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج کی طرف سے یہ دونوں کتابیں شائع ہونے والی ہیں گورنمنٹ آف آندھرا پردیش کے زیر اہتمام آپ کی "آب پاشی کے استعمال" پر مرتب کردہ رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں جو دو جلدوں پر مشتمل ہیں۔ یہ رپورٹیں آپ نے "چیرمن آف کمیشن ایری گیشن" کی حیثیت سے لکھی ہیں۔ اشیاء میں آب پاشی پر یہ منفرد رپورٹ ہوگی جس کی اشاعت کا تقاضا بیرونی ممالک میں بھی ہو رہا ہے۔

ہاشم علی اختر صاحب نے ہندوستان اور بیرون ملک متعدد سیمیناروں میں شرکت کی اور اپنے مقالے پیش کئے جن میں قابل ذکر ورلڈ بینک، فوڈ اینڈ اگریکلچر آرگنائزیشن (روم) انٹرنیشنل رائس ریسرچ انسٹیٹیوٹ، اگریکلچر سوسائٹی (نیویارک) اور فوڈ فونڈیشن کی جانب سے منعقد کردہ سیمینار ہیں۔ آب پاشی کے مسائل پر ورلڈ بینک F.A.O. اور فوڈ فائڈیشن کے وہ مشرکہ چکے ہیں۔ انڈونیشیا کے آب پاشی پراجیکٹ پر اپنی ایک رپورٹ انھوں نے

فروں سے ایک زندہ دنی کی کیفیت اور فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ اشعار کی برجستہ تحریف کرنے میں بھی انھیں کمال حاصل ہے۔ ایک بار اردو مجلس کا جلسہ ہاشم علی اختر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں راقم الحروف نے ایک مقالہ اکر کی شاعری پر پڑھا تھا مقالہ میں اکر کے اس شعر کا بھی ذکر تھا کہ ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا ہاشم علی اختر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اس شعر کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ مزاحیہ انداز میں سنایا۔ ہاسٹل میں رہنے والے لڑکے اس شعر کو یوں پڑھتے ہیں کہ ہم بھوک سے مرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام وہ دال بھی دیتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا یہ شعر سن کر ہاشم علی صاحب نے محفل کو زعفران ڈال دیا۔ جب ان کے کسی دوست کی صاحبزادی کی شادی "ٹرنک کل" پر طے پائی تب ہاشم صاحب کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے دریافت کیا جناب مونوگمی، پولوگمی کی اصطلاحات تو ہم نے سنی ہیں اس شادی کو کیا نام دینا چاہیے۔ اس پر ہاشم علی صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ٹیل گمی"۔

ہاشم علی اختر صاحب اپنے آپ کو "فرانسیسی ادیب" خیال کرتے ہیں انھیں اتنی فرصت نہیں ملتی کہ اپنی خواہش اور مرضی سے کوئی مضمون تحریر کریں۔ آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد یا کسی ادارے نے فرمائش کی تو کسی طرح وقت نکال کر مضمون قلم بند کر دیتے ہیں۔ آپ کے نشریوں کے اکثر مسودے آل انڈیا ریڈیو

ورلڈ بینک کو بھیجی ہے۔ بیرون ملک آپ آٹھ بار سفر لے چکے ہیں۔ ۱۵ ملک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ سسکس (Sussex) یونیورسٹی کی دعوت پر انٹی میورٹ آف ڈیولپمنٹ اسٹڈیز میں تین ماہ فیلو کی حیثیت سے اسٹڈی کی ہے اور ایک کتاب کا مسودہ تیار کیا ہے۔

ہاشم علی صاحب کو اردو زبان اور اس کے مسائل سے گہری دل چسپی ہے۔ ۲۶ نومبر ۱۹۶۱ء میں ایچ۔ ای۔ ایچ۔ وی نظامس اردو ٹرسٹ کی جانب سے ”آئندہ ہر پریش میں اردو کے بائیس سال“ کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں ہاشم علی صاحب نے ”اردو کی بقا، ترویج اور ترقی کے مسائل“ کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔ اس مقالے میں بڑے اہم اور خیال انگیز سوالات اٹھائے گئے تھے۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے مقالے پر مفصل بحث نہیں ہو سکی تھی۔ اس مقالے کی اہمیت کے پیش نظر یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک سیمینار اسی موضوع پر منعقد کیا جائے چنانچہ اس موضوع پر ایک سیمینار ادارہ سب رس کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر گیان چند جین صاحب، صدر شعبہ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی نے کی۔

ہاشم علی اختر نے اس مقالے کو کلیدی خطبے کے طور پر پیش کیا۔ مباحث میں کئی دانشوروں، اساتذہ اور صحافیوں نے حصہ لیا اور اردو زبان کے مسائل کے بارے میں بہت ہی کھل کر اظہار خیال کیا گیا اس مقالے کی اہمیت کے پیش نظر انجمن ترقی اردو کے ترجمان ہفت روزہ

ہماری زبان میں اسے مکمل شائع کیا گیا تاکہ اردو تحریک سے تعلق اور دل چسپی رکھنے والوں کی رہنمائی ہو۔

اردو ذریعہ تعلیم کے بارے میں ایک استفسار پر ہاشم علی اختر صاحب نے بتایا کہ جامعہ عثمانیہ میں ساری تعلیم اردو ہی میں ہوتی تھی۔ دارالترجمہ کے باقاعدہ کام کرنے کی وجہ سے تقریباً ہر مضمون کی اصطلاحات کا ترجمہ ہو چکا تھا۔ اردو ذریعہ تعلیم کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ہے جامعہ عثمانیہ ہندوستان کی پہلی جامعہ تھی جہاں ہندوستان میں اردو ذریعہ تعلیم کا کامیاب تجربہ ہوا۔ حکومت کی سرکاری زبان اردو ہی تھی۔ لہذا سرکار کا کام کیسے اردو مددگار ثابت ہوئی۔ اردو ذریعہ تعلیم آج کل کے حالات میں شاید ملازمتوں کے حصول اور اپنے کام میں اچھی کارگزاری کے لیے مددگار ثابت نہ ہو۔ اس زمانے میں سیول سروس کے امتحانات کامیاب کرنے کے لیے انگریزی ضروری تھی۔ انگریزی کی وجہ سے اردو ذریعہ تعلیم سے فارغ التحصیل امیدواروں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

ہاشم علی اختر صاحب نے بتایا کہ حالات کے بدل جانے کی وجہ سے خود ان کے بچوں کی تعلیم انگریزی میڈیم سے ہوئی۔ بچے غالب اور اقبال کو نہیں سمجھ سکتے یہ ایک قسم کی ”ثقافتی“ بے مانگھی ”رکچل“ دینی تھی ابا میریکہ سے اب جو خطوط ان کے بچوں نوائے نواسیوں کے پاس سے آتے ہیں انگریزی میں ہوتے ہیں۔ اردو ہاشم علی صاحب کی دانستہ پس منظر ہے جسے ہندوستان کے عام لوگ بولتے تھے اور جو اس زمانے کے سرکاری رسم الخط میں لکھی جا چکی تھی۔ سرکاری زبان کے دوسری زبانوں پر

گہرے اثرات ہوتے ہیں چنانچہ اس وقت ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسی زبان ہے جس میں انگریزی کے الفاظ شامل نہ ہوں اسی طرح ہندوستان میں فارسی چھ سو سال تک سرکاری زبان رہی جس کی وجہ سے تمام ہندوستانی زبانوں میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ تگلو میں تقریباً کس ہزار اور ٹامل میں چار ہزار الفاظ پائے جاتے ہیں۔

موجودہ حالات میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو ضروری سمجھتے ہیں اس لیے کہ دنیا کے کسی بھی مضمون پر انگریزی میں بڑی تعداد میں کتابیں مل جاتی ہیں جب کہ کئی مضامین ایسے ہیں جن پر ہندوستانی زبان میں کوئی کتاب نہیں ملتی۔ انگریزی اس وقت بین الاقوامی زبان ہے۔ روس، جرمنی اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک بھی اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں اور وہاں یہ زبان پڑھائی جاتی ہے۔ مقامی سرکاری زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے تو یہ کوشش ہونی چاہیے کہ مادری زبان لازمی طور پر زبان دوم کے طور پر رکھی جائے۔ برطانوی حکومت کے دور میں مدراس اور آندھرا کے علاقوں میں اردو و الہی کے لیے یہ سہولت حاصل تھی۔ ایسے مقامات پر جہاں انگریزی زبان کی تعلیم کی سہولت حاصل ہے انگریزی میں بھی تعلیم مل کی جاسکتی ہے لیکن سرکاری زبان کو کبھی انداز نہیں کیا جانا چاہیے ایسا کرنے سے حکومت اس کے ہزاروں کارکنوں سے جن سے ہر شخص کو بچہ پڑتا ہے ربط ختم ہو جاتا ہے۔ سرکاری زبان، عدم واقفیت قومی دھارے میں شامل ہونے

میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ موجودہ زمانے میں طلبہ میں بڑھتی ہوئی دلچسپی دشمنی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ طلبہ سیاست میں حصہ لینے لگے ہیں۔ آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں طلباء سیاست میں حصہ لیتے تھے اس کے باوجود اس وقت دلچسپی نہیں ہوتی تھی بلکہ ہر محسوس ہوتا ہے کہ آج جو سیاست ہے اس میں اخلاقی تدبیر باقی نہیں ہیں اس کی وجہ سے اس کا طلبہ پر برا اثر پڑتا ہے آج کل اساتذہ طلبہ میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ بعض اساتذہ ایسے بھی ہیں جو اپنے مضمون میں کمزور ہیں اسی لیے وہ طلبہ سے ڈرتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ اساتذہ جو اپنے مضمون پر حاوی ہیں اور پڑھانے میں مہارت رکھتے ہیں ان کی عزت آج کے دور میں بھی ہوتی ہے۔ طلبہ کے چھوٹے چھوٹے گروہوں سے اساتذہ کو ربط پیدا کرنا چاہیے تاکہ باہمی تعلق برقرار رہے۔ ایک بڑے مجمع سے شخصی تعلق نہیں پیدا کیا جاسکتا طلباء کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد پوچھنے کا ربط اور کھیل کے میدان میں اساتذہ کو خود جا کر شخصی ربط پیدا کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ سے کم از کم طلبہ کے طلبہ بڑی اخلاقی بہتری ہو سکتے ہیں۔ بیس سال قبل جو سیاسی رہنما کا کردار تھا وہ اب نہیں رہا ہے اس دور کے بے لوث اور اونچے کردار کے رہنما نظر نہیں آتے جیسے آزادی ہندوستان کی جدوجہد میں ہم کو نظر آتے ہیں۔ تعلیم، تربیت اور نمائندگی کی غیر

نذرانہ سخن

(جناب ہاشم علی اختر صاحب دامن چاند عثمانیہ یونیورسٹی ہونے کی مسرت میں)

خندہ لب خندہ دہن ہاشم علی اختر بنے
زندگی کا پانچمین ہاشم علی اختر بنے
اعتدار جوئے گل مائل انھیں ہے آج تک
صورت رنگ چین ہاشم علی اختر بنے
گر گھڑی ہر مرحلے پر باکمال و با مراد
عزم و ہمت کی لگن ہاشم علی اختر بنے
کامیاب و کامراں ہوتے گئے ہر باب میں
کامیابی کا جین ہاشم علی اختر بنے
ہر نظر ہے آپ کے نظم و نسق کی معترف
اہل دل کا حق ظن ہاشم علی اختر بنے
قومی یکجہتی کا جیتا جاگتا کردار ہیں
ربط شیخ و برہمن ہاشم علی اختر بنے
شاعری و انشوری کی سیرتی کے سبب
روحی بزم سخن ہاشم علی اختر بنے
ہے وجود ان کا مثال صورت دانش کدہ
ذات سے خود انجمن ہاشم علی اختر بنے
کارنامے ان کے عظمت کی نشانی بن گئے
عظمت ارض و کن ہاشم علی اختر بنے
جامعہ عثمانیہ کی سربراہی مل گئی
احترام علم و فن ہاشم علی اختر بنے
ان کے بارے میں اکہارِ حسن جامی بنے بجا
حرمت و فخر وطن ہاشم علی اختر بنے

رکھنے کے علاوہ عصری تعلیمی مسائل پر گہری نظر رکھتے
ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کامیاب ایڈمنسٹریٹر بھی
ہیں۔ یقین ہے کہ ان کے دور میں عثمانیہ یونیورسٹی
حیات نو طے گی نہ صرف علمی معیار میں اضافہ ہوگا
بلکہ

موجودگی میں جو طلبہ کے عام معیار میں انحراف ہے اس
کے لیے محض طلبہ کو ذمہ دار قرار دینا ٹھیک نہیں ہے
دیے بھی تعلیم اتنی تیزی سے عام ہوئی ہے کہ بہت
سے لڑکے ایسے ہیں جو اپنے خاندان میں پہلے تعلیم یافتہ
ہیں اور اکثر دیہات کے طالب علم ہیں جن سے اخلاق
و رہنمائی کے معیار کی امید نہیں رکھی جاسکتی تاہم
ساندہ اس جانب خاص توجہ نہ کریں۔

تعلیمی نظام میں محض علم کی خاطر علم حاصل
کرنے کے چند کورس ہیں مثلاً فلسفہ، تاریخ وغیرہ
اور بعض کورس روزگار پر مبنی تعلیم (JOB
ORIENTE) کے ہیں جیسے انجینئرنگ اور ڈاکٹری
لسفہ اور تاریخ کے مضامین کامیاب ہونے والے
طلبہ کے لیے ملازمتوں کا حصول مشکل ہے اس لیے
اعلیٰ درجہ کے سابق امتحانات میں جس قسم کے
سوالات پوچھے جاتے ہیں وہ شاید شمال ہند کی
وچار یونیورسٹیوں کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں
کے عام نصاب سے مختلف ہیں۔ ہمارے ملک نے
منطقی طور پر اپنی ترقی نہیں کی ہے کہ روزگار پر مبنی
کورس کے فارغ التحصیل تمام طلباء ملازمت حاصل
کیں۔ اس لیے بہت سے لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل
کرنے کے بعد جس احساسِ ناکامی (FRUSTRATION)

سے دوچار ہوتے ہیں وہ اتنا شدید
نہ ہوتا اگر ان کی تعلیم کم درجہ پر ختم ہو جاتی اس لیے
کہ انھیں اپنے طالب علمی کے زمانے کے خوابوں کی
تعبیر نہیں ملتی۔

سید ہاشم علی اختر صاحب تدریس کا تجربہ

بہ سرت تقرر جناب سید ہاشم علی اختر صاحب آئی ایس
(ریٹائرڈ) برصغرت و اُس چاندلری عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

نظم تہنیت

قطعات ریح

سرت کی گھڑی تقدیر لے آئی مبارک ہو
بچی پھر جھوم کر اک بار شہنائی مبارک ہو
خدا نے نیک ساعت خجھ کو دکھلائی مبارک ہو
یہ قدرت کی ہے یہ کار فرمائی مبارک ہو
ہستے پھول کی مانند تیری زندگانی ہے
گلستان سرت پر گھٹا چھائی مبارک ہو
ترے چھونے سے ہلکی اور کھل کر زلف اردو کی
تجھے مشاغل کی حسن رعنائی مبارک ہو
ہیں بختے جاں بلبل ملات کے قرب جوانب میں
تجھے اے خضرؐ رہ ان کی مسیحائی مبارک ہو
چھکادے سارے میخوار کو دے کر بادۂ الفت
خوابات کہن کا جام مینائی مبارک ہو
وہی آغوشِ مادر جس نے تیری پرورش کی تھی
بعد ارمال ہوئی تیری تمنائی مبارک ہو
مبارک جامعہ کو تیسرا ذوقِ بزم آرائی
تجھے یہ جو ہر ذاتی و آبائی مبارک ہو
تقرر کی بہاریں بھی ہیں شامل ساتھ پیش کے
زیلچا کی جوانی لوٹ کر آئی مبارک ہو
بنے ہاشم علی اختر ہیں دی۔ سی۔ شان سے
مردس علم کو فن کی مسند آرائی مبارک ہو

شکرِ کرم چوں شنیدم شرۂ نیکو پگاہ
آسمان گوہر بہار داز شجوم جامعہ
مصرعہ تاریخ صاحبِ گفتہ ام روشن بہر
بزمِ انجمن تبریر سربابِ علوم جامعہ

مے کے کھلنے

شہید آزادی بھگت سنگھ اور اردو

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفبت
سیری مٹی سے بھی خوشبو ملے وطن آئے گی

جلی لاشوں کو دریا سے نکالا گیا اور انہیں رسم و
رواج اور عزت کے ساتھ آگ کے سپرد کیا گیا انقلاب
زندہ یاد اور بھگت سنگھ راج گرو سنگھ دیو زندگی
کے نعرہ کی گونجوں سے آسمان کانپ اٹھا لیکن
دیوتاؤں نے پھول برسائے۔ دریائے ستلج کا کنارہ
ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر آج ایک تیرہ
ہے جہاں سربراہ گیر اور مسافر شہید خرم کر کے گذرتا
ہے بھگت سنگھ ایک فرد نہیں تھے بلکہ ایک تحریک
شمع آزادی۔ انقلاب کا امام کہا جاتا ہے
بھگت سنگھ کا نام لیتے ہی بزدل، بزدل نہیں رہتے
۳۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو لاہور سنٹرل جیل سے بھگت
نے اپنے چھوٹے بھائی کلثا سنگھ کو ایک چٹھی لکھ
عزیز کلثا۔

آج تہملی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر
رنج ہوا۔ آج تمہاری بات میں بہت درد تھا
آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ برخوردار
سے تعلیم حاصل کرتے جانا اور صحت کا خیال رکھنا

یہ وہ نذر ہے جو بھگت سنگھ نے چھانی
پر گلے سے پہنے لایا تھا۔
یوں تو سر فریسی کی تمنا ہمیشہ ہی سے بھگت سنگھ
کے دل میں موجود تھی لیکن ۲۳۔ مارچ ۱۹۳۱ء کی شام
کو سات بج کر ۳۳ منٹ پر اس تمنا کی تکمیل لاہور
سنٹرل جیل میں ہوئی اور بازو سے قاتل نے اپنا
زور دکھایا۔ تین شہیدوں کی نعشوں کو جیل کی پہلی
دیوار توڑ کر کے ایک فوجی ٹرک میں بوریوں میں بند کر کے
دریائے ستلج کے کنارے حسینی والا کے مقام پر پل
کے نیچے مٹی کے تیل سے جلادیا گیا۔ آدھ جلی نعشوں کو
دریا میں پھینک کر پولیس کے افسر واپس لاہور چلے
گئے۔ کیوں کہ صبح ہونے سے پہلے انہیں واپس
پہنچنا تھا لیکن رات کے اندھیرے اور سناٹے
نے بھی بھگت سنگھ کے ساتھ ہی دم والے گاؤں
کے لوگوں نے فضا میں جب شعلے اور انگارے دکھے
تو جوق در جوق دریا کے کنارے پر جمع ہونا شروع ہوئے
یہ خبر لاہور اور فیروز پور میں کل کی طرح پھیل گئی آدھ

رکھنا۔ اور کیا لکھوں چند شعر لکھے ہیں مزید کیا لکھوں۔
سنو

اُسے یہ فکر ہے ہر دم نیا طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق دیکھیں اب تم کی انتہا کیا ہے
کوئی دم کا مہمان ہوں اہل محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
میری ہوا میں رہے گی خیال کی بجلی
یہ میرٹ خاک ہے فانی رہے رہے رہے
اچھا اجازت۔ خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
حومے سے رہنا۔ نیست۔ تمہارا بھائی بھگت سنگھ
ایک اور خط میں بھگت سنگھ نے لکھا سنگھ
کو چند بڑے دردناک شعر لکھے تھے جن کا مطلب
مندرجہ ذیل تھا۔

صبح کی کرنوں کو کون روک سکتا ہے۔ اگر تمام
دنیا بھی ہماری دشمن ہو جائے تو کوئی طاقت بھی نہیں
نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ میری زندگی کے دن ختم
ہو چکے ہیں۔ میں ایک شمع کی طرح صبح کی روشنی کی
گود میں ختم ہو رہا ہوں۔ ہمارے ارادے اور خیالات
بھونکی کڑاک کی طرح دنیا کو روشن کریں گے۔ اس
حالت میں بڑھتی بھرتی برباد بھی ہو جائے تو اس
ڈرنا کیا بات ہے۔

عین پھانسی کے روز یعنی مارچ ۲۳-۱۹۳۱ء
بھگت سنگھ کے جیل سے بھاگنے کی بات بھی جیل میں
اٹھی تھی اور اس کے بارے میں ان سے پوچھا گیا
جواب میں انہوں نے لکھا تھا۔

جینے کی تمنا تو قدرتی طور پر سب میں ہوتی ہے
اور وہ تمنا مجھ میں بھی ہونی چاہیے۔ میں اُسے چھانا
نہیں چاہتا۔ مگر میں قید ہو کر یا کسی پابندی کے تحت
زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میرا نام ہندوستانی انقلاب
میں ایک نشان بن چکا ہے انقلاب پارٹی کے اصولوں
اور قریبیوں نے مجھے بہت ادب بچا کر دیا ہے۔ زندہ
رہنے کی حالت میں میں اس سے زیادہ ادب چاہیں
جاسکتا۔ میرے ہستے ہستے پھانسی پر چڑھ جانے سے
ہندوستانی مائیں اپنے بچوں کو بھگت سنگھ بننے کو
کہا کریں گی۔ ملک پر قربان ہونے والوں کی تعداد
اٹنی بڑھ جائے گی کہ شاید انقلاب کے اس سیلاب
کو روکنا ناممکن ہو جائے گا اور ان کی شیطانی
توپور کے بس کی بات نہ رہے۔

پھانسی سے بچنے کی میرے دل میں کوئی تمنا
نہیں ہے مجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا۔ مجھے
آج کل اپنے آپ پر بہت ناز ہے اور میں اپنے آخری
لمحوں کا بڑی بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔
امید ہے کہ میرا آخری وقت اور قریب ہو جائے گا۔
درج ذیل گانا وہ اکثر گایا کرتا تھا۔ یہی گانا
اُس نے جیلوں میں گایا اور پھر چلا پھرنے پر پھانسی پر لٹ گیا۔

شرِ فروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازو قاتل میں ہے
وقت آنے پر بتائیں گے تجھے یہ آسمان
ہم ابھی سے کیا بتائیں کہ ہمارے دل میں
اُسے شہید ملک و ملت میں میرے اوپر مشابہ
اب تیری ہمت کا چرچا فکر کی محفل میں ہے

حیدر آبادی تہذیب

سے اخذ کیا گیا ہے جو اس Root work سے تعلق ہوتا ہے۔ یہ تہذیب جہن بند ہے۔ تہذیب کا تعلق اس مقام کا INTELLECTUAL اور اخلاقی ماحول علوم و فنون تہذیب و رسوم اور انسانیت سے ہے یہ سب اور بہت سی اور اہم چیزیں اس میں ہیں جو میراث کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ یہ میراث ایک بیش بہا خزانہ ہے جس کی قوت اور خصوصیت پشت در پشت اور ایک دور سے دوسرے دور تک چلی آتی ہے۔ اور جب تک قوم میں کمزوریاں خصوصاً اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جائیں اس تہذیب میں جان اور زندگی جولاں کرتی رہتی ہے اس کو HERITAGE اور TRADITION

ہی کہتے ہیں۔ ہماری بول چال، اٹھنا بیٹھنا، رسم و رواج یہ سب ہماری تہذیب میں شریک ہیں لیکن تہذیب کی جز اور بنیاد اخلاق اور انسانیت ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ حیدر آباد کی تہذیب دوسروں سے بہتر یا بالا ہے۔ کسی قسم کی برتری یا SUPER- LOTY مقصود نہیں۔ لیکن جیسے گڑی میں کہتے ہیں DISTINCTION WITHOUT A DIFFERENCE یہ امتیاز اور خصوصیت حیدر آباد کو کمزور حاصل ہے۔

مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ ہماری حیدر آبادی تہذیب کے متعلق کچھ کہوں۔ اس جلسہ میں میرے بہت سے دوست اور صاحب علم و فن موجود ہیں جن کی معلومات اس موضوع پر مجھ سے زیادہ ہیں اور وہ اس پر بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ لیکن محترم دوست ہاشم علی اختر صاحب اور میرے بزرگ نواب اکبر علی خاں کی بات مانا نہیں سکتا۔ نواب صاحب خود ہمارے حیدر آباد کی تہذیب کی اعلیٰ ترین مثال اور نمونہ ہیں۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تہذیب اور تمدن میں تیزی ملتی ہے بلکہ تہذیب تمدن کا ایک جز ہے اور ہماری حیدر آبادی تہذیب ہندوستان کے قدیم تمدن سے وابستہ ہے۔

تہذیب کو کسی عمارت کی طرح تیزی سے تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی مثال ایک درخت سے لگائی جاسکتی ہے۔ زمین محنت سے تیار کرنی پڑتی ہے۔ بیج بویا جانا ہے۔ پودا اگنا ہے۔ و انتہائی حفاظت کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ اپنے شباب و کمال کو پہنچے اور پھول اور پھل سے اس قطعہ زمین کو فیض پہنچائے۔ اور اگر ہم تہذیب کا ترجمہ لکھ کر دیں تو یہ لفظ خود CULTIVATE

عہد میں مستحکم ہوتی گئیں۔ ہماری تہذیب ان ہی بزرگوں کی عملی زندگی اور تاریخ کی دین ہے۔ اور اس میں امیر غریب سب شریک ہیں دیکھیے اس تاریخی جملہ میں کس شان سے محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی حید محل آتے ہیں۔ ذرا دوسری طرف نظر ڈالیے ملک دکن اور دلوں کے بادشاہ نواب محبوب علی خاں علوہ افروز ہیں داغ اور سر جوئی نائیڈو کی شاعری سے سرور ہو رہا ہے میں اور خود اپنے کلام اور عمل کے محبت اور اتحاد شقائق اور انسانیت کی بے نظیر مثال پیش کر رہے ہیں۔ اور آگے دیکھیے سالار جنگ اولیٰ نظر آئیں گے جن کے سر جدید حیدر آباد کا سہرا ہے اور جن کے پوتے سالار جنگ سوم کے نوادرات کا جو میوزیم ہمارے شہر میں قائم ہے عالمی شہرت پا چکا ہے۔ اب جس سمت نظر اٹھائیں گے اس جلسہ میں امرا۔ روشن خیال عہدہ دار، والیان سمنان اور حیدر آباد کے مشہور ہندو مسلمان گھرانوں کے نمائندے دکھائی دیں گے جنہوں نے اپنے علم اور سیاست اور وفاداری اور وضع داری سے سے ہماری تہذیب کو مالا مال کر دیا ان میں آپ جباراج کشن پرشاد کو دیکھیں گے جن پر حیدر آباد کو ناز ہے۔ اب اس بات میں سب کو اتفاق ہے کہ اردو کی نظم موجودہ نے دکن میں پور کیا چنانچہ میر تقی میر نے بھی ایک غزل میں اشارہ کیا ہے

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم پر سختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

وہی کے ساتھ ہم نظم بلبلان، میوہی عبد الحق، سر جوئی نائیڈو، سیدین بکرا کی عزیز جنگ، آغا نظامت جنگ

چوں کہ تہذیب کا تہری تعلق تاریخ سے ہے - His TORICAL DEVELOPMENT کے سلسلہ میں اس موقع پر اگر میں چند مثالیں حیدر آباد کی تہذیب کی پیش کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ سچ ہے: میراث پدر خواہی علم پدر آموز ہماری تہذیب کی حرفوں میں تصویر کھینچنی مشکل ہے اور اس پر میں اس رنگ کے الفاظ کہلا سے لاؤں ہمارے بزرگ جو حیدر آباد کی تہذیب کے روح و جان تھے ان کی جیتی جاگتی بولتی چالنی تصویر کھینچ دکھاؤ ہی لوگ جنہوں نے حیدر آباد کو تہذیب کا گہوارہ بنایا۔ آزاد کے الفاظ میں ادب کی آنکھ ان کی متانت پر نظر نہیں اٹھا سکتی اور محبت کی آنکھ ان کی پیاری حالت سے نگاہیں نہیں ہٹا سکتیں۔ یہ وہ جملہ ہے جو شاہان، مانت، علماء، امرا و شرفاء سے آراستہ ہے معقول معقول بد سے اور جوان اس محفل میں نیم جاہ۔ یا جامہ دار شروانیاں اور جامہ زیب کپڑے پہنے دستار یکڑی باندھے میٹھے ہیں کوئی کٹاوی لگا ئے بے کوئی سیف کٹن سال ہیں کہ جن کے بڑھاپے کو سفید رادھی نے نورانی کیا ہے اور اس پر خوش مزاجی حال پوچھے ہی نہیں۔ ایک طرف قطب شاہیوں کے شاندار کارنامے اور مشہور بادشاہ اور صاحب کمال نظر آتے ہیں تو دوسری سمت نظام الملک آصف جاہ اول نجم پنا وطن بنایا۔ اور یہاں کے نامور بادشاہ اور وہ امرا اور وفادار گروہ جو ان کے ساتھ وہی سے یہاں آئے کر حیدر آباد کو اپنا وطن بنایا اور یہاں کے مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر شیر و شکر ہو گئے۔ محبت اور یکانگت اور یک جہتی کی بنیادیں ڈالیں اور ہر

لاکھ زور جلیل، مخدوم اور وجد شاد نکلتے کنول
 رشاد کنول کو دیکھتے ہیں اور ذاکر حسین صاحب بھی تو
 مارے ہی تھے۔ جناب صدر! میں نے تو صرف چند
 ام لچے ہیں ورنہ ہمارے علماء ادیب و شعرا اور
 فن دان کی فہرست سے ایک مکمل کتاب بن سکتی ہے
 ان ہی کے اظہار خیال اعلیٰ قابلیت اور اخلاص فکر
 ادب کا جادو جگاتے ہیں۔ ان ہی بزرگوں کی زندگی اور
 نو علم کا ذخیرہ وہ چھوڑ گئے ہیں ہماری تہذیب کی میراث
 ہے اور ہمارے CULTURE کی عکاسی کرتی ہے۔
 نصف جاہ سابق کے عہد میں دوسری ترقیوں کے علاوہ
 جامعہ عثمانیہ کی تعمیر اور اس یونیورسٹی میں اردو کا نظام
 بنایا گیا۔ شان دار اور تاریخی کارنامہ ہے۔ آرٹس
 باغ کو دیکھیے فنی لحاظ سے یہ عمارت اسلامی اور ہندو
 طرز تعمیر کا حسین امتزاج ہے۔

یہ تاریخی قلعہ گوگنٹھہ اور اس کی دیواریں
 درکھنڈر ہم سے بہت کچھ کہہ رہی ہیں اگر مہ سیں۔
 اس وقت روح اللہ خاں شہنشاہ عالمگیر کا فوجی کمانڈر
 ۱۷ ماہ کے زاید محاصرہ کے بعد قلعہ میں داخل ہوا تو
 عبداللہ اف لاری جو قطب شاہیوں کے آخری بادشاہ
 ابوالحسن کے جنرل تھے دس یا بارہ سپاہیوں کے
 ساتھ مثل فوجوں کے ہجوم کا مقابلہ کیا سترہ سے زیادہ زخم
 لگے اور ایسی دلیری اور فداکاری کا ثبوت دیا جس کی
 قدر اور نگ زیب نے بھی کی اور اپنے خاص اطہار سے
 ان کا علاج کروایا۔ اسی طرح ابوالحسن نے بھی شاہانہ
 دلیری و شہادت اور بربداری سے کام لیا۔ اس حادثہ میں
 میں آپ ہماری تہذیب کی جھلک پائیں گے جو شکست

کے خطرناک موقع پر اخلاق و انسانیت کو ہاتھ سے نہ جانے
 دیا۔ ایوان دربار میں جب منہ افسردہ مل جوتے تو ابوالحسن نے
 انھیں اپنے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے کی دعوت دی۔
 ان میں سے بہت سے جو بادشاہ کو گرفتار کرنے آئے تھے
 بادشاہ کے اعلیٰ اخلاق سے شرمندہ ہوئے۔ پھر بادشاہ
 نے انہی بربداری سے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شہزادہ عالم
 اور عالمگیر سے ملاقات کی۔ آپ کو یاد ہوگا گزشتہ سال اسی
 یوم محمد علی قطب شاہ کے موقع پر نواب اکبر علی خاں نے اپنی
 تقریر میں ایک واقعہ کی طرف توجہ دلائی تھی کسی تنگ نظر
 شخص نے محبوب علی بادشاہ سے جا کر کہا کہ آپ کے باورِ خفا
 پر ہندو مت کا رکھنا سنا سب نہیں۔ انھوں نے حکم دیا کہ متم
 صاحب برقرار رہیں گے کیوں کہ سرکار کو ان پر پورا اعتماد ہے
 اور وہ شخص جس نے تفرقہ دار شبہ اور فساد پھیلانے کی
 کوشش کی تھی دربار سے نکال دیا گیا۔ یہ وہ بادشاہ تھے
 جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دوائی نکھیں قصہ کرتے تھے۔
 قطب شاہوں اور آصف جاہی حکمرانوں نے مل کر
 کم و بیش چھ سو سال دکن پر حکومت کی اور یہاں کی تاریخ کی بڑی
 خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک ملی لنگا جمنی تہذیب نے
 جنم لیا جس کی ساخت میں یہاں کی آبادی کے مختلف عناصر
 برابر شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر زمانے میں
 مختلف طبقات میں اتحاد و ارتباط نظر آتا ہے کچھ عرصہ
 قبل تک باہر سے آنے والے کوتیا نہیں چلتا تھا کہ کون ہندو
 ہے اور کون مسلمان۔ لوگوں کی صورت اور معاشرت میں
 بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک
 واقعہ یاد آتا ہے۔ ہم اردم منزل میں رہتے تھے۔ میرے چچا
 نواب شاہ نواز جنگ بیمار تھے۔ ان کو دیکھنے ان کے عزیز

کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شہر ہندوستان میں بے مثل ہے۔
اسی طرح فرانسیسی سیاحوں میں TARENIER

نے یہاں کے لوگوں کی سلیقہ مندی کو سراہا ہے
خواص خاں لکھا ہے کہ اگر حیدر آباد کی طاعت کا ذکر
تفصیل سے کروں تو ان کی خوبیاں بیان کرنا میری
دسترس سے باہر ہے یہ دکن یہ ہمارا شہر سب کو
اپنا گردیدہ بنا لیتا ہے۔ زمانے نے بہت سے
پہلے کھائے۔ حالات بدل گئے لیکن یہ تہذیب
بہت کچھ کمزور ہونے کے باوجود باقی ہے اور باقی
رہے گی جس طرح یہ ہمارا شہر باقی رہے گا اور انشاء اللہ
پھر رشک جہاں بنے گا۔ یہ ہماری زمین ہے جس سے
ہماری بہترین روایتیں صدیوں سے وابستہ ہیں اسی
سے ہماری بزرگ ہستیوں نے جنم لیا اور آپ ہم سب
اسی کے شہر ہیں۔

تیری اک مثبت خاک کے بدلے؛ ہوں نہ ہرگز اگر بہت ملے
دیوم محمد علی قطب شاہ کے افتتاحی اجلاس منعقد ہوئے اور پڑھا

انی شہر سلطان محمد علی قطب شاہ	
اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی شخصیت	
اور وزیر حکومت پر ڈاکٹر زور کی مرتبہ دو کتابیں	
نذر محمد علی قطب شاہ	معانی سخن
باتصویر ۲۵ صفحاں	(انتخاب کلام مع بسط و مفاد)
قیمت ۱۱/۱۰ روپے	۱۲۰ صفحات
قیمت ۵ روپے	ناشر
ادارہ ادبیات اردو "ایوان اردو حیدر آباد - ۴"	

دوست راجہ نارائن پرشاد جو ہمارا راجہ کشن پرشاد کے قریبی
رشتہ دار تھے تشریف لائے مجھ سے کہا گیا کہ ان کو موٹر
سے انارکرا اوپر لے آؤں۔ سیرٹھیوں پر راجہ صاحب کا پیر
پھلا اور ان کی زبان سے بے ساختہ Spontaneously
یا علی نکلا۔ اور پھر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ۲۰ سال
گزر گئے لیکن اب بھی میں اس واقعہ سے متاثر ہوں۔ حال
ہی میں سارے ملک میں ہولی منائی گئی۔ جب ہم ارم منزل
میں رہتے تھے محل کا بڑا حوض رنگ سے بھر دیا جاتا تھا اور
فخر الملک کا خاندان اس تہوار کو اپنا سمجھ کر منایا کرتا تھا
جاگزی سپاہی جو ارم منزل پر پہرہ دیتے تھے ان کے افسر
سکھ تھے اسی طرح پانی اور بجلی کا انتظام سکھ ملازمین کے
ہاتھ تھا اور اسی طرح حیدر آباد کے دوسرے گھروں
میں بھی ہولی ڈوبوالی دسہرہ اور عیدین مسلم اور ہندو مل کر
منایا کرتے تھے۔

محم میں بابی کے علم کو ہمارا راجہ کشن پرشاد دھڑکتی
باندھا کرتے تھے اور عید کے موقع پر ہم سے ایسے ہی
متے تھے جیسے دوسرے بزرگان خاندان ہم سے ملا
کرتے تھے۔

جناب صدر۔ میں نے حیدر آباد کی تہذیب
کے متعلق جو چند باتیں کہی ہیں یہ شاید اب ایک یاد ہو کر
رہ گئیں ہیں ہماری تہذیب ڈاکٹر یوسف حسین کے الفاظ
میں صدیوں کے تاریخی عمل کا نتیجہ ہے اور اس کی پرورش
اور نشوونما اہل دکن کے دیرینہ رہن سہن میں جوں سے
جواستہ ہے۔ حیدر آباد کی تہذیب اور شہریت اور یہاں
کتاب دہوا کی اینوں اور پرائوں سب نے توفیق کی
ہے فرشتہ جو محمد علی قطب شاہ کا ہم عصر تھا حیدر آباد

نواب میر محبوب علی خاں کے دور کے چند ادیب اور شاعر

نواب میر محبوب علی خان آصفیہ سادس
کے بیالیس سالہ دور (۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء) کو سوا
دو سو سالہ آصفیہ دور حکومت (۱۷۲۴ء - ۱۹۴۸ء)
میں دیے ہی امتیاز حاصل ہے جیسے کہ خلافت عتبات
کے دور حکومت میں خلیفہ ہارون رشید کے دور
کو۔ اس دور میں عوام کو امن و امان اور ذہنی سکون
ملا اور مستوطن ہو کر مالی خوش حالی اور فراخ البالی
میسر آئی۔ ان کے دور میں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا
جس میں حیدر آباد نے غیر معمولی ترقی نہ کی ہو۔

بادری زبان میں ذریعہ تعلیم دانی جامعہ کے
قیام کا خیال اسی دور میں پیدا ہوا۔ شیخ احمد حسین
رفعتیہ یار جنگ اتول دہلوی کا مقصد انگریزی نے ۱۸۵۰ء
میں بھر دو ان ملک کے نام اپنی شائع کی جس میں
مردہ تعلیم کی خامیاں دکھا کر ایک جامعہ العلم کے
قیام کی تحریک کی گئی تھی۔ انھوں نے انگریزی کو ذریعہ
تعلیم بنانے کے متعلق یہ پراپیجے دی کہ اگر انگریزی
زبان کی تعلیم ضروری خیال کی جائے تو اس کا انتظام
کیا جائے وہ مردہ تعلیم کی حیثیت سے انگریزی
زبان کا استعمال باعث الفتنہ اوقات ہے۔

اس کے علاوہ جلسہ کے قیام کے مقصد میں سید جمال الدین افغانی کا بھی دخل معلوم ہوتا ہے۔ جمال الدین افغانی ستمبر ۱۸۷۹ء میں حیدرآباد آئے تھے۔ ۱۳۔ ستمبر ۱۸۸۳ء کو بلنٹ کی ملاقات سید جمال الدین افغانی صاحبزادہ میں ہوئی بلنٹ حیدرآباد آئے اور پھر کلکتہ گئے اور ۲۔ جنوری ۱۸۸۴ء کو انجمن اسلامیہ کلکتہ کی میٹنگ میں اسلامی یونیورسٹی کی تجویز پیش کی۔ جب بلنٹ دوسرا مرتبہ حیدرآباد آئے تو ۲۶۔ اپریل ۱۸۸۵ء کو باغ عمارت میں بڑا جلسہ ہوا جس کی صحت و ثبات علی بن عثمان نے کی جن کی عمر ماضی وقت اٹھارہ سال تھی۔ نواب میر قانع علی خاں سالار جنگ ثانی بھی شریک تھے اس جلسہ میں نظام یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ یونیورسٹی کے قیام کی تحریک بھی اسی دور میں شروع ہوئی۔

دارالعلوم مکہ کے خارجہ تحصیل علماء
جن میں محمد مرتضیٰ پیش پیش تھے اس تحریک کو
دیا۔ محمد مرتضیٰ نے خیال انگیز مضامین لکھے
۱۹۰۳ء میں ایک کتاب روح ترقی لکھی اور

نظام قائم کرنے اور اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کی تجویز پیش کی و نیز مغربی زبانوں سے علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ کے لیے دارالترجمہ قائم کرنے کی تحریک کی۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی کے والد محمد عبد القادر نے مخبر دکن میں ایک سلسلہ مضامین بعنوان اصلاح تعلیمات حیدرآباد شہر و رع کیا۔

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں سر جوہی ناسد و سہ والد کا بھی حصہ تھا۔ خود سر جوہی ناسد کو اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں نے نواب سرور الملک کی سفارت پر اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکاری سفر پر انگلستان بھیجا تھا۔ اس دور نے اعلیٰ معیار کے شاعر اور ادیب خاصی تعداد میں پیدا کیے۔ ان سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ جلیل، انیسوری، داغ دہلوی، فیض، وطن بہار، جیش پرشاد، ضامن کشوری، ترکی، محمد حسین آزاد حیدرآبادی اور بیسیویں شاعر اور ادیب ہیں جن میں سے بعض کے تعلق سے اہل اردو زیادہ جلتے ہیں اور اکثر کے تعلق سے کم جانتے ہیں۔ آج کی صحبت میں صرف چند نمائندہ شخصیتوں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔

۱۔ ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۷۷ء میں جب کہ ان کی عمر چھ یا س سال تھی حیدرآباد آئے۔ اس آمد میں علمی شان بھی تھی اور سرکاری اعزاز کی آن بان بھی۔ ایہ کہ انگریز حکمرانوں کا ایک طبقہ ہندوستانی زبانوں کی مغربی علوم کو منتقل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ شش کا بار بھی تھی کہ ایسی لاوشوں کے لیے ترغیبی کمات بھی دیے جائیں۔ علم ہیئت کی ایک کتاب

کے اردو ترجمہ کے لیے ایک ہزار روپے کا اعلان کیا گیا۔ گیارہ ترجمے مقابلہ کے لیے آئے جن میں ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ انعام کا مستحق قرار پایا۔ یہ ترجمہ تنقید و نظر ثانی کی غرض سے ریڈیٹنٹ حیدرآباد کی وساطت سے سر سالار جنگ اور امیر کبیر محمد رفیع الدین خاں شمس الامراء سے شمس کے پاس بھیجا گیا۔ جن کو علمی ذوق اپنے والد نواب فخر الدین خاں سے ورثہ میں ملا تھا۔ (جنگی چھاپہ خانہ یعنی لیتھو طباعت کی ابتداء جرمنی میں ہوئی تھی اور ۱۲۱۴ھ کے لگ بھگ یہ طریقہ ہندوستان میں رائج ہو گیا۔) شمس الامراء کے سنگی چھاپہ خانہ کا شمار لیتھو طباعت کے اولین مطبعوں میں کیا جاسکتا ہے۔ مغربی علوم کی کتابوں کے ترجمے کرنے کی اولین منظم کوشش نواب فخر الدین خاں ہی نے کی تھی۔ دہلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی تحریکیں اس کے بعد کی ہیں۔

امیر کبیر اور سالار جنگ ہر دو نذیر احمد کی ذہانت و قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ سالار جنگ ہمیشہ قابل اور لائق افراد کی تلاش میں رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سرسید کے ذریعہ نذیر احمد کی خدمات کو حیدرآباد کے لیے حاصل کرنے کی تحریک کی۔ اس وقت نذیر احمد اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلرک تھے۔ اس طرح ان کی علمی قابلیت ہی ان کے حیدرآباد آنے کے لیے ذریعہ بنی۔ ڈپٹی نذیر احمد براہ و مصلحت میں تھے۔

کے ترجمہ جس دوام، عبود، دریا، شہر اور میں پاس Transposition کے ترجمہ مداخلت جی کا شمار ایسی ہی اصطلاحات میں ہے۔ پھر قرآن شریف کے با محاورہ ترجمہ کو لیجیے جو دلی کی لکھائی زبان میں ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں ادبیت زیادہ ہے یا مذہبیت۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ واحد ترجمہ ہے جس میں آپ کو دونوں چیزیں ملیں گی۔

۲۔ مولانا ظفر علی خاں ۱۸۷۱ء میں بہ مقام کوٹ میر (پنجاب) پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگ زمیندار تھے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد اور پٹیالہ میں حاصل کی پھر علی گڑھ سے بی اے کر کے بمبئی گئے جہاں محسن الملک کے ساتھ معتمد خصوصی کی حیثیت سے ایک سال تک کام کیا۔ ۱۸۹۶ء کے اواخر میں مولانا شبلی بمبئی گئے تو ان سے حیدر آباد کے حالات سنے اور ان کے مشورہ سے حیدر آباد گئے عزیز مرزا کی وساطت سے ہوم آفس میں مترجم ہو گئے ترقی کرتے کرتے لیجسلیٹو کونسل کے رجسٹرار قرار پائے داغ حیدر آباد میں تھے شاعری میں ان سے اصلاح لیتے رہے۔ ظفر علی خاں ایک کامیاب ادیب تھے شعر گوئی ابتدائی سن تیز سے شروع کی شاعری میں مذہبی اور سیاسی عنصر غالب تھا۔ قلیل سے قلیل وقت میں کئی کئی نوسو شعر کہہ جاتے تھے۔

حیات۔ بہارستان۔ نگارستان اور چمنستان کلام کے مجموعے ہیں۔ سنہری گھونگا اور میری عینک انگریزی کے دو مختصر افسانوں کے ترجمے ہیں۔ معرکہ مذہب و سائنس انگریزی کی مشہور تصنیف

انگریز سرکار میں ان کو اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ایک ایسی دیسی ریاست میں جس کا حکمران سلطان ہوان کو طلب کیا گیا تھا۔ نذیر احمد کی احتیاط پسندی کا تقاضہ تھا کہ وہ اس اعتماد کو مستانہ نہ ہونے دیے جو انگریز سرکار نے ان پر کیا تھا۔ انھوں نے خود کا تعارف غرض مند کی حیثیت سے نہیں کروایا بلکہ ایک عالم با اعزاز شخص کی حیثیت سے۔ چنانچہ جب ان کو سرکاری خدمت کا پیش کش آیا تو اولاً یہ کہہ کر حیدر آباد آنے سے انکار کر دیا کہ میں ایک مضبوط حکومت کو چھوڑ کر ایک کمزور حکومت میں نہیں آتا۔ جب اصرار ہوا تو تنخواہ زیادہ طلب کی۔

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد اپنی دینی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ایک منفرد اور ممتاز معمار رکھتے ہیں۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسلامی نادلوں کے ذریعہ جوش بہا خدمات انجام دیں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ نعتیہ ہند ضابطہ فوجداری و قانون شہادت کے اردو ترجمے ایسے شہ کار ہیں جن پر زبان اردو ہی نہیں فن ترجمہ بھی ناز کر سکتا ہے۔ ان کی وضع کردہ اصطلاحیں قانونی ادب کا جز بن چکی ہیں۔

ان کے ترجمے میں بیشتر قانونی اصطلاحات ایسی ہیں جن کو نہ صرف حرف آخر قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ اصلی انگریزی اصطلاحات پر فوقیت دی جاسکتی ہے۔ ٹرانسپویشن فار لائف

Transposition for Life

کا ترجمہ ہے۔

ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا اور شہر بدری سہن پڑا۔ جس کو انھوں نے قبول کیا لیکن جو کتنا تھا وہ کہہ کر دے اور اپنے تاثرات کو دوام بخشا اور اردو ادب کا سراونچا رکھا۔

داکر نامہ کا شمار جو شش طبع آبا، کی انقلابی نظم ”ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب“ باسرو وڈنڈا کی مشہور مزاحیہ نظم ”سینجیا ریڈی مانا“ کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر نظم یہ ظنی ہے اور موصوفہ الذکر نظم میں مزاح بکے داکر نامہ میں بھر پور ظہور ہے۔

۳۔ مولانا عبدالحلیم شہید ۱۸۶۰ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم عربی فارسی میں ہوئی۔ حدیث کا شوق غالب ہوا تو دہلی گئے اور محمد نذیر حسین محدث دہلوی کے مدرسہ میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانہ میں انگریزی سیکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ انیس سال کی عمر میں کلکتہ سے تعلق ترک کر کے لکھنؤ کی سکونت اختیار کی۔ مصافت سے طبعاً دل چسپی تھی۔ اخبار اور ادب سے تعلق پیدا ہوا ۱۹۸۰ء میں اسی اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوئے۔ خاص رنگ کے مصداق اس زور و خور لکھنا شروع کیا کہ ملک بھر میں شہرت ہو گئی۔ ۱۹۸۲ء میں ہفتہ وار سالانہ نمبر شائع کیا۔ اٹھارہ انیس نمبروں میں مسلسل صبح کا سماں دکھایا۔ قافیہ بندی اور رعایت لفظی کا ایک نیا اسلوب نکالا۔ تشبیہات واستعارات فارسی کے موثر نمونے مکرر شش انگریزی کی تھیں۔

انگریزی سے منظم ترجمے بھی کئے۔ سر جوئی ناسد کی انگریزی نظم ”سم کا ترجمہ“ تاجدار دکن کے عنوان سے کیا۔ دوسرے منظوم ترجمے مدی کا لاگ، دھوپ اور چاندنی، فراق روح و قن لائق ذکر ہیں۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران ایک سیاسی نظم ”داکر نامہ“ لکھی جو اردو ادب میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ ظفر علی خاں حیدر آبادی توقعات کے ساتھ حیدر آباد آئے تھے اور دل سے یہاں کی حکومت کو دیکھنے کے منتھی تھے جو بہت کچھ کر سکنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں بنیں کہہ کر ہی حیدر آباد کے اندر ملحق حالات میں انگریزوں کا دل بے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ کیسے داکر نے جو وزیر الیہ تھے یہاں کی حکومت میں مضبوط مقام پیدا کر کے انگریز در آمد پالیسی کی پر زور تائید شروع کی جس سے عہدہ داروں کے وقار کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ .. ظفر علی خاں کو جب یہاں کے حالات کچھ اور ہی نظر آئے تو انھوں نے مایوس ہو کر افراد حکومت کے خلاف اپنی شاعری کا تجربہ استعمال کیا اور اس وقت کے ارباب اقتدار کا تسخیر کیا جو کہیں داکر کے مقابلہ میں کمزوری کا ثبوت دے رہے تھے۔ اس سے زیادہ اس بے چین طبیعت اور بے باک شاعر کو یہ کیا سکتا تھا۔ جب اپنے شدید احساسات کو خدا یا ان ملکیت تک نہ پہنچایا جاسکتا تو شاعر نے ان کو عوام کی بارگاہ میں پیش کر دیا اور سند قبولیت حاصل کی۔

داکر نامہ ۱۹۰۹ء میں لکھی گئی۔ اس پر خوں اور وفادارانہ کاوش کے سلسلہ میں ظفر علی خاں کو

۱۸۸۲ء میں پہلی مرتبہ حیدر آباد آئے۔ چھ
 بیتہ قیام کیا۔ ۱۸۸۴ء میں رسالہ دل گداز جاری
 ہوا۔ اس میں ناول نویسی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔
 ۱۸۸۹ء میں رسالہ مہذب جاری کیا۔ جس میں غلام
 ملف کی سوانح عمری ان قسطوں میں درج ہوتی تھیں۔
 ۱۸۹۰ء میں دل گداز اور مہذب بند کر کے حیدر آباد
 پہنچے۔ اور دو سو روپیہ! ہمارے سرکاری ملازمت
 دل کی۔ ۱۸۹۵ء میں وقار الامراء نے اپنے فرزند
 لی الدولہ کی مذہبی تعلیم کے لیے جو اس وقت انگریزوں
 کی تعلیم پارسہ تھی۔ انگلستان بھیجا اس دوران
 گریزی قابلیت بڑھائی اور فرانسیسی بھی سیکھی۔
 ۱۸۹۰ء کے اواخر میں حیدر آباد واپس ہوئے
 در تعلیمات میں مددگار ناظم مقرر ہوئے۔ بعض
 ایسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔
 ۱۸۹۸ء میں حیدر آباد سے رسالہ دل گداز
 دوبارہ جاری کیا۔ جناب سکیٹنگ کی لائف کے سلسلہ
 کا رد عمل ہوا تو گیارہ ماہ بعد ہی رسالہ بند کر دیا
 رکھنچو چلے گئے۔

۱- ۱۹ میں دوبارہ حیدر آباد طلب کیا گیا۔
 ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ واپس ہو کر دل گداز پھر سے جاری کیا۔
 بیس سال کی عمر سے آخر دم تک لکھتے رہے۔
 چھبیس سال کے عرصے میں کبھی ان کے قلم کی سبائی
 خشک نہ ہوئی۔ بقول فراق گورکھپوری عمر بھر چین لیا
 زمین دیا۔ ان کے پسندیدہ عنوانات مذہب تاریخ
 ریاضیات اور اہل لیر تھے۔ بقول ڈاکٹر ذوق مضامین
 کے بعض مشہور پارے ادب عالی کہے جاسکتے ہیں۔

۴- ہدی علی خاں اٹاواہ کے ایک معزز
 خاندان سادات سے تھے۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۸۲ء کو
 یہ مقام اٹاواہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خاں کی کتب
 میں ہوئی۔ ختم تعلیم کے بعد اٹاواہ کی کلکٹری میں دس
 روپیہ ماہوار کی محوری پر تقرر ہوا۔ رفتہ رفتہ تحصیلدار
 پر پھر ڈپٹی کلکٹری پر ترقی ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں
 جب کہ ان کی عمر ستیس سال تھی سرسید احمد خاں
 کی سفارش پر سربراہ لاہور نے حیدر آباد میں سرکاری
 ملازمت کی پیش کش کی۔ ابتداء صدر محسبی کی تنظیم
 کا کام تفویض ہوا۔ ریاست کا بجٹ مرتب کیا جو مہر
 کے بجٹ کے نمونہ پر تھا۔ پھر مقصدی مال پر تقرر ہوا۔
 سرورے اور بندوبست کے کام کو انجام دلوا یا حکمران
 بندوبست ان ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ انتظام مالگزار
 کے لیے اصول اور مبادیات قائم کئے۔ یہ کہا جائے تو
 غلط نہ ہوگا کہ ریاست حیدر آباد کا نظم ملای گزاری
 جیسا کہ ۱۹۰۸ء تک تھا ان ہی کی وضع کردہ بنیادوں
 پر قائم رہا۔ قحط اکشر مقرر ہوئے۔ قحط کے متعلق
 مبسوط رپورٹ مرتب کی۔ ۱۸۸۷ء میں فینانشیل
 اور پولیٹیکل سکیٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان
 کی جگہ چراغ علی مقصد مالگزار بنائے گئے۔ اسی
 زمانہ میں محسن الملک کا انتخاب ملا۔

حیدر آباد میں ان ہی کی کوششوں سے ۱۸۸۴ء
 میں بجائے فارسی کے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا
 گیا۔ برطانوی ہند میں ۱۸۳۵ء میں فارسی کو ہٹا کر
 اردو کو ثانوی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا تھا۔
 مطالبہ کا سید شوق تھا۔ حیدر آباد قیام

کے دوران ہی علمی ذوق کی تکمیل کا سامان ہم پہنچایا۔ انگریزی سے نااہل تھے۔ لیکن انگریزی کتابیں پڑھوا کر سنتے اور خاص کتابوں کا ترجمہ کرواتے۔ ان کے مضامین میں انگریزی خیالات کی ترجمانی صاف نظر آتی ہے۔ انھوں نے فکر کی پوری آزادی کے ساتھ مضامین لکھے۔ ان کے مضامین ان کی وسیع علمیت۔ روشنی طبع۔ استدلال پسندی اور سلیجے ہوئے ذہن کے آئینہ دار ہیں عبارت بڑی شگفتہ تھی۔ ان کی تحریروں میں ادبیت کی شان پائی جاتی ہے روائی فصاحت تسلسل بیان اور اثر پذیری ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ سرکہ کے خلیب تھے۔ ان کی عاریہ زور بیان اور عزم و ہمت سے مرفع ہوا کرتی تھیں۔ خوش بیانی بے مثالی تھی جو مخالف رجحان رکھنے والوں کو بھی متاثر کرتی تھی۔ بڑے بے بڑے منع کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ تقریریں میں عموماً ظرافت کی چاشنی ہوا کرتی تھی۔

۵۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی کا کاشمیر حیدرآباد کی ایسی شخصیتوں میں کیا جاسکتا ہے جن کی بلند پایہ علمی خدمات اور تعلیمی کارناموں پر سارا ہندوستان ناز کر سکتا ہے۔ تعلیمی میدان کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس میں انھوں نے اپنا کردار ادا نہ کیا ہو اور اینالوہ نہ منوایا ہو۔

عماد الملک کا ناندا ان اودھ میں معزز رہا ہے۔ ۱۶۔ اکتوبر ۱۸۴۲ء کو ضلع گیا کے قصبہ صاحب گنج میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پیر کلکتہ اور دھاکہ میں عربی زبان میں نصاب نظامیہ کی تحصیل

کی۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزی تعلیم شروع کی۔ ۱۸۵۹ء میں فرانسیسی درس گاہ لا مارٹیئیر میں شریک ہوئے۔ ٹیچر ڈیٹیکٹو لکچرر بنے۔ بکھنوک کیننگ کا بیچ میں عربی کے پروفیسر قرار دیے۔ سربراہ ہنگ ۱۸۷۲ء میں آئے۔ اور تین سو دس روپے ماہانہ دیا گیا۔ ۱۸۷۶ء میں سربراہ جنگ نے حیدرآباد میں ملازمت کی پیش کش کی۔ حیدرآباد میں مابین مہاراجن انگریزی مراسلت ان کے تفویض تھی۔ ۱۸۷۶ء میں سربراہ جنگ نے یورپ کا سفر کیا تو یہ بھی ساتھ تھے۔ سالار جنگ کے انتقال کے بعد کونسل آف اسٹیٹ قائم ہوئی تو عماد الملک اس کے معتمد کی حیثیت سے نو سال تک کارگزار رہے کچھ عرصہ معتمد پیشی حضور نظام بھی رہے بعد ازاں متفرقات اور پھر ناظم تعلیمات ہوئے تینتیس سال تک اس خدمت پر رہے۔ دو سال تک انڈیا کونسل کے رکن رہے۔ انگلستان کی آب و ہوا موافق نہ ہونے سے مستعفی ہوئے سررشتہ تعلیمات کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف علوم پر کارآمد کتابیں موزوں ذی علم حضرات سے لکھوائیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایسا سے بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ علوم اسلامیہ کی نادر و نایاب مخطوطات کی طباعت و اشاعت کے لیے عماد الملک اور ملاح عبدالقہوم نے مل کر ۱۸۸۸ء میں اس ادارہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ ادارہ اس وقت تک قائم ہے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ۱۹۵۹ء میں چند ہم عصر

میں یہ فرمایا کہ عہد الملک کی ایک بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی جو درست نہیں ہے۔ نواب صاحب نے کتب خانہ آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ سید علی حیدر طباطبائی ۳۱ کے پہلے مہتمم مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کا کام پایا۔ اردو مولوی عبدالحق کے تقویٰ فیض ہو تو انھوں نے صدارت کے لیے نواب عہد الملک کا نام پیش کیا جس کو مجلس انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا۔

۶۔ عزیز جنگ ولا

۲۸ دسمبر ۱۸۶۰ کو یہ مقام نور پیدا ہوا۔ ان کا تعلق جنوبی ہند کے معزز اور ممتاز خاندان سے تھا۔ جو ۷۰ء ہجری میں بصرہ سے کوئٹن آیا۔ اور نوائٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ پرتگالیوں سے قبل مہند پراہل ہند کا تسلط اسی خاندان کی وصا طت سے تھا اور بقول سلیمان ندوی انگریزوں نے لفظ نیوی اسی خاندان کے نام سے ماخوذ ہے۔

حضرت ولا اپنے چچا کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ چودہ سال کی عمر میں سلاطنت میں داخل ہوئے۔ تیس روپیہ ماہوار کی اہلکاری سے ترقی کرنے ہوئے۔ بحیثیت کلکٹر، بطریقہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے۔

علمی ذوق ولا کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ گونا گوں سرکاری مسروعات کے باوجود اپنی زندگی کو منظم کیا اور اوقات کی اس انداز سے پابندی کی کہ فہرین مختلفہ پر قابل قدر تحقیقی کتابیں بطور یادگار چھوڑیں۔ یہ مختصر مضمون ان بے شمار

اپریل ۱۹۱۲ء
اور عظیم الشان علمی کارناموں کے بیان کا مختل نہیں ہو سکتا اور نہ ان کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ نہایت اختصار کے ساتھ صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔
”آصف اللغات“ مبسوط فارسی اور اردو

نعت ہے۔ یہ حضرت ولا کا ابا کا نام ہے کہ اگر ان کے اور کارناموں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو ہی نعت ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے لکھا ہے۔ یہ نعت سترہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ سترہ جلدوں میں صرف ”ج“ تک کا احاطہ ہوا ہے۔ اسی سے اس کام کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

”ولایہ حافظ“ حضرت ولا کی عمر کے آخری دنوں کا کلام ہے۔ ولا نے حافظ شیرازی کی ہر غزل پر دو دو اور تین تین غزلیں کہی ہیں۔ اپنی زندگی میں وہ ردیف ”م“ تک پہنچ سکے۔

”مجموعہ قوانین مال گزاری“ پانچ جلدوں اور اندکس پر مشتمل ہے اس میں مال گزاری کے جملہ قوانین و گشتیات و احکام اور سررشتہ آب کاری جنگلات۔ کروڑ گیری۔ عطیات وغیرہ کے منظوم احکام مع شریحات درج ہیں۔

ترکاری کی کاشت (۱۹۰۱ء) کھجور کی کاشت (۱۹۰۲ء) اور انگور کی کاشت (۱۹۰۶ء) کبوتروں کے اقسام اور ان کی بچہداشت، غذا، بیماری علا، ان کے طبی قواعد سے متعلق مفید اور دل چسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔

غزل جس کا یہ ایک شے ہے توفیق نے، ۱۹۶۰ء سے قبل
کبھی غنی اقبال نے اسی غزل سے متاثر ہو کر ارج، ۱۹۶۰ء
میں غزل لکھی جس کا مطلع ہے ۵

زمانہ آیا ہے بے جہانی کا عمامہ دیدار ہوگا
سکوت ہے پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
توفیق کی ایک غزل کا مطلع ہے ۵

سکوں آمیز بے تانی ہے فرقت میں فغاں میری
بھرتا ہے جو دل پہلو میں جیلتی ہے زباں میری
اقبال نے اسی زمین میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع ہے
نہیں منت کس ناب شنیدن داستان میری
غموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
توفیق کی مشہور غزل کا مطلع ہے ۵

کبھی پردہ درہوں میں راز کا کبھی ہوں میں پروں راز میں
کہ حقیقت اک مری مشترک ہے حقیقت اور مجاز میں
اقبال نے اس غزل سے متاثر ہو کر ایک غزل لکھی جس کا مطلع
کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباس مجاز میں
کہ ہزاروں مسجد تے تپا ہے میں ہی جہنم نیاز میں
اگر پرو فیض عبد القادر سرودی کا کتبہ درست ہے تو اقبال
کی یہ غزل توفیق کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی۔ توفیق او
اقبال ہم عصر تھے۔ تقریباً ربع صدی تک یعنی ۱۸۹۶ء
سے جب کہ اقبال کی شاعری کی ابتدا، جونہی ۱۹۲۱ء
تک جب کہ توفیق کا انتقال ہوا۔ دونوں نے مل
شاعری کی ایک دور افتادہ صورت پسند شاعر
اقبال کا متاثر ہونا اہمیت کی بات ہے۔

۸۔ پرو فیض عبد الغفور شہباز (پیدائش
۱۸۵۸ء) نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سید طالب

اعظم العلیات (۱۸۸۹ء) میں عطا
نقدی، معاش، جاگیرات و انعامات اور محکمہ مال
سے متعلق دیگر اصلاحات کی تشریح کی گئی ہے۔
راقم الحروف اور ضیاء الدین احمد شکیب کی مشترکہ
کوشش سے اس کتاب کے ایسے حصوں کو حذف
کر کے جو فی الحال غیر ضروری ہیں جدید ایڈیشن مرتب
کیا گیا ہے اور یہ کتاب جامع العلیات کے نام سے
دلائیڈ می نے شائع کی ہے۔

”تاریخ النواظ“ (۱۹۰۴ء) خاندان نواظ
کی تاریخ ان کے رسوم و رواج معاشرت و مشاہیر
خاندان کا تذکرہ ہے۔
۵۔ سید جلال الدین توفیق

لال بہادر شاستری پر ائمہ منبر کی حیثیت سے
پہلی مرتبہ حیدر آباد آئے تو انھوں نے ایرپورٹ پر
یہ شعر پڑھا

دے سلامت جو خاکساری کبھی تو اپنی ہو ابد سے گی
کبھی تو اٹھیں گے گردن کر کبھی تو اونچا غبار ہوگا
۱۹۶۴ء کے حیدر آبادیوں میں بہت کم لوگ
جانتے ہوں گے کہ یہ شعر حیدر آباد کے ایک قابل فخر
شاعر کا تھا جس شاعر کا جادو جمہوریہ ہند گئے
وزیر اعظم کے سرخیرہ کر بول رہا تھا وہ اس بات کا
بہمہ وجہ مستحق تھا کہ ۱۹۶۴ء میں اس کی سو سالہ
سالگرہ منائی جاتی۔ اہل اردو کو تو یہ سعادت حاصل
ہو سکی لیکن شاستری جی نے یہ بات ظاہر کر دی کہ انھیں
اردو ادب سے کتنا گراں گناہ ہے اور ساتھ ہی اپنی
شخصیت اور انداز فکر کو بھی اجاگر کر دیا۔

اگر نہیں کی جاسکی تو اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ یہ کام مشکل تھا لیکن اگر اردو کو آسان بنا نامزدوری ہے اور اگر اردو دہندی کو ایک دوسرے سے قریب لانا مفید ہے تو اس قسم کے تجربے کرنا ناگزیر رہے گا۔

بقیہ دکنی ادب اور تہذیبی اقدار سے آگے

گلہری، چنگری اور مگرمی وغیرہ جیسے زیورات میں کیا ہے۔ اسی طرح محمد علی قطب شاہ نے اپنے مرثیوں میں ہندوستانی پھولوں ترکاریوں اور پرندوں ذکر کیا گیا ہے۔

دکنی ادب میں ہندوستانی تہذیب کا یہ واضح حصہ اس دور کی اس ضرورت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو سماجی اور سیاسی دونوں میدانوں میں شدید تھی۔ دکنی ادب میں ہندوستانی ماحول دکن کے حکمرانوں اور امرا کی کشادہ دلی مذہبی رواداری اور ان کی خواہم دوستی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہی دکن کے ادب کو اسی دور کے دوسرے ادب سے ممتاز کرتا ہے۔ اپنے مختصر مضمون کو میں یہ کہتے ہوئے منزل اختتام تک لانا چاہتا ہوں کہ جو ادب ہمارا ورثہ ہے اس کا ہر جز ہمارا اپنا ہے۔ زبان، ماحول، تہذیب، پس منظر، احساسات، روایات، جذبات، زیورات، لباس وغیرہ۔ ادب کے جو جو اہر پارے ہمارا ورثہ بنے ہیں ان کی اہمیت یوں بھی ہے کہ ان کے محرکات انسان کو قریبی رواداری اور کشادہ ذہنی سے عبارت ہیں جو اس دور کے سماجی اور تمدنی اقدار کے صحیح نقوش ہم تک پہنچاتے ہیں۔

سے حاصل کی۔ انگریزی پڑھنے کے لیے سکول میں داخل ہوئے۔ سید محمد جو مظفر پور میں رجسٹرار تھے اور ان کے بھائی شہباز کے سرپرست بن گئے۔ کلکتہ کے ایک اخبار دار السلطنت سے منسلک ہوئے۔ جریدہ نائش کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا۔ کلکتہ قیام کے دوران جمال الدین افغانی سے جن کو انگریزوں نے مصر کی بغاوت فرو ہونے تک جلاوطن کر کے حیدرآباد پھر کلکتہ میں رکھا گیا تھا استعفا کی۔ افغانی کے علمی مضامین مقالہء حالیہ شائع کئے۔ شہباز بیک وقت انگریزی۔ اردو۔ بنگلہ فارسی اور عربی پر دستگاہ رکھتے تھے۔ انگریزی ادب سے لگاؤ تھا۔

شہباز نے ایک عرصہ تک اورنگ آباد کالج میں بحیثیت لکچرار خدمت انجام دی۔

شہباز نشر نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ انگریزی کی بعض مشہور و معروف نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ ٹیلیو کی نظم ”دی سام آف لائف“ کا ترجمہ ”زمزمہ زندگی“ کے عنوان سے کیا۔ سرے کی نظم کا ترجمہ ”آب رواں کے عنوان سے کیا۔ بیمنٹ کی نظم ابو بن ادم کا ترجمہ ابراہیم بن ادم کے عنوان سے کیا۔ گولڈ سمٹھ کی نظم دی پرمٹ کا ترجمہ جوگی کے عنوان سے کیا۔ جوگی اردو شاعری میں ایک منفرد نظم ہے جس میں عربی اور فارسی الفاظ قطعاً استعمال نہیں کیے گئے۔ ساتھ ہی اس کی زبان سنسکرت آمیز بھی نہیں ہے۔ نظم کے لیے نہایت سادہ اور عام فہم ہندی بھاشا کا استعمال کیا گیا ہے۔ عام طور پر اس طرز کی ہندی

دکھنی ادب اور تہذیبی اقدار

ہے۔ عوام کا کام سوچنا نہیں ہوتا عمل کرنا ہوتا ہے۔ وہ اسی راستے پر چلتے ہیں جن پر ان کو چلایا جاتا ہے۔ چلنے کی رفتار اور رخت سفر میں فرق ہوتا ہے لیکن راستے میں نہیں۔

اٹھارویں صدی سے قبل کی تاریخ میں ہندو اقدار کا دارومدار جس طبقے پر تھا وہ اشراف کہلاتا تھا۔ اُمرا کا یہ طبقہ، بادشاہ، بادشاہ کے رشتہ دار، جاگیردار اور مذہبی رہنماؤں پر مشتمل تھا۔ اسی طبقے کے ذہن کی عکاسی اس دور کی تہذیب کہلاتی تھی۔ لیکن جو بات اس دور کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ اس طبقے کی دو جماعتوں کے درمیان ہونے والی ذہنی جنگ ہے۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ پر ہمنوں اور راجپوتوں کے درمیان شدید اور مسلسل کشمکش کا افسانہ ہے جو مختلف ادوار میں مختلف صورتوں سے سامنے آیا۔ سولہویں صدی کے پہلے دہے میں جب شہلی خاندان پر مسلم حکمرانوں کی مملکت کی بنیادیں پڑھیں تو یہ کشمکش علما اور اُمرا کے درمیان شروع ہوئی لیکن اس کشمکش کے حدود دربار کی چار دیواری تک محدود رہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اسی دور سے ایک نیا موڑ آیا

تہذیب و تمدن ادب اور تاریخ دو ایسی اصطلاحیں ہیں جن کی توضیح و تشریح زمان و مکان کے حدود میں محصور ہوتی ہے۔ جغرافیائی حالات، سیاسی ضروریات، سماجی احساسات اور معاشی تصورات اس کے حدود و حتمین کرتے ہیں۔ اس لیے کسی دور میں کسی مملکت کے رہنے بسنے والوں کی تہذیب و تمدن پر تنقید و تبصرہ محال نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ تہذیب صاف لفظوں میں آئین زندگی سے عبارت ہے۔ یہ انسان اور سماج کے درمیان طے پائے ہوئے چند اصول ہوتے ہیں جنہیں سمجھایا نہیں جاتا لیکن یہ سمجھے جاتے ہیں۔ چوں کہ تہذیب کے تغاضے فکر سے مربوط ہوتے ہیں اس لیے ان میں قیام نہیں پایا جاتا۔ یہ زمانے کے ساتھ بدلتے اور تغیرات کے ساتھ تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں اسی لیے کسی دور کے تہذیبی اقدار کا عرفان اس دور کے ذہن کو سمجھنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے کہ ہر دور میں دنیا کے ہر خطے پر تہذیبی اقدار کی بنیادیں سماج کے ایک خاص طبقہ کا منصب ہوتی ہیں۔ یہ طبقہ اُمرا، مذہبی رہنماؤں، فوجی عہدیداروں یا سماج کے باعزت افراد میں سے کسی کا بھی ہو سکتا

والے اثرات کا عکس بناتا ہے بلکہ یوں بھی ہے کہ تاریخ اکثر مقامات پر مجبور ملتی ہے مثلاً سماج کے دو گروہوں کے درمیان جو ذہنی کشش ہوتی ہے وہ تاریخ کے احاطہ میں نہیں آتی لیکن ادب اس کی عکاسی کرتا ہے اس لیے کسی بھی دور کے ہندی اور تمدنی ارتقا کو سمجھنے کے لیے اس دور کے ادب کا مطالعہ ضروری ہے مضمون کو مواصلت سے بچانے اور اپنے کو آج کے عنوان سے مربوط کرنے کے لیے میں تاریخ کے اس مختصر جائزہ کے پس منظر میں دکنی ادب سے واقفیت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب اردو مثنوی شالی ہند میں کہ صفحہ ۱۱۸ پر یوں لکھا ہے ”اردو کا دکنی عہد مثنوی کا دور ہے غزل کا نہیں۔ قلی قلی شاہ اور دلی کے علاوہ دکن کے تمام مشاہیر شعر شنوی کے شاعر تھے۔ دکنی کا یہ پہلا شاعر غزل کا ہی ہے جس نے ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۶ء کے درمیان مثنوی کہ مراد و پدم راؤ لکھی۔ دکن میں اردو کی ابتدا اور دیشوں کے سایہ برکت میں ہوئی اس لیے دکنی مثنویاں معرفت سلوک اور مذہبی عقائد پر مشتمل ہیں ان میں اشرف کی ”نوسر بار“ فرزند شاہ برہان الدین جابنم کی مختصر مثنویاں اور شیخ خوب محمد حبشی گجراتی کی طویل مثنوی خوب ترنگ شامل ہیں ڈاکٹر صاحب کی عالمانہ رائے میرے اس خیال پر مبنی ہے کہ چودھویں اور پندرہویں صدی کے ذہن کی عکاسی اس دور کے ادب میں نمایاں ہے اس دور میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا مکتبہ

ہندوستان کا سرمدوں میں در آنے والے مسلمان اس بات سے واقف تھے کہ باہر سے آنے والی مرقوم کو ہندوستان نے یوں اپنا یا تھا کہ دو ایک نسلوں کے گزرتے ہی وہ ہندوستانی سماج کا جز بن گئی تھیں۔ ان کی ہندوبیت تمدن حتیٰ کہ مذہب بھی ہندوستانی ہو گیا تھا۔ آنے والے مسلمانوں کا ہندوستانی سماج سے فرار اسی خوف کا نتیجہ تھا۔ ان کا غرور اور احساس برتری ان میں اور ہندوستانیوں میں ایک خط فاصل بن گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو ایک بادشاہوں کے مختصر سے دور کو چھوڑ کر اکبر اعظم کے دور حکومت تک ہندوستانیوں کو مسلم حکمرانوں سے نہ کوئی دل چسپی تھی نہ ان کی وفاداریاں ان سے وابستہ رہیں سخت پرہیزگار دلی تبدیلیوں سے انھیں کوئی واسطہ نہ رہا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہوئی کہ ہندوستان میں بسنے والے ان دونوں مذاہب کے درمیان وہ مقام تلاش کریں جہاں اتحاد ممکن ہو سکے۔ ہندوؤں میں بھکتی تحریک اور مسلمانوں میں مہوئی تحریک کا آغاز یوں تو پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن اس دور میں اس میں شدت پیدا ہوئی تاریخ میں پس منظر کے اس مختصر سے جائزے کے بعد اگر آپ اس دور کے ادب کا جائزہ لیں گے تو آپ کو یہ تبدیلیاں ادب میں واضح طور پر دکھائی دیں گی۔ تاریخ کے مقابل ادب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ واقعہ سے زیادہ اس واقعہ سے ذہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لیے جہاں تاریخ واقعات بیان کرتے ناموش ہو جاتی ہے وہاں ادب واقعات سے انسانی ذہنوں پر مرتب ہونے

اسلام رہا ہے۔ لیکن اسلام کے کینوس پر جو خاکے
 بھارے گئے وہ اُن ذہنوں کے بتائے ہوئے تھے
 جو اس دور کے سماج کی نمائندگی کرتے تھے یہ بات غافل
 طور سے مثنوی کے لیے کہی جاسکتی ہے مولانا شبلی نے
 شعر الجم کی جلد چہارم کے صفحہ (۲۴۷) پر اسی خیال کا
 اظہار کیا ہے لکھتے ہیں ”مثنوی کی ہمہ گیری اور رجائیت
 کا کوئی ہر نقاد نے مانا ہے کیوں کہ اس میں کوئی تاریخی
 واقعہ یا افسانہ بیان کیا جاتا ہے اس بنا پر زندگی اور
 معاشرت کے جتنے پہلو ہیں سب پر تبصرہ ہو جاتا ہے
 اسی لیے مثنویوں کا مطالعہ اس دور کے ذہنی سفر
 کی عکاسی کرتا ہے۔“

دکھنی اردو میں واقعات کو بلا پر لکھی گئی
 بلکہ مثنوی شاہ اشرف کی فوسر ہا رہے جو شہادت میں
 لکھی گئی۔ یہ الگ بحث ہے کہ فوسر ہا و مثنوی کی تعریف
 میں آتی ہے یا نہیں ڈاکٹر زینت خاں جہاں اسے یقیناً
 مرثیہ مانتی ہیں اور شاہ اشرف کو پہلا مرثیہ نگار تسلیم
 کرتی ہیں لیکن ڈاکٹر رشیدہ موسوی کے خیال میں شہاد
 مے اور مرثیے میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے اس لیے
 شہادت نامہ کو مرثیہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن فوسر ہا
 کا ہندوستانی لب و لہجہ متعل محاوروں کا استعمال اور
 تشبیہ اور استعاروں کا ہندوستانی مزاج اشرف کی
 مثنوی کی وہ خصوصیات ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا
 سکتا۔ شہزادی زینت علیہ السلام کا سراپا ملاحظہ ہو۔
 زینب اچھے اس کا نام یونین سلونے جو ان بادام
 زرد صاحب حسن و جمال پڑیا موزوں صورت حال
 تھا جانوں سورج پاٹ پڑیا کہ جانوں چاند لاٹ

دانت تپسی تپسی جان پڑ جیسے ہیرینہ کیری کھان
 مگر گال جیسے لمبے بال پڑ چند سورج جیسے گال
 چاند پشانی دانت تپ پڑ سبزہ رنگ اور موزوں قد
 گو لکندہ کے تقریباً ہر شاعر نے مرثیہ کہا ہے۔
 اگرچہ کہ یہ مرثیہ مختصر ہوتے تھے۔ ڈاکٹر چراغ علی کی
 تحقیق کے مطابق قطب شاہی دور میں ۲۱ شعرا
 نے مرثیے کہے ان مرثیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ
 ان میں واقعات کو بلا کو ہندوستانی پس منظر میں بیان
 کیا گیا ہے اور اس دور کے تمدن کی عکاسی کی گئی ہے۔
 مثلاً حضرت قاسم ابن حسن شہزادی فاطمہ کبریٰ سے
 عقد کا تذکرہ خالص ہندوستانی ہے اس میں جو
 رسم و رواج دردی نے بیان کیے ہیں وہ عرب کی
 سرزمین پر کبھی بھی رائج نہیں تھے۔

مندپ کون گئے تمام تیر تمام پڑ ہوئی تیغ جھا کر سلام علیک
 بندیا بس سہ اسو بلم کا پشچات کلنگ کر سلام علیک
 اقصائیس پر رحمت کر دگا پڑ ہما با و معتز سلام علیک
 عبوری کا خوشبو لگایا بدن پڑ براتی برابر سلام علیک
 مندپ، کلنگن، چھتر وغیرہ ہندوستانی چیزیں ہیں جو
 عرب میں رائج نہیں مرثیے کا مطالعہ ہمیں اس دور
 میں شادیوں کے اہتمام و انتظام سے متعارف کروانا
 ہے یہ بھی نہیں بلکہ بعض مرثیوں کا مطالعہ ہمیں اس
 دور میں استعمال ہونے والے زیورات اور اسباب
 آرائش کا پتہ دیتا ہے مثلاً وجہی کے مرثیے
 کالی گوری چہر بند ی تھیمی ہے جون کالندری
 کالے لٹان کالے بھوان کالی گلی میں گلہری
 میں وجہی نے نیلم، نال، زرد، موتی، وغیرہ کا استعنا
 (بانی صفت پر دیکھیے)

عہد آصفی کی علمی و ادبی خدمات

اس لیے درباری سرپرستی کے بغیر بھی اس دور میں ادبی اور شعری کارنامے سرانجام پاتے رہے۔ اس دور میں شعرائے اردو کے متعدد تذکرے لکھے گئے۔ جن میں لکھمی ناراین شیفس کا تذکرہ چستان شعر بہت مشہور ہے۔

آصف جاہ ثانی اپنے بھائی نواب صلابت جنگ کے جانشین ہوئے۔ انھوں نے اورنگ آباد کے بجائے حیدرآباد کو پایہ تخت بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ آباد کے علماء اور شعرا سب حیدرآباد آ گئے۔ آصف جاہ ثانی نے سلطنت کے انتظام کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب سے بے حد دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس دور کے مشہور شعرا میں عزلت اور تجلی کے نام قابل ذکر ہیں۔ نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث نے بھی اردو شعر و ادب کی سرپرستی کی۔ ان کے عہد میں مارسلو جی کی طرح مبارجہ چند و لال کا دربار بھی دکن اور شمالی ہند کے شعرا کا مسکن بن گیا تھا۔ اسی طرح شمس الامراء نے بھی اردو زبان میں مختلف علمی کتابوں کو منتقل کر کے اردو کی بے نظیر خدمت انجام دی۔

نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع بھی اپنے

آصف جاہ اول نے ۱۱۳۳ھ میں سلطنت آصفیہ کی بنیاد رکھی۔ انھیں علم و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ فارسی اور عربی زبان پر عبور رکھتے تھے اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ اس وقت اورنگ آباد کے بڑے شعرا میں داود، سراج اور عاجز اساتذہ سخن مانے جاتے تھے۔ عاجز کی مثنوی لعل و گوہر بہت مشہور ہے۔ گوکنڈہ اور جیاجی پور میں نثر نگاری کی جو تحریک شروع ہوئی تھی آصف جاہ اول کے دور میں بھی برابر جاری رہی۔ صوفیائے کرام اس دور میں بھی تصوف کے مختلف موضوعات پر رسالے لکھتے رہے۔

آصف جاہ اول کے جانشین نواب نام جنگ عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت زبانوں سے واقف تھے۔ شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

خانوادہ آصفی کے تیسرے فرمانروا نواب صلابت جنگ کا عہد زیادہ تر معرکہ آرائیوں میں گزرا۔ اس لیے وہ علم و ادب کی طرف کوئی خصوصی توجہ نہ دے سکے۔ تاہم حیل کہ اردو شعر و ادب کا مذاق عام ہو چکا تھا

نذیر احمد، سید علی بلگرامی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مصغیا سادس کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کو ایک فرمان کے ذریعہ سرکاری زبان قرار دیا۔

سلطنتِ اصفیہ کے آخری فرمان روا نواب میر عثمان علی خاں آصف جادو ساج کا دور اردو کی سراج کا زمانہ بھی ہے۔ نواب میر عثمان علی خاں اپنے والد کے استاد نواب فصاحت جنگ جلیس سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں نے شریکاری سے بھی خصوصی دلچسپی رکھی۔ حکمرانِ وقت کی اردو نوازی کے اثر سے عمائدینِ سلطنت میں بھی شعر گوئی اور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کا رجحان عام ہو گیا۔ چنانچہ اس دور میں ہمارا جہ کوشن پرشاد، نواب معین الدین، نواب لطف الدولہ، نواب نواب یار جنگ، اور نواب عزیز یاد جنگ نہ صرف قادر الکلام شاعر تھے بلکہ شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔

عہدِ عثمانی کا زریں کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ ۱۸۸۵ء میں نواب میر محبوب علی خاں نے یونیورسٹی کا منصوبہ تیار کیا تھا مگر یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۵ء میں اعلیٰ حضرت نے فرمان کے ذریعہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی منظوری دی۔ جامعہ عثمانیہ نے ذہن وادرا کی آزادی کے ذریعہ جو انقلاب پیدا کیا تھا وہ حیدرآباد کے ہر شعبہ زندگی پر اثر انداز ہوا۔ مادری زبان میں تحصیل علم کی سہولتیں حاصل ہونے کی وجہ سے شاہانِ علم کے قابل جامعہ سے تعلیم حاصل کر کے بیرون

آباد اجداد کی طرح اردو زبان شعر و ادب کی سرپرستی کرتے رہے۔ اس دور میں حیدرآباد آنے والے شعرا میں میر احمد علی شہید، میر رضا علی، ذوالفقار علی خاں مفا اور عیسیٰ خاں آفاق قابل ذکر ہیں۔

نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ خاں بھی علم و فن کی سرپرستی کرتے رہے مختلف مدارس جو ریاست میں پہلے سے قائم تھے ان کی امداد و اعانت کے علاوہ بلکہ حیدرآباد میں نئے سرکاری مدارس قائم کئے۔ ان کے زمانے میں اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے مختلف مدارس میں رائج ہو گئی۔ سلطنتِ اصفیہ کے سلاطین و امرا کی اسی اردو نوازی کے اثر سے ریاست میں اردو تعینیف و تالیف کا ذوق عام ہو چلا تھا۔

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی ادب نوازی کا شہرہ سن کر داغ حیدرآباد آئے۔ انھوں نے داغ کو اپنی استاد کی کاشت و بخشا۔ اعلیٰ حضرت اور امرائے سلطنت کی فیاضیوں کا شہرہ سن کر ہندوستان کے گوشے گوشے سے متعدد شعرا حیدرآباد چلے آئے۔ ان میں نظم طلبا طبائی کا اثر تھا کہ اس دور کے چند امرائے بھی اس فن میں کمال پیدا کیا۔ جیسے ہمارا جہ کوشن پرشاد اچھے شاعر ہی نہیں شعرا کے سرپرست بھی تھے۔

حیدرآباد میں اردو کی مقبولیت اور قدردانی کا شہرت سن کر بالکمال شعرا ہی نہیں بڑے بڑے شریکار بھی حیدرآباد چلے آئے۔ ان میں پنڈت ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مولوی چراغ علی،

میں جذب ہونے لگے۔ ان کے دماغ علوم و فنون کی روشنی سے منور تھے اور ان میں علم و ادب کی خدمت کا جذبہ تھا۔

جامعہ کے قیام کے بعد اردو میں نصابی کتابوں کی فراہمی کے لیے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ جس میں مختلف علوم و فنون پر لے شہرہ کتابوں کا ترجمہ کروایا گیا ترجمے کے سلسلے میں وضع اصطلاحات کا مسئلہ بڑا اٹھن تھا اس دشواری پر قابو پانے کے لیے مستند علماء اس دارالترجمہ سے منسلک رہے۔ طغر علی خاں مجددی، دریا بادی، جوش، وحید الدین سلیم، مولوی عبدالحق جیسے مشہور ادیبوں کے علاوہ مختلف علوم کے سربراہان و ماہرین مختلف شعبوں میں کام کرتے رہے۔

نواب میر محبوب علی خاں کے دور میں بعض اہل علم و فن نے یہ محسوس کیا کہ عربی اور فارسی کا نادر و قیمتی سرمایہ تلف ہو رہا ہے۔ جہاں چہ انھوں نے اس کے تحفظ کی بہت کچھ کوشش کی۔ لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں نواب فضیلت جنگ نے ایک ادارے کی بنا ڈالی جس کا نام: ائرتہ المعارف رکھا۔ اس ادارے کو چلانے کے لیے ابتداء میں علماء اور مشائخین نے مدد دی۔ بعد میں امر کی سرپرستی میں یہ ادارہ چلتا رہا۔ لیکن اسے برتا کا موقع: آصف جاہ سابع کے زمانے میں ملا۔ نواب فقیدانہ جنگ بہادر نے آصف جاہ سابع کو اس ادارہ سے وقف کر دیا۔ تو انھوں نے پانچ لاکھ روپے عطا کئے اور اس کی تعلیم و توسیع کے احکام جاری فرمائے۔

ابتداءً اس کا تعلق براہ راست جامعہ عثمانیہ سے نہ تھا جس کی وجہ سے جامعہ کا عمل دخل اس پر نہ تھا لیکن ڈاکٹر نظام الدین کی سفارش پر اس کا الحاق جامعہ سے کر دیا گیا اور اس کی اصلاح اور ترقی کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا جس نے اس ادارہ کو مضبوط اساس پر قائم کرنے اور اس کو ترقی دینے میں مدد دی اس طرح دائرۃ المعارف کی وجہ سے علمائے اکرام کے نوادرات تلف ہونے سے بچ گئے۔ یہ عہد عثمانی کا سب سے عظیم کارنامہ ہے۔

آصف جاہ سابع کے علمی و ادبی کارناموں میں کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے دارالعلوم کا ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں عربی اور فارسی کتابوں کا نادر اور قیمتی ذخیرہ موجود تھا۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم سے متعلق کتابوں کا ذخیرہ جامعہ عثمانیہ میں منتقل ہو گیا۔ اسی وقت سے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی نقوش ظہور میں آئے۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے کا شمار ہندوستان کے بڑے اور معیاری کتب خانوں میں ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ آصف جاہ سابع کی اردو نوازد اور ان کی علمی و ادبی سرپرستی کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان کا روشن ترین دور اعلیٰ حضرت کی عہد حکومت تھا۔ اس دور میں اردو نے دکن میں وہ عروج پایا جو ہندوستان کے کسی حصے میں اور کسی دور میں اس کو نصیب نہیں ہوا۔

نجیب رامش

مضطرب صبا ئی

کیا تعجب ہے جو خود سر ہو گئے
 نفعے پودے، بے تن اور ہو گئے۔
 ذہن کے آئینے میں نہروں کا ہجوم !!!
 اپنے گھر میں خود ہی بے گھر ہو گئے
 جس کو دیکھو اس کا سینہ داغ دار
 لوگستاں اب تو گھر گھر ہو گئے
 ان کا ماضی ہے نہ مستقبل نہ حال
 وہ کہ جو مسجور مجبور ہو گئے
 سانس ہی لی تھی، کہا تو کچھ نہ تھا۔
 کیوں یہ آئینے مکدر ہو گئے
 دیکھئے حالات کی نیرنگیاں
 تکیے نازک پھول پتھر ہو گئے
 وہ جنہیں مضطرب عمل سے پیار تھا۔
 خارجِ نظمِ مقدر ہو گئے

••

اب جو معمولات کی ٹھنڈک سے کٹائے کوئی
 جسم درجہم ایک صحرا ہے، کہاں جائے کوئی

کب تک اپنے عکس سے سراپنا کلائے کوئی
 گرد بن کر گھر کے آئینے پر جم جائے کوئی

رات بھر اپنے لہو میں خود کو نہلائے کوئی
 کیا کرے اس سے جو پھر بھی کچھ نہ کہہ پاوے کوئی

جل رہا ہے صحت کی آگ میں پیسا بدن
 سامنے ہی موج کی مانند لہرائے کوئی

کوئی خط اس سے مشابہہ کوئی عادت اسکی دین
 میرے اندر میرا کیا ہے، کاش بتلائے کوئی

زندگی ہے یہ کہ گونگے آدمی کا خواب ہے
 کتنا کہنا چاہے، پھر بھی کچھ نہ کہہ پائے کوئی

••

اردو نامہ

وقار خلیل

اردو ملی علمی ادبی تہذیبی، خیر

۵ مارچ: شکر جی میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام آٹھ واں شکر جی ہسند مشاعرہ مسٹر پی، وینکٹ سبیا مرکزی ملکتی وزیر داخلہ کی صدارت میں آراستہ ہوا۔ جناب مکیش شاہ صدر نشین ریاستی قانون ساز کونسل اور ریاستی وزیر داخلہ مسٹر بیجا سکر راؤ نے جہانان قصومی کی حیثیت میں شرکت کی۔ پاکستانی شاعر محترمہ حمیدہ ریاض کے علاوہ پروفیسر نریش، میکل آتساہی، فدا ندوی، ایاز جھانسوی، یکتا گپتا، شبنم راج کساری سورج کلاسمور اور میزبان شعرا و شاد نکنت، علی احمد جلیلی، امیر احمد خسرو خواجہ شوق، کنول پرشاد کنول، صلاح اللہ نیر، رئیس اختر، فاروق شکیل اور عزیز اللہ صبا نے کلام منایا۔ جناب ثقلین حیدر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۶ مارچ: ادارہ قلم اور آواز کی طرف سے ایوان اردو میں آخری، نصفی حکمران حضور نظامت پر عثمان علی خاں آصفیہ کے عہد حکومت میں ادب اور ثقافت

کی گراں قدر خدمات کو خراج ادا کیا گیا۔ اس ادبی محفل کی صدارت کاظم نواز جنگ نے کی۔ ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنریونی جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر مفتی تبسم ڈاکٹر ہمیں سورتی، ڈاکٹر سید عبد اللہ محترمہ فیزہ کلاوس نے خطاب کیا۔ سکریٹری قلم اور آواز محترمہ سیدہ طہنہ نگم نے نظامت کی اور ہماون کاخیر مقدم کیا۔ محترمہ اختر محبوب اور جناب احمد جلیلی نے بھی اپنا تعاون دیا۔ مشہور موسیقار کوشل کمار نے کلام آصفیہ ساج ساگر دایا۔

○ جناب معلم عبیدی کے مجموعہ کلام پرواز نظر کی رسم اجرا کا جلسہ اردو گھر میں بعد ازاں ڈاکٹر سید اطہر جاوید منعقد ہوا۔ جسٹس سردار علی خاں نے رسم اجرا انجام دی جناب سید ہاشم علی اختر وائس

چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی جہان قصومی تھے۔ ڈاکٹر مفتی تبسم، ڈاکٹر مسعود علی بیگ، ڈاکٹر ابوالفضل محمود قادری، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، ملک الشعراء اور یعقوبی نے معلم کی شاعری پر اظہار خیال کیا اور پرواز نظر کی اشاعت پر مبارکباد دی۔ علی احمد جلیلی، راز عابدی اور غلام جیلانی صادق نے تنقیدی نظائیں سنائیں۔ صلاح الدین بتر نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور معلم علی (بی اے علیگ) نے شکریہ ادا کیا۔

○ اردو آرٹس کالج، اوڈیٹل کالج، ممتاز کالج اور ممتاز یار الدولہ وقف کی طرف سے اردو ہال میں جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کا جلسہ بنیت پر و فیض حبیب الرحمن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر عثمان غلام نیر دانی، محمد ابراہیم انجینئر اور دیگر حضرات نے جناب اختر کی حکیاتی شخصیت کو عثمانیہ یونیورسٹی کے مستقبل کے لیے قابل نیک قرار دیا۔ اور اس نظر انتخاب پر مبارکباد پیش کی۔

۷ مارچ: انجمن ہوامی مصنفین اور ادب قلم کی طرف سے پاکستانی

پریں سنہ

وقار علی نے نظامت کی اور جمیل شیدائی نے شکر یہ ادا کیا۔

○ مولوی سید صدیق علی قادری ایڈیٹر ہفتہ وار علم و عمل فرزند محترم اشرف علی کا بھارمہ قلب انتقال ہوا۔ جناب قادری وضعہ اور حیدر آبادی روایات کا مجتہد تھے اور پابندی سے اپنا ہفت روزہ نکالتے رہے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

○ ۱۱ مارچ: ریاستی وزیر تعلیم مسٹر آئندہ گجپتی راجو نے سلطان العلوم صدی تقاریب کے موقع پر منعقدہ سمینار کو مخاطب کرتے ہوئے سخی اور آصفی حکمرانوں کے دور کو سیکولر روایات کا سرچشمہ قرار دیا۔ آئندہ پریش میں اقلیتوں کے مسائل پر منعقدہ اس سمینار کی صدارت پروفیسر جعفر نظام نے کی ڈاکٹر جمیل الدین کمال، مسٹر ایم اے احمد جزل سکریٹری ریاستی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی، ڈاکٹر عبدالقادر عہادی، یوسف اعظمی اور جناب نظام الدین احمد نے حصہ لیا۔ پروفیسر سید سراج الدین نے نظامت کے خراج افسانہ دیا۔

○ محفل خوانین کا ادبی اجلاس محترمہ ناز جہد کی صدارت میں منعقد ہوا۔

خراج افسانہ دیا۔

○ بجے شب سلطان العلوم صدی تقاریب کا اجلاس عام پرائیویٹ میں جناب اکبر علی خاں سابق گورنر اڈیشہ کی صدارت میں ہوا مسر ز غوث خاموشی محمود انصاری ایڈیٹر منصف، جلال الدین حالی کامل، محمود پاشا قادری تخت نشین، سلیمان سکندر نے عہد آصفی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کنول پرنسڈ کنول، رحمن جامی، حسن طبعی نیر اور غلام دستگیر شیدائے نظمیں سنائیں جناب مظہر الحق قادری نے نظامت کی ○ جناب قطب سرشار کے مجموعہ کلام "انفس و آفاق" کی رحیم اجرا کی خوش گوار تقریب تلگو سخن و مرثر جی شیشندر شرما کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر معنی جتیم ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے رحیم اجرا انجام دی۔ انگریزی کی شہ راج کماری اندرا دیوی مدر ریاستی سندھی اکیڈمی، جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف، ڈاکٹر یوسف کمال جناب مضطر مجاز، ڈاکٹر حبیب منیا اور جناب رؤف خیر نے سرشار کی شہری صلاحیتوں پر روشنی ڈالی۔

شاعرہ محترمہ فہمیدہ ریاض کو استقبال دیا گیا۔ جناب احسن علی مرزا نے صدارت کی۔ جناب قادر جاوید نے پاکستانی شاعرہ کا تعارف کرایا۔ فہمیدہ ریاض نے اپنا منتخب کلام سناتے ہوئے اپنے ادبی اور سیاسی نظریات کی وضاحت کی۔ ۱۲ مارچ: مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام سر روزہ سلطان العلوم صدی تقاریب کا افتتاحی اجلاس اردو ہال میں بصدارت جناب آصف پاشا سابق ریاستی وزیر منعقد ہوا۔ پروفیسر جی رام ریڈی وائس چانسلر اوپن یونیورسٹی نے آخری آصفی ہی حکمران حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں کے ۳۶ سالہ دور کو تاریخی، ادب اور ثقافت کا اہم زمانہ قرار دیا۔ میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی اور نواب کالم نواز جنگ نے بھی مخاطب۔ جناب مظہر قادری معتدہ تقاریب نے نظامت کی۔

○ ۱۱ بجے ایک سمینار بعنوان "تعلیم انتظامیہ اور تہذیب عہد آصفی میں بصداد پروفیسر تقی خاں برائشتراک عثمانیہ یونیورسٹی منعقد ہوا۔ مسر ز میر معظّم حسین، ڈاکٹر معنی جتیم، ڈاکٹر دھرم چندر پرشار، ڈاکٹر شمیم علیم اور اسد اللہ سعید (آئی۔ اے۔ این) نے حصہ لیا۔ ڈاکٹر انور معظّم نے نظامت کے

بانو طاہرہ سیدہ اور بیگم غیاث صدیقی نے
نثری تخلیقات پیش کیں اور خواتین شعرا
نے کلام سنایا۔

۱۷ مارچ: آئبر پوریش اردو اکیڈمی
کے کل ہند ادبی انعامات برائے سال ۱۳۲۵
کے بموجب حیدرآباد کے مصنفوں کو
عفت موہانی کو ان کے ناول اور پرنسپل
غیاث الدین کی کتاب غیاث پر ایک

ایک ہزار روپیے اور ۴ شعرا و سیدہ
شہیدی، خیر شیدہ جنیدی، زور آغائی
اور ڈاکٹر راؤ دیشمکھ کے شعری مجموعوں
نیز اکرام جاوید کی کہانیوں کے مجموعہ
نیر سرست اور ڈاکٹر یوسف کمال کی
مطبوعات پر فی کس ۷۵ روپیے کے
ادبی انعامات دیے گئے۔ ادارہ سب رس
نام مصنفین کو اس ادبی اعزاز پر مبارکباد
پیش کرتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اسلامک سٹڈیز

کی طرف سے صدر ذہ سمینار جناب
یہ ہاشم علی اختر وائس چانسلر کی صدارت
میں منعقد کیا گیا۔ افتتاحی خطبہ پرنس
مفخم جاہ بہادر نے پڑھا اور مسلم
مالک سے سندھ وستان کے بہترین فنکار
اور سندھ وستانی تہذیب پر اسلامی افکار
کے اثرات کو روشن کیا سمینار کے دیگر شرکاء
میں سرزہرہ فیضہ رشید، لاداعاں، رفیعہ

دشال سنگھ، پروفیسر منظور عالم
پروفیسر شیر الحق، پروفیسر حسن چکری
کاملی، شاہد علی عباسی، اصغر اشرف
اور ڈاکٹر حفیل حیدر عابدی قابل
ذکر ہیں۔ ڈاکٹر انور معظم صد شعبہ
اسلامک اسٹڈیز نے نظامت
کی اور ڈاکٹر سلیمان صدیقی نے
شکریہ ادا کیا۔

۱۹ مارچ: سلطان العلیم
صدی تقاریب کے سلسلے میں ایک
سمینار جامعہ عثمانی میں طب یونانی
پر حکیم عبد الحمید دہلوی، شوہی ہمدرد
وقف کی صدارت میں منعقد ہوا۔
ریاستی وزیر تعلیم مشرام سنی ریڈی
کے علاوہ حکیم عبد الرزاق، بیچم
عبدالوہاب ظہوری، حکیم عزیز احمد
مجددی، طیبہ ام الفضل نے

مخاطب کیا۔ ۹ بجے شب مشاعرہ
یاد سلطان الشعراء بہ مقام پرائی
حویلی منعقد ہوا۔ جناب شاہ عالم
خاں نے صدارت کی سرزہ سیدہ
شہیدی، امیر احمد خسرو، کنول
پرندا کنول، خیرات ندیم، نواب
ہاشم جاہ، راشد آذر، مسعود مدنی
خواجہ شوق، صلاح الدین نسر،
محمد منظور احمد، ناصر کریم فیضی

خیال، صادق نقوی، رئیس اختر،
علی الدین نوید، حسن جامی اور نرگس
صبا نے کلام سنایا۔ مقتدی کے
فرائض صلاح الدین نے پورے انجام دیے۔
۲۰ مارچ: سلطان العلوم صدی
تقاریب کا اختتامی اجلاس ادبی محفل
پر ہوا پروفیسر ڈاکٹر غلام عرفان صدر
شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے ادبی محفل
کی صدارت کی۔ حمد عثمانی کے ادب،
آرٹ اور کچھ برسر ڈاکٹر یوسف
سرست، ڈاکٹر حفیل ہاشمی، سیدہ بیگم
نواب غلام عرفان، مصطفیٰ علی فاطمی،
حامد لطیف طمانی اور سیدہ صدیقی نے
مقالات سنائے رئیس اختر نے نظم
پیش کی۔ جناب مظہر قادری نے مقتدی
کی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۴ مارچ: حلقہ آرباب ذوق انظاف
اردو وٹرسٹ لائبریری اکامانات ادبی
اجلاس ڈاکٹر یوسف سرست کی صدارت
میں ہوا۔ جناب یوسف اعظمی پچھرا
انوار العلوم کالج نے محترمہ بانو طاہرہ سیدہ
کی کہانیوں کے مجموعہ خون جگر پر ادبی
تبصرہ سنایا۔ محفل شعریں غیاث صدیقی
وقاد خلیل، بانو طاہرہ سیدہ، تاج کریم نگر
اور منظور احمد مدنی حلقہ آرباب ذوق
نے کلام سنایا۔

۲۰ مارچ: ادارہ ادبیات اردو کے
پر اہتمام ۲۱ واں یوم قلی قطب شاہ بتقدیم
نبہ محمد قلی واقعہ گوگندہ پر منعقد ہوا۔
فتاحی اجلاس کی صدارت مسٹر کے
دھوریڈی چیف جسٹس آندھرا پردیش
نے کی۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال، پروفیسر
مید سراج الدین اور محمد اعزازی ادارہ
نائب سید ہاشم علی اختر (وائس چانسلر جامعہ
نمائندہ) نے قطب شاہی عہد کے ادب
ورکچر پر بحث کیا۔ مسٹر من راج
سکینہ معتمد لوم محمد قلی نے خیر مقدمی
طلبہ پڑھا۔ محمد قلی اور آصف سابق کا
لام مشہور موسیقار کوشل مکمل نے
سنایا۔ کمپن جاس عابدی نے محمد قلی کا
رشیہ پڑھا۔ صلاح الدین نیر نے نذرانہ
سخن ادا کیا۔ عزیز احمد خاں دارق کی
والی ہوئی۔ اس تقریب میں پاکستانی
نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی شرکت کی۔
اختتامی اجلاس سے پہلے ایسوں شاعر
کا اجتماعی ظہرانہ ہوا اور ایک مشاعرہ
سعید شہیدی کی صدارت میں عمومی پوچھی
کاباعت بنا۔ اس مشاعرہ میں منوہلال
ہمار، بشیر وارثی، محمد منظور احمد، احمد اللہ
حبیبی احمد، حبیب جید رآبادی، اکبر
یوسفی، راجہ لال راجہ، عتیق الرحمن لغر
استحق ملک، منیر الزماں خیر اور یوسف

نے کلام سنایا وقار خلیل نے دکنی
غزل سنائی اور نظامت کے فرائض
انجام دیے۔ جناب من راج
سکینہ نے شاعروں کا خیر مقدم
کیا اور پاٹ لک و مشاعرہ کے
افتقاد پر مبارک باد پیش کی۔
○ اردو گھر (انجمن ترقی اردو شہر
حیدرآباد) میں ریاستی چیف مسٹر
مسترن ٹی رامارادو اور کشمیر کے وزیر
اعلیٰ جناب ڈاکٹر فاروق عبداللہ
کا پرتیاک خیر مقدم کیا گیا۔ ریاستی
چیف مسٹر نے اس موقع پر کہا کہ
تلگو کی طرح اردو کو بھی ریاست
میں اس کا مستحقہ مقام دیا جائے
ڈاکٹر فاروقی نے کہا کہ مسلمانوں کی زبان
قراردینے سے اردو کے فروغ میں
رکاوٹ ہوگی۔ اردو گھر کے بانی
میسٹر جناب عابد علی خاں ایڈیٹر
سیاست نے ہر دو چیف مسٹروں کا
خیر مقدم کرتے ہوئے اردو گھر ٹرسٹ
کی سرگرمیوں کو روشن کیا اور ریاستی
چیف مسٹر کو اردو زبان سکھانے
کا ان کی خواہش پر اپنی طرف سے
پیش کش کیا۔ نواب مفتاح جاہ کے
علاوہ مسرزمین نے اس تقریب
میں شرکت کی۔ مسٹر منوہر انجیکندہ

بھنگ میسٹری نے شکریہ ادا کیا۔
۳۰ مارچ: روزنامہ سیاست
کے زیر اہتمام پاکستان کے نامور نقاد
اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو گھر
میں "ہندوپاک کے جدید تحقیقی رجحان"
پر پہلا توسیعی لکچر دیا۔ پروفیسر گیانی
چند جین صدر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی
نے صدارت کی۔ ابتداء جناب عابد علی خاں
ایڈیٹر سیاست نے سیاست توسیعی لکچر
کا تحارف کرتے ہوئے ڈاکٹر جالبی کو
خوش آمدید کہا اور بتایا کہ سال میں دو
بار ملک کے نامور دانشوروں کے توسیعی
لکچر کا اہتمام کیا جائے گا اور ہر سال
انھیں کتابی صورت میں شائع بھی کیا جائے گا
ڈاکٹر مصطفیٰ ششم کنویر نے نظامت کے
فرائض انجام دیے۔
۳۱ مارچ: یوم محمد قلی قطب شاہ
کا ادبی اجلاس ایوان اردو وس بصداد
جناب امجد علی خاں سکریٹری نظامت
ٹرسٹ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی
مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر جالبی کے
علاوہ ڈاکٹر یمیل نگم، ڈاکٹر انور معظم،
ڈاکٹر حبیب ضیاء، ڈاکٹر رحمت علی
اور پروفیسر سید سراج الدین نے
قطب شاہی ادب، وکلیات اور عہد عثمانی
کے کچھ برقعائے سنائے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ ششم

پرتاک خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر
گیان چند جین نے صدارت کی۔
ڈاکٹر مہینہ شوکت نے خیر مقدمی
خطاب کیا۔ ڈاکٹر مجاہد حسین رضوی نے
جالبی صاحب کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

ادارہ کی نئی مطبوعات

تذکرہ مخطوطات (کتب خانہ ادارہ) جلد ششم (بعانت وزارت تعلیم حکومت
صفحات ۳۳۰، ۸۰ اکراون سائز
۵۰ مخطوطات کا جامع تذکرہ

(حرثین)

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، ڈاکٹر محمد علی اثر

تذکرہ مخطوطات (جلد دوم) مرتبہ ڈاکٹر زور
طبع دوم گولڈن جوبلی ایڈیشن
(بعانت ایچ، ای، ایچ دی نکل س اردو ٹرسٹ)

برگ غزل

از۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر

چند تاثرات

”آپ نے تحقیقی اور تنقیدی کام تو بہت کئے ہیں مگر برگ غزل
شائع ہو کر سامنے نہ آئی تو آپ کی شخصیت کتنی پختل رہ جاتی۔ آپ کا شعرا
ذوق نہایت پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے۔ اشعار میں تاثر کے ساتھ دلکشی
بھی پائی جاتی ہے۔ میں اس شعری تخلیق پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں
امید ہے آئندہ اور تخلیقات بھی سامنے آئیں گی“

ہے شکریہ ادا کیا اور وقار خلیل نے نظامت کی
ایوان اردو میں جناب افتخار احمد بشر
مجموعہ کلام ترش بشر کی رسم اجرا
ب سید ہاشم علی اختر والی چاند
نیہ یونیورسٹی نے انجام دی۔ ڈاکٹر
ل جالبی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مفتی تقی
ڈاکٹر یعقوب عمر نے بشر کی نظم نگاری
راج ادا کیا۔ وقار خلیل نے معصی کی
یہ شب بزم محمد قلی قطب شاہ کاسالہ
عرہ ایوان اردو میں بصدارت جناب
دین محمد سکریٹری نظامت چائیل
ستہ ہوا۔ صدر شاعرہ نے انگریزی
سانچے اور سرز سعید شہیدی
پیر شاہ کنول، منوہر لال ساہو، ڈاکٹر
نشم، امیر احمد خسرو، وقار خلیل،
رح الدین نیر، رئیس اختر، فیض الرحمن
ڈاکٹر محمد علی اثر، محمد منظور احمد خواجہ
دق، صادق نقوی، بشیر وارثی، بانو طہر
سعید، صاحب حیدر آبادی، کپٹن عباس
عابدی، رحمن جامی، یوسف اعظمی، رضا
وصفی اور پاکستانی شاعر واجد علی شاہ
واجد نے کلام سنایا۔ جناب محمد منظور احمد
شریک معتمد ادارہ ادبیات اردو نے
نظامت کی۔

○ سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبہ
اردو کی طرف سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا

The "SABRAS" Urdu Monthly

rgan of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Atwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. F



اسلوب اور انتقاد



بالِ حبشہ

ضررِ کلیم

مکاتیبِ اسلامیہ



سید



فون نمبر ۳۸۲۶۹

سن اجراء: ۶۱۹۳۸

بیاد اکٹر میڈی الدین قلاوی زور
ماہنامہ

سب سے

میدر آباد

مدیر اعزازی معاون مدیر	معنی تبستم وقار غلیل	جلد (۲۳) مئی ۱۹۳۸ء قیمت فی پرچہ ۲ روپے
جلس مشاورت	صدر نائب صدر معمد	محمد علی عباسی ہاشم علی اختر ڈاکٹر معنی تبستم

ارکان

پروفیسر سید علی اکبر
عابد علی خان
پروفیسر گوپی چند نارنگ
محمد اکبر الدین صدیقی
دین راج سکس
پروفیسر سراج الدین
محمد منظور احمد

ادارۂ ادبیات اردو: پنجم گمہ روڈ حیدر آباد

زیر سالانہ	بیرونی ملکوں سے
۲۰ روپے	ہوائی ڈاک سے
کتب خانوں سے	مشرق وسطیٰ ۱۰ ڈالر
۲۵ روپے	امریکہ ۱۶ ڈالر
بزرگم رجسٹری ۴ روپے	۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر
انگلستان	۳ پونڈ

ادارۂ ادبیات ہندو	عابد علی خان	۲
۱۰۰ روپے روائت اور خدمات	محمد ہدایت اللہ	۳
دینی ادب میں تحقیق کے مسائل	ڈاکٹر حمیدہ جلیلی	۵
آینہ دلجو	کے کے گھنڈر	۹
چونچلیاں	حمید الحسن	۱۱
مجموعہ ادب میں خواتین کا حصہ	سیدہ لیلیٰ بیگم	۱۲
۲۰ روپے	حت سہیل میں جانور	۲
۶۰ روپے	خندلیں	۳
۲۰ روپے	فانا و دیوانہ (انٹیم)	۵
۳۰ روپے	ادبی تجربے	۹
۳۲ روپے	ادبی ٹرسٹ کا مقصدی ہند پاک شاعرہ	۱۱
۳۶ روپے	اردو نامہ	۱۲

سید علی اکبر ایڈیٹر، پبلشر، پرنٹر، پبلشر نے پرنٹل فائن پرنٹنگ پریس میڈر آباد ۲، ۵، ۱۰، ۱۵، ۲۰، ۲۵، ۳۰، ۳۵، ۴۰، ۴۵، ۵۰، ۵۵، ۶۰، ۶۵، ۷۰، ۷۵، ۸۰، ۸۵، ۹۰، ۹۵، ۱۰۰

اداس کا ادبیات اور حیدرآباد، ایک کتب خانہ ہی نہیں بلکہ دکنی ادب، تاریخی اور فطریات، فرائض اور نادر نقوشوں وغیرہ کا ایک مرکز اور میوزیم ہے جس کے ذخیرے سے دکن کی (۱۰۰) سالہ ادب اور تاریخ کی کڑیاں ملائی جاسکتی ہیں۔ حیدرآباد میں دائرۃ المعارف اور سالانہ جنگ کتب خانہ جیسے نادر ادارے بھی ہیں۔ مگر دکنی ادب ریسرچ کا واحد مرکز ادارہ ادبیات اُردو ہے۔ ڈاکٹر زور سراج نے صرف سنگ و خشت کی عمارت نہیں بنائی بلکہ دکن پر کام کرنے والوں کو اپنے ساتھ لیا۔ ان کا کام اتنا سہرا اُٹھایا کہ غلام محمد صاحب جب وزیر بنیا نسی حیدرآباد تھے اور جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے انہوں نے کہا تھا کہ زور صاحب میں چاہتا ہوں کہ خزانہ عامرہ کا معائنہ آپ کے لئے کھول دوں۔ لیکن زور صاحب نے پیسے پر کام کو ترجیح دی۔ حیدرآباد کی ۵۰ سالہ تاریخ میں سب سے بڑی اگرچہ کانفرنس ڈاکٹر زور سراج ہی نے منعقد کی جس میں غیر منقسم ہندوستان کی چالیس سے زائد شخصیات شریک تھیں جن میں قابل ذکر سر شیخ عطاء مر محمد یعقوب، خواجہ حسن نظامی، جگر مراد آبادی کے علاوہ سجاد ظہیر بھی پہلی مرتبہ حیدرآباد آئے تھے۔ نواب زین یار جنگ جوان دونوں بڑی شخصیت تھے اس کانفرنس کے صدر استقبالیہ تھے اور ہم مندوب قہر شیر باغ میں ٹھہرایا گیا تھا۔ زور صاحب نے ترقی پسند ادب کے بارے میں سنجیدگی سے بحث کی۔ یہ میرے لئے بڑا اعزاز تھا۔ اس سبب میں کے قہری ترقی پسند ادب غریب زور صاحب نے مرتب کنندہ کی حیثیت سے یرانام لکھوایا۔ شاید میری زندگی کا سب سے شہرہ ہوا۔ زور صاحب کام کرنے والوں کا ایک قافلہ بناتے تھے انہوں نے مجھے بھی اس قافلہ میں شریک کر لیا تھا۔

زور صاحب مرحوم کے بعد یہ ادارہ حکومت اُردو ہزار معمولی گرانٹ کی امداد کے علاوہ دیگر تمام ذرائع سے محروم ہو گیا تھا۔ لڑتے سال ۱۹۸۱ء میں علی اختر سکریٹری ادارے نے اس گرانٹ کو ۶ ہزار کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ ہاشم صاحب ادارہ کی گولڈن جوبلی بڑے شاندار پیمائے پر منانا چاہتے تھے تاکہ ادارے کا احیاء ہو۔ لیکن مالی مشکلات، مسائل تھیں۔ ان دنوں میں چار تھا مالیہ کے اجلاس میں یہ گھر پر ہوا کرتے تھے۔ ادارہ کے نامساعد حالات کے باعث یہ طے کیا گیا کہ ادبی ٹرسٹ کا مشاعرہ اس سال ادبیات اُردو کے لئے منعقد کیا جائے۔ عوام کو جب ادارے کا حال معلوم ہوگا۔ دستِ تعارف بڑے گا اور ادارے کیلئے ایک ٹرسٹ بن جائے گا جس کے ساتھ سے ادارہ کی مالی مشکلات کسی حد تک دور ہو سکیں گی۔

مشاعرہ کے اعلان کے بعد میں نے اس ادارہ کے نادر فطریات، نقوشوں اور ذرائع کے تحفظ کے بارے میں بعض صاحبانِ نظر سے گفتگو کی۔ انہوں نے یہ تہیتی دیا ہے کہ وہ انٹر کڈیشنڈ، حفاظت اور مائیکرو فلمز کے جدید طریقوں سے ان نادر خزانوں کے تحفظ میں مدد کریں گے۔ آج ادارہ بڑی خراب مالی حالت میں ہے۔ جو محقق اسے دیکھتا ہے پہلے اس کے تحفظ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ ان نادر کتابوں اور فطریات کو اگر نقصان پہنچے تو ہم ذمہ دار قرار دیئے جائیں گے۔ زور صاحب سے کسی نے پوچھا تھا کہ ادارہ ادبیات اُردو پر آپ نے گنبد کیوں بنایا ہے؟ انہوں نے کہا تھا کہ آئندہ اگر کوئی خراب وقت آئے تو اس کی گنبد کو دیکھ کر یہ سمجھ لیں کہ یہ کچھ اہم جگہ تھی۔ زور صاحب نے شاید ادارے کے مستقبل کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لیکن وہ صاحب کی نسا، ان قریبہ بھی مانتی ہے۔ جب ان کیٹی ادارہ ادبیات اُردو کو جنوبی ہند میں ریسرچ سنٹر بنانے کا فیصلہ ہوا ہے۔ اور انشاء اللہ یہ تجویز عملی جامہ پہنے گی۔ کمرال کمیٹی نے مرکز خوشنوی کے میاں کا جو مشورہ دیا تھا اُردو پورے دے۔ بھر میں سب پہلے اسی ادارے میں کام شروع کرنے کے مشورے دیئے ہیں۔ آج عوام کے سامنے اُردو کی تاریخ ہے جو دکن کی تاریخ اور دکنی ادب کے اس خزانے کے تعلق سے انہیں ایسا فرضی یاد دلانا ہے۔ ادارہ کے لئے ایک لاکھ کا ٹرسٹ صرف ایک

الحمد لله رب العالمين نائب صدر مجلس اديبات اردو ادارہ ادبیات اردو

روایت اور خدمات

(کوئٹہ جوبلی تقاریر ادارہ ادبیات اردو کے موقع پر کی گئی تقریر)

حالی، شاعر، نثر دان، سب جید آبادی یا قور ہے یا کچھ
مرسے قیام کیا صرف شیخ امام بخش ناسخ نے راجا
چندو مل کے بلاوے پر انکار کر دیا ذوق نے بھی یہاں
آنے سے انکار کیا اور کہا

ان دنوں گھر دکن میں ہے ٹری قدر سخن
کون جائے ذوق دلی کی نگاہیں چھوڑ کر

آج میں نے بھی انہیں ترقی اردو کے جملے میں اردو زبان
کی تاریخ سے متعلق کچھ کہا تھا اور اردو کے نامی شلوک
اور نثر نگاروں کا تذکرہ کیا تھا۔ اب وہ سب کچھ میں
یہاں ڈھرانہ نہیں چاہتا۔ دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد اردو
کے مسکن تھے۔ اردو کی نشو و نما میں کیا مسلمان کیا ہندو
کیا سکھ مذہب کے لوگ سب شامل رہے ہیں اردو
زبان کا حصہ انہی میں ہے کہ اس میں ہل چل اور
پیار کی وہ فضا رہی ہے جس کی بدولت یہ زبان وجود
میں آئی اور اس کو قائم رکھنے میں سب کا ہاتھ تھا۔ اب اگر
اردو کو آگے بڑھنا ہے تو میں ہی دو یہ باتیں رکھنا ہو گا۔ پہلے
یقین ہے کہ اردو کی ترقی انہی وقت ہو سکتی ہے جب
وہ عوام میں پھیلے، مگر اب عوام میں اس کو آگ کرینے
کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی اردو میں ہی
فرق تھا مطلقاً ماتی نے اپنے قد و شعور و شاعری میں کھلے۔

شعراۃ الاولیاء کے زمانے سے سعادت ملی ناں کے

دقت تک اردو سے تمام مامور شعرا کا جھکا کھنوی میں رہا
سب ایک کہ مہر سودا، سوز جوارت، مصطفیٰ اور انہی کے
انہی کے ہاتھ میں رہے اور انہی کے ہاتھ میں رہے۔

ادارہ ادبیات اردو کا میں مسکرمزاد ہوں کہ اس کی پہلوں
دعوت پر مجھے یہاں آنے کا موقع ملے۔ میں مرے سے اس ادارے
کے بارے میں اکثر سن کر تاگر جب میں حیدر آباد آیا تو اس وقت نہیں
ملائیں یہاں تک پہنچتا پچھلے چند برسوں میں ڈاکٹر سید علی الدین قادری
نور اور ان کے ساتھیوں نے اسے آٹا بھجایا کہ اب یہ ادارہ
ہمدستان بھری ہو رہا ہے۔ اس کی شہرت ملی ادبی تحقیق اور تقریری
ملکومات کے ذریعے ملک کے کونے کونے میں پہونچ گئی ہے
مستند نفع مدی میں تقریباً ہر شعبہ حیات سے متعلق یہاں
کام ہوا ہے۔ شعرا و مصنفین سائنس تاریخ دکن، خوشنویسی، تعلیم نسوان
داخلت سمی اس میں شامل ہیں۔ اس ادارے کا ایک بڑا
کتب خانہ بھی ہے۔ ان سب سے ایک جی چیز سامنے آتی
ہے کہ اس ادارے نے اپنے منصوبوں میں آنے والے دنوں
کا خیال رکھا ہے۔

محمد علی قطب شاہ اور دلی دکن کی اس سرزمین کو
غور حاصل ہے کہ یہاں ہمیشہ اردو کی نشو و نما ہوتی رہی ہے
تہذیب و تمدن، علم و شرافت، اتحاد و اخلاص کا ماحول
یہاں ایسا نظر آتا ہے جیسا دیگر شہروں میں کبھی دیکھنے میں آتا
ہے۔ یہ شہر ہندوستان کا مرکزی محلوں میں ہے یہی سبب ہے
کہ مالی نے کہا تھا۔

فانی دکن میں آئے یہ عقدہ کھلا کر ہم

سہ و سناں میں رہتے ہیں ہندوستان کے دور

ن آبادے ان شعرا و ادبا کو جلدی جن کو مثال میں سکون حاصل
سرفراز، ان میں رتن ناتھ سرشار، نذیر حسین آزاد، عبدالحلیم شرر،
مکملی، نذیر احمد، شبلی نعمانی، مولوی محمد الحق، خواجہ الطاف حسین

ان کے طرزِ بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور گھٹو سے زمانہ موافق ہوا اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدمہ کے موافق ہوا اور شعرا گھٹو نکلیں گے اور وہ ملت و ثروت کے ساتھ طویل قدم نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی اس وقت پھر ملو پر اہل گھٹو کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہو گا کہ جس طرح دولت اور شغل و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان اور لب و لہجہ میں بھی ہم دلی سے فائق ہیں... بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور ان کی جگہ عربی الفاظ و کلمات سے داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ سیدھی سادی اردو امراء اور اہل مسلم کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہو گئی بلکہ جیسا کہ ثقافت سے سٹائی ہے معیوب اور بازاروں کی گفتگو سمجھی جانے لگی اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و شعر پر بھی غالب آ گیا۔

مولانا حالی نے جس بات کی تشریح کی ہے وہ اب بھی صیح آ رہی ہے۔ اب اردو داں ہندی کو نظر انداز کر کے اردو کو پھر بگاڑ رہے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے "اس زمانے میں عربیت کا رنگ جو غالب ہوتا جا رہا ہے وہ اس سے (میر اور ان کے ہم عصر شعرا کے کام کی فارسیت سے) کچھ کم نہیں ہے۔ ان بزرگوں نے تو پھر بھی یہ کہا کہ جہاں کثرت سے فارسی الفاظ اور عوارے اور فارسی ترکیبیں داخل کیں وہاں بہت سے الفاظ کو اپنا کر لیا اور اپنی صرف و نحو کے خداداد پر چڑھا کر اردو بنایا لیکن آج کل یہ کوشش کی باقی ہے کہ عربی الفاظ اور ترکیبوں کو جوں کا توں رکھا جائے ایسا نہ ہو کہ یہ محض الفاظ اور صرف و نحو کے چٹو جانے سے نہیں ہو جائیں۔ ان بزرگوں نے زبان کو بنانے اور وسیع کرنے کی کوشش کی اور بہت بڑا احسان کیا، مگر آج کل لوگ ان کی تقلید کو دنگ سمجھتے اور ان کی کوششوں کو "غلط العام سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ وہ صحیح اصول پر عمل رہے تھے اور ہم باوجود ہم دلی کے زبان کی اصل ترقی و تطور کا کچھ کچھ سے موافق

ہیں۔ ایک دوسرا برحق جو فارسی عربی کے مقبول الفاظ نکال کر ان کی جگہ غیر مانوس ثقیل منکرات کے الفاظ ٹھونس چاہتا ہے اسی ناہمی میں مبتلا ہے جہاں رائے میری دونوں زبان کے دشمن ہیں۔

میری بھی یہی رائے ہے اور میں نے انجمن ترقی اردو کے جلسے میں اپنی اس رائے کا اظہار بھی کیا تھا۔ عربی اور فارسی کا استعمال کتنا جائز سمجھا جائے اس کو میری ترقی میرے شکات اشعار میں لکھا ہے اور میری رائے میں ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ مرنقی میر فرماتے ہیں:

الاحرف و فعل پارسی بکار بردن بدین قبیح است... انگریز کی بات فارسی میں آرنہ اکثر ترکیب کے مناسب زبان ریختہ می آفتد آن ہائے است دین را غیر شاعری دانند ترکیب کے مانوس ریختہ می باشد آن معیوب است و دانشمندان نیز موقوف سلیقہ شاعری است و مختار فقیر ہمیں است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگو سے ریختہ بود مضائقہ ندارد میں نے میر تقی میر مولانا حالی اور مولوی عبدالحق بابا سے اردو کے حوالے سے کچھ باتیں انجمن ترقی اردو کے سامنے کہیں اور اس تقریر میں ان کا خود کہا ہوا آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان دو تقاریر سے اردو کی ترقی کی راہ جو مجھ فقیر نے سائی ہے امید ہے کہ غور کے قابل سمجھی جائے گی۔

مجھے یقین ہے کہ ادارہ ادبیات اردو جیسا عظیم اور پران ادارہ اس سلسلے میں بہت خاصہ لے گا اور لے رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ بہت خوبی اور تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے امید ہے کہ جس طرح اس ادارہ سے نے نصف صدی میں ترقی کی ہے اس ترقی کی رفتار کم نہ ہوگی۔

یہ اس بچا سوئیں ساگر کے جشن کا افتتاح کرتے ہوئے ماکوہوں کہ یہ ادارہ دن دن ترقی اور رات رات جو ترقی کرے اور چلے زیادہ کامیابی حاصل کرے۔

مجموعہ مضامین تقدیر و تعبیر سے

(مجموعہ مضامین تقدیر و تعبیر سے)



دکھنی ادب میں تحقیق کے مسائل

نصفی کی فوٹو کاپیاں یا میکرو فلم ہیں حاصل بھی ہو جائے تو فوٹو کو ڈیولپ کرنے یا میکرو فلم کو پیرد میکس کے ذریعہ پڑھنے کا بھی مناسب انتظام ہمارے یہاں نہیں ہے۔ جو بھی طور پر تحقیق کام کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف۔ مصنف کے حالات زندگی اور ادبی کارنامے۔

ب۔ ادب پارے کے متن کی ترتیب و تدوین۔

اب صورتحال یہ ہے کہ عموماً بڑے سے بڑے مصنف

کی زندگی کے حالات تاریخ میں موجود نہیں اور اگر کسی تذکرے یا تاریخ میں کسی فن کار کا ذکر ہو بھی تو نہایت مسہرری اور برائے نام۔ اب محقق کے لئے اس کے سوائے کوئی راستہ نہیں جانا کہ وہ خارجی و داخلی شہادتوں کی مدد سے ہی سوانح مرتب کرنا شروع کرے۔ داخلی شہادتوں میں خود مصنف کے بیانات کو بڑی حد تک مستند قرار دیا جاسکتا ہے جو وہ کبھی واضح طور پر اور کبھی اشارے کنائے میں انہیں تصنیف کے مختلف حصوں میں موقع محل کے لحاظ سے پس کر دیتا ہے۔ اس کی بہترین مثال دہچی کا فارسی دیوان ہے جس سے دہچی کی زندگی کے بیشتر ڈھکے چھپے گوشے ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس شہرہ آفاق شاعر کی تاریخ پیدائش و تاریخ وفات کے لئے ہمیں قیاسات

دکھنی ادب کی بازیافت کو تقریباً نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے اور اس عرصہ میں وکھنات پر بہت زیادہ اور بہت اچھا کام ہوا ہے۔ چنانچہ دکھنی ادب کی تاریخ کی نگ شدہ کڑیوں کو ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مصنفین کے حالات زندگی کو تحقیق و جستجو کے ساتھ منظر عام پر لایا گیا ہے۔ اور ادب پاروں کی قدر و منزلت کو تنقیدی تدوین کے تحت جانچا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دکھنی ادب کے حقیقی کو روئے اول سے جو مسائل درپیش تھے وہ ہنوز باقی ہیں۔ اور کسی بھی مصنف کے حالات زندگی کو پیش کرنے یا کسی ادب پارے کے متن کی ترتیب کے لئے اب بھی ہفت خواں لٹے کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ آج بھی دکھنی ادب کا ایک قابل لحاظ ذخیرہ ہماری پہنچ سے باہر ہے۔ کیونکہ شاکی کتب خانوں اور مختلف درگاہوں سے مسلک کتب خانوں تک ہماری رسائی نہایت دشوار طلب ہے۔ اور اگر کسی طرح ہم وہاں تک پہنچ بھی جائیں تو مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے خطوط اتنے کرم خورہ اور ناقص حالات میں ملتے ہیں کہ ان سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ محفوظ بیرون ملک کتب خانوں میں محفوظ ہیں انکی دستیابی بھی جوئے مشیر لانے کے مترادف ہے اگر بالفرض حال مطلوبہ

ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ترقیہ کی عبارتیں بھی عمراً معنف کا نام، کتاب کا نام، معنف کا سماجی رتبہ اور سن تعنیف جیسے اہم امور پر روشنی ڈالنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات یہ عبارتیں اتنی مبہم اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ کئی دوسرے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں الحاقی عبارتیں بھی معنف اور تعنیف کے تعلق سے کافی غلط فہمی اور متنازعہ صورت حال پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کی عمدہ مثال تاج العقائق کا وہ نسخہ ہے جس کا اندراج سالہ جنگ لاہوری میں تصوف و اخلاق ۱۲۱۲ کے تحت ہے۔ اس نسخے میں ابتدائی عبارت سے پہلے درج ہے۔

”کلام میدان بی شمس العشاق کہ کلام وجہ الدین بزبان دکنی۔“

اور ابتدائی عبارت میں لکھا ہے۔
”کتاب تاج العقائق، رواج الحقائق، سراج القاف، جبکہ اسی نسخے کے خاتمے کی عبارت اس طرح ہے۔
”تمت الكتاب معنون ملک ابواب المسؤل
سب رس تعنیف میراں بی شمس العشاق“

اب تحقیق کے لئے یہ ایک پیچیدہ مسئلہ بن جاتا ہے کہ اس کتاب کا نام آیا سب رس سمجھا جائے یا تاج العقائق اور پھر یہ کہ یہ کتاب میراں بی شمس العشاق کہے یا وجہ الدین کی؟ وجہ الدین سے مراد وجہ الدین گجراتی ہیں یا کوئی اور بزرگ۔ ویسے زبان اور اسلوب کی بنیادوں میں اسے ارد اللہ و جمہ کی تعنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ اب بھی اس ضمن میں تعلیقت سے کوئی حکم نہ لگایا جائے۔

اسی قسم کا ایک مسئلہ اس وقت بھی پیدا ہوتا ہے جبکہ ایک ہی معنف کی پیدائش یا وفات کی تاریخ

مختلف تذکروں میں مختلف دی گئی ہو۔ جیسے میدان بی شمس العشاق کا سنہ وفات محبوب ذی الشمس میں ایک جنگ ۲۵ پر شوال ۹۷۰ھ ہے اور دوسری جنگ ۲۵ شہر شوال ۹۷۰ھ لکھا ہے۔ اس کے برخلاف برکات اللہ میں تاریخ وفات ۲۲ ربیع الاول ۱۰۸۶ھ درج ہے جبکہ برہان الدین جہانم نے اپنے والد میدان بی شمس العشاق کی وفات پر جو مرثیہ قلم بند کیا ہے اور اس میں وہ اشعار جس میں تاریخ وفات کا ذکر ہے اس طرح ہیں۔
”تاریخ حضرت سال نو سو اس پر لکھے بھی دو

دین مدت وفات یہ سنو بچہ کچھ حکم الہی کا
اربع تہوں یوں سال ماہے کون شوال ہے
رحلت کئے اس حال ہے بچہ کچھ حکم الہی کا“

بعض محققین نے سن وفات کے معرے کی قرأت اس طرح بھی ہے۔ ج

”تاریخ حضرت سال نو سو دو اس پر لکھے بھی دو“
اب محققین کے لئے ایک طویل عرصے تک یہ مسئلہ درپیش رہا کہ آیا محبوب ذی الشمس میں دی ہوئی دونوں تاریخوں میں سے کسی ایک تاریخ کو درست مانیں یا پھر برکات اولیائی تاریخ کو ٹھیک سمجھا جائے۔ جبکہ مرثیہ میں شامل اس معرے کی قرأت میں بھی اختلافات ہیں جس میں وفات کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں بعد کے مؤرخین میں اربعہ تسعون سے کیا مراد لی جائے۔ بہر حال تذکرہ نویسوں کی لاہور داہی اور اہم عبارت کی قرأت میں اختلافات کے باعث ایک پوری مدت تک میدان بی کی وفات کا سن ایک محمّد بنا دیا اور محققین کو دفرہ فکر دیتا رہا۔

مذکورہ مرثیہ کے بعد کے اشعار میں وفات کا

اس سے تو وہی واقف ہو سکتا ہے جس نے کبھی اس پر حصار وادی کو سہ کیا ہو۔ اس افسوسناک صورتحال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم ایک ہی شے کی پیمائش کرنے والوں کے درمیان تعاون اور ہمدردی کا جذبہ غفلت ہے۔

مثنیٰ کی ترتیب کے دوران ایک مرحلہ وہاں بھی درپیش رہتا ہے۔ جب ہم بیاضوں سے مواد حاصل کرنا شروع کریں۔ اب جہاں تک بیاضوں میں شامل ادب پاروں کا تعلق ہے تو یہاں محقق کو نہایت محتاط رویہ اپنانا پڑتا ہے کیونکہ اکثر کاتبین ایک شاعر کا کلام نقل کرتے کرتے بغیر کسی وضاحت کے دوسرے شاعر کا کلام نقل کر دیتے ہیں اکثر مستقل تصانیف کی صورت میں بھی کاتبوں سے ایسے فرد گزشتہ ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اکثر شعراء کا کلام ہم تک مشکوک حالت میں پہنچا ہے۔ اس کی ایک مثال عبداللہ قطب شاہ کا کلام ہے۔ گوکہ عبداللہ قطب شاہ کا نام مکمل دیوان ترتیب دیا جا چکا ہے مگر محتاط طرز عمل رکھنے والے محققین کا ایک گروہ اب بھی حیران کرتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے دیوان میں اس کے قریب ہی دور کے کسی اور شاعر کا کلام بھی شامل ہو گیا ہے۔

ایسی تصانیف جن کے سردست صرف دو ہی نسخے دستیاب ہوں ان کے مثنیٰ کی ترتیب میں بھی کافی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ جیسا کہ قطب مشتری کے مثنیٰ کی ترتیب کے وقت مولوی عبدالحق کے پیش نظر صرف دو ہی نسخے تھے اور ایک نسخہ میں کئی صفحات پر مستقل زاد جمعہ موجود تھا۔ مجھے اس وقت مولوی صاحب نے مجھے کے تحت پیش کر دیا تھا۔ لیکن اگر اب قطب مشتری کے مثنیٰ کو دوبارہ

دن پمختہ بتایا گیا ہے۔ اسی طرح اکثر تاریخی مادوں اور ہم سینوں کے ساتھ ماہ اور دن کا بھی وضاحت کی جاتی ہے بزرگین عام طور پر عسری اور بعض اوقات فصلی میں دیے جاتے ہیں۔ اس قسم کے مسائل کا حل اسی لئے اور ہی ممکن ہو جاتا ہے کہ ہمارے یہاں ایسے کیلنڈرز دستیاب نہیں ہوتے جو دن اور ماہ کی راحت کے ساتھ کم از کم پچھلے پانچ سو سال کا احاطہ کرتے ہوئے عسری، فصلی اور عیسوی کی سینیں کی یہ اب وقت نشانی دہی کر رہی۔

اب جہاں تک ادب پارے کے مثنیٰ کی تدوین کا سوال ہے۔ تو یہاں بھی کئی مسائل درپیش ہیں۔ اس سلسلے کا ایک بڑی دشواری تو وہی ہے جو پچھلے بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی خانگی کتب خانوں اور کھری ہوئی حالت بیرون ملک تک پچھلے محمولات کی تو بھی فہرست کی عدم دستیابی اس لئے ہم کسی بھی تصنیف کے تعلق سے تعینت سے کہنے کے موقف میں نہیں ہوتے کہ اس کے کتنے نسخے کس حالت میں اور کہاں کہاں موجود ہیں۔

چنانچہ آئے دن یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مرتب نے نہایت جانفشانی سے دستیاب شدہ نسخوں کو مدد سے مثنیٰ ترتیب دیا ہے اور ساتھ ہی بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ مصنف کی سوانح بھی پیش کر دی ہے لیکن جیسے ہی اس کا مقالہ زیرِ طبع سے آراستہ ہوا اسی تصنیف کے دیگر نسخوں اور مصنف کی سوانح کے تعلق سے اہم دستاویزات کی نشاندہی شروع ہو جاتی ہے۔ اب مرتب کو جن ذہنی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور نقل و تدوین کے مسئلہ ان نقد و مہر پر اس کے مقالے کی جو قدر و قیمت مقرر کی جاتی ہے

جس کی سزا محقق کو اس طرح جگنی پڑتی ہے کہ جب بھی اسے سند کتابت کے تعلق سے اس قسم کا شبہ ہرگز دوسری شہادتوں کے ساتھ کاغذ اور روشنائی کو بھی یہ نظر فائز جانچتے ہوئے نسخے کی قدامت اور کتابت کے قریبی سن کا اندازہ لگانے۔

دکھنی ادبیات کی تحقیق میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اکثر محققین مسائل نقوف سے پوری طرح اجنبی ہیں۔ حالانکہ کسی بھی خاندان کے کی عمومی طور پر ادبی خدمات کا جائزہ یا فرد واحد کے ادبی کارناموں کا محاسبہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان مخصوص خاندانوں کے مرکزی افکار، نظام نقوف اور محفوز اصطلاحوں سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ ہو یہی وجہ ہے کہ اکثر رسائل کا غلط انتخاب نظام نقوف پر پوری توجہ نہ دینے کی بنا پر یہی ہوا ہے۔

زبان کی وسعت اور اندازہ کا معیار طبعی اندازہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ادب پارے میں شامل روزمرہ اور محاوروں کا بھی مطالعہ کیا جائے اور یہ ایک دشوار گزار مرحلہ ہے۔ کیونکہ ہمارے اکثر محققین دکنی زبان کے روزمرہ محاوروں اور ضرب الامثال کے حقیقی پس منظر اور محل استعمال سے پوری طرح واقف نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر حسینی شاہ نے اپنی کتاب ”شاہ ابن الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے“ میں اس جانب خاص توجہ دی ہے۔ لیکن اس ماہر مقالے سے مجموعی طور پر دکنی ادبیات کا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر اکبر الدین صدیقی جیسے ماہر دکنیات کی نگرانی میں دکنی روزمرہ محاوروں اور ضرب الامثال پر باقاعدہ تحقیق

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

ترتیب دینے کا بیڑہ اٹھایا جائے تو مرتب کے لئے وہ بڑا مددگار ہو گا۔ عبدالحق نے مجھے کے تحت پیش کر دیا تھا۔ اس وقت تک الجھن کا باعث بنا ہے کہ اب تک کہ قطب مشتری کا ایک اور نسخہ حاصل نہ ہو جائے۔ اب ایچ اے ڈی مشہور پاسے جن کے صرف ایک ہی ایک نسخہ منظر عام آئے ہوں۔ جیسے کلیات عروامیہ ملک غرضخود کی ہفت بہشت تو ان کے متن کی صحت کے ساتھ ترتیب اور زیادہ دشوار طلب ہو گی اور اس سلسلے میں ساری ذمہ داری صرف مرتب ہی کے سر پر ہے گا۔

منظوم تعانیف کے مرتب کو اور کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے بیشتر دکنی شعراء کے یہاں صرف کا کرنا، حکایت و سکنات میں رد و بدل کر دینا معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ بعض اوقات لفظ لکھا جاتا ہے پورا مگر اسے حذف کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ دوسری جانب ساکن الفاظ کو فتح اور فتح الفاظ کو صراحت کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ ساری باتیں دکنی شعراء کے یہاں ضرورت شعری میں داخل ہیں۔ اسکے علاوہ دکنی مصنفین ہائے ہوز اور ہائے مخلوط، یا ئے حروف اور یا ئے جہول میں بھی عموماً تفریق کے عادی نہیں۔ ایسے الفاظ جن کو ایک ہی لہجے میں ادا کرنا چاہیئے۔ جیسے بولیا، سنیا، گرگیا وغیرہ اکثر ان کو ٹکڑوں میں ادا کیا جاتا ہے جیسے بول یا، سن یا، گرگ یا وغیرہ۔ اور یہ ساری چیزیں نثر سے زیادہ نظم کے متن کی ترتیب کے وقت ایک سنگین مسئلہ بن جاتی ہے۔

اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ نسخے کی تدریجیت بڑھانے کی خاطر ان کے سند کتاب میں لکھیں جن چاہی ترمیم کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا ادبی جرم ہے

کے کے کھنڈر

داغ دہلوی



بعد ایک کمرہ پاہلوان روز بدلا جاتا تھا۔ جسم مدت نے
ایسا بنایا تھا کہ لباس زیب دیتا تھا۔ دلی کے شرفاء کا لباس
لوہارو وضع کی ٹوپی۔ نچی چوٹی کا انگرکھا۔ سیدھی تراشی کا پاہلوان
رامپور جانے سے پہلے قیام دلی کے دوران یہی لباس تھا۔
حیدر آباد جا کر اچکن یا شیردانی۔ پاؤں میں دیڑھ عاشرہ کا
جوتا، انگریزی جوتا بھی خوب جیتا تھا۔ کبھی کبھی یوگرہ بھی استعمال
کرتے تھے۔ حقہ کا خوب شوق تھا۔ بیچوان پیسے تھے۔ اور چلم کس
وقت ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔ شطرنج اور چھوڑ خوب کھیلتے تھے۔ غیب
کا حافظ تھا۔ موسیقی کے ماہر تھے۔ سنسار اتنا اچھا جانتے تھے کہ
سننے والے دنگ رہ جاتے تھے آواز میں بے انتہا درد تھا۔
داغ دہلوی نواب شمس الدولہ کے بیٹے تھے۔ دلی کے لال قلعہ
میں تعلیم پائی اور سن ستاون کے انقلاب کے بعد رامپور چلے
گئے تھے۔ یہاں نواب یوسف علی خان کے سلوک نے انہیں اتنا
متاثر کیا کہ وہیں کے ہی ہو کر رہ گئے۔ نواب رامپور کے انتقال
کے بعد ۱۸۸۶ء میں انگریزوں نے درباری شعراء کے ولیفہ بند کو
دیکھ کر تو داغ نے رامپور چھوڑ دیا۔

ہے عجب شہر جھلے آباد — اس کو کھنا بہ نالہ
سب اسے رامپور کہتے ہیں — ہم تو آرام پور کہتے ہیں
غیر تو آپ کی منانے ہیں — جس کا کھلے ہیں اُسکا کلاتے ہیں
رامپور چھوڑا تو حیدر آباد پہنچے جہاں میر محبوب علی خان

جن لوگوں نے داغ کو دیکھا اور سنا ہے ان میں
حضرت یغود دہلوی کو نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔
ان کے مطابق داغ کے کلام کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ جو غزل
رات کو مشاعرے میں پڑھتے تھے۔ صبح کو کوچہ و بازار میں لوگوں
کی زبیاں پر ہوتی تھی۔ اکثر شاعر داغ کی مقبولیت سے جلتے تھے۔
ان میں سے ایک نے تو سر رہا لوگ کر کہا۔ حضرت آپ کا اور میر
آج فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ میں اچھا شاعر کہتا ہوں یا آپ۔
داغ نے کہا۔ حضرت شعر تو اچھا آپ ہی کہتے ہیں لیکن لوگ میر
ہی شعر پسند کرتے ہیں تو میں کیا کروں؟

داغ کے غزل پڑھنے کا انداز انوکھا تھا۔ شادی کوئی
ایسا مشاعرہ دلی میں ہوا ہو جسے داغ نے نہ ٹوٹا ہو۔ یغود کہتے ہیں
کہ مشاعرہ میں ”داغ ہمیشہ تحت اللفظ غزل پڑھتے تھے۔“ فصاحت
زبان کی بلائیں لیتی تھی۔ الفاظ موتیوں کی طرح ڈھلے چلے آتے
تھے۔ شعر اس خوبی سے ادا کرتے تھے کہ سننے والے کے سامنے
لقبہ کھینچ جاتا تھا۔ میں نے ان سے بہتر غزل پڑھتے کسی کو نہ
سنا۔“ ان کے سامنے کبھی کسی کی غزل کا ملباب نہ ہوتی تھی۔
انہیں غزل میں مشاعرہ میں خود غزل پڑھنی چھوڑ دی تھی کسی اور
سے پڑھوا دیتے تھے۔ طبیعت میں نفاست تھی۔ عطر کا بہت شوق
تھا۔ ظہر کے وقت بیسن مل کر اوپر کا جسم دھلتا تھا۔ چھوڑا
مسم پر عطر ملا جاتا تھا۔ اس کے بعد ظہر کی نماز پڑھنے کے

یعنی نظام حیدر آباد نے وہ عزت بشت نہ اپنا سیاسی حلقہ کار بنالیا۔ حیدر آباد میں داغ نے دلی کی شاعری کے چراغ روشن کئے۔ دکھن زبان پر فریقہ تھے۔ اس زبان کے شعور گھنٹوں گھنٹے رہتے تھے۔

داغ کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے فارسی اور عربی کے برعکس الفاظ کا استعمال نہیں کیا۔ اردو میں ایسے سلیں، سادہ اور آسان شعر لکھے کہ سارے ہندوستان میں اس کی دھوم مچادی۔ اردو ہے جس کا نام ہیں جانے جی داغ

سارے جہاں میں دھوم مچا رہی زبان لکھی ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سارے ہندوستان

میں ان کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ مولانا احسن مارہروی اور علامہ اقبال جیسے باکمال ان کے شاگردوں میں تھے۔ اردو شاعری کو مقبول، عوام پسند اور دلی سے قریب لانے میں داغ دہلوی اور ان کے شاگردوں نے جو نمایاں حصہ لیا ہے اسی اس کا بھرپور حبانہ نہیں لیا گیا ہے۔ اردو زبان پر داغ کے جو احسانات ہیں ان کے شمار کا وقت آگیا ہے داغ اس زمانے کی یادگار ہیں جب اردو ادب وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر عموماً کے رخ کو پہچان رہا تھا۔

سر سید احمد، حالی، شبلی وغیرہ اردو ادب کا رخ موڑ رہے تھے۔ لیکن یہ نیا رنگ سخن اسی عام نہیں ہوا تھا۔ ادب و شاعری میں داغ دہلوی، امیر مینائی، مصلحی اور اسیر مکنوی کا سکہ چل رہا تھا۔ حالانکہ ان کی شاعری میں اس پہلے ہوئے نظام اور زمانے کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی صلاحیتوں سے زبان کو جس حد تک سنورا اور نکھارا ہے اس سے اردو ادب کا ہر طالب علم واقف ہے۔ خالص بدائع، تشبیہ و استعارہ، نقد و

پردہ اور وہ فصیح و غریب الفاظ سے متعلق ان کے مباحث نے اردو میں ایک ایسی جاندار روایت کی بنیاد ڈالی جس نے زبان کو بے حد غائدہ پہنچایا۔ لغت اور زبان کے اصولوں پر بھی کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اس طرح قدیم رنگ اسی شان و شوکت ساتھ قائم رہا۔ جیسے جدید اردو ادب ذہنوں پر چھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ قدیم رنگ حرف جام اور ساقی کا رنگ ہی نہیں تھا۔ عاشق، معشوق اور نفع اور پروانے کے رنگ تک محدود نہیں تھا۔ نہ اس میں الفاظ کا گور کہ دھندا تھا۔ نہ تعبیر کی بھرا۔ نہ اس میں چمک آرائی نہ سیاسی گرم جوشی۔ نہ اپنی طرح کی شاعری تھی۔ جس کا انداز نہ الٹا تھا۔

خوشی و طرقت داغ کا وہ چمکتا ہوا جوہر تھا جس کی آب و تاب آج تک باقی ہے۔ ان کا خلق و عادت کی یہ خوبی ان کی تعلیم زندگی پر ایسے چھائی ہوئی تھی کہ بات بات سے شغری اور نقرے نقرے سے طرقت چمکتی تھی۔ مرزا غالب کی طرح داغ کو اپنی اس فطرت سے فائدہ بھی ہوئے۔ مثال کے طور پر اپنی اس زندہ دلی کے باعث وہ غم اور الم کو آسانی سے جھیل لیتے تھے اور اپنی ہر مصیبت کو ہنس مذاق میں ڈبو دیتے تھے۔ ہر بحث و مباحثہ میں حصہ لیتے تھے۔ ایک دفعہ راجپور میں نواب کلب علی خان کی موجودگی میں لفظ "سانس" پر بحث چمڑ گئی۔ اس لئے کہ دلی میں سانس مذکر سمجھا جاتا ہے اور مکھنوں میں مؤنث۔ دلی اور مکھن کے شعراء دونوں مہو تھے۔ امیر مینائی اور داغ دہلوی بھی تھے۔ جب بحث کافی طویل پکڑ گئی اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچی تو نواب صاحب نے داغ کو مخاطب کر کے کہا۔ داغ صاحب آپ بھی کچھ فرمائیے۔ استاد جواباً بولے۔ "مخدوم میرا ضمیمہ یہ ہے کہ مؤنث کا سانس مؤنث اور مذکر کا سانس مذکر سمجھا جائے۔"

چھ نظمیں

⑤ نظم کے روپ

بند کمرے کے سرد گوشے میں
کتنی سرگوشیوں کے بعد کہیں
فکر
لفظوں میں دھل کے نظم بنی
اور وہ نظم جس کی رنگ رنگ میں
تھا شجاعت کا گرم گرم لہر
اب تو یہ سوچنا ہے
ہاتھوں میں
کاسہ فکر ہو کہ یا تلوار ...!

④ سوال

فدا
میری جھولی مسرت سے بھر دے
فدا
پھر بٹا
اس کرم کے عوض
تسرا ناچیز بندہ
تجھے کون سی پسند دے
کیا کہے
وہ تہی قلب ہے

زندگی

یوں بھی ہو سکتی ہے
اپنی زیست کی تعریف جیسے
پینک سے محسوس ہو
آئے نہیں

⑤ کمزوری

میں نے ہی اسکو پکارا تو وہ انجان رہی
آج بے اسکی ضرورت ہے نہ قربت کی تنہا
میرے پہلو میں وہ ایسا دم ہے
گدگداتی ہے مجھے برق صفت ہاتھوں سے
گنگنائی ہے وہی گیت
جو الماس کی کمزوری ہے !

① اندیشہٴ لہساں

ناخنوں میں
انگلیوں میں
گرو تھی
میوے ہاتھوں کی بکریں بھی نلڑاتی نہ تھی
صاف پانی میں ڈبو کر
بدلتے اپنے ہاتھ دھوئے ہیں ابھی
شک ہو جائیں گے حرمی
ہے بھی بہتہ کہ
کوئی مسکند پیدا نہ ہو
پھر کسی رومال کا — !

② ہمدانی پچیان

شعبہ شور انگیز میں
تم جو آؤ تو
ہماری جستجو شکل نہیں
اعتیادِ عرض ہے
ایک ہی تنہا نشان
جسکے دردِ آنے کھلے ہوں
نفس اے سمجھو
ہمارا ہی مکان — !

سیدہ طیبہ بیگم

عہدِ آصفی کے ادب میں خواتین کا حصہ

سیدہ طیبہ بیگم کو ادبی ذوق نابالغ سے مدد تین پلاہ پرانا عہد الملک بہادر، نانی طیبہ بیگم اور والدہ سیکندہ بیگم رحمت اللہ علیہم وسلم دوست ہستیوں نے عید آباد کے خالص علمی اور ادبی ماحول میں بلا واسطہ اور بالواسطہ طور پر انکے ذہن کی آبیاری کی۔ انکی ماس فطرت نے جو کچھ زندگی میں دیکھا اور حاصل کیا انسانوں کا روپ دے دیا۔ طالب علمی سے کہانیاں لکھنے شروع کیں۔ نانی سوری ماڈل پرائمری اسکول میں ڈراما گیس میں حصہ لیتے لیتے ڈرامے، نیمبر اور کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ریڈیو پر بچوں کے پروگراموں میں حصہ لیتی رہیں اور خود اپنی کہانیاں، نیمبر اور ڈرامے پیش کرتی رہیں۔ محبوبہ گورنر اسکول اور دینس کالج کی تیلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہیں۔ ان ہی دنوں مختلف رسالوں اور اخباروں میں انکی کہانیاں، مغامروں اور افسانے چھپنے لگے۔ لیکن ”خوب تر“ کی جستجو میں انکی بہت سی کہانیاں انکی کاپیوں میں ہی دفن رہیں اور چھپ نہ سکیں۔ ۱۹۵۵ء میں جرجی کی ڈالی ”بچوں کیلئے“ اپنی والدہ اور نانی کی کہانیوں کو مرتب کیا۔ ۱۹۵۷ء میں پاکستان میں شوہر کے انتقال نے دینی صلاحیتوں کو غم و اندوہ کے طوفان میں بہا دیا۔ اس سانحہ نے کچھ اتمدادی ذمہ داریاں بھی لا ڈالیں۔ سندھی ایجوکیشنل انسٹیٹیوٹ، دہلم گورنر اسکول (دھرو دھن) اور سینٹ پال ہائی اسکول (عید آباد) میں کچھ سال پڑھاتی ہیں۔ ۱۹۷۱ء اور سنڈیکٹ بینک کے لیے بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ علیگڑھ کے قیام کے دوران بیشتر نامی کام انجام دیئے۔ ادبی اور سماجی تنظیمیں قائم کیں۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے طلباء اور خواتین و بچوں کی مختلف سرگرمیوں میں علمی حصہ لیتی رہیں۔ ۱۹۷۵ء میں انٹرنیشنل دینس انٹر کالج لاڈل بھی دیا گیا۔ رفاہی، سماجی اور ادبی خدمات کے سلسلے میں علیگڑھ میں انہیں مختلف ایوارڈز اور سکرز بھی عطا کئے گئے۔

عید آباد آنے پر بعض خواتین سے وابستہ ہو کر متحدی کے فرائض انجام دیئے۔ ساتھ انڈیا اور پاکستان کی شعبہ خواتین کی متعدد مقررہائیں جو قبل اور آواز کے نام سے اخبار ہلنے پر اُردو تنظیم کی بنا ڈالی۔ (ادارہ)

عہدِ آصفی کے محبوب بادشاہ نواب میر محبوب علی خان کا سرپرستی میں اُردو کا مستقبل شاندار تھا

میدرآباد کی تہذیب، اس کا مزاج، اسکی سوچ اور فکر میں
برآوردگی گہری چھاپ تھی۔ اہل علم و فن نے گونے گونے
میں علم کی شمعیں روشن کر رکھی تھیں۔ مشاعروں کا سالانہ
ہوتا تھا اور ہر خاص و عام میں شعر و سخن کا ذوق تھا۔
خود بادشاہ شہر کہتے اور آصف، مخلص فرماتے تھے۔ عزت
و آغ سے تلمذ حاصل تھا۔

لیکن ۱۹۱۱ء میں جب آصف جہاں صاحب نواب
میر عثمان علی خان تحت نشین ہوئے تو حیدرآباد تہذیب و
نہل کا حاکم بن گیا اور علم و فن کا سرچشمہ بن گیا تھا۔ یہ زمانہ
اُردو زبان و ادب کی ترقی کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا
اور بلاشبہ ”عہد زریں“ کہلانے کا مستحق بھی۔ ۱۹۱۹ء میں
جب جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو اس گنجینہ علم و
فن میں دور دور سے علم کے پروانے کھینچ چلے آئے۔
شاعروں اور ادیبوں نے عروسِ دکن کو بیش بہا جواہر
پر دنا سے سنوارا۔ ترقی یافتہ ادیبوں اور شاعروں کو نئی
جولان چاہیں ملیں۔ اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر جانہ
نے دیا۔ ہر کے علوم اُردو زبان میں منتقل کئے۔ اور اس
کا دامن علمی، فنی اور تکنیکی اصطلاحات سے بھر دیا۔
حیدرآباد کے علمی و ادبی کارناموں میں جن لوگوں نے نمایاں
طہ پر حقہ لیا ان میں نواب حامد الملک بہادر، نواب حفیظ
جنگ، عبدالعلیم شتر، اور عزیز مرزا قابل ذکر ہیں جن کی کوششوں
کے سبب دائرۃ المعارف، دارالترویج، مکتب خانہ آصفیہ اور
جامعہ نظامیہ ظہور میں آئے۔ رنہ رنہ مختلف کالجوں کا قیام
عمل میں آیا۔

آصف صاحب کی سرپرستی اور علم و ادب میں فائز
دہی کے باعث ان کی تدبیراں رعایا نے انھیں سلطانِ علوم
کو خطاب دیا۔ بقول جاب حبیب الرحمن صاحب ”میسویں صدی

کے نصف اقل میں اُردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کے
تعلق سے جن افراد کے نام لے جاتے ہیں ان میں نواب میر عثمان
علی خان آصف، صاحب کا نام ہمیشہ سہرے حرفوں میں لکھا
جائے گا۔“

آصف، صاحب خود بھی شعر کہتے اور عثمان مخلص فرماتے تھے۔
حضرت فصاحت جنگ جلیس سے تلمذ رہا۔ سراج، نظم
لیا جہاں اور کشتن پر شاد جیسے نامور شاعروں نے کلام میں
نیچے جوڑے۔ قیصر، منتوی، غزل، نظم جملہ اصناف
شاعری میں شعرا کی نازک خیالیاں نغما میں طویل ہوئیں
تو کیا وجہ تھی کہ حیدرآباد کی نسوانی دنیا علم و ادب
کے اس سرچشمہ سے سیراب نہ ہو۔!

آصف، صاحب نے پہلی بار طبقہ نسوان کے مسائل کو
کی کوشش کی۔ یہ وہ دور تھا جب ہر جگہ انقلاب رونما
ہو رہے تھے۔ سیاسی، سماجی، جسمی، ادبی، تہذیبی اور
صنعتی ترقی کے لئے جدوجہد کا آغاز ہو رہا تھا۔ آصف،
صاحب کی مدد میں نگاہوں نے خواتین کی بیداری کا عمل
تلاش کر لیا۔ جہالت، توہم پرستی اور تعصبات کے
پردوں کو گرا کر انہوں نے خواتین کے لئے تعلیم ضروری
قرار دی۔ اور تعلیم کے مواقع فراہم کئے۔ زنانہ
مدارس کھولے اور جامعہ عثمانیہ کے ساتھ کلیہ انات بھی جوڑ
میں آیا جو آج زنانہ کالج یا ویمینس کالج کہلاتا ہے۔

اسی طرح خواتین کا احسان بیداری کا قطعی
اور تھمتی حثیت میں نمایاں فرق ہوا۔ اور انہیں اپنی خواہش
صلاحیتوں کے آجا کر کرنے کا موقع ملا۔ مجموعہ ”گرلز اسکول
اور نامیہ زنانہ اسکول کے ذریعہ حبیبیہ دیر محبوب
علی خان کے عہد حکومت میں ڈال گئی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیمی
حالت سنبھلنے لگی۔ اسکول کے بعد وہ زنانہ کالج اور جامعہ

عثمانیہ سے بی۔ اے، ایم۔ اے اور سائنس کی ڈگریاں لینے لگیں۔ قدامت پرستی کو خیر باد کہہ کر لڑکیوں نے طرزِ جدید پر اپنی زندگی کو ڈھالنا شروع کیا۔ عمل کے ہر میدان میں کود پڑیں۔ جب علم نے سفارِ ارقادب کے خزانے بھی ان کے رشتہاتِ مسلم سے بھرنے لگے۔ تعلیم کی روز افزوں ترقی تہذیب و تمدن کے مینار بھی روشن کرتی چلی۔ خواتین گھر کی چار دیواری میں موقی پھرتی تھیں وہ بھی پردے سے باہر آئیں۔ اور پھر وہ ہوا جواب تک نہ ہوا تھا۔ نسوانی فکر و جذبات نے اردو ادب میں دلاؤ نیری پیدا کر دی۔ معاشرت کو سنوارنے کی باتیں عمل کا حد تک پہنچیں۔ خواتین اپنے حقوق حاصل کرنے میں کوشاں ہوئیں اور قریٰ تحریر کیوں میں مصروف ہو گئیں۔ اور پھر دکن دلیس کی خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ زندگی کے سفر پر روانہ ہواں ہوئیں۔ نئے راستے بننے لگے۔ نئے منزلیں ملنے لگیں۔ نئے آفاق پیدا ہوتے گئے۔ آج طباطبائی اور شادکی شعلہ نواہوں کے ساتھ خاتونِ شہزادہ زنگیں بیابانِ ہند آصفی کے ادبی ماحول میں رنگ بھرنے لگیں۔ دکن کی چہیتی اور عظیم شاعرہ بشیر النساء بیگم بشیر کا احاطہ تفکر و عقیدت چھل بن کر شہرِ عثمانیہ پر برہنہ ہوا۔

نہ پوچھ اسکی حقیقت کہ آج کیا ہے دکن
و قارِ مہند کا باعث بنا ہوا ہے دکن
وہ کوہِ نور، وہ ہیرے نہ ہوں بھی تو کیا غم
جواہراتِ ادب سے بھرا ہوا ہے دکن!
معاشرت میں، تمدن میں اہل ہر ایک فن میں
ترقیوں کے منازل پہ آگیا ہے دکن
یہ فیض ہے شہ عثمانیہ کی صکرائی کا
کہ یادِ عظمتِ رفتہ دلار ہا ہے دکن

جہدِ آصفی سے قبل حیدر آباد کی سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات ایسے تھے کہ عورت پرست سے باہر آکر اپنا لوہا مناسکتی یا اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے آواز اٹھا سکتی۔ پرانے رسم و رواج کا طیارہ ان کے پیروں میں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ توہمات میں گھری ہوئی خواتین ڈرتے ہوئے سورج اور پھیلتے ہوئے اجالے سے مستفید نہیں ہو سکتی تھیں۔ زندگی کے تقاضوں سے بے تعلق انکی سوچ و فکر گھر کی چار دیواری سے آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔ طبقہ نسوان کی اس زبوں حالی اور عسروییوں نے محترمہ طیبہ بیگم بکراہی کے احساس کو جھنجھوڑا۔ طیبہ بیگم مرحومہ آصفی صاحبہ کے اہلیق نواب عماد الملک بہادر کی صاحبزادی تھیں جو عالمِ اہل فکر ہونے کے علاوہ حامیانِ اردو اور تعلیم نسوان میں سے تھے۔

طیبہ بیگم نے ناپولی گرلز اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدراس یونیورسٹی سے مگجنگ ۱۹۰۶ء میں گریجویشن کیا۔ یہ پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں مہارت رکھتی تھیں۔ شہستہ علی ماحول میں انہوں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا۔ اپنے ادبی مضامین، ناول اور فکر انگیز نثر اریہ کے ذریعہ انہوں نے سماج اور معاشرے کی خرابیوں، جمود و جہالت اور دلتاؤسی رسم و رواج سے خواتین کو جھٹکا رلاؤ کا بیڑہ اٹھایا۔ غریب لڑکیوں اور خواتین کی علمی، اخلاقی اور معاشی حالت کو درست کرنے ۱۹۱۳ء میں انہیں خواتین اسلام کا جھنڈا آج بھی ان کی صاحبزادیاں معصومہ بیگم اور سکینہ بیگم سنبھال رہی ہیں۔

تصنیف و تالیف علمی خدمات کا پھول ہیں۔

سہ ملک و قوم کے دماغی اور ذہنی ارتقاء کے معیار کا اندازہ
 میں دور کی تصانیف و تالیفات سے ہی ہوتا ہے۔ اس دور
 کی معاشرت اور تمدن کی بہترین عکاسی طیبہ بیگم نے اپنے
 "اولہ انوری بیگم" میں کی ہے۔ ان کا دوسرا ناول
 "حشمت النساء" بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کا ایک
 کامیاب تجربہ ہے۔ "اسرارِ سلیمانی" ان کے ترجموں کا
 مجموعہ اور "وسائلِ طیبہ" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے
 ادارہ ادبیات اُردو نے شائع کروایا ہے۔ اپنے ناولوں
 مضامین، ترجموں اور تقریر کی وجہ سے مرحومہ نے دنیا
 ادب میں ایک خاصی مقام پیدا کر لیا۔ چنانچہ یہ پہلی مسلم
 ماہرینِ تحقیق جنہوں نے دورِ آصفی میں ادب کے ذریعہ ایک خوبصورت
 نقاب برپا کر دیا۔

میدر آباد کی تاریخ اپنی خواتین کی بیداری اور
 ترقی کا دلچسپ سے مشاہدہ کر رہی تھی۔ ادب و ثقافت منظر
 تھا کہ ستوائی تحریک اور قومی تحریک کے جادو کے سر
 چڑھ کر بولتے ہیں !

مغربی بیگم ہالین مرزا کی عورتوں کے مسائل سے
 دلچسپی نے انہیں طیبہ بیگم بلگرامی بیگم (غدیو جنگ) کے
 ساتھ ملکر پردہ نشین خواتین کے اندھیرے راستوں میں اجالے
 پیدا کرنے کی تلقین پیدا کر دی تاکہ وہ اپنی منزلِ خودمیان
 سکیں۔ چنانچہ وہ "انجمن خواتین اسلام" کی سکریٹری بن گئیں۔
 پھر "انجمن خواتین دکن" کے قیام پر اس کی صدر بن گئیں۔

مغربی بیگم ایک سلیجی ہوئی ادیبہ اور شاعرہ تھیں
 اُردو ادب کو انہوں نے "مروغی"، "زہرہ"، "آوازِ غیب"
 "نی بی طور" کے خواب "صحیفہ خجالت"، "پند و نعار"،
 "مشیرِ نسوان" اور "سرگزشت ہاجرہ" جیسی کتابیں دیں۔
 مختلف سفرنامہ لکھے۔ "النساء" اور "زیب النساء" نامی دو
 رسالے جاری کر کے لڑکیوں اور خواتین کے مسائل پیش کیے

شاعری کا بھی ذوق تھا۔ میا علی گزنی اور استاد جلیل
 سے تلمذ حاصل رہا۔

ان دنوں خواتین نے جذبِ دل اور نورِ قلم سے
 طبقہٴ نسوان کو "خودی کی بلندی" اور "پروانہ فکر" کی
 دعوت دی۔

اس فن میں یں اگر بلبل ہند منہ سرد و جہن فانیڈ
 کا ذکر کروں تو بے جا نہ ہو گا۔ دکن کی یہ وفا دار ادا قابل
 فخر بی بی نے گو انگریزی زبان میں گیت گائے لیکن اُردو
 زبان اور شاعروں اور اُردو مصنفوں کی سرپرستی بھی کی۔
 اقبال، جوش، حفیظ اور احمد کے کلام کی قدر داں
 تھیں۔ انہوں نے اُردو میں دعوائل دارِ تقدیر بھی کیں۔

نیشنل کانگریس کی رکن بن کر جمیل کی سختیاں بھی چھیلیں
 بعد میں کانگریس کی صدر بھی رہیں۔ عہدِ آصفی کی ایک دینی
 خاتون کے یہ کارنامے بے شک حیدر آباد کے طلحہ طرہ امتیاز تھے۔
 ۱۹۲۹ء میں ادارہ ادبیات اُردو کے زیرِ سرپرستی اُردو
 نسوانی دنیا میں علمی و علمی سرگرمی اور علم و ادب کا صحیح
 سنجیدہ اور سلجھا ہوا ادق پیدا کرنے کی غرض سے جب "مشعر
 نسوان" قائم کیا گیا تو اس کی مجلسِ عاملہ کی صدر محترمہ ماجہ
 بیگم انوار اللہیہ جسکی علمی و ادبی صلاحیتوں کا پورا پورا
 اُردو فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اخلاقی اور اصلاحی
 تقیوں لکھتی رہیں۔ سو تیل ماں "ان ہی کے قلم کی رہی بہت
 ہے۔ انکے خیالات سلیجے ہوئے پاکیزہ ہوتے ہیں۔ کئی عربی تک
 آپ محبوبہ گریز اسکول میں اُردو اور فارسی بھی پڑھاتی رہیں
 ڈاکٹر می الدین قادری زور کی شریک حیات تہنیت
 النساء بیگم نے بھی اُردو ادب میں اپنی دلگوشی کی ایک نمایاں
 مقام پیدا کیا۔ یہ پرانی تہذیب کی دلدادہ ہیں۔ غزل کے شیراز
 میں لغت اور قصیدے لکھتی رہیں۔ اپنے وارداتِ قلبی کے ساتھ
 وارمیش کرتی ہیں۔ کلامِ خالص و تاتر سے بھرپور اور عشقِ رسول

سے لبریز ہو چکے۔ لافان اور عویق ان کے ہر شعر سے ٹپکتی ہے۔ ”اکرو فکر“ ”میر و فکر“ اور ”تسلیم و رضا“ ان کے نصیبیہ نظم کی قدیمیں ہیں۔ بقول انعامیہ در حسن ”ہر لفظ ایک چراغ ہے۔ کیا چراغ جسک اللہ سبحان قرآن میں تعریف فرماتا ہے کہ ہر کجی کی قدیم ہے اور اس میں زمینوں کے تیل کا چراغ روشن ہے۔ زور بیگم کی لغتوں کی قدیمیں مرم غوی میں نظر آتی ہیں۔ اللہ یہ اتنے سارے بدشمن عین چراغ ان کے پاس کہاں سے آئے؟“

آغا صاحب ثنیت النسا بیگم کو ”زور بیگم“ کہا کرتے تھے جسکو دلنے اداۃ کے قیام کے دوران اپنے شوہر کا علوم و دل سے ہاتھ بٹایا ہے۔

سکینہ بیگم رحمت اللہ تعالیٰ علیہا ماد الملک کی لڑائی اللہ تعالیٰ علیہا طیبہ بیگم بلگرامی (خدیوہ جنگ) کی دوسری صاحبزادی ہیں۔ محبوبہ گلزار اسکول سے سنہ ۱۹۲۷ء میں گریجواری کی اور انگریزی میں مہارت رکھتی ہیں۔ محققہ نوپس اور انسانہ نگاری میں شہرت حاصل کی۔ جدید و قدیم رجحانات کا فروغ کو امتزاج رکھتی ہیں۔ سخن نہیں اور سخن سبھی کے ساتھ شعر گوئی کا بھی شوق ہے۔ سکینہ تخلص کرتیں۔ اور رسید علی مید رنگب طباہی سے ملتی لیتی رہیں۔ انداز بیان سلیقہ پر انداز شستہ ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو کے شعبہ نساں کی معتمد اور رسالہ ”سب رس“ کی مجلس ادارت کی رکن رہیں۔ ”مذکرین“ کے نام سے خواتین کی قلمی کادستوں کو کتابی صورت دی اور ”سائل طیبہ“ میں اپنی والدہ کے مضامین و گفتار پر کو شائع کیا۔ ان کے افسانے اور نعت اور ریڈیو سے بھی نشر ہوئے۔ غریب حور توں کو تعلیم کے ساتھ انہوں نے دست کاری اور کشیدہ کاری بھی سکھائی۔ ادارہ کی طرف سے تعلیم بالغان کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں دلچسپی لیں۔ مگر بڑھاپے کی کشتی میں۔ نساوی کائناتوں، مجلسوں اور

انجمنوں میں شریک رہیں۔ دواخانہ عثمانیہ میں نگار کار کی حیثیت سے مریضوں کی دیکھ بھال بھی کی۔ غنوں لطیفہ سے بھی دلچسپی رہی۔ اپنے علمی اور سماجی کاموں کے سبب مقبول رہیں۔ فی الحال ”انجمن خواتین اسلام“ اور ”درسہ عثمانیہ نساں معظّم“ میں مارک، ایجوکام سنبھال رہی ہیں۔

بشیر النسا بیگم بشیر حیدر آباد کا تعلق ادبی اور تہذیبی زندگی کی رواج رواں تھیں۔ کوئی ادبی مجلس ایسی نہ تھی جہاں بشیر کے لئے نہیں گونجتے تھے۔ بشیر کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اُردو، فارسی، عبور حاصل تھا۔ کم عمری سے ہی مزاج شاعری کے لئے موزوں ہو گیا۔ کبھی سے اصلاح نہیں لی۔ ۱۹۲۷ء سے شاعری کا آغاز کیا۔ نظم، غزل، قعیدے، لغت، مسدس لکھتی رہیں۔ قوم کو فلاح کی راہ دکھائی۔ اور نامساعد حالات سے واقف کرایا۔ حیدر آباد تہذیب کی دلدادہ اور اسلامی معاشرت کی حامی رہیں۔ ”کئی دیس“ و خدمت نساں و اُردو زبان اور شاعری بشیر کی ادبی سرگرمیوں اور مہارت جہری زندہ لکے چار میں آتے تھے۔ جس کے اطراف انکی زندگی پروانہ دار گھومتی رہتی۔

بشیر کی ذات مائی کی شاندار روایات کی امین اور عہدہ نو کے لئے اقدار اور تقاضوں کی پاسبان تھی۔ انہیں معاشرے میں عورت کو صحیح مقام کے نہ ملنے پر ان کا دل کڑھتا تھا۔

عورت کے دم سے کہتے ہیں نظم حیات ہے عبور کیوں زمانے میں پھرا سکی ذات ہے؟ عورتوں کے حقوق کی انہوں نے پرجوش سفارش کی۔ بشیر مجسم شعریت تھیں۔ انکی شاعری لطافت و پاکیزہ نساوی وقار، اصلی اقدار اور قوی جذبات محبت سے

الغٹ اگم ہوا آپ کو ہندوستان سے
خاغل نہ آب ہو کر ہی اُردو زبان سے
اس دور کشمکش میں ہوئی نیم جان ہے
اللہ سبحانہ کہ یہ اپنی زبان سے
دو زبان سے انہیں عشق تھا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں۔

زبان کی قدر میں خود اپنی قدر دانی ہے
زبان کے رشتے سے مربوط زندگی گمانی ہے
زبان نہ ہو تو ادب کا کوئی وقت نہیں
ادب نہ ہو تو زبان کا نہ ہاں کا کہیں ٹکڑا
مجھے یقین ہے جب تک ہے یہ دکن باقی
جھے گی اُردو کہ اُردو کا ہے وطن باقی

اقبال کے فلسفہ حیات سے متاثر رہیں۔ انکے
فارمیر اکثر اقبال کے اشعار کا دھوکہ ہوتا ہے۔ شاعر
ساتھ بزرنگاری کا بھی شوق تھا۔ انکا شعری مجموعہ ”آئینہ
نثر“ ادارہ ادبیات اُردو نے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا جس
میں الدین احمد کے الفاظ میں ”بہندشوں کی دکنی خیال
بندی، فکر کی گہرائی اور الفاظ کی مونہ و نیت
اشعلہ میں ایک خاص رنگ تفنن پیدا کر رہا ہے۔“
بشیرِ ادارہ کے شعبہ نسوان کی شریکِ معتمد ہیں۔
کے انتقال پر ڈاکٹر زور نے یہ کہہ کر قراجِ عقیدت
تس کیا۔ ”اگم دو شاعری کو کسی نے خیالی نزاکت کسی
مذہب باقی جدت دی مگر بشیر نے سب سے بڑا احسان
ہے۔ اس نے اُردو کو شرافت سے نوازا۔“

نوحیہ ادیب و شاعر خواتین کی ہمت افسرانی کے لئے
عزیز خواتین کے نام سے ادبی انجمن قائم کرنے کی جو تجویز غزنیہ
رہا ہر سعید نے رکھی تھی۔ اسکی داغ بیل پڑی تو مارت
کے عزیزہ غلط عبد القیوم کے نام کا انتخاب عمل میں آیا
وین صرف خواتین ہی اپنی تخلیقات پیش کرتی ہیں یہ غزنیہ

کی رات“ فضل خواتین کے وقت خواتین کے مضامین و شاعری
کا حسین مرقع ہے۔ راقم الحروف کو اس فضل خواتین
کی تحقد رہے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اس وقت غزنیہ
فاطمہ عالم علی اسکی معتمد ہیں، اور غزنیہ زینت ساحرہ
اسکی نائب صدر ہیں۔ غلط ساکام بھی انکے نام ہی کی طرح
عظیم اور پاک و صاف ہے۔ شاعری کا ذوق والدہ
طا۔ غلط تخلص کرتی ہیں۔ ”رنگ گل“ اور ”زیر گل“ انکے
پاکیزہ خیالات اور ستویہ ذوق کی تمثیل کرتے ہیں۔
”رنگ گل“ پر اُتر پڑیں، اُردو ادب کی یہ ایوانِ دہلی
ہے۔ غلط کی شاعری کے لئے نیا آنچھوری لکھتے ہیں۔

”غلط کی غزلیں عاشقانہ رنگ کی ہیں لیکن نہایت پاکیزہ
ان کے اشعار سے انکی طبع قدرت فکر کا اندازہ ہوتا ہے
غلط کی شاعری پر انکے قلم کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔“
ہر میں آکر وہ ہاں ایک سہنشاہ کے غم نے زلف
مستانہ کے خم ہیں ایک قدس آنسو کو جنم دیا تھا، ایک یاد
ہی نے اسہانہ فیضان میں آنکھیں کھلیں، لکھنے میں تعلیم
پائی، طہران میں اُردو اجماعی رشتہ میں منسلک ہوئیں، اور
حیدر آباد کو اپنا وطن بنا لیا۔ یہ ہیں غزنیہ ہالو طاہر
سعید۔ تاجِ محل کے محفل میں پہلے والی روح گو شاعر
ہی ہونا تھا۔ ہالو ساکام طبع ترین اقداری وہ بھی آیتا
کلام میں سادگی، سلاست اور جذبات کی آزادانی ملتی ہے
فکر و فن کی بلندیاں اور دلنوازی ملتی ہے۔ انرا انجمن
صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ نظم اور غزل دونوں پر دست
رکھتی ہیں۔ رباعی قلیع اور سونٹ بھی لکھتی ہیں۔ اُردو دنیا کی
ادھندی کے حسین اقتضاج کو ایسے محم میں سمجھ کر اپنا
ایک منفرد مقام پیدا کر رہا ہے۔ ایسا ہی آزاد ہونے کے
باوجود اُردو سے ہمہ پیش بلے انتہا سیر ہے، اور غزنیہ
شہر اور جی اُٹھتی ہیں۔ اُردو کو اپنے فانی دل سے پیغمبر

ہمارا نام بھی ہے خادمانِ اردو میں

جلانے ہم نے بھی اُسے طاہرہ سخن کے چرچ

تنگینے: ”ہدیہ طاہرہ: بزرگ سبزو: دہلی خرمپکاں“۔

شیاں ہمایا، لکھتے دیرانے، انکے شعری مجموعے ہیں۔

سات دہشت، اور خونِ بگڑ، نثر نگاری کے نمونے ہیں

گہری ہے اردو میں منظوم ترجمے بھی کئے ہیں جیسا نام ”مشت

فی“ ہے۔ ”دل شب“ فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ انکے چند

شعر پیش ہیں۔

نثر غم کی جعبن ہو تو غنڈل ہوتی ہے

دل کے زخموں میں جلن ہو تو غزل ہوتی ہے

یوں تو ہونٹوں کا بسمِ گلاب ہے اک توں تو فرما

ان کے ماتھے پہ مسکن ہو تو غزل ہوتی ہے

گفتا ہے کوئی وجہ میں آگاہ ہے کوئی

مغل اہل سخن ہو تو غنڈل ہوتی ہے

غدیجہ بیگم نور الحسن ڈرامہ نگار ہیں۔ بچوں کے لئے مختلف

وائے لکھ اور پیش کئے جن میں ”نور جہاں“، ”تانا شاہ“

”رُ دسرتھ“ قابل ذکر ہیں۔ ماڈل پرائمری اسکول کی لڑکیوں

ہ چکی ہیں۔ بچوں کو ڈراموں کے ذریعہ تاریخی سے روشناس

رانے کا انا یہ اہلگ قابل ستائش ہے۔

عہدِ آصفی کی ان قابل ذکر خواتین کے علاوہ اس

دور کی دیگر خواتین میں عسۃ سلطانہ بیگم، سارہ بیگم،

قیہ بیگم، آمینہ ہارون خان شہزادی، قیصری بیگم

بسی ہندی، پاشاہ بیگم صوفی وغیرہ بھی ہیں۔ ہونگٹا

پے کہ چند ایک نام میرے علم میں نہ آسکے ہوں جن کے

لئے میں معافی کی خواستگار ہوں۔

ہندو خواتین نے بھی اردو ادب کو اپنے خیالات سے

ترقی کیا ہے جن میں مسز برکت رائے، رتن گندن لال،

تلسی مانگ رام اور شیل بالا قابل ذکر ہیں۔ جن کا مختصراً

ذکر کر رہا ہوں

روٹی نہاں سے حیدر آباد آئیں۔ گھر کا ماحول خالص

علمی تھا۔ محفل پر وہ اسکول سے تعلیم پانے کے بعد نہایت

سٹی ہائی اسکول سے لیا۔ اے، بی، سی، سی، اور ایم۔ بی

کیا۔ فنونِ لطیفہ اور شاعری کا بے حد شوق تھا۔ غزل

اور نظم دونوں لکھتی رہیں۔ انکی شاعری میں آمد تھی۔

تجسیر سادہ اور مؤثر تھی۔

مسز برکت رائے نے گھر ہی پر اردو، فارسی اور

انگریزی کی تعلیم پائی۔ ملکی و سماجی کاموں سے دلچسپی

کے علاوہ معنوں نگاری اور شاعری بھی ان کے محبوب

مشغلے رہے۔ بچوں کے لئے بھی لطیف لکھتی رہیں۔ نظموں

کا مجموعہ ”بچوں کے بتلئے“ بچوں میں مقبول رہا۔

تلسی کشمیر سے جب حیدر آباد آئیں تو وہیں بس گئیں

تعلیم اردو، ہندی اور انگریزی میں ملی۔ اسکے بعد پونہ

مشین اسکول میں شریک ہوئیں۔ لیکن گھر پر اردو، فارسی

جاری رہی۔ چچا یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کیا۔ تلسی کو اردو

ادب اور شاعری کا خاص ذوق تھا۔ چھوٹی بھدر میں بھی کھیتی

نمونہ ہے۔

سجدہ شوق کو کیا قید مقام

کہ لیا سجدہ جدر یاد آیا!

کس قدر آنکھ سے نکلے آنسو

جب بھری شام کو گھر یاد آیا

شیل بالا حیدر آباد کے کوئی راج کنول پر شاہ

کنول کی شریک حیات ہیں۔ آگرہ کی تھیں۔ لیکن اندور

میں ابتدائی تعلیم پائیں۔ بنارس یونیورسٹی سے بی۔ اے

بی۔ اے۔ کر کے حیدر آباد آئیں۔ اردو ہندی میں افسانے اور

نظیں لکھتی رہیں۔ حیدر آباد اور اورنگ آباد کی نشر کار ہوں

سے انکی چیدنا نشر ہوتی رہیں۔ شاعری سلیس اور سحرنا

انکی نظم "کسکو مجھ لوں کیا یاد کروں" ہندوستانی

انکی نظموں کا مجموعہ "موج تھیل" ہے۔

شاعری کا وسیلہ نمونہ ہے۔

جامعہ عثمانیہ نے جن خواتین ادیب اور شعراء کو اردو زبان و ادب کی خدمت گزاری کے لائق بتایا۔ ان میں نوشاہہ بیگم نوشاہہ، جہان بانو نقوی، لطیف النساء بیگم، انجم النساء بیگم، نجم النساء، قمر النساء، تقدیر فاطمہ، اہلیق، ازیت ساحرہ، رفیعہ سلطانہ، فاطمہ عالم علی خاں اور سلطانہ شرف الدین قابل ذکر ہیں۔ نئی نسل کی لکھنے والیوں میں جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، عفت موبانی، رفیعہ منظور الامین اور سیدہ جعفر ہیں۔ اور آپ اجاز دی تو کہوں کہ راقم الحروف بھی ان ہی کی بسم عمر رہی ہے۔ ان خواتین کے کلام و نثر میں قدیم معاشرت کی دلکاشی بھی ملتی ہے اور جدید حیالات کی ترجمانی بھی۔ عشق و محبت کی داستانوں اور رگ و پس کی حکایات میں شیریں بیانی اور جدت افزائی ملتی ہے تو طرز جدید کی ترنگاری اور شاعری میں ملک و قوم کو بیدار کرنے اور مسندوں کو ڈھونڈنے کے پیام ملتے ہیں۔ ان میں تغزل جو ہے، تصوف بھی، یاس و حیران کی تصویریں بھی ہیں۔ سادہ و مستر کے لہجے بھی۔ بلند خیالی، سادگی، لذت و رکت انکی تحریر کی خصوصیات ہیں۔

جہان بانو نقوی رانچور کے ایک ضلع میں پیدا ہوئیں۔ نامی گزرا اسکول سے میٹرک اور جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۰۵ء کیا۔ کینر بان اسکول میں اردو پڑھاتی رہیں۔ پھر گزرا علی مل اسکول میں صدر معلمہ کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ پھر محبوبہ گزرا اسکول منتقل ہوئیں۔ اور اسی زمانے میں ایم۔ اے کیا اور زمانہ کالج سے ترقیہ اردو میں بیچر اور بنیں۔ لکھنے کا شوق طائب سلی سے تھا۔ "شہاب" "ساقی" وغیرہ میں لکھتی رہیں۔ انکی کتابیں "رمت یہ حیا" "خندراک" "بربط ناہیدہ" جو خطوط شمس کا بہترین نمونہ ہے اور "محمد عین آزاد" قابل ذکر تصانیف ہیں۔

انگریزی امثالوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ ہر قسم کے موضوعات پر طبع آزمائی کرتی رہیں۔ نثر میں شاعری کرتی تھیں اور خاکسار کا بھی بہت اچھا ذوق تھا۔ تشبیہیں اچھوتی، استعارے نازک ہوتے تھے۔ اور عبارت دلکش اور دل آویز۔ ٹی ٹی کے لکھے والیوں کی ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے۔ سب رس کے متبعہ خواتین کی مجلس عالمہ میں رکن کی حیثیت سے کام بھی کرتی رہیں۔ علمی اور ادبی سوسائٹیز میں پیش پیش رہتی تھیں۔

لطیف النساء بیگم نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے ماحصل کیا۔ شاعرہ اور انشاء پر دانہ تھیں۔ نرائی دیا کی ہندی فرابیوں کو درد بھرے پیرائے میں قلب بند کرتی تھیں۔ "شہاب"، "دہر دکن"، اور "پیام" میں ادبی اور تاریخی مضامین لکھتی رہیں۔ سب رس میں انجمن کے لئے اصلاحی اور علمی نظمیں لکھتیں۔ "ولی کا قہقہہ" ان کا ادبی شاہکار ہے۔ جو تاریخ ادبیات میں یادگار رہا ہے۔ سب رس کے متبعہ انوار میں مجلس عالمہ کی رکن بھی تھیں۔ اندازہ بیان پُر جوش و خروش تھا۔

ان سب خواتین کا مختصر ذکر کرتی چلوں۔ ..
نوشاہہ خاتون نوشاہہ — اردوہ میں پیدا ہوئیں پھر حیدر آباد آئیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کیا۔ جامعہ کے پہلے گریجویٹ تھیں۔ گریجویٹیشن کے بعد زمانہ کالج میں رہیں، فارسی اور انگریزی کی لکچرار بنیں۔ شاعری کا ذوق ان میں بھی تھا۔ کلام میں سادگی اور سلاست تھی۔ غنڈلیں کم لکھتی تھیں۔ نظم کو نئے سانچوں میں ڈھالتی رہیں۔

ڈاکٹر زینت ساحدہ بھی رانچور میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۴۷ء

بن جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کیا اور زمانہ کالج میں لکچرار مقرر ہوئیں۔ اردو کالج، پوسٹ گریجویٹ کالج اور آرٹس کالج میں بھی تدریسی رہیں۔ اب نظام کالج کے شعبہ اردو میں ریڈر ہیں۔ نئی تعلیمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انکے شاگردوں نے ۱۹۸۱ء میں جتن زینت ساحدہ بھی منایا تھا۔ انہیں ۱۹۸۱ء کی بہترین ٹیچر کا ایوارڈ حکومت سندھ کی طرف سے ملتا ہوا ہے۔ ان دنوں صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے عہدہ پر فائز ہیں۔ مسلم و ادب کا ستمرا ذوق رکھتی ہیں۔ مطالعہ بہ حد وسیع ہے۔ انکے فلسفہ اور تنقید مضامین، خاکے اور انصاف فلسف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ دکنی ادب میں انہیں بہت شہرت ہے۔ پوری کی ”نور مار“ پر مس مکت، لکھن اور اہمک سے انہوں نے تحقیق کا کام کیا ہے اس کے علاوہ انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی ہے۔

زینت ساحدہ کی کتاب ”حیدر آباد کے ادیب“ جہاں دو دم معنیوں و شمر اور سوانحی خاکے اور انکی تحریروں کے مجموعے ہیں جسے ساحدہ اکسڈمی نے شائع کر دیا ہے۔ انکی تصانیف میں ”جلت رنگ“ انہوں کا معروف ہے ”عجب وطنی فرائض“ اور ”بہارِ عربیہ“ انہوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ ”کلیات جری“ ہندی میں اور ”مہدی کے“ اور ”نور“ کتابچہ ”راہِ راہیہ“ کے تعاون سے تیار ہو چکی ہیں۔ انہیں میانِ حلقہ اور ”ادبِ ہندوستان“ کے لیے بڑے بھائی کی نقادانہ شہرت ملی رہی ہے۔ ساحدہ اکسڈمی کی دکن بھی ہیں اور انہوں نے اردو کی اراکینِ عاملہ میں شریک ہیں۔ کل ہند اردو کانفرنس کی سکریٹری بھی رہ چکی ہیں۔ اردو و ہندی کے مختلف ادبی سیمیناروں میں حصہ لیتی ہیں۔ مصنفہ اور شاعرانہ خصوصیات پر دیباچہ اور پیش لفظ بھی لکھتی ہیں۔ حیدر آباد کی ماہی جہاں ایسہ ہیں۔

رضیہ سلطانہ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر زور کی شاگرد رہ چکی ہیں۔ طالبِ علمی سے لکھنے کا شوق تھا۔ مختلف رسالوں میں لکھتی رہی ہیں۔ دکنی ادب پر تحقیق اور تنقیدی کام کرتی رہیں۔ اور علمی ادبی مضامین لکھتی رہیں۔ ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد زمانہ کالج میں فارسی کی لکچرار ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ کی صدر شعبہ اردو بنیں۔ اور جامعہ کی تخلیق سرگرمیوں میں پیش پیش رہیں۔ ”کچھ دھاگے“ انکے انصافوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کی کتاب ”اردو شہزادہ آغا زاد اور لقاء فورٹ ولیم کالج سے پہلے“ پاکستان سے تعلق ہوئی ہے۔ ”اردو ادب کی ترقی میں خاتون کا حصہ“ ”کلیاتِ اہلِ حق اور“ ”کلیاتِ احسان“ انکی تحقیق پر مبنی کتاب ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ”فن اور فنکار“ ہے۔ ”حیدر آبادی نرندہ بنیاد پر بھی انہوں نے کتاب لکھی ہے۔ کئی ریسرچ اسکولز انکی زیرِ نگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی کر چکی ہیں۔ ”دودھ چراغِ محفل“ ان کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اور کل رضیہ سلطانہ ڈین فیکلٹی ہیں آرٹس جامعہ عثمانیہ ہیں۔

سلطانہ شرف الدین نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے، بی۔ ایل اور ایم۔ اے ایم۔ ایل کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنے کا شوق ابتدا سے تھا۔ ”شہابِ ابد و زمانہ“ ”سب رس“ اور ”مجلہ غزلبہ“ میں انصاف اور مضامین چھاپتے رہیں۔ ڈاکٹر زور کی ایما پر یحییٰ کے لئے ”نظمِ اکبر آبادی“ پر کتاب لکھی۔ ”فوقِ تعلیم“ ”پرکھی جھوٹے پھولے“ مضامین مختلف اخباروں میں شائع ہوئے۔ ”خواجہ حسن نظامی“ ”ریحانِ ہوا“ ”ایک مضمون“ ”آجکل“ ”میاں چھپ چکے“ ”ایک سدا“ ”آغا حیدر حسن“ ”یرکھے گئے“ انگریزی مضامین کو اردو کے آدھ میں ڈھال دیا۔ ملک راج آئندہ کی کہانیوں کے ترجمے بھی لکھے۔

شاعری کا بھی شوق رہا اور ترنم سے شعر طبعی رہیں ایک صاحب طرز ادیبہ ہیں۔ لیکن لکھنے میں تساہل برتنی ہیں شائد یہی وجہ ہے کہ انکی کہانیوں اور معاین کی کوئی کتاب منظر عام پر نہ آسکی۔

مازمت کی ابتداء پرانٹری اسکول سے کی۔ پھر ہائر سکندری اسکول اور اس کے بند Comprehensive College of Education میں اُردو طریقہ تعلیم پر پیکرار مقرر ہوئیں۔ چادرگھا ساج فار برائٹری ہیڈ ماسٹر بن گئیں۔ فی الحال چھوٹے بچوں کے لئے وڈیا ویپ "اسکول چلا رہی ہیں۔

فاطمہ عالم علی جناب قاضی عبدالغفار صاحب جیلٹ اور ایڈیٹر "پیام" کی صاحبزادی ہیں۔ جن کا تعلق مراد آباد سے تھا۔ قاضی صاحب کے ساتھ حیدر آباد آئیں تو یہیں کی ہو رہی ہیں۔

فاطمہ نے زمانہ کالج سے تعلیم حاصل کی۔ اُردو رب سے مودوں لگاؤ رہا چنانچہ معاین، انشائیہ اور خاکے کیفیتی رہیں۔ مختلف رسائل میں انہوں نے اپنے شعور تسلیم چھپوائے۔ لیکن کسی کو کتابی صورت نہیں بخشی۔ اندازِ بیاں شستہ ہے۔ زبان پر لکھنؤ کا گہرا اثر ہے۔ دلچپ اور حسین پیرائے میں لکھتی ہیں۔ "مغفل خواتین" کی ممتد ہیں۔ وینس انڈسٹریل کونسل سوسائٹی کی نائب صدر اور وینس میڈریشن کی میٹری ہیں۔

جیلانی بالو نے نئی نسل کی لکھنے والی خواتین میں نامور ادیبہ امناؤں کے ذریعہ مشہرت حاصل کی ہے۔ چند دیگر کے ادبی حلقوں میں مقبول ہیں۔ بدایون کے علم دوست گرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ علامہ حیرت بدایونی ۱۹۲۰ء میں جب حیدر آباد آئے تو یہیں بس گئے۔ والد کی

صحتِ نظر، بذلہ سخی اور حسلی تجربہ کا اثر جیلانی بالو پر بظرافتِ قیامت تھا۔

بالو کی تعلیم ابتداء میں گھر پر ہی ہوئی۔ بی۔ اے عثمانیہ سے کیا۔ اور ایم۔ اے۔ جامدہ (دہلی) سے بالو نے اپنا ادبی سفر ۱۹۴۸ء سے شروع کیا۔ پہلے فلمی موضوعات پر لکھتی تھیں۔ رفتہ رفتہ افسانہ نگاری پر مائل ہوئیں۔ سماجی اور سیاسی حقیقتوں کو موثر بنانا کہ دل کو چھو لینے والی کہانیاں لکھتی ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ "بدشتی کے میثار" پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ ناول "ایوانِ قزل" پر سابقہ انگریزی نے ایوارڈ عطا کیا ہے۔ "نروان" (افسانے) "گلزار اور ستارے" (ناولٹ) "ولیعے ہاسفر" (ناولٹ) اور "پرایا گھر" (افسانے) انکی دوسری تصانیف ہیں۔ ان کی کچھ کہانیوں کا "کدارم" کے نام سے تلگو زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے لئے طبعی تعلیم کہانیوں کا ہندی سے اُردو میں ترجمہ کر چکی ہیں۔ انکی ایک کتاب "ہاتھ" ہندی میں چھپ رہی ہے۔ امرتا پریتم نے ان کے ایک ناولٹ اور چند افسانوں کو پنجابی زبان میں لکھا ہے۔

مرحوم زبان میں بھی انکی کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ "ایوانِ قزل" اور کچھ کہانیوں کو روسی زبان میں بھی لکھا گیا ہے۔

آمینہ ابوالحسن کی کہانیاں بھی مختلف رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ "تم کون ہو؟" (ناولٹ)

عفت مولانی کا تعلق لکھنؤ سے ضرور ہے مگر رہتی ہیں حیدر آباد میں۔ انسانی رسائل میں معنیوں اور ناول لکھتی رہی ہیں۔ متعدد ناول قسط وار "سالہ خیرم" لکھنؤ کے سالانہ سے شائع ہونے کے بعد نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ تقریباً ۳۰

۲۵ ناول لکھ چکی ہیں۔ جن میں ”درد آشنا“، ”تقدیر“،
”شرارت“، ”داع دل“ اور ”ابھول کے گیت“ بھی ہیں۔ جفت
موہانی کا اسلوب سادہ سیدھا اور تحسین پختہ اور نگار
ہے۔

رفعہ مظلومہ الامین امیرتی ہونی ڈرامہ نویس ہیں۔
ان کی قلمی کاوشیں مختلف رسائل کی زینت بن چکی ہیں۔
اور ریڈیو پر بھی پیش ہوتی رہتی ہیں۔ اندازہ بیان سلیجھا
ہوا اور سلیجھا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تحسیریں چند پاکیزہ
مقامی مقام پیدا کر چکی ہیں۔ دکنیات پر انہوں نے
تحقیقی کام کیا ہے۔ ”جنتی اردو بروڈ کے تحت“ کلیات محمد
قلی قلی شاہ، ”پیر تحقیق کی ہے۔ ڈاکٹر زور کی خواہش
پر شاہ تراب کی سیرت و سوانح ”من سمعہا و“ کے
نام سے تلمذ کیا ہے۔ ”مسکھ الجمن“ صوفیائے کوام
پر لکھ رہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں ریڈیو
اور بی۔ ایچ۔ ڈی کی نگرانی بھی۔

ناشکری ہوگی اگر اس ضمن میں یمن مرحوم نعیم الدین
ہاشمی کا نام نہ لوں جنہوں نے خواتین دکن کے ادبی کارناموں کا بانی
کتاب ”خواتین دکن کی اردو خدمات“ کے ذریعہ دنیا کے
ادب سے روشناس کرایا اور انکی ادب نواری کا قلمی
جائزہ لیا ہے۔

جہدِ آصفی میں علم و ادب میں دکن کی خواتین
نے جہاد رواں کیا ہے اور چوادی، ساقی اور تہذیب
خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخِ زمانہ اگر دو کا ایک روشن
باب ہے۔ ■

دکنیات پر منعقدہ سیمینار گولڈن جوبلی تقاریر
ادارہ کے موقع پر پڑھا گیا مقالہ

”نمت سہیل ہین جانو“ ص ۳۳ سے آگے

سب کو رسالے گناہیں اور مخطوطات دینے کے بعد وہ
کچھ دیر اپنی کرک پر براجمان ہوتے، پھر سراج الدین
سے ملنے کے لیے ”ایوان“ کے دوسرے حصے
میں پہنچ جاتے، کبھی میں نے ان کو بحث کرتے ہوئے
یا کسی کے خلاف کہتے ہوئے نہیں سنا۔ معاملہ ان کا
نہیں کسی دوسروں کا ہوتا اور بات کچھ تلخ ہو جاتی
تو سکراتے ہوئے اپنی جگہ لوٹ آتے ایک بھتے ہی
دو قار صاحب (وقار طیل) دندنا تے آتے۔ کیا
ہے انصاری صاحب بھوک نہیں لگی؟ ایک بچ رہا
ہے، ان کے الارم کے ساتھ ہی انصاری صاحب
اُٹھ کھڑے ہوتے، چلتے چلتے دریافت کرتے کہ مزید
کچھ اور کتابوں کی تو ضرورت نہیں، پھر وہ کھانے
سے فارغ ہو کر جب لوٹتے تو لوٹا ہاتھ میں ہوتا، اور
اور وضو بنانے میں مصروف، اب کرے سے
اقامت اور نماز کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور
کے قریب وہ روانگی کی تیاری کرنے لگتے۔ بس یوں
سمجھے کہ گھر کی سویچوں کی ہدایت پر وہ عمل پیرا
تھے، کبھی دیر سے آتے اور نہ دیر تک ٹھہرتے،
بہت ہی اصولی آدمی تھے، احتیاط اُن سے جب
دریافت کیا جاتا کہ انصاری صاحب کیا کل آپ
آئیں گے؟ تو کہتے کہ ہاں روز آتا ہوں سوائے
ہزار تاریخ کے، اس لیے کہ اُس روز مجھے وظیفہ
ملتا ہے، دیکھیے کبھی آپ ہزار تاریخ کو نہ آنا۔

مت سہل ہمیں جانو.....!

کرنا اتنا ہی مشکل تھا، جتنا کہ بانی سے شکر، ان کا وجود
ادارہ میں بالکل گم ہو گیا تھا۔ انصاری صاحب کو میں
اس وقت سے جانتی ہوں جب میں ایم۔ اے۔ میں
پڑھا کرتی تھی۔ پُرانے رسالوں کے قائل اگر ہیں تب
وسیلہ کے ساتھ مل سکتے ہیں تو وہ واحد جگہ ادارہ ہی
ہے۔ ڈاکٹر زور کے بعد اُس ذمہ داری کو انصاری صاحب
نے بڑی خوبی سے نبھالیا ہے۔ مطبوعات کی فہرست میں
سے ایک نوٹ تیار کر کے جوں ہی انصاری صاحب کو
دیا جاتا بڑی تیزی کے ساتھ وہ تمام رسالے یہ ہمارے
سامنے اکھڑے ہوتے، کبھی ہم کو اُن سے یہ شکایت
کرنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ انصاری صاحب ہم نے
فلاں رسالے کے لیے کہا تھا، آپ نے نہیں دیا،
اور ہمارا کام ادھورا رہ گیا جب ہم نے ریسرچ میں
قدم رکھا، اس وقت اُن سے ادوبے نکلے ہوئے
جناں پر بعض اوقات کوئی کتاب یا رسالے کو...
CATALOGUE میں ڈسٹنڈ صفا مشکل ہوتا تو وہ
ذمہ داری بھی انہیں ہی سونپی جاتی کبھی خدا کے
اُس نیک بندے نے یہ نہیں کہا کہ یہ کام میرا نہیں
مسکراتے ہوئے ہر کام کی ذمہ داری نبھاتے ہیں
الماریوں میں رسالے اور کتابیں انصاری صاحب

تازہ اخبار دیکھتے ہی بیرونی خبروں سے زیادہ
ملکی خبروں کی طرف توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔ اور اُس سے
زیادہ اپنی ریاست اور اپنے شہر کا حال جاننا چاہتے
ہیں۔ لیکن ان سب سے پہلے جس کالم پر ہماری نظر پڑتی
ہے "وہ ہے" انتقال ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون
چھوٹ گیا اور کون ابھی قید ہستی کی مصیبت جھیل رہا ہے
اپنے شہر سے دور ہوں تو اس کالم کی اہمیت اور بڑھ
جاتی ہے۔ اخبار ہاتھ میں لیتے ہی، غالب کا وہ شعر یاد
آتا ہے۔

فصل مجھ سے روداد جن کہنے نہ ڈرتے ہم
گڑی جس پہ کل بجلی وہ میسر آئیاں کیوں ہو؟
ایک دن اپنی کالموں میں ایک خبر نظر سے گزری
کہ زمین الدین انصاری کا انتقال ہو گیا۔ چند ہفتے قبل
ہی ملاقات ہوئی تھی، بھلے چنگے تھے۔ اس میں شک نہیں
کہ بڑے درد کھائی دے رہے تھے اور عمر کا تقاضا بھی تھا
لیکن موت اپنے آہنی پنجے میں دبوچنے والی ہے اس کا
اندازہ لگانا مشکل تھا۔ "انصاری صاحب" کو لوگ
ان کے اصلی نام سے زیادہ نام کے دوسرے جزو سے
زیادہ پہچانتے تھے۔

ادارہ ادبیات اردو سے ان کی شخصیت کا جدا

کی منتظر نہ ہا کرتیں، اُسی طرح فہرستوں میں بھی انھیں تلاش کرنے وقت نہ ہوتی، فوری ڈھونڈ کر بتا کر آپ کی طلب کردہ کتاب یا رسالہ اس صفحے پر ارد اس نمبر پر ہے، دیکھ کر کہیں فحالت ہوئی کہ اتنی درق گروہ اتنی کے باوجود ہماری نظری وہاں تک کیوں نہیں انصاری صاحب کو میں نے کبھی بگڑتے نہیں دیکھا ہمیشہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر بکھری رہتی۔ "ادارہ" کا چوکیدار عبداللہ بھی ڈاکٹر زور دی کے زمانے سے ادارہ کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ وہ بھی نرم خو ہے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی بات ناگوار گزرنی تو وہ ایسا دکھڑا سنانے انصاری صاحب کے پاس پہنچ جاتا، کبھی کام کی ریادتی کا شکبہ ہوتا تو کبھی ان کی کارگزاریوں کی ستائش نہ کرنے کا لگہ۔ وہ اس کی باتوں کو بڑے فود سے سنتے بہت ہی خلوص اور نرمی کے ساتھ اُسے سمجھانے کی کوشش کرتے، بعض لوگ اپنے آپ کو ہر دلعزیز بنانے کی خاطر آگ کو اور بھڑکایا کرتے ہیں۔ مگر وہ اس کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کرتے ہوئے، معاملے کو رفع دفع کرنے کی سعی کرتے۔

ادھر پچھلے چند سالوں سے انصاری صاحب کو اپنی ضعیفی اور کمزوری کا احساس زیادہ ہو چلا تھا۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے کئی دفعہ بورڈ کے آگے اپنا استعفیٰ رکھا، لیکن بورڈ نے ہر مرتبہ میری درخواست مسترد کر دی۔ اور ہمیشہ یہی امراد کہ ڈاکٹر زور سے کہنے ہوئے وعدے کو نبھائیں۔ بالآخر وہ مجبور ہو کر یہ کہنے لگے تھے کہ

کم از کم میری مدد کے لیے ایک اسسٹنٹ کا تعین کیا جائے ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا میں اہل نہیں رہا لیکن آخر دم تک انھوں نے باقی ادارہ سے کئے گئے وعدے کی پابندی کی معاشی حالت تو انصاری صاحب کی کافی اچھی تھی، بچے باہر تھے۔ ان لوگوں نے بار بار ان سے گزارش کی کہ وہ ملازمت چھوڑ دیں، اور گھر پر آرام سے رہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انصاری صاحب نے مانی وسائل کے مل کی خاطر نہیں بلکہ بے تو جذبے کے تحت کام کرتے رہے۔ بورڈ والوں کا یہ بات کا پورا پورا احساس تھا کہ انصاری صاحب کے بغیر "کتب خانے" کا چلنا دشوار ہے۔ آج جب کہ انصاری صاحب ہم میں نہیں تو اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ واقعی جس کی حفاظت کے لیے انھوں نے جتنی تن دہی سے کام کیا تھا، کیا وہ کتب خانہ، اب بھی اسی حالت میں رہے گا۔ لیکن انکس اس بات کا ہوتا ہے کہ ایسے فوسل کارکن کی دنیا بہت کم قد کرتی ہے۔ ادارہ کی طرف سے ان کا تعزیتی جلد منایا جانا چاہیے تھا، اس طرح ان کے خلوص کا حق ادا تو نہ ہوتا، مگر پھر بھی خدمات کا اعتراف تو ہو جاتا

انصاری صاحب میں ہلاکی انکساری تھی۔ کبھی انھوں نے اپنے آپ کو بڑا آدمی نہیں سمجھا ایک منہ عارضی طور پر انصاری صاحب کے تعاون کے لیے رکھے گئے تھے۔ مجھے اس کا تو علم نہیں کہ وہ پھر غائب کیوں نہ لیکن تصور یہ بتلاتے تھے کہ سنبھاؤ مشکل ہے۔ یہ بورڈ انھوں نے انصاری صاحب سے کہا کہ کتابیں ہر ف کیوں اسکالرس کے پاس لے جائیں۔ ان کو یہاں تک

بنا چاہیے، خواہ وہ پروفیسر ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم کو اپنے پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیے۔ انصاری صاحب نے نہایت سادگی سے میرے سامنے یہ بات بیان کی کہ موصوف کے کیا خیالات ہیں؟ میں نے کہا انصاری صاحب آپ کتابیں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم سب کی نظروں میں آپ کی وہی عزت ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، دوسرے اگر نہ پہچانیں بھی تو آپ کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتے۔ آپ کی شخصیت ہی سب کچھ ہے، ماننے اور نہ لانے کا سوال ہی نہیں۔

ادارہ والوں سے ایک شکایت ہے کہ وہ اسکلر کے لیے کوئی علاحدہ کمرہ نہیں رکھتے۔ خوش فہمی کرنے والی طالبات بھی اسی دراندے میں بیٹھتی ہیں، اور اسکلر کو بھی وہیر بیٹھ کر اپنے کام سے متنہار رہتا ہے۔ وہ کام سے زیادہ باتیں، اور تہقہوں میں مصروف رہا کرتی ہیں۔ انصاری صاحب کو یہ بات ناگوار محسوس ہوتی تھی، ایک ٹھنڈی سی ڈانٹ خود پلاتے، لیکن جب ان کا نالہ بے اثر ثابت ہوتا تو دھیرے سے ہمارے پاس آئے، اور کہنے لگتے ”بی بی“ آپ خاموش رہتی ہیں۔ نہ جانے آپ کے کام میں کس قدر ہرج ہو رہا ہے؟ اسٹ دیا کیجئے۔ ایک اور لکچرار صاحبہ آتی ہیں، وہ تو خوب ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہیں۔ جواباً مجھے کہنا پڑتا ہے کہ انصاری صاحب غلطی ان بے چاروں کی نہیں، اس لیے مجھے ڈانٹنا اچھا نہیں لگتا۔ اس کے ذمہ دار درباب اقتدار ہیں۔ ان معصوموں نے دوستی کا ہتھ بڑھایا ہے، سب مجھ سے بے تکلف ہیں، دشمنی سے کیوں؟ آپ یہی بات بورڈ کے ارکان تک پہنچادیں

تو مناسب ہے۔ تو تب انصاری صاحب کا عارضی غصہ ٹھنڈا ہو جاتا، وہ مسئلہ کی کیسوری کی طرف متوجہ ہوجاتے۔ بعض اوقات تو انصاری صاحب سے میں نے ایسے کام لیے، جن کی ذمہ داری، اُن پر عائد نہ ہوتے ہوئے بھی، وہ اپنا فرض سمجھ کر ادا کیا کرتے تھے۔ جیسے ایک مرتبہ دو بزرگ، کتب خانہ آئے، پڑھتے ہوئے وہ سگریٹ نوشی بھی کر رہے تھے، ان میں سے ایک نے برجستہ یہ اشعار پڑھے۔

ز تمباکو بھر دو دکن دیدم : کشیدم بارہا سودن دیدم
بجرتا کیئی ماحولِ نخل : خدا را بہودے نہ دیدم

میں نے انصاری صاحب سے خواہش کی کہ وہ اشعار لکھ لائیں وہ بلا کسی تامل کے نوٹ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

انصاری صاحب اس قدر غفلت ہونے ہوئے بھی، فرض کے آگے کبھی اپنے اصول سے ہٹے نہیں۔ ادارہ کی کتابوں سے صرف کتب خانے ہی میں استفادہ کیا جاسکتا ہے، گھر لانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کبھی بھی انصاری صاحب نے خلافِ اصول کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اخلاص اپنی جگہ لیکن ”فرض“ کی حیثیت اُن کے یہاں مسلم تھی۔

انصاری صاحب کے انتقال کے بہت دن بعد ادارہ گئی خصوصاً وہ حصہ جہاں انصاری صاحب بیٹھا کرتے تھے، بہت سونا سونا لگا، آتے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے اور پھر اپنی شروانی کو کمرے میں ٹانگ دیتے، ٹوپی بھی سر سے اُتر جاتی، اور وہ اپنے منتظرین کی خواہشات کی پابجائی میں لگ جاتے

دہائی صفت پردیکھئے

فزلیں

محسن جٹانوی

قاضی انصار

عبدالقوی صیف

چہرہ کا سمجھ آنا دشوار ہی ایسا ہے
یا آئینہ خانہ کا کردار ہی ایسا ہے

بھٹلے نہ جلتا ہے چدن کا ہر اجنل
اپنے میں سگنے کا آزار ہی ایسا ہے

ہر جنس دکان اپنا خود مول چکاتی ہے
چمکے سے گزر جانا بازار ہی ایسا ہے

ہے راکھ سفینہ کی میرے بھی کنارے پر
تم یہ نہ سمجھ لینا اس پار ہی ایسا ہے

فرد چمٹے لگتا ہے احساس کا گونگا پن
سچ بولنے لفظوں کا اظہار ہی ایسا ہے

کھل جاتی ہے اپنوں کو ذہنوں کی دنیا بھی
حسنِ تدوین کا بازار ہی ایسا ہے

اچھی نہیں ہے دوستوں انصاف کی روش
تھک کر تو لگ رہا ہے گتہ کار کی روش

اقرار کی روش کبھی انکار کی روش
کیا کشمکش میں آن پڑی پیار کی روش

چونکا دیا ہے جھکے بھی حسن نے وقت پر
مشکوٰۃ لگ رہا ہے صلاح کار کی روش

اب بات بات میں ہے سیاستِ مضامین
کچھ میرے دوستوں میں ہے دعا پر کی روش

ہر مسئلہ حیات کا لفظوں میں حل کریں
بدلی ہے ہم نے اس لئے اشعار کی روش

تم کو دیکھا تو پھر دو آنہ ہوا
چھوڑ کر خود کو میں روانہ ہوا

ظن ہوتا ہے پاس جانے سے
آئینہ دیکھ کر رمانہ ہوا

لے گیا نقش یا بھی اپنے ساتھ
آدی ایسے کچھ رومانہ ہوا

موت بھی رہ گئی ہے منہ ٹککتے
زندگی تیرا بھی بھلا نہ ہوا

بت کیا ہے کہ بڑھ گئے ناخن
اور پھر زخم بھی ہرا نہ ہوا

اے کس پہ بعدِ سیف بتا
تو بھی اے وقت بے شکا نہ ہوا

دانا و دیوانہ

کیا دانا، کیا دیوانہ، کیا فرزانہ سب ایک ہیں۔
 جو نہ کرتا رہے گا وہ آخر تک بھی اس حقیقت کو نہ سمجھے گا
 کہ وہ دانا ہے یا دیوانہ۔ دانا آپ کا رفیق ہے تو دیوانہ
 آپ کا رقیب۔ ایک سے آپ مصافحہ کرتے ہیں تو دوسرے
 سے کرتے ہیں۔ یہ آپ کی دانا ہی نہیں دیوانگی ہے۔
 ایک شخص کس منزل پر دانا رہتا ہے اور کس منزل
 پر دیوانہ آپ کیا جانیں۔ آپ اسے اس لیے دانا کہتے ہیں کہ
 اس نے آپ کی مرضی اور امید کے مطابق کام کیا۔ جہاں
 احتجاج شروع ہوا۔ تہذیب کا دامن مسکنے لگا۔ اخلاقی
 کنایوں میں نہہم ہونے لگیں، امید کے چول مر جھانے
 گئے، لگام ہاتھ سے چھوٹتی نظر آئے، آپ کا غلبہ کارگر
 ہوا نہ آپ کا غلبہ تو آپ نے بس اسے دیوانہ کا نام
 دیا۔ کتنا نادان ہے انسان جن اشاروں کو خود سمجھ
 نہیں پاتا۔ جن حرکات سے وہ لطف اندوز نہیں ہو سکتا
 توانی ناکامی کا ذمہ دار اس شخص کو قرار دیتا ہے جسے
 دیوانہ کہتے ہیں۔ رات کو پستی کی اور دن کو عروج کی علامت
 وار دیکھتا رہے۔ یہ دراصل ایک ہی سکہ کے دو رخ
 ہیں۔ رات کبھی دن میں تبدیل ہوتی ہے تو کبھی دن رات
 ہار پختیار کر لیتا ہے۔ پس اسی طرح دانا کبھی دیوانہ
 ہوتا ہے تو دیوانہ کبھی دانا۔ جنت کی مانوس فضا سے

نکل کر دنیا کی غیر مانوس فضا میں قدم رکھنے کے بعد اس
 شخص پر دیوانگی ہی تو طاری ہو گئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ
 پھاڑ کر دیکھتا، مونا زمین ہاتھ اٹھائے ہوئے شجر و حجر
 پتی پتی ہوئی صحرائی ریت، سائیں سائیں کرتے ہوئے
 جنگل کی دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ دیوانہ نہیں تھا۔ اب بھی
 گواہ ہیں وہ حادثات جن کی کھال، کلباس اور جن کا
 گوشت اس کی غذا تھی۔ غار کے پتھر اس بات کے شاہد
 ہیں کہ آج کا دانا کبھی دیوانہ بھی تھا۔ وقت کی گردش
 نے اسے دانا بنایا۔ آج کا دانا تاریخ کے اوراق
 انسائیکلو پیڈیا کی کتابوں میں اپنے پرانے احوال پڑھ کر
 کیا دیوانہ نہیں بن جاتا۔ وہ آکر کیا جو کچل میوزیم میں جا کر
 اپنی کچھل زندگی کو اس قدر دیوانگی سے دیکھنے لگتا ہے کہ
 وہ خود شوکیں میں رکھا ہوا کئی سال پرانا نمونہ نظر
 آنے لگتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں دیوانہ اور فرزانہ
 کا فرق مٹ جاتا ہے۔

دیوانہ اپنے من کا موبی ہوتا ہے۔ شرافت،
 مروت، مصلحت، موقع پرستی، مکاری جیسے سفلیہ
 جذبوں سے وہ بالکل پاک ہوتا ہے۔ اس کا مقام
 فرشتوں سے بھی بلند ہے۔ جو رول ملک بھی اس کی
 عظمت کے معترف ہیں۔ دیوانگی میں اطاعت کے

ساتھ شطیت بھی ہوتی ہے۔ آدم کے دیوانے پن نے جنت کی نعمتوں کی بیچ گردانا اور خیر و شر، نیکی و بدی کے لمحوں کو پسند کیا۔ عرشِ معلیٰ سے تحت الثریٰ (ہر اذین) کا سفر کیا۔ اسی دیوانگی نے کبھی وہ خواہش کی جس کی بدولت کوہِ طور خاک کا ڈھیر بن گیا۔ اسی دیوانے پن نے کبھی اپنے تختِ جگ کو خدا کی راہ میں ذبح کیا تو کبھی اپنے آپ کو نازِ فرد کے خوائے کیا۔ عربِ دلوں نے جسے دیوانہ کہا خدا نے اُسے چاہ کہ پھر عرشِ معلیٰ پر بلایا۔ یہ فرش سے عرش کا سفر دانا کا نہیں دیوانہ کا ہے۔

بے خبری کو دیوانگی کہتے ہیں۔ "انالحتی" دیوانگی کا ثبوت ہے اور یہی سلوک کی منزل بھی۔ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا مقام صرف دیوانے کو حاصل ہوتا ہے "یوریکا" "یوریکا" کافرہ لگتا ہوا حمام سے ایک دیوانہ ہی باہر آسکتا ہے چاہے وہ "عرشیدس" ہی کیوں نہ ہو۔ نرون ایک بے خبر، جھگ میں بیٹھنے والے تبسوی کو مل سکتا ہے۔ مذہب، سائنس، فلسفہ اور ادب ان داناؤں کے نام سے ترین ہیں جو اپنے شوق کے ہاتھوں دیوانے ہوتے ہیں۔ نیوٹن کی دیوانگی نے "کششِ ثقل" کے راز کو ہویہ کیا تو غالب کی دیوانگی نے خلوت کو انجمن سمجھا۔

دیوانہ کا اپنا معیار ہوتا ہے۔ اس کا فرمایا ہوا مستند ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ زمانہ کو اپنا ہم خیال بنالیتا ہے۔ دیوانے مجنون نے لبلی ہی سبب فام کو دنیا کی حسین ترین عورت قرار دی۔ تاریخ دیوانوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ ایک شہزادے کی دیوانگی نے محبت کے تخت و تاج کو ٹھکرایا تو دوسرے شہزادے کے دیوانہ پن نے محبوب کی یاد میں وہ محل تعمیر کروایا جسے لوگوں نے دنیا کا

ساقاں مجبور قرار دیا۔ جو بھی چیز دسترس سے باہر ہو جاتی تو اُسے دیوانگی کہتے ہیں۔ دیوانی آگ وہ ہے جس کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے ہیں جو پل کے پل میں وسیع و عریض جھل کو خاکستر کر دیتی ہے۔ سمندر کی لہروں کا دیوانہ پن یہ ہے۔ بسائے شہر کو اجاڑ کر رکھ دے۔ دیوانہ کی دنیہ محدود نہیں رہتی وہ اپنی دنیا آپ بناتا ہے دانا کا پیالا بڑا سلی ہوتا ہے اور دیوانہ خوب سے خوب تر کی جستجو کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے وہ ستاروں سے آگے کے جہاں کا سراغ لگانا چاہتا ہے۔ آگے بڑھنے کی ہی خواہش ایک غریب ملک کو بھی دیوانہ بنا دیتی ہے اس لیے ملکِ زمیں پر رہنے والوں کو بھوکا، تنگا رکھ کر ستاروں پر کنڈیں ڈالنے کے لیے کروڑوں روپیہ ضائع کرتا دیوانہ کا مقام داناؤں سے برتر ہے۔ کئی مراحل سے گزر کر اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں دانا رسائی نہیں۔ اس کی ہمت، اس کے حوصلے اپنی نیا آپ ہیں۔ دانا وہ بزدل ہے جس کی ہنسی پر بھی روایات کی زنجیریں پڑی رہتی ہیں تو جس کی خوشیوں پر آطوب کے پیر سے۔ دل جو چاہے وہ نہیں کرتا۔ ماحول جو چاہتا۔ اس کے احکام بکالتا ہے۔ جب کہ دیوانہ خاموش محف میں قہقہے لگاتا ہے تو مسکراتی محفلوں میں زار و قد آنسو بہاتا ہے۔ دانا اس کی ہنسی کو قابلِ رحم سمجھتا ہے جبکہ دیوانہ اس قدر خود دار ہوتا ہے کہ وہ کسی رحم طلب نگاہوں کا بھی احسان لینا نہیں چاہتا۔ وہ بے نوث خدا کرتا ہے اور وہ بھی ساز و ناند۔ دانا اپنی خدمت ایک فرض کے تئیں مشینی طو پر ادا کرتا ہے۔ ایک دیوانہ دوسرا بندر۔ دو ذوق۔

نقد و نظر

(تہرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا ممبر کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں)

نام کتاب: "انقلاب ۱۸۵۷ء: تصویر کا دوسرا رخ" - تحریک آزادی کے جذبہ و دلولہ کو دلایا، پرترسم کرنے
ترجمہ: شیخ حسام الدین۔ دیہائی سائیز: ۱۲۰ صفحات،
قیمت: ۶/۷ روپے، ناشر: اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ
مفت پورہ لیشی اردو اکیڈمی نے "تحریک آزادی کا

ادب" سلسلہ وار شائع کرنا شروع کیا ہے اور زیر نظر
کتاب اس سلسلے کی گڑھی ہے۔ ڈاکٹر محمد الہی صدر مجلس
انتظامی یو۔ پی۔ اکیڈمی نے پیش لفظ میں تحریک آزادی کے
ادب کی اشاعت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے
کہ ۱۸۵۷ء ہماری جنگ آزادی کا انتہائی وسیع اور جرات
آزما نقطہ آغاز ہے، اس جنگ کے تقدس کو طرح طرح
سے داغدار کیا گیا۔ زیر نظر کتاب مغربی اہل قلم مسٹر
ایڈورڈ ٹامس کی روشنی فکر کا گارنامہ ہے۔ اس کی دو طبع
ستمبر ۱۹۲۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" میں پہلی
بار شائع ہوئی۔ پوری کتاب کا ترجمہ شیخ حسام الدین امرتسر
نے کیا ہے۔ مولانا عبدالرحیم خان پولیل زئی جو مجاہد آزادی
رہے ہیں، ترجمہ پر نظر ثانی کر کے بیش قیمت مقدمہ سپرد
کیا ہے اور بتایا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب جن اسباب کی بنا
پر ہوا ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کو انگریز راج کی
بدترین غلامی سے نجات دلا کر آزادی و خودداری کو پھر سے
حاصل کیا جائے اور اس جدوجہد میں ہندوستان کے تقریباً
تمام باشندے شریک تھے۔ مصنف نے دنیا کے سارے ہندوستان
کی جنگ آزادی سے متعلق مفید معلومات کا بیش قیمت ذخیرہ
تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ غرض
ایکے اقلام اور پھر نتائج پر اس کتاب میں مندرج واقعات

نام کتاب: "انتخاب" -
صفحات (۱۰۸) قیمت: ۴/۷ روپے، ناشر: اتر پردیش اردو اکیڈمی
قیصر باغ، لکھنؤ۔

جسوت موہانی کا شمار اردو کے اساتذہ سخن اور تحریک
آزادی کے صف اول کے قلمین میں ہوتا ہے۔ وہ بے باک مقرر اور
امولوں کے پابند معانی اور تربیت کے نقیب تھے۔ انکی غزلیہ شاعری میں
درومان کا طبع غور تھی۔ اور جسکی کی مشقت انکی وطن دوستی اور
افتاد طبع کی مرئشاس۔ ۱۹۲۸ء میں "اردوئے معلیٰ" جاری کیا
اور اردو شعراء کے کارناموں کو بقائے دوام عطا کی۔ اس جہد
نے ہندوستانی سیاست اور ثقافت کی رہنمائی کا فرض بھی عطا کیا
اور کانگریس کے پرچم تلے جدوجہد آزادی کے قافلے کو تیز کام
بنایا۔

حضرت نے ۱۹۲۸ء میں روزنامہ "مستقل" جاری کیا۔
جو ۹ مئی تک یابندی سے نکلا گیا۔ پھر روز روزہ اور سہ روزہ
اور ہفت روزہ ہو گیا۔ اور جنوری ۱۹۳۲ء میں ماہنامہ شادیا
گیا۔ مولانا حضرت نے "مستقل" کے ذریعہ قومی ادب کی شعور
کو عروج عطا کرنے میں اہم کردار عطا کیا ہے۔ اس کے ادارے
ان کی حق گوئی اور بے باکی کا واضح اظہار رہے جن کے مطالبے
سے اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ کے کاغذی پیرہن میں قرار کچھ

لئے ہیں۔

جریدہ "مستقل" سے اس کتاب کے مرتب جناب حامد علی خٹرت سے تحریرہ ادارے، ٹائپوں کی تلاش بسیار کے بعد اپنی خواہش اور اپنے معلوماتی مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیئے ہیں۔ اس مطالعہ سے محافت میں حسرت کی انفرادیت، انکا خلوص نگہ، محسوس اور محسوس کوئی اشتکار ہوتی ہے، اور اس امر کا اندازہ ہر تب سے کہ چند مستقل ادب ہندوستانیوں کی صلاح و بہبود ہمیشہ کے پیش نظر رہی، حسرت باقی خراج محب وطن تھے اور انکی رتی ایما نداری اپنی مثال آپ تھی۔ بقول حامد علی "جب بھی عزیز مسکراؤں، کسی عزیز ملک کی حکومت کسی جماعت یا فرد کو دینی کار یا حکمت علی کو حسرت نے ناپسند کیا تو بغیر کسی مروت، دن یا زمانہ سازئی کے وارح طوط پر اپنے خیالات کو ظاہر کیا۔ اس لئے عطف و حریف میں بھی امتیاز نہیں کیا۔ آج کی ہندوستان کی حسرت کے ان اداریوں کے بنی السطوح میں پیدا ہوا ہیں یوں کہ اپنے لئے نشان راہ بنانا چاہیئے۔ اسی اعتبار سے برتنہ انتخاب مستقل، دائمی سہاوی اور بے باکی کا بے نہایت کارنامہ ہے اور یوں، اکیڈمی قابل مبارکباد قرار پاتی ہے۔

کتاب "مشاعرہ زنداں" پیش لفظ: ڈاکٹر محمد اہلی۔
ترجمہ: اتر پردیش اردو اکیڈمی، قیصر باغ، لکھنؤ۔ صفحات (۸۰)
بائی سائز، قیمت: ۴ روپے، ۵ پیسے۔

اردو میں زندانی ادب کا دامن سرمایہ ملتا ہے مولانا سے لے کر سجاد ظہیر تک دانشور اہل قلم اصحاب نے فرہنگ میں ادبی شام کا تخلیق کر کے اردو زبان کی حرکیاتی حرکت انجام دی ہے۔ زیر نظر کتابچہ اپنے موضوع کی بل شال ہے۔ اردو شاعری اور مشاعروں نے ڈاکٹر محمد کے قلم کے مطابق ہماری مشترکہ تہذیب کو سمایا سنوارا ہے۔ جبکہ آزادی میں اردو نے کردار ادا کیا ہے وہ اسے

ہم عصر زبانوں میں امتیازی نشان عطا کرنے کے لئے کافی ہیں۔
اس کی خدمات کا سلسلہ جیل کی چار دیواری کے اندر بھی جاری
"مشاعرہ زنداں" نامی اس کتابچہ میں اگر وہ دوسرے جیل میں نظر بند سیاسی قائدین، علماء اور قوم پرست شعرا کے چار طرفی مشاعروں کی روداد کو روزنامہ "زمین دار" لاہور ۱۹۷۷ء کے ٹائپوں سے یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔

آزادی کے متوالوں نے جب وطن سے سرشار ہو کر اپنے سلک سخن نے گوہر مراد دید نوک قلم پر نقش کر کے آزادی کی تاریک قسبند کی تھی اور ان ۳۵ برسوں میں صاحبان اقتدار زبان اردو کو اس جائز مقام نہ دلا سکے۔ قطعہ مافی کی اس لہز حکایت کا مطالعہ قاری پر اپنے نقوش ترسم کرنے کا باعث بنے اور اردو کے دن پھر بھی جاری ہی آ رہے۔ مشاعرہ زنداں میں الحق بھونڈوی، عارف ہوی، فرائ گور کھوری اور کئی شعرا کا کلام مشاعرہ کی رپورٹ کے ساتھ درج ہے۔ ابتدا جوش طبع آبادی کی ایک المیاب نظم مطالعہ لگتی ہے، جس کے مطالعے سے جوش کی وطن دوستی، سامراج دشمنی اور حریت شاعری منکشف ہوتی ہے۔ ان شعرا قید فرہنگ نے ملک کی آزادی کے لئے اپنے فکر و فن کو وقف کر کے جو کارنامے انجام دیئے ہیں انہیں نئے حالات میں نئی نسلوں کو گدھ پیلنے کے لئے یورپی اکیڈمی نے مفید اور مختصر کتابوں کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ عام اردو والوں کو بھی اس سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

نام کتاب "ضلع جگت"؛ مصنف: کش پرشاد شاد۔
ڈیمائی سائز۔ (۸۴) صفحات۔ قیمت: ۴/۵۰ روپے۔
ناشر: اتر پردیش اردو اکیڈمی، قیصر باغ، لکھنؤ۔
کسی بھی زبان کی عوامی مقبولیت میں اس کے روزمرہ، محاوروں، ضائع بدائع کے علمی دشمنی اظہار کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے اردو زبان اور شاعری کی روزانہ مقبولیت (باقی صفحہ منگ پر)

ادبی ٹرسٹ کا مقصدی ہند پاک مشاعرہ

(آنکھوں دیکھا حال اور انتخاب مشاعرہ)

۷/ مئی ۱۹۳۳ء کو ۹ بجے شب بمقام وسیع دھریض نائٹس میدان ادبی ٹرسٹ کا ۱۸واں سال ہندو ہند پاک مشاعرہ منعقد ہوا۔ شائقین کا ریکارڈ ٹوڑ کر مجموعہ اور بنیادین مشاعرہ کے مثالی نظم و نسق اور شہر غزل کے معنی جھوں کی داد دینے کے منظر و پس منظر میں اس مشاعرہ سے ۸۵ ہزار روپے کی آمدنی ہوئی۔ جسے جنوبی ہند کے ریسرچ سنٹر ادارہ ۴ اویسیاب اردو کے ٹرسٹ کے لئے عطیہ کے طور پر دیئے جانے کا اعلان تالیفوں کی گونج میں اختتام مشاعرہ سے قبل جناب محترم راج سکینہ رکن ادبی ٹرسٹ نے کیا۔

اردو دست حیدر آبادی مرکزی وزیر توانا نو پٹر ولیم جناب پی بشیر شکر نے اس یادگار مشاعرے کی صدارت کی۔ ۱۰ ہزار سے زائد یادوق سامعین نے رات دیر گئے تک مہمان و میزبان شعراء کو پوری دل چسپی سے سنا، اور خوب خوب داد دی۔ جناب نقیلین حیدر (کلکتہ) نے برصغیر لطائف اور دلچپ اشعار کے سہارے لطافت کے ذرائع نہایت خوبی سے انجام دیئے۔

مرکزی وزیر برادھلہ جناب پرشاش چندر سٹی نے ہر محبت مہمان خصوصی شرکت کی اور حیدر آباد کے ادبی اور سینور روایات کو زبردست فراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہماری زبان ہے اور سیکولر روایات کی پاسداری اس کا شعری سرمایہ اسکی مقبولیت ہے۔ نئے حالات میں یہ زبان اندرون ملک ہی نہیں سوویت یونین، امریکہ اور برطانوی ممالک میں بھی ارتقائی مدارج طے کر رہی ہے۔ آپ نے جامع عثمانیہ کے اردو کردار کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس درمیان میں نے اردو کو اعلیٰ تعلیم کے لئے معقب کرنے کے علاوہ ان اور ملکی زبانوں کے فروغ کی اولین مثال قائم کی ہے۔ جناب سٹیجی دت کے شکر و شاد مشاعروں اور حیدر آباد میں نصف صدی قبل مہاراجہ سرکشن پریشاد کی دیوڑھی کے مشاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ادبی ٹرسٹ کے سالانہ مقصدی اور مقبول عوام جنوبی ہند کے مثالی سالانہ مشاعروں کو قوی پکھن کا روشن منورہ قرار دیا اور کہا کہ جناب عابد علی خان ایڈیٹر سچاست دہانی ادبی ٹرسٹ کی کوششوں سے حیدر آباد میں اردو زبان و ادب اور ہندو کی خلی ترقی ہو رہی ہے۔ موصوف نے جناب عابد علی خان کی اچانک علالت اور مشاعرے میں عدم شرکت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے انکی عیادت مستریابی کی تعانی اہر کی اور ہر اہل سامعین نے آئین کہا۔

صدر مشاعرہ جناب پی۔ شیونشکر نے نفع اُردو میں تقریر کرتے ہوئے مٹرسٹیجی کا اُردو کے شہر میں غیر مقدم کیا۔
 د۔ سادہ مٹری رسم اجراء انجام دی۔ اور کہا کہ اُردو زبان یکانیت اور معنیت کی زبان ہے اور میرے حیدر آباد کو اس
 ت کا فخر حاصل ہے کہ یہ شہر صدیوں سے اُردو کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں مختلف زبانوں میں لسانی اقتصاد بھی فروغ پاتا رہا۔
 جناب شیونشکر نے مشاعرہ کے معزز مہمان جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف اشارہ کرتے
 ہوئے کہا کہ میں اپنے استاد کی موجودگی میں اُردو میں تقریر کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتا رہا ہوں۔ موصوف نے اپنی مختصر
 لہ شداد و تنگنہ تقریر میں مرکزی حکومت کے ان اقدامات پر بھی روشنی ڈالی جن کے ذریعہ ترقی اُردو بھر پور آ رہی ہے۔
 سید میاں زبان، ادب اور کلمہ کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ جناب شیونشکر نے اُردو شاعری کی زبردست
 قوت کو متحدہ اور آزاد ہندوستان سے مربوط اور منسلک قرار دیا اور کہا کہ اُردو ہی وہ زبان ہے جو ملک کو متحد
 اور مستحکم بنانے میں اہم حصہ ادا کر سکتی ہے۔ اس طرح اُردو کا فروغ ایک خوشحال ہندوستان کی تعمیر کے مترادف
 جناب سید ہاشم علی اختر (مقدم ادارہ ادبیات اُردو) نے ابتداً وزراء اور مہمان پاکستانی شاعر
 حضرت شان الحق حق کی تحلیف شہی کی اور مرکزی وزیر داخلہ جناب سٹیجی کو اہل حیدر آباد کی طرف سے چارمینار کا
 ماڈل پیش کیا۔ جناب منوہر راج سکسینہ نے جناب عابد علی خان بانی و معتمد ادبی ٹرسٹ کی طرف سے غلبہ استقبالیہ پڑھا
 اور ادبی ٹرسٹ کے مقصدی شاعروں کا تعارف و تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ اب تک ٹرسٹ کے مشاعروں سے ۱۰ لاکھ
 روپے جمع کئے گئے، جن سے اُردو کے تعلیمی، ادبی اور تہذیبی اداروں کی اعانت کی گئی۔ اُردو ماڈل اسکول اور اُردو
 مراہیے کار آملہ اُردو مراکز ادبی ٹرسٹ کی اعانت سے اُردو کے فروغ اور استحکام کا کام انجام دے رہے ہیں۔
 ادبی ٹرسٹ کے مشاعرہ محیدر آباد کی مشترکہ تہذیب کی تجدید کا سالانہ قومی جشن بن گئے ہیں۔ مشاعرہ کی ابتدائی مقدمات
 کاروائی ڈاکٹر جعفری تقسیم رکن ادارہ ادبیات اُردو و کنوینر مشاعرہ نے انجام دی۔ ٹھیک ۱۰ بجے مشاعرہ روشن
 ہوا اور ملک جناب ثقلین حیدر نے سنبھالا۔ اس مشاعرے میں پاکستان کے جناب شان الحق حق کے علاوہ
 مہمان شہداء حضرت خاں بارہ بنکوی، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی، یزدیہر معین احسن جذبی، جناب فناء
 نظامی، محترمہ ساعہ قزلباش، جناب آغا قزلباش، جناب شاہد فیض، محترمہ روبہا مہتا انجم اور جناب نورانقہ
 کے علاوہ میزبان شعراء حضرت سعید شہیدی، جناب شاد تنکنت، جناب علی احمد علی، جناب امیر امجد نسرو،
 باب گنول پریشاد کنول، جناب راشد آذر، جناب خواجہ شوق، جناب نقی علی خان تاق، جناب صلاح الدین تیر
 باب رحمن جانی اور محترمہ عزیز النساء مہمان نے کلام سنایا۔ ذیل میں اس مشاعرے سے انتخاب پاریہ ناظرین
 کیا جاتا ہے۔

رحمن جانی۔ ایک ذرا نزدیک سے گزری خوشی۔ دور سے ہر غم کا اندازہ ہوا
 جب گناہوں سے ہوا میرا گزر۔ تب تری رحمت کا اندازہ ہوا

نور اندری۔ عشق میں جان دے دینا آسان ہے۔ ہاں مگر ایک ذرا حوصلہ چاہیے

میرا گھر اُڑے یا اُڑے گھر آپ کا - آندھریوں کو تو بس راستہ چاہیے

صلاح الدین تیر - تمام شہر ہے پیاسا دھواں دھواں نظر - نیرید اپنے مقابل ہے کیا کیا جائے
بہت سے ڈوبنے والے تھے پائے تیر - ہمارا گھر لب ساحل ہے کیا کیا جائے

شاہد فیضی - یہ تیری انجن خاص کی نوازش ہے - پڑے ہیں شیشہ و ساعر ادھر ادھر کھٹے
ذرا تم اپنے محل سے تو جھانک کر دیکھو - تمہارے شہر میں اُڑے ہوئے ہیں گھر کھٹے

عزیز النساء صبا - فصلِ گل بھی گلشن آ نہیں سکی اب تک - پھول بھی نہیں مہکے آپ کے نہ آنے سے

روپا بہتا نعمت - تنہا میوں کے بھول ہی غم کی بہا رہے - اُڑے ہوئے دلوں کا یہ اُڑا دیا رہے
گزر رہا تھا کا - واں کوئی اس دل کی راہ سے - اُنکھوں میں اس کی یاد کا اب تک غبار ہے

نقی علی خان ثاقب - محسوس کر سکو تو کرو زندگی کا حسن - چھوڑنے کی ان دنوں تو روایت نہیں رہی
ظہر کو نگاہِ دہر سے کیسے چھپائے - نثر میرِ ردائے شب بھی سلامت نہیں رہی
جھلک نہ کیجئے سورج کے دروازہ کھولے - مانوس دستکوں میں مروت نہیں رہی

امیر آغا قزلباش دلہری - مادل ہو تو برسو کبھی بے آب نہیں پر - خوش ہو اگر تم تو بکھر کیوں نہیں جاتے
تم راہ میں چپ چاپ کھڑے ہو تو گئے ہو - کس کس کو بتاؤ گے کہ گھر کیوں نہیں جاتے
ہر بار ہمیں ہیں ہدفِ سنگِ ملات - الزام کسی اور کے سر کیوں نہیں جاتے

خواجه شوق - کمال ہوش ہے جسکو وہ دیوانے سے لگتے ہیں - حقائقِ زندگی کے آج افسانے سے لگتے ہیں
شرافت کے بادل جب اُتر جاتے ہیں بھولے سے - تو یہ گنجان شہر آباد دیرانے سے لگتے ہیں

سامو قزلباش - کوئی رفیق سفر ہے نہ راہبر کوئی - اک ایسی راہ میں کب سے کھڑے ہیں ہم تنہا
ہماری طرح بھڑک کر کسی سے راہوں میں - کوئی دکھا دے ذرا چل کے دو قدم تنہا
کچھ اس طرح سے گزاری ہے سامو ہم - ہمارے ساتھ زمانہ تھا اور ہم تنہا

راشد آذر - یہ نہ سمجھو زندگی میں اک خلا درہ جائے گا - تم نہ آؤ گے تو دروازہ کھلا رہ جائے گا
یاد میری جب بھی آئے گی خلش بن جائے گی - بھول جاؤ گے تو دل میں درد سا رہ جائے گا
سب فنا ہو جائے گا بس اک صداقت کے سوا - میں تو مٹ جاؤں گا میرا لکھن پارہ جائے گا

شان الحق حقّی - میں خراب راہِ حرم سہی میں جگہ میں ہرے بھرے
وہ چراغِ خانہ دلبری وہ صنم منوہرے سا نورے
یہ جھون دل، یہ سرورِ سحر سے آستانے کی دینے
مری منزلین، مری رہنمائی ترے آستان سے بھی تھوڑے
وہ مرے خیال کا پھولیں کہ جہاں سے آتے ہیں یہ سخن
مرے وہم سے مجھ سے کچھ اُدھر مری یاد سے بھی کہیں پرے
وہ چراغِ شوق جو گل ہوا تو جہاں دل ہی بدل گیا
وہ نظارہ گم وہ نظر نہیں کوئی کیوں ہے، کوئی کیا کہے

ایرا احمد خسرو - وفا، خلوص، محبت، بجا، درست نگر - بتائیے کہ ہے یہ ذکر کس زمانے کا
کلی کی طرح ہر اک زخمِ دل چمکنے لگا - حیاں آیا جو محض تری سجاوے کا
میں آدی ہوں تو پھر کیوں مری تلاش میں ہے - ہر ایک درد، ہر اک حادثہ زمانے کا
چلا ہے جانبِ مقتل جو مسکراتا ہوا - وہ شمع لگتا ہے خسرو مرے گوارے کا

ن نغای - تو چاہے تو بھر دے داتا تو چاہے تو خالی رکھ - اور کہیں دامن پھیلا نا میرے بس کی بات نہیں
کل کانٹوں سے ملتی تھی خود بادِ صبا آ کر - اور آج گزرتی ہے پھولوں سے بھی گزرا کہ
دیوانہ بنا دے گی تجھ کو تری تنہائی - دنیا سے نہ بل لیکن، اہلیت تو دیکھا کر
جلوہ ہو تو جلوہ ہو، پرچم ہو تو پردہ ہو - تو بینِ تجلی ہے چلنے سے نہ جھانکا کر

ایرا احمد جلی - احباب کے خلوص سے جب واسطہ پڑا - شیشہ تو میں نہیں تھا مگر ٹوٹنا پڑا
پھولوں کا حق تو ہم پہ بہر حال تھا مگر - کانٹوں میں بھی کچھ اپنا ہو بلٹا پڑا
جینے کی کس کو دیجیے اس عمر میں دعا - ہر بار اٹھا کے ہاتھ ہی سوچنا پڑا
ہل تو گئی حیات کی منزل مگر عسلی - ہر حادثہ سے اپنا پتہ پوچھنا پڑا

معین احسن جزیبی۔ ہمارے دود کا طوفان کہاں کہاں نہاٹھا۔ یہ شور آپ جہاں چاہتے وہاں اُٹھتے
 کسی کا رنج، کسی کا الم، کسی کا طال۔ اب اور کیا تھا جو ہم زیرِ سلاخی اُٹھتے
 نہ لگے تھے تو یہ ہر حال بسر بھی ہوگی۔ شام آگیا ہے تو اُنے کہ سحر بھی ہوگی
 دل اگر دل ہے تو جس راہ پہلے چلے گا۔ درو مندوں کی وہی راہ گزر بھی ہوگی

شادِ ملکوت۔ بہت بھوم تھا تعبیر کی دوکانوں پر۔ ہیں تھے درنہ کوئی جنسِ خواب کیا لیتا
 فرات آگ دعا ہے نیک پیاسا ہے۔ یہ پیاس کوئی بھُجا کر ثواب کیا لیتا
 جسے درقی چہرہ چہرہ یاد ہو شاد۔ بھلا وہ آدمی درسِ کتاب کیا لیتا

سعید شہیدی۔ دینے والا بے طلب دیتا رہا۔ میں نے دامن اپنا پھیلا یا نہیں
 کیا گشش ہوگی عدم آباد میں۔ جانے والا کُٹ کمر آیا نہیں
 چلنے کس نے دی دہل پر مراد۔ میں نے اس کا نام بھی پوچھا نہیں

خار بارہ بنگوی۔ دوسروں پر اگر تھوڑے کیجئے۔ سامنے آئینہ رکھ لیا کیجئے
 من جب ہر ماں ہو تو کیا کیجئے۔ عشق کی مغفرت کی دعا کیجئے
 عقلِ دل اپنی اپنی کہیں بچار۔ عقل کی نیلے دل کا کہا کیجئے
 رات کئی تو کیا کئی ٹہرے گئی اور ترگی۔ مجھ کے خواب دیکھئے، مجھ کو بھول چلئے
 چلتے گھروں کی رہ گئی شہروں کو چلے گا کی۔ اب تو خدا کے واسطے دل کے دیئے چلئے
 سب ہیں دماغ کے مرید پیرو دل نہیں کوئی۔ آج کے دد میں خار کس کو غزل سنئے

کنور ہمندر سنگھ بیدی بھر۔

ہم مندرِ خرابات بٹھایے ہیں جوان ہیں۔ اور اُن پہ جہانِ میں جوانی نہیں آئی

ڈاکٹر سید فی الدین قادری زمر کے نام کے ساتھ ساتھ کب سے میں ادارہ ادبیات اُردو کا نام سنا رہا
 تھا۔ زچہ نصیب کہ اس ادارے میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ درودِ دیوار کو دیکھا، مخلوقات و
 مطبوعات پر نظر ڈالی۔ نقاد پر و فراین اور نواز کو بیک نظر دیکھا۔ جی خوش ہو۔ اور ایک روحانی
 بالیدگی حاصل ہوئی۔ “انتظارِ حسین، ۷ اپریل ۱۹۸۳ء

اردو نامہ

وقار خلیل

مسرز جوالا کھٹی (تلگو شاعر)،
حمود انصاری ایڈیٹر "منصف"،
چند مسرلو استوڈیو ٹیگز اور دو ایکسپریس
منو ہیراج کینیڈا (انجمن) اور اعجاز قریشی
نے حقہ لیا۔

اردو کی علمی ادبی تہذیبی خبریں

یکم اپریل: حیدرآباد ٹریڈ فورم کا ادبی اجلاس ڈاکٹر مفتی تبسم کی ہدایت میں منعقد ہوا۔ پاکستانی نقاد اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی نے بحیثیت اہم انجمنی ادبی و شعری روایات پر ماضیانہ خطاب کیا۔ ڈاکٹر انور مظہر نے ڈاکٹر جمیل کا تعریف "پاکستانی کلچر" پر سیر حاصل تبصرہ سنایا۔ پروفیسر غلام عمر خاں ہدایت شاہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے جالبی صاحب کی دکنیات تنقاسی کو خراج ادا کیا۔ جناب علی ظہیر نے نظامت کی۔

کلیم ادب کی طرف ادبی فنون میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے نکلنے پر، ڈاکٹر مفتی تبسم، ڈاکٹر مجاہد حسین رضوی، مصلح الدین سعدی اور رحمت یوسف زئی نے ادبی انٹرویو کیا۔ پروفیسر سید سراج الدین نے ہدایت گد جناب عابد علی خاں ایڈیٹر تیجاست اہم انجمن خصوصی تھے۔

ریاستی چیف فٹر مشین، ڈاکٹر اماراؤ نے اخبار والوں کو بتایا کہ حکومت نے ملک انفرام (تلگو آندھ) اور استھانہ وودھان کے چھوٹوں کو

فی الفور درخواست کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اعزاز شاہی اور جاگیر دارانہ روایت کی نشان دہی کرتے ہیں۔

۲/ اپریل: شخبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا پُرچاک خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر غلام عمر خاں نے ہدایت کی۔ جناب جالبی نے ادبی اور تحقیقی رجحانات اور نقاط نظر پر مطالب کیا۔ ڈاکٹر یوسف بسمست نے شکریہ ادا کیا۔ ریاستی انجمن ترقی اردو کی طرف سے اردو ہال میں جناب جمیل جالبی کے اعزاز میں عہرانہ ہوا موصوف نے پاکستان میں ادبی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد مقدمہ انجمن نے خیر مقدمی تقریر کی اور مسر سرنیواس لاہولی شریک مقدمہ نے شکریہ ادا کیا۔

۳/ اپریل: جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر آتر پردیش نے ریاستی اوپنل گراجویٹ اسکولیشن کے زیراہتمام، سرکاری زبان کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے آندھرا یونیورسٹی میں تلگو اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کو اہم عطف دینے کا مطالبہ کیا۔ اردو کے تعلیمی اور سرکاری موقف اور مسائل پر اس کنونشن میں

۴/ اپریل: حلقہ ارباب ذوق و تقاسم اردو ٹرسٹ لاہوری کا ماہانہ اجلاس پروفیسر سراج الدین کی ہدایت میں ہوا۔ جناب علی اہد جمیلی نے شجاع خاں اور کے مجموعہ کلام "دادیں" پر عالمانہ تبصرہ سنایا۔ جناب محمد منظور احمد سکریٹری نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۸/ اپریل: عثمانیہ یونیورسٹی کے شخبہ صفات کی طرف سے ایک سمینار ریاست میں علانائی صفات کارول کے زیر عنوان جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر کی ہدایت میں منعقد ہوا۔ بزرگ تلگو مہائی مشین ڈیکٹور راؤ، ڈاکٹر آے آراباجی متیر ریاستی فیکلڈ اطلاعات، ہدایت شخبہ صفات پروفیسر بشیر اللہ، مسر بی بی بھارگو (انڈین اکسپریس) اور مسر حمود انصاری ایڈیٹر "منصف" نے حقہ لیا۔ مقررین کا عمومی تاثر یہ رہا کہ ریاست کے اردو اخبارات کا معیار دیگر علاقوں کے اخبارات سے بدرجہا بہتر ہے اور ملک میں صفات کا مستقبل ہندوستانی زبانوں کے اخبارات سے وابستہ۔

۹/ اپریل: شہر ادب کا ماہانہ

مشاعرہ جناب راز عابدی کا عداوت
میں ہوا۔ تہذیب کتب نگر کے شعرا نے
کلام سنا یا۔ یوسف نظری نے مقدمہ کیا۔

۱۱/ اپریل: ادارہ تنقید ادب
کا غیر معمولی اجلاس گاندھی بھون میں
اس کے صدر جناب کے ایم خاں کی
عداوت میں منعقد ہوا۔ اور ایک قرارداد

کے ذریعہ ریاستی حکومت سے اردو
کو سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے
کے تعلق سے آرڈینس جاری کرنے
کا مطالبہ کیا گیا اور نئے تعلیمی معیقات
سے قبل اردو اساتذہ، مدارس اُن کی
عمارتوں، تعلیم اور نصاب کتب کے
خاطر خواہ انتظامات کیلئے اقدامات
میں سرعت پیدا کرنے پر زور دیا گیا۔

۱۲/ اپریل: ادبی انجمنوں

”فردوسِ ادب“ اور خاصانِ ادب“
کی طرف سے جناب خاور نوری کی دیرینہ
ادبی دشمنی ضد مات کو ”اردو گھبر“
میں خراج ادا کیا گیا۔ ڈاکٹر مفتی نسیم

نے عداوت کی جھڑپ سعید شہیدی،
ڈاکٹر اشرف ربیع، ڈاکٹر محمد علی اشرف،
ڈاکٹر عقیل ہاشمی، جناب صادق نقوی،

اور جناب راحت عزیزی نے خاور نوری
کی دشمنی صلاحیتوں پر مضامین سنلئے
جہاں شاعر ڈاکٹر احسن رضوی کا اس
مہفل میں خبر مقدم بھی ہوا۔

۱۳/ اپریل: ادارہ تنظیم

اردو اور ہفتہ روزہ کامن نیوز کا طرف
سے دہلی میں سیما ب کے شاعر

رادھا کرشن سہگل دہلی کے خیر مقدم
میں شہری مہفل منعقد ہوئے۔ جناب محمد انصاری

ایڈیٹر منصف نے عداوت کی۔ جناب
منوہر راج سکینہ اور امجد باغی نے خطاب

کیا۔ پولی ایکڈمی سے انعام لینے پر خوشہ چینی
اور زور آٹالی صاحبان کا چٹوٹی لگا لگا میز
سہگل، چینی، زور، بشیر داری، ڈاکٹر

راہی، دتہ رخیل، جہاں دار انس، منوہر
لال پہار، بھل انہر، ظریف، راج لال راجہ
اور جہاں شاعر عبد القادر ادیب،

(نیکلور) نے کلام سنا یا۔ فیاض الدین
صابری مقدمہ تنظیم اردو اور معین فیاضی
(ایڈیٹر کامن نیوز) نے خیر مقدم اور شکریہ
ادا کیا۔

۱۴/ اپریل: زندہ دلائل حیدر آباد

کی ۱۵ ویں سالانہ سرورہ تعاریب کا
ریاستی وزیر لبرسٹریم راجندر راؤ نے
انتسار کیا۔ فضل لطیف کے اس باغ و بہار
اجلاس میں رشید قریشی، مجتبیٰ حسین،
ڈاکٹر احمد اللہ خاں، اظہار انس، مصطفیٰ علی
بیگ، اسلم فرخوری، بالا پرش دگور، دولت
رام، ذہانت علی بیگ، حاجی بشیر احمد اور
کنوینر طالب خوند میری نے لطائف و ظرائف
سنائے اور داد حاصل کی۔

۱۵/ اپریل: زندہ دلائل حیدر آباد
کے نکاحی اجلاس کا جناب سید ہاشم علی اختر
نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اردو
کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا
اعلان کرے۔

۱۵/ اپریل: زندہ دلائل حیدر آباد

کے نکاحی اجلاس کا جناب سید ہاشم علی اختر

والیں چانلرڈ، میو نیوٹی نے
انتسار کیا اور جہاں نکاحی راجہ

جناب انتظار حسین (پاکستان) نے
عداوت کی۔ محترم جیلانی بانو، جناب

رشید قریشی، جناب عداوت چند کھنہ
جناب نریندر توہر، باب مجتبیٰ حسین
محترم شفیقہ فرحت (دھوپال)

جناب پرویزہ اللہ جہدی، جناب
فضل جاوید (دھوپال)، جناب سید نجم
جناب برہان حسین اور ڈاکٹر حبیب ضیا

(کنوینر) نے طنز و مزاح سے عداوت
شگفتہ مضامین سنائے۔ عداوتی
اور انتقامی مضامین نے خصوصی توجہ ملی

۱۶/ اپریل: سبجہ اردو

عثمانیہ یونیورسٹی اور اسٹوڈنٹس ویلج

اسوسی ایٹن کا طرف سے منعقد،

میں کیفیاتی تحریری و تقریری مضامین

میں حصہ لینے والوں کو محترمہ بیگم

ہاشم علی اختر والیں چانلرڈ، انعام

تقدیم کیے۔ جناب والیں چانلرڈ

نے عداوت کی۔ ڈاکٹر یوسف سمرست

ریڈر سبجہ اردو نے لطافت کے

فرائض انجام دیئے۔

۱۷/ روزنامہ سیاست کا طرف

سے ”اردو گھر“ میں پاکستانی جہاں،

انسانہ نولیں، جناب انتظار حسین کے

ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔

جناب نریندر توہر نے عداوت کی۔

انتظار حسین صاحب کے علاوہ محترمہ

جیلانی بانو اور جناب عوف سید نے

نہ کہانیاں سنائیں جبکہ جناب
نبی خین نے انتظار حسین پر اپنا دلچپ
خاکہ سنایا۔ ڈاکٹر مفتی تبسم نے نظامت
کے نرائض انجام دیے۔

جناب انتظار حسین نے آرس
کالج قنایہ یونیورسٹی میں جدید انسانیت پر
نرسیہیں پکڑ دیا۔ ڈاکٹر مفتی تبسم نے
ناضال دانشور کا تعارف کرایا۔

زنگہ دلاں جدید آباد کال ہند
شاہدہ ذاب شاہ عالم خاں صدر تعلیمی
کیش انوار العلوم ایجوکیشنل سوسائٹی
منعقد ہوا۔ ملال راجپوری، شمس مینائی
ساعریخی، ناظر انھاری، مختار یوسفی،
دلکش آفریدی اور میریان شعراء علمی صائب
میاں، حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ،
یاگل عادل آبادی، بیباٹ، سرپٹ،
برگس اور ناظم شاعرہ طالب غوند میری
نے کلام سنایا۔

نیرنگ ادب کا ادب دشوری،
اطلاس جناب انھار اختر کا صدارت
میں منعقد ہوا۔ شاغل ادیب کاظم
اور شعراء اوج یعقوبی، حسن جلاکائی،
راز عابدی، عبد الکیم ماہر نے کلام سنایا۔

۱۷/ اپریل: اردو اکیڈمی،
آندھرا پردیش کی طرف سے میسر محمد
ادب الیادٹ برائے تنقید ایک مائیدہ
جلب میں ڈاکٹر وحید اختر ریڈر شعبہ
نظم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو دیاجی
حاتق ابو یوسف صدر اکیڈمی نے اس
فرشکار تقریب کا صدارت کی جی

سردار علی خاں نے ڈاکٹر اختر کو ایوارڈ
کا رقم دس ہزار روپے، سندھ تو صیف
اور شال نذر کا۔ جناب چند رسریو استو
ڈاکٹر کٹر/ سکریٹری اکیڈمی نے خیر مندی
خطاب کیا۔ جناب اختر حسین نے توصیف
نامہ سنایا۔ سرز کے ایل ہندرا، منوہر
راج سکینہ، محمود انصاری، اکرام حادید
اور اعجاز تریبی نے مخدوم اور وحید اختر
کے مفروضہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے
مخدوم ادب انعام یانے پر وحید اختر کو
مبارک باد پیش کیا۔ ڈاکٹر وحید اختر نے
مخدوم کو زبردست خراج عقیدت ادا
کرتے ہوئے اکیڈمی کا شکریہ ادا کیا اور
ادب و تنقید کے مسائل پر پکڑ بھی دیا۔

جدید آباد ٹیری ٹوڈ نے خاب
انتظار حسین کے خیر مقدم کا اہتمام کیا۔ جناب
عوض سعید نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مفتی تبسم
علی ظہیر اور یوسف اعظمی صاحبان نے
انتظار حسین کی کہانیوں پر اظہار خیال کیا۔
بالوطا پرہ سعید نے تذرائف سخی پیش کیا
انتظار حسین نے کہانی سنائی۔ غیات مبین
نے مقدمی کی۔

۱۸/ اپریل: ریاستی انجمن ترقی،
اردو کا طرں سے جناب انتظار حسین کو
استقبالیہ دیا گیا انجمن کے عہدہ داروں
پروفیسر جیب الرحمن، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ڈاکٹر ثمان، ڈاکٹر حبیبی شاہ اور جناب
سرغواس لاہوتی کے علاوہ ادیبوں اور
شاعروں نے شرکت کی۔
۱۹/ اپریل: خناز حام ڈاکٹر

محمد غوث سابق لائبریرین شعبہ
مخطوطات قنایہ یونیورسٹی کا ۷ سال
کا عمر میں انتقال ہو گیا، خدا مغفرت فرمائے۔
۲۱/ اپریل: جدید آباد کے

ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی
طرف سے ڈاکٹر وحید اختر کو مخدوم ادب
ایوارڈ ملنے کی صرت میں ایک مائیدہ ہنستی
جلب جناب اختر حسین مددگار متمد ریاستی
اردو اکیڈمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔
ڈاکٹر مفتی تبسم، سادہ نعلت، محسن سعید
یوسف اعظمی اور محسن علی صاحبان نے
وحید اختر کے مفروضہ پر اظہار خیال کرتے
ہوئے مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر وحید اختر
نے ادب و رجانات پر خطاب کیا اور،
اپنا کلام سنایا۔ حسن دوع نے کاروائی انجام
دی اور تدبیر زمان نے شکریہ ادا کیا۔

۲۲/ اپریل: ادارہ ادبیات
اردو کیلئے ایک لاکھ روپے کے ٹرسٹ
کا ادب ٹرسٹ نے کلید مشاعرہ کے
ذریعہ قیام علی بن لائے کا جو اعلان کیلئے
اس سے متاثر ہو کر جناب حادیر جادید
سکریٹری انجمن عوامی مصیص نے
۱۰ روپے کے عطیہ کا روزنامہ سیاست
میں پیش کیا ہے۔ حسن کا ادب حلقوں میں
خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔

۲۴/ اپریل: بزرگ ستار
اور جامعہ قنایہ کے سجون جونت رائے
ضیاء مؤلف نچ کا انتقال ہو گیا۔ گزشتہ
دنوں ضیاء کے مجموعہ کلام "توس قزح"
کا رسم پخش کا انجام پائی ہے۔ جناب

نقد و نظر ماس سے آگے

میں اس زبان کے حامدوں، رد و مزہ اور قلعہ جگت کو بھی کلاسیکی اور عصری ہر اعتبارات سے خاص مقام حاصل رہا ہے۔ اتر پردیش اُردو اکیڈمی نے میدر ہلڈ کے صوفی شاعر، عہدِ مصطفیٰ کے وزیرِ اعظم دکنی اور ہندوستانی کلچر کے مثالی کردار اربابِ سرشت پر شاد کے اہم رسالہ "ضلع جگت" کا دوسرا ایڈیشن شائع کر کے اہم ایوانِ خدمت سرانجام دی ہے۔ دیباچہ میں مہاراجہ مرحوم نے ضلع اور جگت کی لغوی اور لسانی اہمیتوں کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہلی اور بکھن میں ہاں اُردو نے نشوونما پائی اور اس میں طرح طرح کی کونپلیں چھوٹیں، اس پیاری زبان میں جب شگوفہ کاری کی گئی تو خوش مذاق تر لغویں اور رنگین مزاج شوقِ طبعوں نے اس پر ضلع جگت کی بھی ایک خوشامیل چڑھائی جس سے اس جہن کی پہاڑ بڑھ کر ایک بے ہزار ہو گئی۔ ہر بات میں لطیفہ اور ہر تقریبی لفظ ذو معنی ہو۔ اس میں علاوہ تفریح و دلچسپی کے اعلیٰ درجہ کی طبیعت داری و ذہن اور زبان کے لحاظات و کلمات و اشارات پر عبور و مہارت پائی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ۲۶ عنوانوں کے تحت ضلع جگت کی خوبی دی گئی ہیں۔ اُردو کے ابتدائی ناولوں اور داستانوں میں "ضلع جگت" کی خوش نظمی، تازگی کو متوجہ کرتی رہی ہیں نگارمن کے لئے تجربے میں ضلع جگت کو رواج دیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کلاسیکی اعتبار سے مفید ہے۔

منشی تبسم نے کلام سنایا۔ جناب احمد حسین چندا نے چاند کا خیر مقدم کیا اور جناب رئیس اختر نے نظامت کی۔

۲۹/ اپریل: ادیبانِ دکن کا ہونے سے حضرت صفی اورنگ آبادی کی یادیں ساکنہ ادبِ اعلیٰ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سلیت کے عہد میں منعقد ہوا۔ جناب محبوب حسین جگر جناب منور راج سکینہ جناب دتار صدیقی جناب غلام یزدانی اور جناب عبدالغنیظ لغوی نے حضرت صفی کا شہری اور اہل کے عہد پر مطالب کیا۔ جناب محمد منظور احمد نے منہدی کی۔

۳۰/ اپریل: ادیبانِ دکن کی طرف سے نعت شاعرہ جناب خواجہ شفیق کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ یحییٰ جمیل نے منہدی کی تلاطم صفی کے علاوہ سازشاعروں نے بارگاہ رسالت میں نذرانہ سنبھالیں کیا۔ کلچر نے سیم کے ساتھ جناب اتر علی کا مجموعہ کلام "دو بوند روضہ روشنی" کا جناب ہاشم علی اختر و ایمن جاسٹر غنائیہ پورڈی نے رسمِ اجساد انجام دی۔ شہر کے بلال سابق آرٹسٹل چیف سکریٹری نے عہدات کی۔ جناب اختر حسین، جناب محبوب حسین جگر، شہر چند رسر بواستو، شہر شہید شرمہ، راجکاری اندر ادیبی دھن راج گرو، اجاز قریشی اور جمیل نیال نے انٹر کے شاعر پر اظہار خیال کرتے ہوئے مبارکباد دی۔ سید یونس نے معاشر شاعر پر نظم سنائی۔ حسن فرخ نے خوشگوار تقریب کا کاروائی انجام دی۔

ضیاء حیدر آبادی تہذیب اور علم دوستی کا مثالی نمونہ تھے۔ اچھا بختے، ان کے صاحبزادہ مشر جگمبون استھانہ شہر سے ادارہ "بے رس" اظہار تعزیت کرنا ہے۔ کلچر جناب طیب انصاری بھرار، گورنمنٹ کالج بھگنہ کے ادارہ ادیبانہ کے ٹرسٹ کیلئے ادبی ٹرسٹ کی اپیل پر ۱۰ روپے عطیہ دیتے ہیں عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر، اسکالروں اور اُردو دوستوں سے اس امر کا خواہش کا کہ وہ ملک کے اہم ریسرچ سنٹر کے مالک کو متعلق بنانے میں ادبی ٹرسٹ سے تعاون کریں۔

۲۵/ اپریل: اُردو گھر میں، جناب طیب انصاری کے سفرنامہ، "کلچر کے کلچر کی" کا افتتاح پر عطیہ تہذیب حیدر آباد کرائیو فریڈیس اسکی ایمنی کے طرف سے عہدات جناب سید ہاشم علی اختر و ایمن جاسٹر غنائیہ یونیورسٹی منعقد ہوا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سلیت، جناب شاہ عالم خاں جہانان خصوصاً تھے۔ ڈاکٹر منشی تبسم، جناب حسن کمال سابق اہم ایل لے کرائیو اور جناب صادق ندوی نے جناب طیب کی ادبی خدمات اور انصافی اہمک پر اظہار ستائش کرتے ہوئے سفرنامہ کا، افتتاح پر مبارکباد دی منشی شرمہ سید شہیدی، علی احمد جلیلی، صلاح الدین خیر، صاحب حیدر آبادی، صادق ندوی، رئیس اختر، اور عہدات عمرہ ڈاکٹر



•

•

•

بیادگار ڈاکٹر سعید محمدی الدین قادری زور
ماہنامہ

سب رس

سعید آباد

مدیر اعزازی معاذین مدین	مفتی محمد وقار علیل
جلد (۴۳) جون ۱۹۸۳ء	شمارہ (۶۱)
قیمت فی پرچہ ۲ روپے ۲۵ پیسے	

مجلس مشاورت
مدیر
نائب مدیر
مسئد

عابد علی عباسی
ہاشم علی اختر
ڈاکٹر مفتی تبسم

ادارۃ ادبیات اردو: پنجم گٹھ روڈ سعید آباد

ارکان
پروفیسر سعید علی اکبر
عابد علی خان
پروفیسر گوپی چند نازنگ
محمد اکبر الدین صدیقی
رمن راج سکینہ
پروفیسر سراج الدین
محمد منگلو احمد

نہ سالانہ
۲۵ روپے
کتاب خانہ سے
۳۰ روپے
نذر لیجہ ریسرچی ۲۵ روپے
پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر
انگلستان ۷ پونڈ

بیرونی ملکوں میں
ہوائی ڈاک سے
مشرق وسطہ ۱۰ ڈالر
امریکہ ۱۶ ڈالر
۳ ۱/۲ ڈالر
۳ پونڈ

۲۲۔	۲۳۔	۲۴۔	۲۵۔	۲۶۔	۲۷۔	۲۸۔	۲۹۔	۳۰۔
۳۱۔	۳۲۔	۳۳۔	۳۴۔	۳۵۔	۳۶۔	۳۷۔	۳۸۔	۳۹۔
۴۰۔	۴۱۔	۴۲۔	۴۳۔	۴۴۔	۴۵۔	۴۶۔	۴۷۔	۴۸۔
۴۹۔	۵۰۔	۵۱۔	۵۲۔	۵۳۔	۵۴۔	۵۵۔	۵۶۔	۵۷۔
۵۸۔	۵۹۔	۶۰۔	۶۱۔	۶۲۔	۶۳۔	۶۴۔	۶۵۔	۶۶۔
۶۷۔	۶۸۔	۶۹۔	۷۰۔	۷۱۔	۷۲۔	۷۳۔	۷۴۔	۷۵۔
۷۶۔	۷۷۔	۷۸۔	۷۹۔	۸۰۔	۸۱۔	۸۲۔	۸۳۔	۸۴۔
۸۵۔	۸۶۔	۸۷۔	۸۸۔	۸۹۔	۹۰۔	۹۱۔	۹۲۔	۹۳۔
۹۴۔	۹۵۔	۹۶۔	۹۷۔	۹۸۔	۹۹۔	۱۰۰۔	۱۰۱۔	۱۰۲۔

سید علی اکبر ایڈیٹر، پبلشر، پرنٹر، فنانس، ڈسٹریبیوٹر، چار کمان میں چھپا کر سعید آباد ۵۵۵ سے شائع کیا۔

اپنی بات

جشنِ وجہ کی ہماہمی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ وہ شدید علالت کا شکار ہو گئے اور ان کی صحت کے بارے میں تشریش ناک خبریں آنے لگیں۔ آخر موت کے لٹام ہاتھوں نے انہیں ہسم سے چھین لیا۔

دعوتِ مہمب شائستہ اور نفیس آدی تھے۔ وہ زندگی کے عاشق اور اس کے ہزار شیوہ حسن کے پرستار تھے۔ مظاہرِ فطرت ہوں یا انسان کی صنایع وہ ہر شے میں لطافت اور ندرت کے متلاشی رہتے تھے یہی حالیاتی ذوق اور احساس ان کی شاعری کا جوہر بن گیا تھا۔ یوں ان کے کلام میں تجربے کا پیچیدگی اور گہرائی نہیں ملتی۔ وہ ایک سو حق مشاہدے اور یک طرفہ احساس کے شاعر تھے لیکن ان کے ہاں ہر جذبہ بہت شیک اور لطیف بن کر شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔

کارزارِ خمیر و شراب میں وہ خمیر کے طرفدار تھے۔ انہوں نے بدی کے پھول نہیں کھائے۔ بدی اور شر سے انہیں نفور تھا۔ لیکن نفرت کے اظہار کو بھی وہ تہذیب اور شائستگی کے معیار سمجھتے تھے۔ انہوں نے نیکی اور خمیر کی مدح سرائی کو اپنا شعار بنایا۔ دعوتِ مہمب کے نزدیک خمیر اور مس میں کوئی تمیز نہیں تھا۔ ان کی مجال پرستی اپنا ایک نظامِ اخلاق رکھتی ہے۔ جس میں خیر کے لئے حین ہونا شرطِ اولین ہے۔ دعوتِ مہمب نے مجالِ مینی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ حسن کو الفاظ کی گرفت میں لائے دوام بخش دیا۔ زبان کے کوہستان میں مجھے تراشے، آوازوں کے رنگوں سے نقش و نگار بنائے۔ ایسا اور اجنبی طرح ان کی شاعری بھی ایک تہذیبی نگار خانہ ہے۔ دعوتِ مہمب کا کلام اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ اردو شاعری کا سرمایہٴ عزیز بنا رہے گا۔ دعوتِ مہمب کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس پر حسن اور شاعری ہمیشہ ماتم کناں رہیں گے۔

معنی تبسم

جدید ہندوستان میں اردو کی بقا اور ترقی کی تہذیبی ضمانتیں

یورپی قوموں کے علاوہ جو یہاں آیا وہ بس یہیں کا جو رہا۔ انہوں نے
اس ملک کو بہت کچھ دیا اور اس سے بہت کچھ لیا بھی ہے۔
اس میں مل چلاپ کش کش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف تہذیبی، معاشرتی
اور سیاسی ادارے بننے اور بگڑتے رہے۔ ٹانگاؤں نے نوادار
مٹا دیا قوم کے لیے جگہ خالی کر دی اور پیچھے ہٹ گئے۔ اسی طرح
جب دریا واٹھی قومیں آئیں تو مٹا دیا قوم نے بھی پیچھے قدم ہٹائے
اور دریا واٹھی قومیں سندھ، پنجاب، ہریانہ اور گجرات کے ایک
حصے پر پھیل کر دریاؤں کے واسطوں میں بستیاں آباد کیں جب آریاؤں
کا داڑی بڑھا تو دریا واٹھی قومیں خشکی اور تری کے راستوں سے
اڑیں، آندھرا پراش، کرناٹک، کیرالہ، شمالی ناڈو میں پھیلیں اور
اپنی جگہ آریاؤں کے لئے خالی کر دیں۔ یہ عمل صدیوں جاری رہا۔
قوموں کے احتکام سے نئی نسلیں پیدا ہوئیں۔ آریاؤں
کو لین دین میں مل چلاپ تھا وہ ان کا مشترک کام یہ روایتیں زندگی کیلئے
ضروری بن گئیں تھیں کچھ زیادہ پسند آئیں اور انہوں نے انہما تہذیبی
لسانی اور نسلی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے ایک طرف آریاؤں
کی داغ بیل ڈالی اور اپنے درون کے زردشت، مہنڈو کر لئے اور
دوسری طرف بیرونی سطح پر مختلف جاتیوں میں انہوں کو تقسیم
کر دیا، برہمنوں کو تری اور آریاؤں کو زمیندار بنائے۔ یہاں واٹھی قوموں
کو سب سے نیچا بنایا۔ ان میں اعلیٰ اور ادلی جاتیوں کے
درمیان طے جا۔ اور دیش بن کر زندگی کے مسائل
چلاتے رہے۔ اس کے ذریعہ نکلے۔
ایک طرف تو بہت معاشرہ پیدا ہوا۔ دوسری طرف

ملک کی تقسیم کے بعد سے ایک عرصہ تک جہاں اردو
پر ایک طرح کی مادی اور پرمردگی کی فضا چھائی رہی۔ کسی کو یہ
یقین نہیں آتا تھا کہ اردو ہندوستان میں باقی رہے گا۔ اس
خیال کا وجہ سے اردو کے بعض شیدائیں پر برسوں حزن و ملال
کی کیفیت طاری رہی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ ان میں سے بعض
اس کرب و اضطراب کی وجہ سے زیادہ دن زندہ بھی نہ رہ سکے
میں اس وقت بھی اردو زبان و ادب اور اردو تہذیب
کی بقا اور مستقبل کے بارے میں مختلف رائے رکھتا تھا اور
آج یہ میری یہ رائے ہے کہ اردو زبان و تہذیب کے ساتھ جدید
ہندوستان کا مستقبل اس طرح جڑ گیا ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے
کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ ذیلی براعظم کو اگر ایک رشتے
میں منسلک کرنے والی کوئی قدر ہے تو وہ اردو تہذیب ہی ہے
میں اپنے اس استدلال کو تاریخی، لسانی، تہذیبی اور سیاسی
بنیادوں پر ثابت کر دل گا۔

یوں تو آزادی کے بعد سے اب تک نامساعد حالات
اور غیر تو غیر خود اردو زبان و تہذیب کی ترقی اور اس کی بڑھتی ہوئی
مقبولیت سے اس کی تاب نہ لائی اور سمت جاتی کا اندازہ
ہو سکتا ہے۔

ہندوستان ہمیشہ سے باہر سے آنے والی قوموں کا جگہ
رہا ہے ٹانگا، مٹا، دریا واٹھی (دریا واٹھی) آریاؤں، ایرانی،
افغانی، شہساز (تاتاری)، چمن، بھیر، عرب، ایرانی
اور یورپی قومیں یکے بعد دیگرے ہندوستان میں آتی رہی ہیں

زبان مختلف مرحلوں اور یادوں سے گزر کر ایک علمی اور معیاری زبان تو بن گئی مگر اس عمل سے اس کا رشتہ عوام سے ٹوٹ گیا اور قواعد و اصول کے شکنجے میں جکڑ گئی۔ اس عقیدہ بند کے خلاف سب سے پہلے ملک کے شمال مغربی حصے میں انقلابی آوازیں بلند ہوئی اور جمہوریہ مرحلے پر پہاڑیوں نے جین مت کا غلطہ بند کیا۔ اس کے ساتھ ہی بہار کے علاقے سے گوتم بدھ اٹھے۔ جین اور بدھ متوں میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ بدھ مت نے سنسکرت کے بجائے پالی کو رجوع ہی کر لیا تھا۔ اگر جین اور بدھ متوں کا مابینا نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان دونوں مذہب والوں نے آزادی کی آواز اٹھائی تھی اور آزادی فکر اور احترام انسانیت کا درس دیا تھا۔ یہ سب صدیوں کے تاریخی جدیاتی DIOTIC TICAL عمل کا نتیجہ تھا۔ اس طرح ہندوستان کی تہذیب و دھاروں میں بہت کمی۔ ایک دھارہ تہذیبی تحفظ کی علامت بن گیا اور دوسرا دھارا ترقی و تبدیلی کی نشانی بن گیا۔ اس عرصے میں اور قریب ہی ہندو مت میں داخل ہوئیں۔ یہ قریب تقریباً سب کا سب وسط ایشیائے سے آئی تھیں۔ شا کا بھی نسلا آتاری ہی تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے ایک وسیع حصے پر اپنی حکومت قائم کی۔ ان کے ساتھ ان کی زبانیں بھی آئیں۔ ان کی زبانوں میں لچک بھی تھی اور جذبہ قبول کا خوبی بھی تھی۔ ان کی پیکارا زبان نے سنسکرت پالی اور ان سے پیدا ہونے والی ہمارا کئی زبانوں سے نئے نئے الفاظ خیالات اور محاورے اپنے اندر سمنا شروع کیا۔ اسکے خلاف جب بدھ مت پر بھی برہمنی خواریت کا غلبہ ہوا اور خود گوتم بدھ کی صورتوں کی پوجا ہونے لگی تو پالی میں سنسکرت کی طرح قواعد و اصول کے شکنجوں میں پھنس گئی اور عوام سے اس کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔

نئی قوموں کی زبانوں میں لین لین سے وسعت پیدا ہونے لگی اس کے خلاف سنسکرت اور پالی بند زبانیں بن گئیں

اور ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں نئی قوموں کی زبانیں آپ بھرنش بولی جانے لگی۔ جب ان کی مرکزی حکومت ٹوٹ گئی اور دوسری کئی نئی قومیں داخل ہوئیں تو آپ بھرنش نے علاقائی زبانوں سے میل کھا کر ایک نیا روپ اختیار کیا۔ ہر جگہ اس علاقے کی مناسبت سے ایک علیحدہ نام سے پکاری جانے لگی۔ کہیں وہ اودھی تھی کہیں پنجابی اور کسی جگہ سندھی کہلائی۔ اس علاقائی خصوصیات کے باوجود ان زبانوں کی ساخت اور الفاظ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان سب میں مشترک تھا۔ ان واقعات کے تجزیے سے چند نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ہندوستان کے تہذیبی اور فکری دھاروں کو درجہ حصول میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک دھارہ تو تحفظ کی علامت بن گیا تھا۔ اور دوسرا دھارا ترقی اور تبدیلی کی نشانی بن گیا تھا۔ اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں زبانوں سے تہذیب و سیاحت کا رشتہ بہت قریبی اور گہرا ہے۔ کبھی تو ایک تہذیب ایک نئی زبان کے بنانے کا سبب بنی ہے اور کبھی ایک نئی تہذیب ایک نئی زبان اور نئی سیاسی وحدت کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ زبان و تہذیب ایک دوسرے کو اس طرح متاثر کرتے ہیں کہ اس سے زبان میں وسعت اسلوب میں دلکشی اور ادب میں ترقی تہذیب میں تاب و توانائی پیدا ہوتے ہیں۔ قیسرا اہم نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر دو جیا کہ عام خیال ہے سنسکرت سے نہیں بنی بلکہ اس کی نشکلی میں آپ بھرنش کی تعمیری اور انقلابی روح کار فرما رہی ہے اور دو کے مورخوں نے اس کے تہذیبی پس منظر پر بہت کم توجہ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخیں ناممکن نہیں آتے۔ صردور ہیں۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے یہاں ایک نئی طرز فکر کا آغاز ہو چکا تھا۔ شمال مغربی علاقوں میں تاتھ و تہذیبوں کا زور تھا۔ اس تحریک کی دو خصوصیات ہمارے نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں

بہل جول سے بننے والی ان گھر ٹونکی ترقی پذیر زبان کو اپنا لیا تھا۔ دوسرے مسئلہ یہ جا کے وہ مخالف تھے۔ اس طرح نئے عقاید اور افکار کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہاں کے مقامی باشندوں نے میل جول اشتراک و تعاون کی نئی راہیں نکال لی تھیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ معاشرتی تہذیب اور سالہ ارتباط و اختلاط سے دو تین سو سال کے اندر قدرتی طور پر نئی زبان کا بیڑا تیار ہو چکا تھا۔ اس کا دوجی روح عصر، انجانی فکر اور اشتراک و تعاون کے جذبات سے ملوث تہذیب سے بندہ گیا تھا۔ آئندہ دور میں اردو زبان کی آبادی ان ہی سورتوں سے ہوتی رہی۔ ہندوستان پر جب آل سبگتین کے حملے شروع ہوئے تو اس وقت تک یہ ملک سیاسی افزائری کا شکار ہو چکا تھا۔ آپسی لڑائیاں عام ہو گئی تھیں برہمنوں نے ماجھرتوں سے ایک قسم کا کجوتہ کر کے انہیں اپنے معاشرہ کا ایک جزو بنالیا تھا تاکہ وہ حکومت اور ملک کی مدافعت کی ذمہ داری نبھال سکیں۔ لیکن وہ خود آپس کے جھگڑوں کا دھبہ سے چھٹی چھٹی ریاستوں میں بٹ گئے تھے۔

اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ محمد غزنوی نے اپنی فوج میں ہندوستانی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد شامل کر لی تھی ان کی چھاد پھاں غزنی اور اس کے نواح میں ہندوستانی طرز پر تعمیر ہوئی تھیں۔ ان کی زبان آپ بھرتش تھی جس پر علاقائی اثرات پڑے تھے۔ اور پراگرتی زبانوں کے بے شمار الفاظ پہلے ہی شامل ہو چکے تھے۔ غزنی کی زبان فارسی تھی لیکن اس میں بے شمار عربی اور ترکی الفاظ داخل ہو چکے تھے۔ ہندوستانی فوجیوں نے اپنی زبان میں فارسی ترکی اور عربی الفاظ غیر شعری طرز پر داخل کرنا شروع کیا جب پنجاب سندھ ملتان اور میرٹھ اور نواح دہلی تک کے علاقے اس کی سلطنت میں داخل ہو گئے تو اسی رواج کو اور تقریت پہنچی۔ اس طرح ہندوستانیوں کی زبان کی اس پر ایک نئی زبان جس کا ڈھل پہلے ہی سے ڈالا جا چکا تھا زیادہ ٹھکر بننے لگی۔

اس سلسلے میں چند باتیں مطلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ

ان نئی زبان کے بننے والے ہر علاقے میں ہندوستانی تھے۔ یہ لوگ ابتدائی طرز فکر کے حامل تھے۔ اردو زبان کا ساخت اور اس میں ہندوستانی زبانوں کے الفاظ کی بہتات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی ترک ایرانی یا عرب اس زبان کو بناتا تو اس کی ساخت اور لہجہ بچھا ہوتا۔ بلکہ اس کی ساخت ترکی عربی یا فارسی زبانوں جیسی ہوتی۔ پنجابی گجری اور دکنی زبانوں کے مطالعہ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ عربی فارسی اور ترکی الفاظ کا ابتدا بالکل بدلا ہوا تھا۔ ع کی جگہ الف، ط کی جگہ ت اور ص کی جگہ س، ق کی بجائے ک کا استعمال عام تھا۔ غرض اس طرح کی اور مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ اس سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستانی زبانیں برلنے والے ہندوں نے عربی فارسی اور ترکی الفاظ کو اپنی زبان میں داخل کر لیا لیکن اس کا احلا اور لہجہ نہیں لیا۔

شمال مغرب سے آنے والے مسلمانوں میں ترکوں کا غلبہ تھا زندگی کے ہرے میں ترکوں کا نقطہ نظر اثباتی تھا۔ انہوں نے جدت سے کام لیا اور مقامی جدت پسندوں سے اشتراک عمل کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی نئی چیزیں عالم وجود میں آئیں ترکوں میں وقت نظر تھی وہ دوسروں کی اچھی چیزوں کو اپنانے میں کمال رکھتے تھے۔ امیر خسرو ان ہی جدت پسندوں میں سرخسرت ہیں۔ انہوں نے بے خدشا بجا دیں محض اس وجہ سے کہیں کہ وہ بزرگندگی پر بھی نقطہ نگاہ رکھتے تھے۔ اردو زبان و ادب اسی اثباتی اور تعمیری نقطہ نگاہ کا بہترین حاصل ہے۔ اسی مجدد حار سے اردو تہذیب نکھرتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو زبان کی تشکیل ہی میں ایک خاص طرز فکر اور نقطہ نگاہ کو دخل رہا ہے۔ اس طرز فکر اور نقطہ نگاہ کی تعمیر اردو زبان کا عالم وجود میں آنا ممکن نہیں تھا ایک اور بات یہ بھی گرہ میں باندھ رکھنے کے قابل ہے کہ ترک مسلمانوں کی نظر اسلامی تدریوں پر اس کے ظاہر سے زیادہ تھا۔ چنانچہ وسط ایشیاء سے ہندوستان آنے والے صوفیوں نے

اس ملک کے مختلف حصوں میں جو گراں قدر کارنامے انجام دیے
ان کا ذکر تفصیل حاصل ہے۔

ان صوبوں نے سب سے پہلے اردو زبان کو اپنایا
اس کی وجہ سے یہ تھی کہ یہ عوام کی بولی تھی۔ عوام کی بولیاں
پہلے حد قوت و اثر رکھتی ہیں اردو زبان کی تشکیل ہندوستانی
تہذیب کے اس دھارے کے مطابق جوتی ہے جو ترقی پزیر
اور صحت آفرینی کی جان بخش خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کا
رشتہ عوام کی جدت، قدرت اور قدرت سے بندھا ہوا ہے
اردو زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے درباروں میں بار بار
ادب و شاعری اور عالموں کے علم و جگر سے سیلاب ہونے
اور ان کے جوش و خروش اور دلوں سے فیض پانے کے باوجود
عوام سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا اس کے مقابل پہلے یہ بات
قابل غور ہے کہ سنسکرت اور پالی عالموں اور قواعد اللہ کی ہر پرتی
سے ایسی پرست ہوئی کہ ان کے ہاں عوام سے تعلق رکھنا ایک
عیب بن گیا اور اس طرح وہ بندہ زبانیں بن گئیں اور عوام کی
مقبولیت سے محروم ہو گئیں۔ اس کے خلاف 'ادیوں' عالموں
اور شاعروں نے اردو زبان کی ترغیب و ترغیب کٹر حیوت کے
ذریعہ جو اصلاحیں کیں اس کا چلن اسی وقت عام ہوا جب کہ
عوام نے نکال میں ہر قول ثبت کی۔ جن پر یہ بہت نہ
ہوئی وہ الفاظ و محاورے ترکیبیں چلن سے خارج ہو گئے۔

اردو زبان کی یہ بھی خوبی ہے کہ اس کو تھالی سے جس
قدر ملا۔ اس نے اس سے ناگہ اٹھایا اس سلسلہ میں دکن
سلطنت کی ابتداء اور دکنی زبان و تہذیب کے فروغ اور
اسی دور کے مختلف ادبی تجربوں کا ذکر نہ صرف دلچسپ ہے
بلکہ میر سے اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے ضروری
بھی ہے۔

محمد تقی دلی میں سربراہی سے سلطنت ہوا تو اس
وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کی حکومت کئی مرحلوں
سے گزر چکی تھی دلی تاتاریوں کی زد میں تھی مسلمانوں کی کڑی

خلافت کمزور رہی تھی۔ محمد تقی پر ضرورت پسند عالموں
کا دباؤ تھا۔ اس بیدار مغزوں ان میں ہلاکی جدت اور جدت
تھی ایک جدت خیال یہ تھی کہ ایسی سلطنت کی داغ بیل
ٹولی جائے جو مقامی افکار اور عوام پر قائم ہو، مقامی باشندے
اس میں شریک رہیں۔ اس سے پہلے افشاری نے ایک گز
عاشی حلیہ سے حلیت محض اس لئے حاصل کی تھی کہ ہندوستانی
حکومت کو سنبھال جائے۔ لیکن محمد تقی نے ملکی افکار اور
عوام پر سلطنت قائم کرنے کا پہل کی اس کو دلی کے علماء نے
سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ علماء کے حلقہ اثر
سے دور تاتاریوں کے حملے کا رد سے باہر دولت آباد میں
ایک نئے دار الخلافہ کا نئے عوام اور مسلمانوں کے ساتھ
بناد رکھی جائے۔ اس طرح ایک نئی طرز فکر کا آغاز ہوا
یہ منصوبہ یوں پورا ہوا کہ اس کے امراء نے عوام میں کٹر
الہی قہیلوں کے ترک تھے دکن میں پہلی سلطنت قائم
کی اور گجرات میں نظر حال نے ایک آزاد مملکت کی بنیاد رکھا
امراء صده ترک تھے وہ تلخیز ہی کے زمانے سے دکن کا
طرف آنے لگے تھے جلال الدین خلجی کو وہ ترک نہیں مانتے
تھے ان کا ایک بہت مضبوط انتظامی نظام دکن میں قائم نہ
تھا۔ دکن کی طرف رخ کرنے والے امراء کے ساتھ صوفیوں
دریشوں اور اہل حرنہ کی ایک بڑی تعداد بھی تھی۔ ان
ساتھ ان کی زبان اردو بھی تھی۔ اردو نے دکن پہنچ کر ایک
سلطنت کے ساتھ آزاد فضاؤں میں فروغ پایا۔ جس نے
خیال نے ایک نئی سلطنت کا آغاز کیا تھا اسی قدرت نے
لے اور زبان کو درباری مرتبہ دیا اور یہ فارسی کی بجائے علم
ادب اور انشا کی زبان بن گئی۔ یہی حال کم دیش گجرات
کا ہوا۔ اردو دکن میں دکنی کے نام موسوم ہوئی اور گجرات
میں گجراتی۔ جس طرز فکر کو عام طور پر دکنی تہذیب
نام دیا جاتا ہے وہ دراصل ہی نہایت فکری ہے۔ اس کے
دکن میں ملنے میں اور گجرات میں بھی۔ یہ زبان شہل آباد

دکن و مہجرات میں مشترک بن کر تیزی سے ترقی کرنے لگی۔
 صوفیوں نے اسے دلیل کو حاکم کرنے، اخلاق کو سنوارنے
 اور ایمان کو پختہ کرنے کا کام لیا۔ توانائی کو سیکھنا اور شاعری
 و رباعی کا دوبارہ اور زندگی کے عام معاملات کا وسیلہ بنی۔ اس
 میں تاب و توانی بھی پیدا ہوئی اور دھرت و گہلا بھی جب گہرا
 کوغلوں نے فتح کر لیا تو یہاں کے ادیب شاعر عالم صوفی دکن کی
 طرف نکل آئے۔ دکن کی پانچوں سلطنتوں میں اردو برابر
 ترقی کر رہی تھی۔ اردو زبان و ادب پر دکن کی سرزمین میں ہندوستانی
 روایات، اشعار، اساطیر، راگ، رانگینوں اور سُرلوں کا
 اچھا اثر پڑا، تاہم پختہ، بگڑتوں اور ترنگ وادلوں کی فکر
 اور عقیدہ کے آثار اس میں ملتے ہیں۔ بھجوں کے پتہ جو مخصوص
 راگ، رانگیاں تھیں ان کے ساپنوں میں شعر و سخن لگے۔
 قاضی محمد ریائی کا کلام اس خصوصیت کا حامل تھا۔ مختلف
 راگ، رانگینوں اور سُرلوں کے مطابق ترتیب پایا تھا۔ عرب
 محمد حشمتی نے خوب ترنگ میں عرب و عجم کا سسٹم بنانے کا
 ایک نیا تجربہ کیا۔ یہ روایت آج مل کر دکن کی شاعری اور ادب
 کے مزاج کو بدلنے کا باعث بنی۔ اس سبب پر ایسا محسوس
 ہوتا ہے کہ ہندی روایات اساطیر و مزیات و مزیات سے
 سیر ہو کر اردو ایک نئے سرچشمہ کے لیے بے چینی تھی۔ محمد ریائی
 اور کام و مہنی کی زبان و بیان نے آئندہ کے ارتقا کے لیے نئے
 راستے کھول دیئے۔ جب مہجرات کی سلطنت ٹوٹی تو اس نیا
 و بیان نے دکن پہنچ کر نیا لکھا رہا پیدا کیا۔

اس سلسلہ میں گوکنڈہ اور بیجاپور کی ادبی خصوصیات
 کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ گوکنڈہ فارسی روایات کا
 نمائندہ بنا۔ اس میں ہندی کا وسیلہ اور رچا و سحر ہوا تھا۔
 بیجاپور ہندی روایات کا حامل تھا اور ایک لڑیل عرصہ تک
 ہی رہا۔ برقرار رہی۔ لیکن غلامی کی سعادت کے بعد
 گوکنڈہ کی فارسی روایات کو قبولیت ملنے لگی۔

دکن میں اردو چھٹی دہائی اب کے ارتقا اور ادبی

تجربوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ
 دکنی زبان میں ہندی کے بوجھل اور ان گھڑ الفاظ کو اس میں چھکار
 اور سببوں لفظوں اور لہجوں میں ڈھال دیا جاتا ہے۔ اس طرح
 زبان شستہ اور ہرکار بنتی جاتی ہے۔ اردو ہندی روایات،
 مزیات، مزیات، راگ، رانگینوں اور سُرلوں سے آشنا
 ہو کر اور نکھر آتی ہے۔ اس کے قالب میں اب فارسی روح ڈالی
 ہو کر ایک نیا شکار اختیار کیا گیا ہے کہ اس میں ایک نئی
 دلکشی اور حسن پیدا ہوا ہے۔ اس کا اسلوب بیان اور
 بھی پُر و تار بن جاتا ہے۔

ہر چند دکنی تہذیب کا فروغ دکنی کے پانچوں سلطنتوں
 میں ہوا لیکن اس طرز فکر کو دکنی کی حدوں میں بند کر دینا اس
 کی عظمت کو گھٹا دینے کے مترادف ہے۔ سیاسی بند بندن نے
 ابھرتی ہوئی لہروں کو کچھ عرصہ کے لیے رک رک دیا تھا۔ لیکن
 جب اورنگ زیب نے دکن فتح کر لیا اور اورنگ آباد کو
 اپنا مرکز بنالیا تو یہ لہریں دکن سے اٹھیں اور اورنگ آباد میں
 جذب ہوتی رہیں۔ اور پھر ایک مرتبہ اورنگ آباد دکن اور
 شمال میں ارتھاط پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوا۔ اورنگ آباد
 کو اردو تہذیب کے بنانے سنوارنے اور ٹوٹے رشتوں
 کو جوڑنے میں ایک خاص حیثیت حاصل رہی ہے۔

اورنگ آباد کے ارتقاء میں دکن کا حصہ بنیاد کی اہمیت
 رکھتا ہے۔ اس نے ہندوستان کی سرزمین سے وہ سب
 کچھ حاصل کر لیا جو یک رنگی، جہتی ترقی، شیرینی اور اثر و نفوذ
 کے لیے ضروری تھا۔ دلی کے بعد شمال و جنوب کے رشتوں
 کے پڑ جانے کی وجہ سے ریختہ کا دور شروع ہوا تو وہ سب
 کچھ جو جنوبی ہند کے ادبی تجربوں کا حاصل تھا۔ ریختہ کا حصہ
 بنا اور یہاں سے اردو ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا
 ہے۔

اردو زبان اور ادب کا جدید دور نور محمد رحیم کالج
 سے شروع ہوتا ہے۔ دلی کالج، علی گڑھ سائنٹفک سائنس

اور سب سے زیادہ اس کے زور میں مدد پرستی تھیں۔ ان خصوصیات کو کہ اس طرح اپنا یا کہ اردو میں ان کی اصیلت کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان تخلیقی خصوصیات کی بھی حامل ہے۔ اس نے نہ صرف دوسری ہندو جوں کو اپنا یا اور باہم مربوط کیا بلکہ بعض نئی خصوصیات کا تخلیق بھی کی۔ اس کے تخلیقی کارندے ڈرٹ ولیم کالج، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ کی صورتوں میں جلوہ گر ہوئے۔ اردو کا جدید دور مشرق و مغرب کا سنگم ہے جدید حالات میں ان عظیم طرز پر معلومات میں اضافہ اور نئے نئے کاتریت ہوئی۔ اس طرح ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

ڈرٹ ولیم کالج، علی گڑھ کالج سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی بدولت ایسے روشن خیالی باخ نظر صاحب بعیت پیدا ہوئے اور باخ صاحب کر دار آزاد پیدا ہوئے کہ سائے جنت میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ ڈرٹ ولیم کالج علی گڑھ اور انڈین سائنٹفک کالج لاہور نے دینی اور مطالعہ کی کتابوں کی ذہنی کام کام انجام دیا اس سے ہمارے ادب میں حیض پہلا خاں ہوا۔ سائنٹفک سوسائٹی دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ نے اردو زبان میں علوم و فنون کا اضافہ کیا۔ اس طرح علوم و فنون جو غیر اردو ناظرین میں زبانوں میں صدیوں سے بند تھے وہ آزاد ہوئے۔ علوم و فنون کے ایک نئے اسلوب اور طرز بیان کا اضافہ ہوا۔ زبان سائنٹفک بنی۔ ڈھرت زبان لہجہ ادب اس سے متاثر ہوئے بلکہ ہماری فکر کے سہانے بھی بدلے ہماری تخلیقی صلاحیتیں ابھریں۔ ہم کو اس طرح کچی آزادی میسر آئی اور فعال کی لعنت سے بچ گئے۔ زبان اپنی خودی اور ذات کو پہچاننے کا ذریعہ بنی۔ ہماری شخصیتوں میں نکلا گیا۔ غلامی سے ہماری امتیاز بڑھیں۔ کام کرنے اور آگے بڑھنے کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس پس منظر میں اقبال ہندوستان کے انق پر نمودار ہوتا ہے۔ غالب پر سید جمال اور سبیل کے بغیر قزاقان کا نمودار ہوا لیکن خاندان ہی وہ

اردو زبان میں سادہ اور دزمرہ لکھنے کا ڈھنگ شروع ہوا۔ عقیقی اور سبھی بدلت حرکت کر دیا تھا۔ جدید طرز پر لغت اور قواعد تیار ہوئے لکھنے کے سکھ اور لغت کی تحریک ضرور اٹھی لیکن پتہ نہ سکی۔ اردو زبان کی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ لغت اور سکھ سے پاک ہے۔ وہ تحریک جس کے زیراثر عربی فارسی کے بے شمار الفاظ لئے گئے تھے بلکہ ان کا تلفظ بھی عربی اور فارسی قاعدہ کے مطابق ہونے لگا تھا چند روزہ ثابت ہو گیا۔ یوں بھی یہ تصنع اور سکھ اردو مزاج کے مطابق نہ تھا یہی حال لکھنے کی شاعری کا ہوا۔ نتائج بدلتے پیر اکھٹے کی خوشن میں لکھنے نے جو غلو کیا تھا وہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ الہی ان خوشن سے اردو زبان کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس کے اسلوب میں چاہا بھی معنویت پیدا ہو گئی اور زبان کی تراش و تراش اور کثرت پخت کے بعد چند ایسی مفید اصطلاحیں ہوئیں کہ اس سے زبان اور بھی شستہ اور پاکار بن گئی۔

جس زمانے میں اردو زبان میں یہ تحریک اٹھی تھی وہ دراصل ایک دور انحطاط تھا۔ ایک زندہ قوم کی الوداعی ولولہ انگیز خیالات کا فقدان تھا۔ جب دل اور لکھنے کے دربار اٹھ گئے اور سید نے قوم کی قیادت کا بیڑا اٹھا یا تو سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اردو زبان و ادب اور تہذیب میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ اور ان میں ایسی تازگی اور رونق پیدا ہوئی کہ ایک مختصر سے عرصے میں اردو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کا ہم پل بن گئی۔ اردو زبان کو ہندی فارسی اور ترکی کی طرح انگریزی زبان اور انکار سے بھی فائدہ پہنچا جو کہ اس میں رائج آفرینی INTEGRATION کی مثالیں بدرجہ اتم موجود تھیں اس نے دنیا کی مختلف تہذیبوں سے ایسی خصوصیات لیں جو اس کے مزاج کے مطابق تھیں

آئندہ آنے والی نسل کو کوئی جان بخش پیام دے سکا تھا۔ میں نے اپنے مقالے میں صرف اردو زبان و ادب کی چند تحریکوں کا ذکر کیا ہے۔ صوفیوں کا ذکر وہ بہت ہی سرری ہے۔ اہل فکر اور اہل رائے جنہوں نے اردو ادب کو متاثر کیا۔ کم جگہ پاسکے۔ صوفی نثر میں ایک طویل سلسلہ ملتا ہے جنہوں ہمارے ادب اور تہذیب کی تدریج کی بڑی جاں فشانی سے حفاظت کی ہے۔ اس کے ذریعہ کے لئے اپنا سوز و گداز دیا ہے اردو تہذیب کی تدریج نے ہماری ذات میں ایک قلندرانہ شان پیدا کی ہے۔ ان کے بغیر ہم بے نفسی اور بے باکی کی ان فطرت کو چھو نہ سکتے۔ اور نہ ہی علم و مجاہدے کا آزمائشوں سے گزر کر نکھرتے۔ رواداری، بردباری، تحمل اور صبر کی دولت سے ان ہی کی بدولت ہم مالا مال ہوئے۔ تعصب اور تنگ نظری کے جھبیل سے پاک رہے ہیں۔ ہمارے دلوں میں ان ازل کی خدمت گزاری، ملت و قوم کی تعمیر، ملک کا ترقی کے جذبات اور انگلیں بیدار ہوئیں یہ سب کچھ اردو تہذیب کی دین ہے۔ انگریزی دور حکومت کا اثر دوسری علاقائی زبانوں کی بنیاد پر اردو زبان و ادب اور تہذیب پر کم پڑا ہے اس میں انگریزی اور یورپی تہذیبوں سے تعمیری عناصر ضرور جذب کئے ہیں مگر دوسروں نے یا تو انگریزی اثر کو ایسا قبول کیا کہ وہ اپنی ذات اور خودی سے غافل ہو گئے اور تعالیٰ کی یا پھر ماضی کی طرف لوٹ گئے۔ یہ وہ فوجی قہوں کی ترقی کے لیے سفر ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے غیروں کے علم و حکمت و صفت و معرفت کو اس طرح دیکھا کہ دوسروں کی زندگی میں جو نادر پیدا ہوا تھا اس کے لیے بھی شکار ہو گئے۔ اردو تہذیب میں اس نادر سے بچنے کا خوب علاج ملتا ہے۔ یہ خصوصیات اس کے کامیاب مستقبل کی ضامن بھی ہیں۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ جدید ہندوستانی کی تعمیر ترقی کے کیا تقاضے ہیں اور وہ اس کام میں کئی مرحلوں سے دوچار ہے۔ ہندوستان میں پہلے تو بنو کا ایک گمشدہ اور پھر مسیحی مذہب سے ہے۔ یہ مختلف تہذیبوں اور قوموں کی ہدایات کا ایک حسین موقع ہے۔ جدید ہندوستان کے اساسی دستور کے بنیاد میں ہمارے بزرگوں نے چند اہم چیزیں رکھے ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ دستوریات ان لوگوں کے ذریعہ جو خیالات، خیالات اور تصورات داخل کئے ہیں اور بندھے ادوار کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ وہ ہندو کے لیے غیر مالوکس ہیں ان کے عقائد و ملک کے تصورات اور تخیلات سے ہونا لازمی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ہندوستان میں جمہوریت ملکی روایات اور خیالات خاصہ ذات پات کے جھگڑوں کا دھبہ سے ایک خاص نچر ہا چل رہی ہے۔ اس کی بنیادیں ابھی تک مضبوط نہیں ہو سکی اس کے ساتھ ہی ساتھ مختلف اسباب کی بنا پر ملک لسانی بنیادوں پر تنظیم جدید ہوئی لیکن اس سے نئے مسائل بھی پیدا ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہندوستان کی تاریخ شاید کہ یہاں کی سلطنتوں اور محو ترقی کے بننے اور جڑتے پر ہمیشہ زبان و تہذیب اثر انداز ہوئے ہیں۔ لیکن میں ہمیں ہا لسانی بنیادوں پر تنظیم ہوئی تو اس سے خود ہمیں سلطنت کے ٹوٹنے اور لسانی مہربان کے آزاد ہونے کا راستہ کھلا جب کبھی ہندوستان میں مرکزی حکومت کمزور ہوئی تو اس اور لسانی جذبات ابھرے اور انہوں نے اپنی چھٹی چھری سلطنتیں قائم کر لیں۔ ہندوستان کے جدید دستور کا تو یہی تھا کہ لسانی بنیادوں پر ملک کی تنظیم ہوئی لیکن اسے ہندوستان کی عظمت اور وحدت کو دوچکانہ لگتا۔ اس وقت جو علاقائی تحریکیں اُٹھ رہی ہیں ان کا یہ رجحان قوی ہوتا جا رہا ہے۔

ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے ایک دور کے فرقے سے ہندو کو اردو کے مقابلے میں قومی زبان بنادیا۔ تاریخی فیصلہ ہندوستان کی عظمت اور وحدت کے لیے مفید تھا یا نہیں اس کا صحیح اندازہ تو صرف مستقبل کا مرآ

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ جدید ہندوستانی کی تعمیر ترقی کے کیا تقاضے ہیں اور وہ اس کام میں کئی مرحلوں سے دوچار ہے۔ ہندوستان میں پہلے تو بنو کا ایک گمشدہ

کہے گا۔ لیکن گذشتہ تیس یا بیس سال میں ہندی کو قومی زبان بنانے کے فیصلہ سے جو سانگے پیدا ہوئے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صحیح خطہ ہندوستان میں ہر ہاے اہل تہندی والوں نے اپنا رشتہ سنسکرت سے اتنا قریبی اور گہرا جوڑ لیا ہے کہ ہندی رفتہ رفتہ سنسکرتی روایات میں ڈھل رہی ہے۔ اور وہ بنی دور نہیں کہ ہندی بھی سنسکرت کی طرح ایک ہندو زبان بن جائے گی اور اس کو صرف ہندی بھجور کرنے والے اور اصطلاحیں بنانے والے ہی سمجھ سکیں گے نہ تو زندگی کی اسنگوں سے اس کا کوئی تعلق ہوگا اور نہ ہی ہندی محبت راجہ دلی کے جذبات سے متاثر ہو سکے گی۔ خود ہندی ریاستوں میں بھی صرف ہندی بنڈت ہی اسے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ بول چال سے بھی اس کا رشتہ ٹوٹ رہا ہے اگر ہندی والے اپنے طریقے بدل ڈالیں تو پھر اردو ہندی کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ اور ایک ہی زبان کے دو روپ ہونگے ورنہ مجھے ڈر ہے کہ رفتہ رفتہ موجودہ ہندی سنسکرت اور پالی کی طرح کتابوں میں بند ہو جائے گی۔ پالی پہلے ایک عوام کی زبان تھی لیکن جب اس نے سنسکرت کی طرح علم و دانش کی اصطلاحوں اور قواعد کی بندش میں اپنے آپ کو جکڑ لیا تو عوام سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا اور وہ ایک کتابی زبان بن کر رہ گئی۔ ہندی والوں کو اس مثال پر کھلے دل سے غور کرنا چاہیے۔

ہندی والوں نے سنسکرت روایات کو جو تحفظ کے جذبات سے ملو ہے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے اس سے ہندی والوں کے ڈر اور کمتری کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح تحفظ کی یہ تحریک ہندوستان کا تہذیب کے دوسرے دھارے یعنی ترقی اور تبدیلی کے جان بکشن احوال سے اس طرح متصادم ہو گئی ہے کہ اس کے جینے کے لئے پڑ جائیں گے۔ یہ سب کچھ ہندی والوں کی کم نظری اور تاریخی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ تصنیف اور عقلی

سے زندگی میں تاؤ کی نہیں آسکتی۔ اردو والوں کو اس سے سبق لینا چاہیے اور سانگے اور ہمسائی کو اپنا نشانہ راہ بنانا چاہیے اور ماضی کا بجائے مستقبل پر نظر رکھنا چاہیے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں یہ نکتہ کرنا کو شش کی ہے کہ ہندوستانی تہذیب کے دو متصادم دھاروں میں اردو نے ترقی و تعمیر نو اور انقلاب کے دھارے کو اپنا لیا ہے۔ اور یہ بات اس کا سرشت میں اس طرح داخل ہے کہ اردو کو ان سے الگ کیا جائے تو اردو کی ہیئت اور اس کا مزاج ہی باقی نہیں رہ سکتے جذبات و کشش ہٹ کر ایک میٹھا میٹھا اور لین دین محبت اور اخلاص کی بجائے اور یکسر عجیب و غریب اور کٹھن میں پڑی ہیں۔ اہل کامزاج ہی ان عناصر ترکیبی سے بنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ تیس سال کے دوران اردو دشمنی ہم سرپرستی اور اپنوں کے بے رحمی اور سہلی کے باعث زندہ اور سلامت ہی نہیں بلکہ باکرامت بھی رہی ہے۔

اردو والے ایک اور حقیقت کو بھی بھول بیٹھے ہیں۔ اردو بولنے والے اردو ادب کے شہساز ہیں اور اردو تہذیب کے برتنے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مختلف ملکوں میں اردو زبان اور تہذیب کے قلعے ملے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذوق کی تسکین یا اپنی ضروریات کی تکمیل اور اپنے بچوں کی تعلیم سہولت کے غرض سے اردو زبان و ادب کی انہیں بنا رکھی ہیں۔ ہاں اردو تحریکیں کا رخ بین الاقوامی ہونا چاہیے۔

بین قومی سطح پر ایک اردو دانش گاہ کا قیام وقت کا کام ضرورت ہے۔ ہماری اردو سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کام پر قومی توجہ کریں اور ایک بین قومی اردو کانفرنس کے ذریعہ اس تحریک کو پروان چڑھائیں۔ ایسی جامعہ کے بنانے میں بے شمار احتیاطیں ملحوظ رکھنی ہوں گی تاکہ یہ عصری ضروریات کو پورا بھی کر سکے۔ یہ معزین بجائے خود ایک غلط موضوع ہے۔ گذشتہ چند دنوں سے اخبار سیاست میں سنا ہے کہ پرمیش پل رہا ہے کہ مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم کا ذریعہ اردو یا انگریزی۔ یہ بحث میری نظر میں بعد از وقت ہے۔ برہنا

کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر فرد کو کام کرنے کا موقع ملے۔ اور ان کو کام میں کامیاب اور کامرانی کی مسرت بھی حاصل ہو، ہر مصلحت انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کو رو بہ کار لائے اس لیے ایسے مواقع فراہم کرنا محبت اور اتحاد کو بڑھانے کا ایک اچھا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

اردو دالوں کو یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اردو صرف ملازموں ہی کی میراث نہیں ہے۔ دوسرے مذہب کے اردو دوستوں کو قریب کرنے اور ان کی طرف تعاون اور دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے مواقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

اردو اعلیٰ خیالات انقلابی عزم، تعمیری امور، تخلیقی جذبہ، جدت و ندرت کی اسگوں کے سہارے ترقی کرتی رہی ہے۔ اگر ہم اردو کو زندہ رکھنے اور ترقی کرنے کا سامان ہم بیچنا ناچا، ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ہم اعلیٰ افکار، بصیرت افروز خیالات اور انقلاب آفرین دلولوں اور جدت پسند اسگوں سے اردو ادب کا دامن بھریں تاکہ دوسری زبانوں والے اردو کو اس کے اعلیٰ اور ارفع تخیلات اور افکار کی وجہ سے پڑھنے پر مجبور ہوں اور خود اردو دالوں میں زندگی کی تازگی اور تنوع برقرار رہے۔

بغیر عمل کے خوش کن خیالات اردو کے مزاج اور کردار سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ہندوستان ہمارا ملک ہے۔ اس کی ترقی تعمیری اور خوش حالی سے ہم کو طمانناؤ ہے۔ اردو والے ہندوستان کے کسی ایک علاقے میں بند نہیں ہیں۔ اس لیے ملک کی یکجہتی اتحاد و ترقی سے اردو دالوں کی دلچسپی فطری بات ہے۔ اس کو نظر انداز نہ کیجیے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ علاقائی زبانوں اور ان کی اسگوں سے بھی ہمدردی دلچسپی لینا ضروری ہے۔ تاکہ آپ کو ان سے علحدگی کا احساس نہ رہے۔ یہ سب کام بہت استقلال و متانت اور ہمدردی سے سرانجام دینے کے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وقت کا ایک چمنی (CHALLENGE) کو کھیلے گا۔ اردو اس کیلئے ہر قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

••

پہلے ہی یہ بات مسلح ہو چکی ہے کہ بچوں کی انفرادیت اور شخصیت کا کلی تشدد تھا اور ان کی اپنی شناخت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تہذیبی ورثہ سے کما حقہ واقف ہو سکیں تاکہ ان کی اپنے تہذیبی ورثہ میں اضافہ کرنے کی بھی صلاحیت ہوتی چاہیے۔ سچے ہم نے ان تعلیمی اداروں کی حد تک جو ہماری رہنمائی میں چل رہے ہیں۔ بہت غم و غصہ کے بعد ایک سانی پالیسی بنائی ہے۔ ہرگز نزدیک موجودہ حالات میں یہ سانی پالیسی بہت ضروری ہے۔ اور چند سال کے تجربے کے بعد ہم اس کو اپنانا بخش بھی دیتے ہیں۔ ہمارے اداروں میں ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا مادری زبان سے کما حقہ واقف ہو، اس میں ادبی اور علمی زبان کے سمجھنے اور اس معیار پر لکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی چاہیے تاکہ وہ نہ صرف ادبی، علمی اور تہذیبی ورثہ سے واقف ہو سکے۔ بلکہ اس میں اضافہ بھی کر سکے۔ یعنی اس میں اس معیار کی زبان کے لکھنے کی بھی صلاحیت ہوتی چاہیے۔ جہاں تک قومی زبان کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق اردو دالوں کے لیے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ یعنی ہندی اردو کا ایک لازمی جز ہے۔ ہندی کے بغیر اردو کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہندی کا اتنا جاننا ضروری ہے کہ وہ بآسانی قومی ضرورتوں کی تکمیل کر سکے۔ علاقائی زبان کو دفتری اور کاروباری اغراض کے لیے سیکھنا ضروری ہے۔ انگریزی یا کسی جدید مغربی زبان میں سائنسی اور ٹیکنالوجی کے سطح پر مہارت پیدا کرنا چاہیے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسلیں نئے نئے شعبوں میں کام کر کے اپنا نام پیدا کریں، ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مجھے امید ہے کہ میری صاف گوئی پر مجھے معاف کیا جائے گا۔ اردو کے ادراک کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اپنے کاموں کے میدان اس طرح متعین کریں کہ وہ ایک دوسرے سے متصادم نہ ہوں بلکہ مشترک نقطہ نظر کا وہ تہذیب کے شعبے میں کام کرتے رہیں۔ اور کام کرتے دالوں میں اتحاد و تعاون بڑھ سکے۔ شخصی مفاد اور آقا کے نگاہ ہونے نہ دیں جو ہر

انشائیہ

میں اصول و ضوابط نقش پا کے وہ نشان ہیں جو فن کار اپنی تخلیقی منزلیں طے کرتے ہوئے چھوڑ جاتے ہیں۔ انشائیہ کی تعریف کرنا اپنی ناکامی کو دعوت دہ ہے لیکن ناکامی کے خوف سے کچھ نہ کرنا ناکامی۔ بدتر بات ہے یوں بھی ناکامی کو نباہ لیا جائے تو ناکامی سے کام لینے کا سلیقہ آ جاتا ہے یہ بہر حال (ESSAY) کا لفظ انگریزی میں اب کافی وسیع معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ بنیادی طور پر اس کے معنی کوشش و کاوش کے تھے۔ شاید اس میں موضوع کے تعلق سے اپنی صلاحیتوں کی آزمائش کا نام ہو یا ایسی کوشش و کاوش جس سے موضوع کے تعلق کا احاطہ ہو جائے۔ اور موضوع بحث پر مختلف زاویوں سے روشنی پڑ سکے۔ اردو میں پرسنل اےسے (PERSONAL ESSAY) کے لئے انشائیہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور صرف انہی معنوں میں استعمال ہونا بھی چاہیے۔ انشائیہ کا مقصد و محرک ذات، شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ میں، مجھ ہی چیز ہے جب اسے چھپایا جاتا ہے تو یہ ظاہر ہونے نہیں رہتا اور جب ظاہر ہو جاتا ہے تو اپنے ہی قارئین سے نکل جاتا ہے۔ انشائیہ میں میں کا اظہار ہے اور اسے قابو میں بھی رکھنا ہوتا ہے۔ اس فن

انشائیہ کیا ہے؟ یہ بتانا مشکل ہے یوں کہا جاسکتا ہے کہ جو مضمون و مقالہ نہیں ہوتا وہ انشائیہ ہوتا ہے۔ مضمون میں بڑے مرتب اور منظم انداز میں اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ مقالے میں دلیل اور استدلال بھی ضروری ہے کیونکہ مقالے میں دلیل کے بغیر کوئی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ انشائیہ ان دونوں کے برخلاف ربط و تنظیم کی پرواہ کرتا ہے نہ دلیل و حجت کو جگہ دیتا ہے یوں سمجھیے یہ مکمل فن پارہ ہوتا ہے۔ اس کی اختراعی اور انہی نوعیت بنیادی اہمیت رکھتی۔ اس کی اہمیت بھی افسانہ، غزل کی طرح ہوتی ہے یعنی وہ بھی تخلیقی ادب میں داخل ہے۔

انشائیہ نگاری چونکہ فنکاری ہوتی ہے اس لئے اصولوں اور ضابطوں کی اس میں پابندی نہیں ہوتی، جی ہاں فن کار اصولوں کا پابند نہیں البتہ اصول و آئین فن کار کے پابند ہوتے ہیں۔ فن آزاد ہوتا ہے۔ جو اصولوں اور ضابطوں کی زنجیروں میں جکڑی جاسکے وہ فنکاری نہیں صنائی ہوگی۔ فو کا زمانہ کی تکرار ممکن نہیں، تجلی کی تکرار کب ممکن ہے۔ فن کار فن سے علاحدہ ہی نہیں کیا جاسکتا وہ فن کے ساتھ وجود میں آتا ہے۔ اس لئے ہر فن کار منفرد ہے اگر اس کی انفرادیت اتنی بلند بانگ نہیں تو وہ ابھی فن کے اعلیٰ درجے پر پہنچا نہیں اصل

وحد نہیں نے ایسے SELF PORTRAIT

ذاتی یا ختمی تصویر کہ کرب کچھ دیا ہے۔
 شائے میں شخص زاویہ نگاہ کو بخوری حیات ظہن
 ہے۔ انشائیہ نگار کے پردے میں ذاتی پسندیا
 پسند محبت، نفرت، ایذا، فن، انباشتوں، اپنے،
 نشانات اور توہمات ظاہر کرتا جانتا ہے یہ صنف
 رب اپنی ذات کے آرا مانہ اظہار کا ذریعہ ہے انشائیہ
 پر جب تک انشائیہ نگار کی شخصیت چھا آجاتی،
 اس وقت تک انشائیہ نہیں بنتا شخصیت کی جلوہ گیری
 کی جان بھی گت ہے۔ اور ایمان بھی ذاتی جذبات اوستا
 اتی تجربات اور مشاہدات اس میں بیان کیے جاتے
 ہیں۔ کوئی بات، کوئی خیال کوئی چیز یا موضوع انشائیہ
 نگار کی شخصیت کو چھپو دیتی ہے۔ اس کے خیالات،
 رو کو راستہ دکھاتی دیتی ہے۔ اور انشائیہ نگار
 سحر و جادو کا ہے اسے دماغ کی آزاد ترنگ
 بجا طور پر کہا گیا ہے۔ غیر رسمی انداز اور آزادانہ نش
 شائے کی پہچان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ نگار بھی
 ہونو دوسرے کے ہی نہیں اپنے ہی کرتوت کرے۔
 لے سکتا ہے۔

انشائیہ نگار کی آزادی میں کوئی چیز حائل نہیں
 ہوتی یہ اور بات ہے کہ وہ صرف موضوع کے احاطہ
 میں گھومتا ہے۔ انشائیہ کو رشید احمد صدیقی نے بجا،
 طور پر غزل سے مشابہ قرار دیا ہے۔ غزل میں چیدہ
 خیالی طغی ہے۔ یہی حال انشائیہ کا ہے۔ غزل میں ردیف
 قافیہ کی پابندی کر کے شاعر خندا چاہے بہک سکتا
 ہے۔ انشائیہ نگار بھی موضوع کی پابندی کرتے ہوئے
 جو چاہے کہہ سکتا ہے۔ اصل ہلکا اور ہلکا، ہلکا ہلکا
 انشائیہ نگار کا کام ہے۔ انشائیہ نگار جب ہوش
 میں آتا ہے بہک جاتا ہے تا کہ وہ ہمیں سلا سکے۔

وہ عقل کی باتیں نہ کر کے عقل مندی کی بات
 کر جاتا ہے انشائیہ نگار اصل میں ایک مذہب
 بے تکلفی کی نشا پید کرتا ہے ایک ایسی دوستانہ
 فضا میں رہ اپنے دل کی باتیں، اپنے جی کی باتیں،
 کہہ سکے۔ انشائیہ میں مکالمے کا اہتمام کئے بغیر ایک
 مثالی کہنے والا اور ایک مثالی سننے والا ہوتا ہے۔
 یہی وجہ ہے کہ بعض خطوط میں جب وہ کسی ایک
 موضوع کے طعن سے ہوتے ہیں انشائیہ کا دلگ و
 آہنگ پیدا ہو جاتا ہے اور بعض انشائیوں میں خطوط
 کا سلف و کرم۔

انشائیے کی صنف میں اسی لئے تقرب و،
 تقریب کا انداز ہوتا ہے، مخلصانہ اور دوستانہ
 فضا ہوتی ہے۔ اس فضا میں نظر کی گمانش قوم ہوتی
 ہے نظریہ سازی کی نہیں، انشائیہ نگار عالم تو
 ہو سکتا ہے اور ہوتا بھی ہے لیکن علمیت کا بوجھ لادنا
 ہے نہ لادنے کی کوشش کرتا ہے، اسی لئے نہ
 تو وہ ناصح ہوتا ہے نہ داعی۔ وہ دوزخ سے
 چھٹاتا ہے، نہ جنت کا لالچ دیتا ہے ایک مخلص
 اور عقل مند دور رس کی طرح جب ضرورت پڑتی
 ہے ان کی طرف اشارے کمزور کر دیتا ہے وہ
 سلسل اور مروط انداز بیان اختیار کیے بغیر پتے
 کی باتیں کہنا جاتا ہے۔ اسی وجہ اس کی وضاحت میں
 بھی اشاریت ہوتی ہے اور اشاریت میں بھی وضاحت
 انشائیہ ایک یہ منظم فن پارہ ہوتا ہے جس میں،
 اختصار کے ساتھ عدم تکمیل کا احساس ہوتا
 ہے۔ انشائیہ میں دل نشینی کی بھی کیفیت ہوتی ہے
 اور آہستہ روی کے ساتھ جذبے و جوش کی شدت
 شدت احساس میں انداز بیان کی نرمی و لاشوری
 افہام میں شعور و آگاہی کا رجاء پر آمند خیالی

میں خیالات کی شہسازہ بندی۔ لے دئے
 رہتے ہوئے بھی کھل کھیلنے کا انداز۔ یہ تضاد
 اور تضادم اور تضاد کے انشائیے میں موجود درجہ ہیں
 انشائیہ نگار کے پاس موضوعات کی کمی نہیں
 ہوتی وہ ذرت سے لے کر سورج تک کسی بھی چیز کو
 موضوع بیان بنا سکتا ہے شرط یہ ہے کہ اس میں ذاتی
 اور انفرادی تجربات اور ان سے حاصل ہونے والی
 دانائی اور بنیائی پوری طرح موجود ہے۔ یہ اسی وقت تک
 ہے جب انشائیہ نگارش نوک طرح کا درجہ حساس
 لہجہ اور تاثیر میں خوش نمکری پیدا کرنے کا سہرا جاتا ہے
 شگفتگی اور شادابی انشائیہ میں لازمی اور ضروری ہے۔
 اسلوب بیان میں بھی اور انداز فکر میں بھی۔ لیکن اس کے
 باوجود، دقیق موضوعات اور فلسفیانہ نکتے انشائیہ میں زیر
 بحث آجاتے ہیں لیکن ان کی گہرائیوں میں جا کر الجھا اور
 الجھانا انشائیہ نگار کا مقصد نہیں ہوتا۔ البتہ سلسلے بیان
 میں دلی تاثرات کو ظاہر کرنے لے وہ ان خازنوں
 سے بھی ہلتا کھلتا گزر جاتا ہے۔

انشائیہ نگار کے لیے موضوعات کی قید ہوتی
 ہے نہ بھی خاص نظم و ضبط، ترتیب و تسلسل کے
 ساتھ ان پر خیال کرنا، وہ طرز بیان کی لڑی میں خیالات
 کے موتی چمکاتا ہے یہ موتی الگ الگ ہوتے ہیں لیکن
 ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی ہوتے ہیں ان
 میں اندرونی خیالات و تاثرات کی آب و تاب میں غارت
 کا بے رنگ دھماکا پوشیدہ طور پر دوڑتا ہے۔
 انشائیہ نگار دل کے قریب پاسبان عقل کو رکھتا
 ہے۔ لیکن پاسبانی کے لئے، حکمرانی کے لئے نہیں۔
 انشائیہ میں دلی جذبات کو عقل کی کسوٹی پر پڑھا جاتا
 ہے۔ اور عقلی دلائل کو دل کی صورت پر رُس کے دیبا جاتا
 ہے۔ انشائیہ نگار دوسرے ہی کو نہیں اپنے کو بھی پرکھ

سے نہیں چوکتا۔ وہ فلسفی نہ ہوتے ہوں بھی فلسفیانہ
 بصیرت رکھتا ہے۔ زندگی کو بازو کے اطفال نہ سمجھتے
 ہوئے بھی اس کا تماشا کرتا اور کرتا ہے۔ وہ
 تنقید سے ہتھیار کا بھی کام لے سکتا ہے اور ڈھال
 کا بھی۔ وہ زندگی اور انسانی نظریات کے گرے میں
 پرانی بات کو استوار کرتا ہے۔ نئی کڑی بات
 بھی انسانی کے ساتھ چلتی ہے نیچے اتر جاتی ہے۔
 کیونکہ اس کی ہر بات میں خلوص کے ساتھ جلدی
 بھی ہوتی ہے اور سنگینی کے ساتھ خوش طبعی بھی۔
 انشائیہ نگار زمین کی بات کہہ کر آسمان کی اپنے
 زور و قلم، زور و بیان اور انداز فکر سے اسے بید
 پیرا اثر بنا دیتا ہے وہ اپنے موضوع کی پاسداری کے
 باوجود اپنے مودے کے تابع ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کو
 کسی سہارے کی ضرورت نہیں، مہدی افادی نے
 سرسید، حالی، شبلی اور آزاد کا موازنہ کرتے ہوئے
 کہا تھا کہ ان میں سے سوائے آزاد کے ہر ایک کو کسی
 نہ کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ کسی کسے
 معقولات ضروری ہے۔ کوئی مقنولات کے بغیر نہیں
 چل سکتا۔ کوئی تاریخ کو اپنا سہارا بناتا ہے اور
 کوئی مذہب کے بغیر نہیں چل سکتا لیکن افادی کے
 الفاظ میں آقائے اردو آزاد کو کسی سہارے کا
 ضرورت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افادی کی
 بات پوری طرح اس لئے صحیح ہے کہ بنیادی طور
 پر انشائیہ نگار بھی
 اور افادی بھی یہی کہ ہیں اور یوں ایک انشائیہ نگار
 نے دوسرے انشائیہ نگار کو خوار و خمیں پیش نہ
 ہوئے انشائیہ نگاری کی سب سے بڑی ضرورت
 بیان کر دی ہے۔

انشائیہ نگار کا سب سے اہم شرط یہ ہے کہ

کچھ چائے کے بارے میں

پہنچاتی ہے بلکہ پینے والی تمام چیزوں میں جیب کے لئے بھی نامزدہ مند ہے۔ کیونکہ چائے کی ایک خاصیت یہ ہے کہ دوسرا پلائے اور آپ بیگن تو جسم میں فرحت اور تازگی کی ہر سی دورہ جاتی ہے۔

جن لوگوں نے چائے کے مقابلے میں آسکریم کو کھڑا کرنے کی کوشش کی انہوں نے منہ کی کھائی پہلی چیز تو یہ ہے کہ جس طرح گرم چائے گرم موسم میں دیکھ کر ہی کپکپی آجاتی ہے۔ اور پھر آسکریم کو سرد موسم میں دیکھ کر ہی کپکپی آجاتی ہے۔ اور پھر چائے جہاں فصل کو جگاتی ہے، آسکریم کھلانے کے کام آتی ہے۔ چنانچہ آپ نے غور کیا ہو گا کہ آسکریم کھاتے وقت بڑے سے بڑا منہ زور لٹا دیتی چپ سادہ لیتا ہے۔ نہ پا لٹا کھڑا نہ لگتی ہے۔ اپنے مطلب کو صرف اشاروں سے ادا کرنے پر اکتفا کر لیتا ہے۔ اسی لئے مصیبت پسند حضرات دو پارٹیوں میں صلح کرانا چاہتے ہیں تو فوراً آسکریم سامنے نہ رکھ دیتے ہیں۔ بس سانسے گرما گرم اختلافات آسکریم کے سلاخی کی طرح پگھلتے چلے جاتے ہیں۔ سنا ہے ایک خاتون اپنے بیٹے کیلئے لڑکی پسند کرنے آئیں تو لاکھوں کے جہیز کا مطالبہ ساتھ لے کر آئیں تھیں۔ مگر دور اندیش محمد صنی نے ایک کے بعد ایک آسکریم کے اتنے کپ انکے حلق میں اتارے کہ

بعض قنوطی فلسفیوں کا ایک یہ مشغلہ ہوتا ہے کہ مختلف چیزوں کا اثر زندگی میں تلاش کریں۔ مثلاً سینا پھل کا اثر جدیدیت پر۔ سرف مرغ کا اثر اردو ناعری پر اور کرکٹ کا اثر ہارٹ کے مریضوں پر۔ ان قنوطی فلسفیوں میں اپنے آپ کو شامل کرنا نہیں ہوتا۔ لیکن اسکے باوجود میں نے اکثر بیکاری میں چائے اور سانی سیاست کے باہمی تعلق پر غور کیا ہے۔ کیونکہ تمام غلط فہمیوں اور عالمی امن کی تمام کوششوں کا انعقاد اچھی نہ ہوئی چائے پر ہوتا ہے۔ اور دنیا کے تمام اہم طے نہ سکنے والے مسائل کی وجہ یہ تھی کہ ان مسائل کے حل کرنے والوں کو انکی پسند کی چائے نہیں ملی۔ دنیا میں آج تک ایسی دو کافر نس ہوئی نہ مینگ، جس میں مقرین نے چائے پیئے بغیر اطہار خیال کیا ہو۔ بات چلے ایم ایم بنانے کی ہو یا کسی ملک سے دوستی کی پیٹنگیں بڑھانے کی۔ اس کا حل چائے کی پیالی ہی میں دستیاب ہوتا ہے۔

ابھی حال ہی میں ایک ڈاکٹر نے یہ انکشاف کیلئے نہ چائے دل کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اس ڈاکٹر نے اپنی دانت میں، دن کو ایک شذرہ سنایا ہے۔ حالانکہ چائے پینے دے پہے ہی یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ چائے نہ صرف دل کو فائدہ

بھاری ٹھنڈے ہونٹ بند کئے انکے سارے کے سارے سانس بند
قبول کر کے گھرائیں۔

اس کے برخلاف چائے نہ صرف نفاذ کو گرم کرتا ہے
بلکہ طرائق جاری رکھنے کے دوران بطور ہتھیار کام آتی ہے۔
اسی لئے جو شخص صحت کے لحاظ سے غلطی نہ پاسکیں وہ چائے
خانوں میں نبٹائے جاتے ہیں۔

اب ذرا درست دیکھئے، جب چائے نہیں تھی تو
سرمایہ داری تھی نہ کمونزم۔ ترقی پسندی تھی نہ جدیدیت۔
دنیا نہایت سرد بلکہ گھٹکی ہوئی آئسکریم تھی جو کھائی جاتے
نہ پئی جاتے۔

یوں تو ہم ہوتے، تم ہوئے کہ مسٹر ہوئے،

سب ہی چائے کا زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں، لیکن پچ
پوچھئے تو پائے پینے والے بھی سماج کے مختلف طبقوں میں
بٹھے ہوئے ہیں۔ اودن میں سخت لسانی، اور طبقاتی
تقسیم بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے لائٹ اسٹار ہوٹل اور رستورنٹ
کے کنارے ٹھیلے پر بکنے والی چائے کی پیالی کی میڈیٹیشن
زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حالانکہ اسکے تیار کرنے کا
نمونہ ایک ہی ہے۔ لیکن ہر جگہ کی چائے کا ایک مزاج
ہے۔ ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ بحال ہے کہ ایک چائے
برائڈ کی چائے پینے والے کسی دوسری برائڈ کی چائے
کو منہ نہ لگائیں۔ یہاں چائے کی خصوصیت بیوی سے ملتی
جلتی ہے کہ باہر لاکھ محبوباؤں سے دل بہلاؤ مگر بناہ بیک
میں ملتی ہے۔ اسی لئے ایک مخصوص ہوٹل میں چائے پینے والے
کبھی دوسرے ہوٹل کا رخ نہیں کرتے۔ اس کے باوجود
کچھ لوگوں کو اپنی پسندیدہ چائے دوسروں کو پلانے سے
دلی مسرت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بار ہمارے ایک میزبان
نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنی بیوی سے کہا۔

”جی ذرا بات کو اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی بارہ سالے والی

چٹ پٹی چائے تو بلاؤ آج۔“ بارہ سالے والی چٹ پٹی چائے
کو پینے کے لئے آپکو دو سو فیصد مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔
پہلے اس چائے کی پیالی کو فیم کرنا اور پھر میرے برادر
تائزات کو قائم رکھنا اسی طرح ہم نے آخر اپنے عقلی
میزبانوں کے ہاں کھوئے، باہام والی مقوی چائے، برف
والی کولڈ چائے، لیو والی کھٹ چائے۔ گرم سالوں میں
خوشبودار چائے۔ اور نمک والی نمکین چائے پی ہے۔
بلکہ ایک کفایت شعار خاتون کے ہاں تو ہم نے انڈوں
والی چائے بھی پی ہے۔ سنا ہے وہ خاتون جس پالی
میں انڈے ابالتی ہیں، اسی میں چائے کی پتی ڈال کر ایک
نئے ذائقے کی چائے سے ہماؤں کی ترویج کرتی ہیں۔ اس
طرح چائے بنانے کے مختلف طریقے مختلف گھرانوں کی مخصوص
تہذیبی روایتوں میں شامل ہیں۔

یوں تو چائے تیار کرنے کے بے شمار طریقے ہیں کچھ
خواتین اتنے اہتمام کے ساتھ چائے تیار کرتی ہیں کہ چائے
پینے والا خند دم کا یہ مصرعہ لگتا ہے۔

آجھی جائے تیرے قدموں پہ مری جاں نکلے

ایک اور خاتون چائے بھی اسی ترکیب سے بناتی ہیں جو
ترکیب سے ہنڈیا پکانا انکی دادی نے انہیں سکھا دیا ہے۔
یعنی چائے، پانی، دودھ اور شکر ملا کر چوڑے پر چڑھا دو
اب جو چیز دیکھی میں یک رہی ہے وہ چائے ہوئی۔ اس
دیکھی میں پہلے پکائے ہوئے سالن کا ایک لطیف امتزاج
بھی چائے میں شامل ہو جاتا ہے جو صرف صاحب ذوق
حضرات ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اور جھٹ بتا سکتے ہیں کہ چائے
بنانے سے قبل اس دیکھی میں کوئی سالن پکایا گیا تھا،
جو لوگ چائے کے عادی ہوتے ہیں وہ ہر غم اور
خوشی کے موقع پر چائے میں پتلہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ چٹ
پینے والا چائے کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔

دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اسی نسخے میں دیکھار، بھی دکھائی گئی ہے۔

سترہویں صدی عیسوی کے ایک خطوطِ مصنفہ نقاشی میں ہم تلواروں کے بعض بہترین نمونے دیکھتے ہیں۔ یہ تلواریں بالکل سیدھی ہیں اور لوہے کی طرف خمدار۔ دستے دائرہ نما ہیں۔ انہیں تلواروں سے شائد آگے چل کر مرسلوں نے کراچ تلوار، بمقام وجانگم اٹھارویں صدی عیسوی میں ایجاد کی۔ گھالیں گول ہیں۔ نیزوں کے تیغے پتوں جیسے ہیں۔ جو ٹکڑی کے ایک لمبے ٹکڑے پر بٹھائے گئے ہیں۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے قلمی تصاویر میں تلواریں ایسی ہیں جن سے فخرِ اپنے چل جاتا ہے۔ نہ ان پر مخلوں اور راجپوتوں کا اثر ہے۔ دستے حلقہ نما ہیں۔ کبھی کبھی تیغوں پر پٹے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کراچ تلوار عام طور پر دائیں ہاتھ میں پکڑی جاتی تھی۔ جبکہ دیگر تلوار اور خنجر وغیرہ کمر بند سے لٹکا جاتے تھے۔ آخری زمانے کی دکھتی تصاویر میں ذوالفقار

تلوار بھی اکثر نظر آتی ہے۔ یہ تلوار زیادہ تر مذہبی تقسیمات میں استعمال ہوتی تھی، خصوصاً مارو خرم میں

زندگی مول سے آگے۔

فناؤں میں ایک کیف سا سمودوں۔ ایک ایسی جنت بن جائے جہاں صرف خوشیاں ہوں۔ قیمتی ہی قیمتی ہوں۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میں اُداسیوں کا کفن اور بڑے اپنی گفٹ نہائی میں مسکوتہ رہتی ہوں۔ کیوں یہ غم و خوشی کی بدلتی کھڑکیاں ہماری زندگی کو اس قدر متاثر کرتی ہیں؟ کیوں ہنستے ہنستے آنسو ہمارے دامن سے پڑتے ہیں؟ بچپن میں یہ ستر پر بٹھا تھا۔

غیر تری زندگی یہ دل لہتا ہے - نس الہ تبسم سے لے کھلتا ہے
غیر تری کہا کہ اس میں ہیں بابا! - یہ ایک تبسم بھی کسے ملے
کیا ہماری زندگی بھی غم کا ایک تبسم ہے!! ••

بعض لوگ جب صاف صاف کرنسی نوٹوں کے ذکر، شرمیلیں تو بات کو چائے کی پیالی میں گھول دیتے۔ اس طرح اڑے وقت میں چائے کی بدولت بڑے بے مسئلے حل کئے گئے ہیں۔ جہاں لاکھوں خوشامدین کا آئینہ وہاں چائے کی ایک پیالی اپنا جادو جگا سکتی ہے۔ چائے پینے کے بہت سے مدارج ہیں اور اسی کے اب بھی ہیں۔ مثلاً ایک کلرک اپنے ”باس“ کو چائے لے تو یہ تعلقات اندیش چائے ہے۔ ایک شاعر نقاد کو چائے پلانے تو یہ خوشامدانہ پائے ہے۔

ایک ”باس“ اپنے اسٹاف کو چائے پر بلائے تو بدبختانہ چائے ہے۔

ایک بڑا کسی لڑکی کو چائے کی دعوت دے تو ردِ مافی چائے ہے۔

ایک غریب مند کسی پیر اسی کو چائے پلائے تو یہ راندیش چائے ہے۔

اسی لئے ہمارا آپکو مخلصانہ مشورہ ہے کہ چائے دعوت قبول کرنے سے پہلے رسم دینا، موقعہ دستور پر غور کر لیجئے۔ ■

ادارہ کے اُردو امتحانات

اُردو فاضل، اُردو عالم (مسئلہ عثمانیہ یونیورسٹی) کے علاوہ اُردو دانی اور اُردو زبانِ ادبی کے امتحانات اسی بار کوٹہ سسٹم میں حیدرآباد اور اندھرا پردیش، کرناٹک، باراشیر اور شمالی ہند کے مختلف مرکزوں پر منعقد ہو رہے ہیں۔

نئے اور قدیم مراکز کے احباب فوری مراسلت کریں۔

عاب اور کتب کے لئے نکھیں۔

ڈاکٹر مخفی تبسم - سید اعجازی شعبہ امتحانات

”ایران اُردو“ پنجہ گڑھ، حیدرآباد - ۴

میتہ طیتہ میگ

زندگی غنچے کا تہم ہے

موند لیتا؟ زندگی میں کون سی ایسی گھڑیاں آتی ہیں جو اس کے حسِ یاس کو اس قدر تھرکا دیتی ہیں کہ اسکے تال پر دھڑکنے والا دل اپنا رونا رنگ شروش کر دیتا ہے۔ میں بھی بار بار جھوم جھوم کر ہنسی اور ہنس ہنس کر رو دی مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کس بات پر ہنسی آئی اور کس بات نے ولادیا۔ میری خاص طبیعت ٹھنڈوں بلکہ دنوں کسی بات پر بو بھل رہی۔ دکھ کا یہ ساگر خوشی کی ہر لہر کو ٹھکراتا گیا۔ حسدس ہوا کہ دکھ میں بھی ایک خاص قسم کی لذت ہوتی ہے۔ جیسے اس دکھ کو کھینچ کر نکال دیا جائے تو دل میں کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔ ایک دکھ کے ساتھ دوسرا ایسے سمٹ آتا ہے جیسے ایک دوسرے کا سلسلہ ہے اور پھر اس کی وضاحت بھی تو نہیں کی جاسکتی کہ کس موقع پر کس بات نے دل کو دکھ اور کس بات کے یاد آتے ہی حالیہ دکھ پھیل کر ایک بڑا سا طغیانی بن گیا۔ ایک گھر داب کی شکل اختیار کر گیا۔ جس میں یوں چکرانی رہی اور اندر رہی اندر دھنسی گئی۔ سارے ریاہ دھچے میرے اطراف بڑھتے گئے اور میں ان میں سمائی گئی۔ اور مجھے اُس گھر کی کوشش کی تو کوئی روشنی نظر نہ آئی۔ کونہ کونہ کر کے نہ بلی جیسے پکڑ کر آسمان کے گنگوڑوں تک پہنچ سکتا

چلے ہی بیٹھے بیٹھے جی چاہتا ہے کہ کھل کھلا کر ہنسوں ہنسوں اور دوسروں کو ہنساتی رہوں۔ خواہ دل کتنا ہی روتا رہے، مسو ستا رہے، تڑپتا رہے۔ لنگھنے کی طرح ایک پیر پر ناچوں۔ موسیقی کی لے پر چھٹی جاکے اور میرے قدم اس لے کے ساتھ تیسرے سے تیز تر ہوتے جائیں۔ دنیا میرے اطراف گھومتی رہے۔ اور میں دنیا پر ہنستی جاؤں۔ لوگ مجھے پاگل سمجھیں اور میں پاگل بن کر دل کی ساری حریتیں پوری کر لوں۔ وہ وہ کہندوں جو کوئی ہوش والا نہیں کہہ سکتا۔ اچھے بھلوں کو پاگل بنادوں اور پاگلوں کو ہوش دے۔ خدا کے جلوے دکھا دوں۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے بس کہتی جاؤں بگو اس کے جاؤں اور پھر یہ اُمید کر کے کہ کچھ نہ سمجھے خدا مگرے کوئی، اپنا سوانگ بدل لوں۔ سفید رنگ کا چولہہ پہن لوں اور اپنے پاگل پن کا خدا مذاق اڑاؤں۔ میری آنکھوں کے کونے بھیکتے ہیں تو بھیجنا کریں۔ دل چیتا ہے چیتا کرے۔ ان آنسوؤں میں رکھا ہی کیا ہے۔ ان میٹھوں کی قیمت ہی کیا ہے؟

مگر یہ مہنا کیسا، یہ رونا کیسا؟ کیوں نہیں آدی صرف ہنستا ہی رہتا ہے۔ ہنستے ہنستے ہی کیوں نہیں آتھیں

ہر طرف ایک بایوسی، ایک وحشت، ایک دُھندلا۔ گھاٹ پ
اندھیرا! کبھی خوشیوں کی لہریں جھوم کر دکھ کے ساگر کو
بھر گئیں۔ بات بات پر تنگوفے چھوٹنے لگے۔ ہونٹوں کے کنارے
دل نشین زاویوں میں بدل گئے۔ آنکھوں میں تراوٹ آگئی
باتاب کی کرنیں پھوٹ پڑیں۔ پھول مہکا تو ہونٹوں پر
گیت بکھر گئے۔ کبھی بارش کے قطرے میری آنکھوں
سے چھری برسائے لگے۔ کبھی سیاہ بادل زلفوں کی گھیری
جھاؤں کی یاد دلا گئے۔ کبھی مسکراتا شرماتا چاند اور
چمکتی بل کھاتی شام کسی حسینہ کے رخِ انور اور نازک
بدن کا تصور آنکھوں میں بسا گئی۔ اور چھری چاہا کہ کوئی
مجھے بھی چاند سے تشبیہ دے اور میرے زلفوں کی
جھاؤں میں سستائے اور میں ردِ پڑوں۔ حالانکہ مجھے
ہنسنا چاہیے۔ مگر میں ردِ پڑوں گی۔ کیونکہ اس کے پیچھے یہ
احساس مجھے بے چین کر دے گا کہ میں نے جیسا ہوا تھا کہ کوئی
مجھے اس والہانہ انداز سے آنکھوں میں بٹھالے کہ میں
اپنے وجود کو بھول جاؤں۔ سامے دکھ درد ہوا کے
دوش پر اڑ جائیں۔ میں سبک ہو جاؤں اور میری
زندگی کے گل بوٹے روپہلی کمرلوں میں بکھر جائیں اور میں
اسرا بن کر ان کمرلوں پر ناجائز چلوں! تھرتکی چلوں مگر ایسا
نہ ہو سکا۔ میرا جواس دل تڑپتا رہا اور میں اسکی ایک
ایک ٹپس پر غلطی گئی۔ اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
میرے رخساروں پر سے ڈھلک کر وہ حیدرِ سرخ ڈوپٹے میں
جذب ہو گئے اور میرا یہ سرخ گھونگھٹ میری مانگ میں بکر
سینڈلر بکیر کر میرے کانوں میں چپکے سے کہہ گیا۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پریم بنا لیتی تو اچھا تھا
مگر میں نہیں چاہتی کہ میرا سرخ ڈوپٹہ پریم بن
کر ہرے۔ میں تو اسے خوشیوں کی نشانی سمجھتی تھی۔ صبح کا

طلوع ہوتا سورج سمجھتی تھی اور اسکے نور سے اپنی زندگی کا ذرہ
ذرہ چمکانا چاہتی تھی بھر یہ فضاؤں میں کیوں لہرائے! مگر یہ
خونِ رحمتا بن گیا۔ اور میں خاموشی سے تبتاؤں کا خون ہوتا
دیکھتی رہی اور میری بشریاؤں میں، میری رگوں میں بہتا
گرم گرم خون سرد ہوتا گیا۔ سامے جذبات سے عاری
ہوتا گیا۔ میں تھرتھرتی، کاپتی رہی۔ کوئی مجھ میں جدت نہ
پیدا کر سکا۔ میری آندوئیں چلائی گئیں اور میں ایک
تقصیر یا اس بنی اپنی قسمت کی کھوئی پر ہلکتی رہی۔
کسی کے ہاتھوں نے اسے سنوارا نہیں، اور نہ میری قسمت ہی
سنور سکی۔ اور میرا رداں رداں پکارا اٹھا۔

مستند میں لکھا ہے آنسو بہانا

مگر مسکرائے کو جی چاہتا ہے

کہاں تک کوئی روئے اے روئے روتے چہرے بھی مسخ
ہو جاتے ہیں۔ پھر تقدیر کی لکیریں کیسے بن سکیں گی؟

کسی نے کہا تھا۔ ”ہندو تانکا دنیا تمہارے ساتھ۔
ہنس سکے۔ ردو تو تہائی میں اکیلے ردو، غم کا کوئی سا
نہیں۔ سننے والوں کا دنیا ساتھ دیتی ہے مگر میری تھیلی
کی لکیریں بھی تو میرے مقدّر کی طرح میڑھی میڑھی اور گڑھی
ہیں۔ اتنی ساری لکیریں ہیں مگر ان میں سے کوئی لکیر بھی قیمت
کو چمکانے والی نہیں۔ یہ ہاتھ میرا مقدّر ہے۔ میں نے
کئی بار ان میڑھی لکیروں کو پڑھنا چاہا۔ ان سے ایک خوشی
کہانی بنائی چاہی جس میں دلکش ر دلخواہ لبوں کی مسکرت
ہوں، اٹھکیلیاں کرتے پھول ہوں، سبزہ زاد ہوں جہاں
زمرد کے گلؤں بند بڑھ کر میری گردن تک آ پہنچیں، اور میری
سجاد بن جائیں۔ میری آنکھوں کے سینے سے نکلیں۔

شام اودھ اور صبح بنارس کا دھماکا ہو جائے۔ اور شب
ہجران غم فردا بن جائے۔ میرے ہرنٹ مسکرائے رہیں۔
کھیلوں کے تبسم کی طرح! بات بات میں گل افشانی کروں۔

رمانی مکمل شدہ دیکھو

شہریار

حزینہ



کب سماں دیکھیں گے ہم زخموں کے بھر جانے کا
نام لیتا ہی نہیں وقت گزر جائے گا

جانے وہ کون ہے جو دامنِ دل کھینچتا ہے
جب کبھی ہم نے ارادہ کیا مر جانے کا

لاتا ہم تک بھی کوئی نیند سے بوجھل رہا
اتنا ہم کو گمزرہِ خواب میں ڈر جانے کا

دستبردار ابھی تیری طلب سے ہو جائیں
کوئی رستہ بھی تو ہو لوٹ کے گھر جانے کا

سوچتے ہی رہے پوچھیں گے تیری آنکھوں سے
کس سے سیکھا ہے ہنرِ دل میں اتر جانے کا



اہلِ جہاں مقبول ہے تم میں مجھ جیسا دیوانہ کیوں
تم سب کی سفاک زباں پسہ ہے میرا انسانہ کیوں

میں بے چارے ہونے سے پہلے بھی کتنا سناٹا ہے
بستی والو! ملزم مجھ کو پھر تم نے گردانا کیوں

ظالم، سکاں، لمبی راتو! تم ہی کچھ انصاف کرو
دشمنِ خوابوں کے بدلے اک میں ہی دھواں کیوں

میں بھی اُس کو بھول چکا ہوں وہ بھی مجھ کو بھول گیا
اے یادو! اب تم نے نگار کھلبے اُنا جانا کیوں



نظم

نظیر علی مدنی



شہرہ آفاق مصر کا رستہ
ہے اک اندھے کنویں سے وابستہ

دل کے آگے نہیں کوئی رستہ
جیسے کوئی گلی ہو ستر بستہ

منزلِ عشق کیسے طے ہو گی
ہر قدم پر ہے اک نیا رستہ

جن کو لایا بچا کے مقتل سے
ہیں مرے قتل پر کمر بستہ

کیسے نیت اُسے سونے والوں کو
ہو اگر چھت مکان کی غمت

ہم عدم تا عدم چلے تھے عدیل
دایسی میں بدل گیا رستہ

محمد قمر الدین



آج تک یاد ہے جو کچھ وہ بھلا کر دیکھوں
زندگی کو نیا اندازہ دکھا کر دیکھوں

ہے جدا بات، سفرِ قسم بھی ہو گا کہ نہیں
ہاں مگر پہلا قدم خود بھی اٹھا کر دیکھوں

کیسے لگتے ہیں شب و روز یہی، میرے بغیر
کاش یہ فرق بھی، میں خود کو مٹا کر دیکھوں

یہی اک عذر نہ ہو شب کے ٹھہرنے کے لئے
کیوں نہ کچھ دیر چراغ اپنا بجھا کر دیکھوں

دردِ غمِ غن میں ہوئے جمع وہ اشعار اپنے
میر کے نام سے یاروں کو سنا کر دیکھوں

ڈاکٹر محمد علی شری

حسن شوقی کی ایک غیر مطبوعہ غزل

شیخ حسن شوقی، دبستان دکن کا ایک بلند پایہ شاعر تہذیب ہے۔ اس کا تعلق، نظام شاہی (۱۷۴۰-۱۷۴۳) قلمب شاہی (۱۵۱۲-۱۶۱۷) اور عادل شاہی (۱۷۸۹-۱۷۸۹) قلموں سلطوں سے رہا ہے۔ لیکن اس کی زندگی کا بیشتر حصہ بیجا پور میں بسر ہوا۔ ابن نقاشی، نصر قی، ہاشمی اور ولی اورنگ آبادی جیسے عظیم المرتبت شاعروں نے حسن شوقی کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے۔

حسن شوقی اگر ہوتے تو احوال — ہزاراں بھیجتے رحمت مجھ اپراں (ابن نقاشی)
ہوا بہ غلغلہ ہاشمی تیرے اشعار کا چندر — عجیب نین کر سنے شوقی من سا کر دھن نکلے (ہاشمی)
دس پانچ بیت اس دھات کے کہے ہیں تو شوقی کی ہوا — معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو اس ستارہ کا (فرقی)

حسن شوقی کی اب تک دو متغزیاں ”فتح نامہ نظام شاہ“ ”میزبان نامہ“ تیس غزلیں اور ایک نظم کا پتہ چلتا ہے جنہیں ڈاکٹر فیل جالبی نے مرتب کر کے دیوان حسن شوقی کے نام سے ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع کیلئے موجودہ مواد کی روشنی میں حسن شوقی ایک بے مثال متغزی نگار اور باکمال غزل گو کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے، وہ دبستان دکن کے صفر اول کے متغزلین میں شمار کیا جائے گا۔ سادگی، سلاست اور واقفیت حسن شوقی کے کلام کے نمایاں اوصاف ہیں۔

راقم الحروف کو کتب خانہ سالار جنگ کے ایک محفوظے (بیاض مرانی) میں شوقی کی ایک غزل دستبرد ہوئی ہے جسے تدوین متن کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ غزل ”دیوان حسن شوقی“ میں شامل نہیں ہے۔ اس کو طاکر ترقی کی حلقہ غزلوں کی تعداد اکتالیس ہو جاتی ہے۔

۱۔	۲۔	۳۔	۴۔	۵۔	۶۔	۷۔	۸۔	۹۔	۱۰۔
۱۔	۲۔	۳۔	۴۔	۵۔	۶۔	۷۔	۸۔	۹۔	۱۰۔
۱۱۔	۱۲۔	۱۳۔	۱۴۔	۱۵۔	۱۶۔	۱۷۔	۱۸۔	۱۹۔	۲۰۔
۲۱۔	۲۲۔	۲۳۔	۲۴۔	۲۵۔	۲۶۔	۲۷۔	۲۸۔	۲۹۔	۳۰۔
۳۱۔	۳۲۔	۳۳۔	۳۴۔	۳۵۔	۳۶۔	۳۷۔	۳۸۔	۳۹۔	۴۰۔
۴۱۔	۴۲۔	۴۳۔	۴۴۔	۴۵۔	۴۶۔	۴۷۔	۴۸۔	۴۹۔	۵۰۔
۵۱۔	۵۲۔	۵۳۔	۵۴۔	۵۵۔	۵۶۔	۵۷۔	۵۸۔	۵۹۔	۶۰۔
۶۱۔	۶۲۔	۶۳۔	۶۴۔	۶۵۔	۶۶۔	۶۷۔	۶۸۔	۶۹۔	۷۰۔
۷۱۔	۷۲۔	۷۳۔	۷۴۔	۷۵۔	۷۶۔	۷۷۔	۷۸۔	۷۹۔	۸۰۔
۸۱۔	۸۲۔	۸۳۔	۸۴۔	۸۵۔	۸۶۔	۸۷۔	۸۸۔	۸۹۔	۹۰۔
۹۱۔	۹۲۔	۹۳۔	۹۴۔	۹۵۔	۹۶۔	۹۷۔	۹۸۔	۹۹۔	۱۰۰۔

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

اسلام

ماہر ہوتے تھے۔ دکن میں ان کے علاوہ ہر قسم کے ہتھیار مٹی کے بندوبستوں سے تیار کی جاتی تھیں۔ زمانہ وسطیٰ کی یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ اس زمانے کے ہتھیار محض نمائشی تھے۔ بعض محض سیر و شکار کیلئے تھے تو بعض صرف مذہبی یا درباری تقارین میں استعمال کی جاتی تھیں۔ مثلاً سرورہی تلوار صرف جانوروں کے ذبح کرنے کیلئے مختص تھی۔ اسی طرح خنجر ”دھنڈ“ صرف شکار میں استعمال ہوتا تھا۔ تلوار ”ذوالفقار“ محض مذہبی تقسیمات اور جلوسوں میں نکالی جاتی تھی۔ کئی تلواریں اور خنجر مع اپنے خوبصورت دستوں کے صرف تحفہً دیئے جاتے تھے۔ تیغوں کی جلا، صفائی اور یک، ان میں تہہ در تہہ طلائی کام، کوفتہ گری اور قیمتی و نیم قیمتی پتھروں کا ان پر جیڑاؤ، ہتھیاروں کی سجاوٹ کے مختلف ذرائع تھے۔ جن کے لئے ہندوستانی کاریگر مشہور تھے کئی تلواریں ایسی بھی ہیں جن پر سادہ خانے اور تلوار سار کا نام بھی کندہ ہے۔ کہیں کہیں تاریخی تیاری بھی دی گئی ہے۔ تاریخی اعتبار سے دکن کی قدیم ترین دھاتی تلوار، راجپوتوں کے تعلقہ طور کی ہے جو اسی دھات سے بنی ہوئی ہے۔ یہ بڑی سیدھی سادھی تلواریں ہیں جن کا تیغ اور دستہ ایک ہی ٹکڑے سے ڈھالا گیا ہے۔ یہ لمبی اور دو دھاتی ہیں انہیں دوسری صدی قبل مسیح یا اس سے پہلے بنایا گیا ہے۔

دشمن کے حملے کا خوف اور اپنی دفاع کا جذبہ ہماری نظریں ایسے اسباب ہیں جنہوں نے اسلحہ سازی اور دیگر سامانِ حرب کی تیاری کی طرف انسان کو راغب کیا۔ سب سے قدیم ترین ہتھیار پتھر سے بنائے گئے، پھر رقتہ رقتہ لوہے سے ہتھیار بنائے جانے لگے۔ ان کے بعد دھات پھینکے جانے والے ہتھیار مثلاً تیرکھان وغیرہ ایجاد کئے گئے۔ ہندوستان کی قدیم سنسکرت کی کتابوں میں کئی ہتھیاروں کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے اس زمانہ کی اسلحہ سازی سے متعلق مواد کا کھوج لگایا جاسکتا ہے۔ ہم فی الحال دھاتوں سے بنائے گئے دھاتی اسلحہ کا ذکر کریں گے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حیدرآباد ہی کے دو میوزیم یعنی سالار جنگ میوزیم اور آندھرا پردیش اسٹیٹ میوزیم میں اسلحہ کا ایک قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔ جہاں تک دکن کا تعلق ہے، اس کے مختلف مقامات پر اسلحہ بنائے جاتے تھے۔ جیسے وجیانگر، سرینکاپٹن، جنگدیو پور، حیدرآباد اور ورننگل وغیرہ۔ مسلمانوں کے دور میں ایران اور یورپ سے تلواروں کے تیغے درآمد کئے جاتے تھے اور یہاں ان کے دستے، ٹمٹھ اند میں بنی ہندوستانی طریقے سے تیار کروائے مکمل تلوار بنائی جاتی تھیں۔ اسی کام میں ہندوستانی کاریگر بے

اسی صرح لکھنے کا استعمال شاید دکن میں پہلی صدی قبل مسیح سے ہو رہا ہو، چنانچہ اس زمانے کی کئی تلواریں، فنجریاں، نیزے، اور کلہاڑیاں ہمیں کئی مقامات کی کھدائی میں دستیاب ہوئی ہیں۔ زیادہ تر دکن کے برہمنوں، ماسکی، پوجیم پاٹی، ناگر جونا کنڈہ، یلشورم اور پڈا بانکور وغیرہ اس سلسلے کے خاص مقامات ہیں۔ اب آہستہ آہستہ مس کا استعمال کم ہونے لگا ہے۔ پوجیم پاڈ سے دستیاب جنگی کلہاڑی سے پتہ چلتا ہے کہ دکن کے لوہے کے دور میں دھات سازی نے کافی ترقی کر لی تھی۔

اسلحہ کے متعلق معلومات ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ہم قدیم دور یعنی دوسری صدی قبل مسیح تا چھٹی صدی عیسوی کے پتھروں کے مجسموں کا تفصیلی جائزہ لے کر ہتھیاروں کا پتہ چلا لیں۔ امر اوتی کے مجسمے جو دوسری صدی قبل مسیح تا دوسری صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں اسلحہ مختلف نمونے دکھلاتے ہیں، جن سے ظہور ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی مختلف قسم کی تلواریں، ڈھالیں، فنجریاں، کلہاڑیاں اور تیرہ و کمان وغیرہ رائج تھے۔ تیغ آجکل کے کھانڈا تلواروں سے ملتے جلتے تھے۔ دستے یا تو گول ہوتے تھے یا پھر مربع شکل کے، مگر ڈھالیں گول نہیں ہوتی تھیں۔ ناگر جونا کنڈہ کے اسلحہ بھی انہی جیسے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک اور ہتھیار ہوتا تھا جسے ”میس“ (MACE) کہتے ہیں۔ پالوا دور کے مجسموں میں ہمیں دو نئی قسم کی تلواریں ملتی ہیں، جن میں ایک مشہور کھانڈا تلوار ہے۔ مجسموں کی ان تلواروں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دکنی دستے سب سے ملحدہ ہوتے تھے۔

ساتویں صدی عیسوی تا چودھویں صدی عیسوی مغربی ہندوستان میں کھانڈا تلوار بڑی مقبول رہی، تیغے سیدھے مگر پتوں کی شکل کے ہوتے تھے۔ دکن کے مشرق

میں ایک نئی تلوار تیار کی گئی جس کو ”کور“ کہتے ہیں؛ کا تیغ چوڑا مگر اگلے حصے میں خمدار ہوتا تھا۔ گورکھے کو زیادہ استعمال کرتے تھے اور یہ شاید آٹھویں صدی کی ایجاد ہے۔ حالانکہ دور میں ترشول بھی ایک مقبول ہتھیار تھا۔ انہی طرح کاکتیا دور کے جیسے بھی نشانہ بن کر ہیں کہ تیرہ کمان، تلوار، فنجریاں، نیزے، ترشول اور کلہاڑیاں عام تھیں۔ تلواریں لمبی اور دو دھاری ہو تھیں کہیں کہیں چھوٹی خمدار تلواریں بھی دکھائی دیتی ہیں دستانے خالص دکنی ہیں۔ فنجروں کے تیغے، دستوں کا موٹے ہوتے تھے۔ ڈھالیں بڑی اور مستطیل ہوتی تھیں جن کے پچھلے حصے میں دائرے ہوتے تھے۔ مغربی دکن ہریاسلہ دور کی تلواریں چار قسم کی تھیں، اول کھانڈا جن کے تیغے چھٹے ہوتے تھے اور دستانے خالص ہندوستان ہوتے تھے۔ دوم سیدھی تلواریں جو دو دھاری ہیں تھیں۔ سوم ایسی تلواریں جن کے اگلے حصے خمدار ہوتے تھے، اور چہارم ایسی تلواریں جن کے تیغے دوہرے ہوتے تھے۔ دستوں کیلئے بہترین مثال ناٹر مندرجہ کی تلواریں ہیں۔

چودھویں تا سترھویں صدی عیسوی دور کو ہم دجیانگر کے نام سے بھی یاد کر سکتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ اس دور میں تلواروں کی تیاری کیلئے کافی فنی ہمارت اور بغیر کو بروئے کار لایا گیا۔ اس دور کے مجسموں میں جو تلواریں دکھائی گئی ہیں، وہ پہلے دور کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور خوبصورت ہیں۔ بہت نئی شکلیں اور کئی نئی قسم کی تلواریں ان میں مل جاتی ہیں، ان میں دو قابل ذکر ہیں۔ ایک تو وہ تلوار جو دو دھاری، نوکیلی اور پھیلنے والی شکل کی ہے، اور دوسری وہ تلوار جس کا تیغ پہلے حصے میں سیدھا ہے، مگر آگے چل کر خمدار ہو گیا ہے۔ اور پھیل

مرے اور جاسین۔ یہو سلطان لے ایلواں، افغانستان اور قرآن سے راست تعلقات پیدا کئے، عبدید اسلمہ فریدے اور قرآنسیسی ماہرین جنگ کی خدمات حاصل کیں۔ مگر بالآخر اسے بھی شکست اٹھانی پڑی۔ اور اس طرح دکن پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہو گیا۔ یہو سلطان کے ہتھیار، بہترین اور قیمتی تھے۔ بعض تو طوائف کام اندھیرے جواہرات سے مزین تھے۔

ان سب چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں تک اسلمہ، اسلمہ سازی اور فنون جنگ کا تعلق ہے دکن کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا، پہلے ان کا مغلوں سے رابطہ پھر یورپی اقوام سے تعلق وغیرہ لے دکن اسلمہ سازی پر قابل ذکر اثر ڈالا، جس کے نتیجے میں فوجی انداز بھی کافی تبدیل ہوئے۔ ایران اور یورپ سے قابل لحاظ اسلمہ کا ذریعہ درآمد کیا گیا۔ تلواروں اور خنجروں کے تیغے اکثر باہر سے درآمد کر کے ہندوستانی دستوں میں بٹھائے جاتے تھے۔ مرٹوں کے چھوٹے ہوئے ہتھیار بتلاتے ہیں کہ لمبے اور چمکدار تیغے جرمنی، اٹلی اور اسپین سے منگوائے ہیں۔ مقبول عام مرٹوں کے تیغے عام طور پر یورپ سے منگوا کر ہندوستانی دستوں میں بٹھائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر ہندوستانیوں کی فوج میں بھرتی سے بھی کئی جگہ کے اسلمہ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اسی طرح حیدر آبادی فوج بھی عربوں، چٹھالوں، حبشیوں، یورپ والوں، سکھوں اور راجپوتوں وغیرہ پر مشتمل تھی۔

حیدر آباد کے تعلق سے ایک بہت ہی دلچسپ بات معاصر تواریخ میں یہ ملتی ہے کہ یہاں پر کئی ملک و قوم کے لوگ رہتے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی میں حیدر آباد کی مرٹوں پر عرب، سدی، روسیہ، پٹھان، افغان، راجپوت، ایرانی، بھاری، چرکسی اور ترک اپنے اپنے قوی لباس

دم کی طرح لوک پرسم ہوتا ہے۔ دسوں کی ساقبت بھی بدل گئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے زیادہ مضبوط و بہتر ہیں۔ مرٹوں نے آگے چل کر جو دستے اپنے اپنے ایجاد و جہاز دور میں ہو چکی تھی۔ دوسرا اہم اضافہ یہ کیا گیا کہ تیغوں کے دونوں طرف مضبوطی کیلئے پینے دیئے جانے لگے۔ بعض دستے ایسے بھی بنوے گئے ہاتھوں سے پکڑے جاسکتے ہیں اسی دور کے مصور غلطی ”رامائن“ میں بھی مذکورہ بالا تلواریں ملتی ہیں۔

سولہویں صدی عیسوی میں سلطنت وجیا نگر کو زوال ہوا، اور مسلمانوں اور مرٹوں نے سارے دکن کو فتح کر لیا۔ بالآخر مغلوں نے انہیں شکست دے کر اپنی حکمرانی قائم کر لی۔ اور مختلف صوبہ داروں کو دکن پر مامور کیا۔ انہی میں سے ایک گورنر نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں اپنی آزادی کا اعلان کر کے آصف جاہی حکومت کی دکن میں بنیاد رکھی۔ پہلے ان کا دارالسلطنت اورنگ آباد تھا، جو بعد میں حیدر آباد منتقل کیا گیا۔ اسی طرح میسور اور ٹرانکور بھی آزاد حکومتیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ اسی درمیان یورپی طاقتیں مثلاً ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی اور برطانوی قومیں تاجروں کے روپ میں ہندوستان آئیں، اور آہستہ آہستہ انہوں نے یہاں کی سیاست میں بھی دخل دینا شروع کیا۔ راجگان میسور کے ملانم حیدر علی نے اپنے راجہ کو تخت سے ہٹا کر خود کو میسور کا ایک آزاد بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ حیدر علی نے اپنی فوج کیلئے جدید اسلمہ مہیا کئے جو اس نے ڈچ لوگوں سے حاصل کر کے انگریزوں کے خلاف استعمال کئے۔ لیکن موت سے کچھ دن قبل ۱۷۸۲ء میں اسے شکست ہوئی۔ ان کے

اور ہتھیار کے ساتھ گھومنے پلٹتے تھے۔ اب بھی دکن میں اور خصوصاً حیدرآباد میں ہتھیاروں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ محفوظ ہے۔

دکنی اسلحہ میں زمانے کے ساتھ ساتھ تغیر بھی آیا، تاکہ کارکردگی بہتر ہو، تلواروں، خنجروں کی شکل و صورت یقیناً باہر کے ہتھیاروں سے متاثر ہے۔ مثال کے طور پر آپ موجودہ تلوار کو لیں۔ اگر کچھ لمبوں اور قلمی مصوری کے نمونوں سے مقابلہ آئے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ تلوار اور آخر سولہویں صدی عیسوی سے دکن میں رائج ہوئی، اور یہ نتیجہ ہے ایرانی اثر کا، کوئی بھی ہندوستانی تلوار اس سے قبل نیچے کی طرف خم نہیں کھاتی تھی۔ اسی طرح دیگر تلواریں اور خنجر جیسے ذوالقنا سیلاب، قمہ اور جنبہ وغیرہ۔ عرب اور ایران کی ایجادات مسلمانوں کے ذریعہ دکن میں رائج ہوئے۔ فیروز سلطان کو تو ایرانی تلواروں سے گویا عشق تھا۔

یہی حال بارود والے اسلحہ کا ہے۔ یہ بھی زیلہ سے زیادہ تعداد میں یورپ سے برآمد کئے گئے ہیں۔ ہندوستان کی کئی خود مختار ریاستوں نے بندوق اور پستول سازی کے اپنے کارخانے کھول رکھے تھے۔ میارچ، مالک اور فلپٹ، لاک بندوقیں قدیم ترین ہیں۔ توپ، ملک میدانی، وسط سولہویں صدی عیسوی میں بمقام احمد نگر ڈھالی گئی اور اس کا استاد تھا عسینی خاں رومی۔ مغلوں میں باہر کے زمانے ہی سے توپوں کا استعمال جاری تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں تو ہندوستان کے کئی شہروں میں اسلحہ سازی کے کارخانے کھل گئے، جہاں اور سامان کے علاوہ بندوقیں اور توپیں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ خود حیدرآباد شہر کے کارخانے ”مدرسہ صنایعی“ میں بندوق ”میکٹ“، تیار کی جاتی تھی۔ ونیرتی، گدوال

اور نیرمل وغیرہ میں میارچ، لاک وغیرہ تیار ہوتے تھے۔ دکنی قلمی نقادیر سے بھی ہم اسلحہ اور اسکی تاریخ پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ان سے ہم یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہندوستانی ہتھیار کب سے چلے آ رہے ہیں، اور ان کے مقابلے میں ایرانی اور یورپی ہتھیار کیا تھے؟ مگر اندوس کہ ہمیں مختصر قلمی مصوری کے نمونے سولہویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں ملتے۔ سب قدیم مختصر مصوری کے نمونے ہمیں احمد نگر کے خطوط حسین شاہی میں ملتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کٹار اس زمانے کا مقبول ترین ہتھیار تھا۔ سالار جنگ میوزیم کے خطوط سے، جو اچھے سولہویں صدی عیسوی کا تیار دیا جاسکتا ہے، نیز معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی تلواروں اور خنجروں پر ایرانی اثرات زیادہ ہیں۔ دسٹے عام طور پر پستول جیسے ہیں، تیغے سیدھے ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی نوک کی طرف خمدار بھی۔ تلواروں کی میانیں بھی بڑی خوبصورت بنائی جاتی تھیں جن پر نعل ہوتا تھا۔ خنجر چھوٹے ہوتے تھے اور ان کے دسٹے دائرے دار ہوتے تھے۔ ایک قلمی تصویر میں جنبہ بھی دکھایا گیا ہے۔ امریکہ کے ایک میوزیم میں ابراہیم عادل شاہ ثانی شاہ بیجاپور کی ایک مختصر قلمی تصویر ہے اس میں تلوار دھوپ بتلائی گئی ہے۔ یہ اور سترہویں صدی عیسوی کی قلمی تصویر ہے۔ ”پینٹ“ کے لئے جو تیغ ملتے ہیں وہ بھی غیر ہندوستانی ہیں۔ زیادہ تر غیر ہندوستانی تیغ یورپ سے برآمد کئے جاتے تھے۔ لے ایسی تلواروں کا نام ”فرنگی“ پڑ گیا۔ ایسی فرنگی توپ کی نقاشی ہمیں بیجاپور اسکول کے طرز مصوری میں مل جاتی ہے۔ ان میں ڈھالوں کے نمونے بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ کافی بڑی ہوتی تھیں۔ برائٹن کے ایک فنکار نے، جو دور و بیجا نگر سے منسوب ہے، ہم ایرانی تلوار کی قلمی تصویر (باقی ملاحظہ)

سلطانہ شرف الدین احمد

دوسرے

شادی کی پہلے تیسری محفل تھی مگر وہ اسی طرح سیاہ جالی کی ساڑی میں ملبوس تھی جس پر کامدانی کی بوتلوں، سکیاں کڑھی ہوئی تھیں۔ بلاور بھی اسی رنگ کا تھا۔ لیکن اوٹنگا، کلاچرا اور بے آستین جیسے وہ کسی کپڑے کا پوری حصہ ہو۔ سلمیٰ جن میز پر بیٹھی کنگنی کافی کے گھونٹ اطف و خوشی سے اتار رہی تھی، وہیں جسنہ ایسی مہمان خواتین موجود تھیں جو اس محفل میں ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں ان میں سے کئی اونچے عہدوں پر فائز تھیں۔ یہ مردوں اور عورتوں کی ملی جلی محفل تھی۔ مگر عورتوں نے اپنے گروہ الگ سارے کھے تھے۔ دلچسپ باتوں کا سلسلہ جاری تھا ایسی جگہ سے اٹھنے پر کوئی بھی مائل نہیں تھا۔ مسز دلدار ایک جو تھائی گورا بدن چھلکاتی کچھ لہراتی بل کھاتی وہاں ایچانک وارد ہو گئیں۔ سلمیٰ بس ٹھنڈی ہو گئی۔ نکھیں می نہ چرائی جاسکتی تھیں۔ اتنی بڑی محفل میں جہاں زیادہ تر شائستہ عورتیں اور مہذب مرد موجود تھے وہاں کوئی کولیہوں کو خم دیتا، گہرا میک اپ چڑھائے اب بھلکا تا آجائے تو مرد تو مرد عورتیں بھی جینپ

جاتی ہیں۔ مسز دلدار نے بے اختیار سلمیٰ کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا اور اتھائی بے تکلفی سے گفتگو شروع کر دی نہ جانے کتنی مہمانے والی اور کتنی اجنبی آنکھوں نے انھیں دیکھا۔ ایسی بے تحاشہ نمائشی عورت کی دوستی یا اس محفل میں تو شاید ہی کوئی مانہ کرنے والا ہو۔ یہاں کی سوسائٹی اتنی ترقی یافتہ کہاں جو نیم مہنہ عورتوں کو سراہے۔ سلمیٰ نے بیسیوں سانسوں کو منظم کر کے بات کی اور وہ بھی اٹھری اٹھری، بس بس طویل۔ گفتگو کے لئے بہت کم گنجائش نکلتی تھی۔ وہ دیر بعد وہاں سے ٹلیں۔ سلمیٰ کی جان میں جان آئی۔ سانس کھلی اور نارمل رفتار سے جاری ہو گئی۔

سارے دلش میں غنیمت ہواؤں کے نعرے چل پڑے تھے مگر غریبی پھلتی ہی جا رہی تھی۔ اس کفایت اور ہنگامی کے دور میں ایسی محفیں لمبا ب ہوئی ہماری تھیں کوئی پانچ سو مردوں اور عورتوں کی دعوت تھی۔ ہندو مسلم اور عیسائی مہمانوں کے علاوہ دو تین اونچے اونچے گورے جیسے سردار جن بی دکھائی دے رہے تھے مگر ان کی میویاں اس چمک۔ ملک، محفل میں نہ جانے کہاں کم ہو گئی تھیں۔

بے حد لبا چوڑا ہال رنگ برنگی برقی جگنوؤں اور
تیز روشنی کی لکیروں سے جگمگا رہا تھا آراستہ تھا۔
اُن گگنت پنکھے ایک جیسی رفتار سے چل رہے تھے جانی
پیمانی شکلوں کی کمی نہ تھی۔ یہاں وہ غیر لکڑیوں کی بھی
موجود تھیں جو آج کافی سلیقہ سے کپڑے پہن کر آئی
تھیں۔ دو سال پہلے جب یہ آسٹریا سے آئی تھیں اپنے
اونچے ذراک پہنا کر عین باپٹ کھلے عجیب ترکش پہن کر بلوزوں
کے ساتھ پلوئیں پہن رہی تھیں۔ کلب کے گرم مزاج بندہ
نوجوان اور فیشن پرست ذرا ذرا سے چوکرواٹنے مرکز
نظر بنانا کر انھیں عین جو تھا تو تنکا رہنے پر مال کر دیا تھا
ان میں جو سب بڑی تھی وہ تیری کم تھی اور دو ٹکڑوں والے تیرکے
کے لباس میں انھیں کے بے ساختہ قہقہے شریر چلتی آنکھوں
کا تعجب کرنے کی حقیر سے قہقہے مفاؤں میں بکھر رہے۔
مرزا بھٹی بڑا، طرہ پس رہی تھی جیسے کوئی مضحکہ خیز ڈرامہ ہو رہا
ہو، میرے انتہائی شریف اور اسٹارٹنگے سنر دلدار
بدن کی ہلکی ہلکی جھٹکوں کے ساتھ ہنس ہنس کر بات کر رہی تھیں
وہ کافی حیران اور بوکھلائے نظر آ رہے تھے۔

وہ ایک دلکش برج تھی۔ بے حد دلکش شاید یہ مٹی سی
پہاڑی وادی ہی اسے جنم دے سکتی تھی محل نما مکانوں کے وسیع
افسانوی درجوں کے آگے ایسے کئی منظر رُک رُک گزرتے مگر آج
ان کے سین بھی خو خورام تھے بلی کی ایسی صحوں سے
پیار تھا۔ کیونکہ ہمیں اس کی خیالی فردوس نے ناصلیت کا
روپ لیا تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی نے پہلی بار آنکھ کھولی
تو ایسی ہی ایک خوبصورت صبح نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ وہ
اس دادی کے لئے نوادہ تھی اور نوادہوں کے لئے اس
میں دلفریبی ہی دلفریبی تھی۔

آفتاب شاید کہیں دور نمودار ہو چکا تھا۔ اُجالے میں
ٹھنڈا اور شادابی لگتی ہوئی تھی دادی کی گہرائی جانتے اور

لہلہاتے کھیتوں سے آباد تھی۔ ادبچی ادبچی سرشتی اور
بھوری ہاروں سے گھرا ہوا بھرپور چشمہ عجیب عجیب
وضوح کے مکانات، کہیں کہیں جھانکتے ہوئے چٹانوں کے سر
آج کہیں زیادہ نظر نواز دکھائی دے رہے تھے۔ شبنمی ہزار
کی سبک لہریں رہ رہ کر ٹھنڈا کا احساس جگا رہی تھیں۔
سپاٹ سی چٹان پر سیدھا ساری میں لپٹی، سکڑی، اسکڑائی،
سر جھکائے سنر دلدار بھی نظر آ رہی تھیں نہ جانے وہ کیا دیکھ
رہی تھیں شاید کسی عجیب سی چیز پر ان کی نظر پڑی ہوئی
تھیں۔ انجلی ڈھلکنے کے لئے منتظر تھا۔ زلفیں بے ترتیب تھیں۔
سلمی کی آمد نے انھیں چونکا دیا۔ ناک ٹھلائی تھی ترد
تازہ چہرے پر افسردگی کے سائے رنگتے دکھائی دے رہے
تھے۔ پورے سوچے ہوئے تھے سلمی نے اپنی مداخلت کو
بے جا سمجھا۔ لیکن سنر دلدار کے چہرے پر برسرِ تقدی آثار
نظر آئے۔ وہ ہنسنے لگی اور دہلی بٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد بائلا
کے قہقہے موضوعِ مکالمہ کی شریات کی طرح جاری ہو گئے۔
یہ ان کا ہمیشہ کا اس انداز تھا سلمی کے بیاہ کو صرف ۶ ماہ
ہوئے تھے۔ مگر دیکھو! چھ سال کی ازدواجی زندگی کا تجربہ
رکتی تھیں۔ اس مختصر سی مدت میں وہ عین موٹے موٹے۔
انتہائی تندرست لڑکوں کی ماں بن چکی تھیں۔ ایک اور آمد
تھی سلمی نے سوچا شاید وہ بچے پیدا کرنے کرتے تک پہنچ
ہے۔ خوبصورت جوانی بوی بوی زیادہ بچے ہو ہی جاتے
ہیں۔ دلدار صاحب بھی حسین و جمیل مرد تھے۔ شاہرِ مزاج
آرٹسٹ اور ساتھ ہی بڑے عمدہ دارِ ناپ کاٹنے سے
زیادہ انھیں کلب کی زندگی سے پیار تھا۔ وادیِ احمر
میں پیار سا لگا، حسین شومرا، خوبصورت صحت مند بچے
اور کیا چاہئے تھا۔ سنر دلدار کی عورت کچھ اور بھی چاہی
ہے۔ سنر دلدار انگلیں بھری جوانی اور دلفریب
حسن کی مالک تھیں۔ اس لئے انھیں ادبیت کچھ چاہیے

گفتگو کا ملکہ اتنا مبارک تھا کہ شوہر کے اہم فون بھی،
پہلے واسطے وصول کرتے اور اپنے فون پر سے پیغام بھجواتے
وہ تو غرق ہوئی جا رہی تھیں۔ گفت کے فیصلے بعد میں،
زندگی میں ایسی حدیں بھی آپکی تھیں کہ گھر کا ضرورتی بچوں کی
نگہداشت اور شوہر کے نام و آبرو کی بھی انہیں برباد نہ رہی
تھی۔ دار فرائض کے قریبی خفیہ بہنری ازیم چیمس ہوئی
بڑی ٹری پینگیس، دینر ٹی، تاسین، فون، انگوٹھیاں
بے مثال گلاب کے گلے اور نہ جانے کیا کیا تحفوں میں ملنے
لگا۔ دلدار صاحب کی محبت پر اعتماد تھا۔ جیسے عام،
شوہروں کو مددگار اپنی بیویوں پر ہوا کرتا ہے یا خاص۔
بیویوں کو اپنے عام شوہروں کی بظاہر دنا داریوں پر رنگ
اب انہیں چیمس ہو گئی تھی۔ کہ عید برات اور مانگو
سے بھی بے نیاز رہنے لگے۔ نیٹ ساری تو بڑی چیز
ہے۔ بلا در کا ٹکڑا بھی تحفہ میں دینا بھول چکے۔
گھر چلانے کے لئے ادنیٰ، بونی تنخواہ پکڑا دیتے اور
بس۔ حالانکہ منہ گانے کو کی کر دیت چینی نہ تھا۔
دلدار صاحب کا دفتر تو کلب ہی سے والبتہ رہ گیا تھا
جب رات گہری خاموشی میں سو جاتی پھاٹکا
کھڑے ٹرپ ٹرپ کے بے تک سیٹیاں بجاتے اور
بچھڑے پرندوں کی پکار نھاؤں میں پھل جاتی تو ایسے
وقت ان کے گھر سے لڑائی جھگڑے اور تو،
میں، میں کی آوازیں بلند ہو کر ہو کر وادی میں ڈوب جاتی
ایسے زبانی حادثوں سے درمیانی فاصلے کم ہوتے چلے
گئے۔ دادی احمر کی ٹھنڈی لکھا راہوں پر تیز
تیز چلتے، چمچتے، اندھا بگتے ہوئے دسائے اکثر
دکان بڑتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہڈی
چیز کے ہراسرار نادوں کے کردار اصل روپ دھند
چکے۔
اس دیکش وادی کے یکن بھی جان گئے عورتوں

مردوں سے نہ جانے بات کہاں کہاں پھیل گئی۔
مغفلوں۔ دھو توں اندیش کی دلدادہ خواہشیں کے
حلقوں میں بھی سر دلدار کا وجود کھینکے گا۔
صرف موت کے مارے ہی انہیں بلا دانیتہ در نہ،
تفاضل برتا جاتا۔ وہ دعوت کے باوجود ناخاندہ
مہان بھی جانے لگیں۔ خدا جانے وہ اب کہاں رہتی ہیں
ادرس طرح گذر بسر کرتیں۔

ان کی زندگی کی گاڑی جو رستہ پر لوکھ بھی
تھی۔ اس کا اسل ٹوٹ گیا تھا وہ اپنی جگہ سے
ایک انچ بھی نہ کھسکتی تھی۔ دادی احمر کی سرور
راہوں سے چمچتے، چلاتے اندھا بگتے ہوئے دسائے
آج ہی سیری یادوں کے افق پر نقش ہیں۔

•••
(انتالیہ مکمل ہے آگے)

اس کا زبان دبائے دونوں شاعرانہ ہوں کیونکہ
انتالیہ کو ہر طور ادب لطیف ہونا چاہیے۔ یہاں ادب
لطیف سے مراد وہی طرز انتالیہ ہے جو وسعت علم،
احساس شریعت اور حکمانہ نزاکت خیال سے پیدا
ہوئی ہے۔ لیکن اس میں زندگی اور زندہ دلی کا ہونا
بھی لازمی اور ناگزیر ہے۔ اسی وجہ سے
طنز و مزاح نگار اس خف سے خوب فائدہ اٹھا
میں۔ لیکن انتالیہ نگار اس سے جتنا بڑا ہو گا اسی
قدر وہ انتالیہ کی ساری خصوصیات کا احاطہ کرے گا
کیونکہ وسعت علم جب شگفتگی، مشاہداتی اور زندہ
دلی سے مرکب ہوتا ہے تو حکمانہ نزاکت خیال کے
ردازے خود خود کھلنے لگتے ہیں اور احساس شریعت
بھی جاگ اٹھتا ہے۔ ان سب کا امتزاج انتالیہ
نگاری کی مثالی منزل ہے جس تک بڑی کوشش و
کارش کے بعد ہی پہنچنا ممکن ہے۔

محمد عقیل الدین قریشی

شمالی امریکہ میں پہلی اُردو کانفرنس

غالب نے ایک جگہ لکھا ہے

انتر آبلہ سے جادہ حورائے جنوں

صورتِ رشتہ گوہر ہے چمنِ غاں مجھ سے

خیالِ آفرینی اُردو بولنے والوں کو درانت میں لگتی۔
ہاں ایک دو اہلِ ذوقِ دل بیٹھے، کوئی نہ کوئی ایسی صورتِ نمود
پیدا کر لیتے ہیں جس کی کوکھ سے شعر و ادب کی کونپلیں پھوٹنے
لگتی ہیں۔ ویسے ادب و شعر کا شوق جب کسی کے ہاں رچ بس
جائے تو وہ عادتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ اُردو شاعری کے رسیا
مسابِ زندگی کی آزمائش کتنی ہی کڑی کیوں نہ ہو، محمد ظری
نراغت پاتے ہی رزمِ گاہِ حیات کو محفلِ شعر گوئی میں
تبدیل کر لیتے ہیں۔ اُردو زبان کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے، اس
لئے بھی کہ اُردو محض زبان ہی نہیں، ایک تہذیب بھی ہے
اور معاشرتی قدر بھی جس سے اس کے افراد ایک ذہنی اور
عبدانی وابستگی رکھتے ہیں۔ اور اس میں سہ سارِ نظر
آتے ہیں۔ ایسی مثال دوسری زبانوں کے بولنے والوں میں
نہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس وقت اُردو کے سلسلے میں جو
نوش و فردش شمالی امریکہ میں نظر آتا ہے، اسے ایک
سیک مالی سمجھنا چاہیے۔ ہمیں اس کا یقین ہے کہ اس کے لہجے
سے کاغذِ نالغہ ظاہر ہوں گے۔ مستقبل کے متعلق کچھ کہنا
تو ہمیشہ از وقت ہے۔ لیکن اس وقت حالات جو صورت

اختیار کر رہے ہیں، اس کے پیشِ نظر ایسا لگتا ہے کہ شمالی امریکہ
میں شائد یہ پودا جڑ پکڑے۔ یہاں تو رائٹرز میں
"انجمن اُردو" کا قیام کوئی چار سال پہلے عمل میں
آیا ہے۔ اس قلیل عرصے میں اس کے کارکنوں نے ان تھک محنت
اور جوصلے سے کام لے کر اُردو زبان کی آبیاری اور اس کی ترقی میں
بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ شمالی امریکہ
میں ادبی ذوق و شوق کی لہر سی دوڑ گئی ہے۔

چراغ سے چراغ تو جلتا ہی ہے، یہاں پوسے برِ تعلم میں اُردو
زبان کی ترقی و ترویج کا تقریباً ہر شہر میں کچھ نہ کچھ کام ہونے لگا ہے۔
اس سال انجمن نے اُردو کا جو چار روزہ جشن منایا ہے وہ ایک تاریخی
مثال قائم کر گیا ہے۔ اس کانفرنس میں اس کے بعد ہونے مشاعرے
اور مذاکرے میں بڑی کام کی باتیں ہوئی ہیں۔

سردار جعفری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ترقی پسند ادب
اور جدید ادب پر بڑے معرکہ آرا اور مفید بیڑے، مضامین انجمنِ جلد
ہی شائع کرنے والی ہے۔ اُردو غزل کا مسئلہ کافی اچھوتوں کا شمار ہے
اس پر عقیل الدین علی نے بڑا سیر حاصل تبصرہ لکھا۔ مشاعروں کے
آغز اور ان کے جلی اور ان کی روایات پر منیب الرحمن نے تفسیر کیا

میں کثرتِ ظہور سے ناہیدنی ہوں جو جس
میں شکت و جود سے نا آفریدہ ہوں

سردار نے یہ بھی کہا کہ جو جس کی شاعری پر ہمارا کلاسیکی دھڑ
ختم ہو جائے۔ اور انہیں کی شاعری سے قیادہ بھی شروع ہوتا
ہے۔

اس جلسہ میں احمد فراز بھی شریک تھے۔ ان کی رائے میں جو جس
اس غفلت کے مستحق نہیں ہیں جس کا اعتراف اسی جلسہ میں ہوا
تھا۔ سامعین میں افتخار عارف بھی موجود تھے۔ جنہوں نے راقم
الطروف سے ایک ہی جملے میں جو جس کی غفلت کا اعتراف بھی کیا اور
اس کے مستحق بھی ہوئے۔ سامعین سے جو گفتگو ہوئی اس سے
یہی تاثر ملا کہ جو جس اگر دوزبان کے ایک بڑے کامیاب شاعر تھے۔
یہ دلچسپ محفل بڑی دیر تک چلتی رہی اور سامعین بھی باوجود کچلے
تین چار دنوں کی تھکان کے بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

اس سال انجمن کے صدر بیدار بخت اور سکریٹری کرنل
انور احمد، وائس پریذیڈنٹ کرشن ہاکسرتھ اور خزانچی طاہرہ
جوہری تھیں۔ ان کے یہاں سے چلے جانے کے بعد یہ ذمہ داری
ہارون صدیقی کے سر آئی۔ کالفرنس کے روح رواں اور تعلیمی
امور کے انچارج ڈاکٹر جمال نقوی رہے۔ ان حضرات کے علاوہ
اس کالفرنس اور مشاعرے کی تہیہ و تہذیب میں جن لوگوں
نے دامے درمے قدمے حصہ لیا اس کی فہرست طویل ہے لیکن
ڈاکٹر جمال نقوی کی اعانت میں جو لوگ پیش پیش رہے ان میں
صابرہ، زمبیدہ، مب راکہ، ستیدہ مرزا، ڈاکٹر عباس،
سلام صاحب، جفید، اقبال خان اور رینا کی کوششوں
کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پوری کی پوری انجمن
تن من دھن سے جوں رہی۔ بیدار بخت، کرشن ہاکسرتھ، ہارون
صدیقی نے ڈنر دیئے۔ ان کے علاوہ دیگر بانیان نے انڈیٹ
تزیینت الا منہور اور راکہ سنگھ شہتاج نے ایک شاندار دن دیا
جس میں فیض احمد فیض، قزاق، عاتق، سردار، اور افتخار

تھے۔ پاکستان کی نامور شخصیت حکیم محمد سعید صاحب نے بھی شرکت
فرمائی۔ اس دسویں انجمن کی کارگزاریوں پر مردخانی ڈالی گئی اور
پاکستان کے ارد بابت علم عقد سے درخواست کی گئی کہ وہ اردو
زبان کی ترویج و اشاعت میں انجمن کے ساتھ تعاون فرمائیں۔
جمیل الدین عالی اور حکیم سعید صاحب نے اس سلسلہ میں اعانت
کا وعدہ فرمایا۔ حکیم صاحب نے دوسرے دن کالفرنس میں بھی
شرکت کی اور کالفرنس کے حسن انتظام اور سلیقہ کی تعریف
کی اور زبان کے سلسلے میں یہ جو جس اور دلولہ دیکھ کر سب ہی
مہمان خوش ہوئے اور متاثر بھی۔ فضاء میں ایک جشن کی کیفیت
پیدا ہو گئی تھی۔ ہر طرف شعور و فہم کی یورش تھی۔ علم و ادب
کے رسیا چاروں طرف سے کشاں کشاں چلے آ رہے تھے۔
مہمان شہداء، ادبا اور اہل ذوق حضرات کی یکجائی اور ہم
آہنگی سے ٹورانٹو، عراقی کے اس شاعر کی تصویر بن گیا تھا۔

دوش در صومعہ اند صفاں بادہ فووش

جہاں سے در بکف وز ناز عامل بر ووش

اور اپنی یہ حالت تھی کہ

میں غم گزنی و مریدان ہمہ در ہا یا ہائے

من قدح نوش و مغان نغمہ زن نیشا نوش

اُردو زبان و ادب کا یہ چارہ روزہ جشن اس اعتبار
سے بھی معیہ ثابت ہوا کہ شمالی امریکہ میں جن جن یونیورسٹیوں
میں اُردو کی تعلیم یا اس کے تہذیبی موضوعات پر درس و تدریس
کا انتظام ہے ان کے لئے یہ کالفرنس مہمیز کا کام کر گئی۔
ٹورانٹو یونیورسٹی کے ساتھ الٹین پیروگرام نے اس زبان میں تہذیب
دینے کے مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ پروفیسر
عزیز احمد مرحوم لکچر سیریز کے تحت انہوں نے پروفیسر برنس
کوٹی لوگ یونیورسٹی سے مدعو کیا۔ موصوف ہندوستان پاکستان
کے علمی حلقوں میں تصوف پر اپنے عالمانہ تشفق کی وجہ سے
مدعو ہیں۔ پروفیسر ملتان اسمیل کی ایک دعوت میں ان

ان کی شاعری میں فکری انداز نمایاں ہے۔ سردار تقریر و تحریر دونوں دونوں ہی میں سرداری کہتے ہیں۔ اور نظم و نثر پر زبردست قدرت رکھتے ہیں۔

فیض سے متعلق اب مزید اور کیا لکھا جاسکتا ہے کہ عوام کے دلوں میں وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے براجمان ہو چکے ہیں۔ ان سے چھوٹی عمر کے لوگ انہیں پیر مغاں سمجھتے اور کہتے بھی ہیں۔ اب کی مرتبہ یہ جہاں گئے تو افتخار عارف کی زبانی ان کے متعلق ایک نیا خطاب سن کر خوشی ہوئی کہ نئی نسل کے شاعر انہیں محبت سے ”بڑے جی“ کہتے گئے ہیں۔ شاعرے میں بیروت کی خوں ریزی پر بڑی دلوزہ نظمیں پڑھیں۔ کچھ پرانی نظمیں سنائیں۔ اس دفعہ وہ ٹوٹو ٹوٹے آئے تو بہت خوش ہو گئے۔ کانفرنس سے بہت مطمئن، ورنہ بہت خوش تھے۔

شمالی امریکہ میں کئی اچھے شاعر آگئے ہیں۔ ان میں میٹب الریحی، حسین امام، نیر جہاں، مومن ایمن، منظر شکوہ، حمیرہ رحمان، افتخار احمد، حسن فاروقی، نرہیت صدیقی، عرفانہ حریز، طلعت اشادت، شاہین اور عبدالقوی قنیا نے ہمارے شاعرے میں شرکت کی۔

انجمن غنویہ کانفرنس اور شاعرے کی کی تفصیلی روداد شائع کرنے والی ہے۔ شمالی امریکہ میں جو ادب لکھا جا رہا ہے اور جس نوع کی شاعری ہو رہی ہے اس پر بھی کام ہو رہا ہے۔

بھی ملاقات ہوئی۔ مشاعرے چشتیہ و فردوسیہ پر ان کی کتاب ہایت دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مغرب میں اسلامیات سے جو دلچسپی لی جاتی رہی ہے پہلے وہ عیسائی معنویت کی زبردست شکار تھی۔ اس کے بعد عیسائی معنویت میں بدلائو گئے لیکن اب ایسے آثار نظر آتے ہیں جیسے ایک خوشگوار موڑ آگیا ہے اور نقطہ نظر بدل رہا ہے۔

اس کانفرنس اور مشاعرے میں شرکت کے لئے جن مہمان شہر آوا اور ادبا، کہ مدعو کیا گیا تھا۔ وہ ہماری زبان اور ادب کے بڑے نام ہیں۔ فیض، فراز، عسائی، آدآ، سردار جعفری، گوپی چند نارنگ، منیب الرحمن، عصہ حاضر کے نمائندہ لوگ ہیں۔ شاعرے میں احمد فراز نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ فراز کی شاعری میں موجودہ سیاسی صورت حال کی وجہ سے عجیب ٹیکھا طنز آگیا ہے۔ شاعری بنیادی طور پر جذبہ اظہار کا ایک اسلوب ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس میں احساس اور فکر بھی متوازن انداز میں شامل ہو جائے تو یہ دو آئینہ ہو جاتی ہے۔ ہماری جدید شاعری میں یہ انداز پیدا ہو رہا ہے۔

افتخار عارف نئی نسل کا شاعر ہے اور عصہ حاضر کے مسائل کو شاعرانہ پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ جمیل الدین عسائی تو دو ہون کی وجہ سے پھیلے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی غزل میں تحت السطور جذبہ اور فکر کی آمیزش بڑے خوبصورت انداز میں سمیٹی ہوئی ملتی ہے۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ انہوں نے قوی اور ملی تڑانے بھی لکھے ہیں اور قبولیت عامہ کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا ہے۔ وہ عوام کے دلوں میں شہداء پاکستان کی حیثیت سے تحت نشین ہو گئے ہیں۔ آدآ معری کے ہاں نسائی رُوح سے محبت اور زندگی اور زندگی کو مہر و بہر کے بڑے خوبصورت مرقعے ملتے ہیں۔ بعض نظموں پر شاعرہ کی نزاکت احساس بڑی منفرد ہے۔ سردار جعفری متال اور جوشن کے آہنگ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

خوبصورت اور آئینہ پر چھپنے والا مندرجہ ذیل

چمنگاری

ایک کے اور دوسری کی ذات کا مندرجہ ذیل
زیبائے عالم دینے
فخویر جیم ۲ روپے

غوث محمد کی زیبائوسی

معنی تبسم

جناب غوث محمد کے مرقعات کی، مئی ۱۹۸۲ء کو اردو گھر میں ادارہ میاست اور ادبی ٹرسٹ کی طرف سے اشاعت ہوئی تھی۔ اس کی تمام کاپیاں ایک خاص موقع پر جاری کردہ فولڈ ملے مندرجہ ذیل اجماعی شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

گورٹ کی نائش منعقد کی گئی تھی۔ جن کا شمار دورِ حاضر میں برصغیر کے ممتاز خوش نویسوں میں ہوتا ہے۔

جناب غوث محمد ۱۹۳۷ء میں سابق ریاست حیدرآباد کے ضلع عثمان آباد میں پیدا ہوئے۔ خوش نویسی کا ذوق انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ ان کے والد جناب خیر اللہ صاحب خطاطی کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ غوث محمد صاحب نے اس فن کے رموز و نکات اپنے والد سے سیکھے۔ ۱۹۵۲ء سے وہ کتابت کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ اور حیدرآباد سے شائع ہونے والے متعدد روزناموں، ہفتہ وار رسالوں اور ماہناموں میں کام کرتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف ادبیوں اور مصنفین کی کتابیں بھی لکھتے رہے۔ کچھ عرصہ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں ادارہ ادبیات اردو میں قائم کردہ ترقی اردو بورڈ کے مرکز خوش نویسی میں ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جہاں وہ سات برس تک بحیثیت استاد کار گزار رہے اور بے شمار طلبہ و طالبات کو اس فن کی تربیت دی۔

۱۹۶۵ء سے غوث محمد صاحب نے کتابت کے ساتھ ساتھ زیبائوسی (خوش نویسی) کی طرف توجہ کی اور مسئلہ اور مزید خطوط کی تحریر کے نئے ترقیاتی طرز کے اختراع کئے۔ غوث صاحب کو نسخ، نستعلیق، ثلث اور تعلیق پر خاصی مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے ان خطوط کے بعضی تاثر کو ملحوظ رکھتے ہوئے مندرجہ رنگوں کے امتزاج سے آیات قرآنی، اشعار و اقوال کے نقش

خطاطی معترضی کی طرح ایک فنِ لطیف ہے۔ جوفیوں کو آواز کے تحریری نشان ہوتے ہیں۔ اور وہ زبان کے ترسیلی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اسے ترسیل و ابلاغ تک محدود رکھنے کے بجائے ایک فنِ لطیف بنا دیا۔ اسلام میں شبیہ نگاری پر امتناع کی وجہ سے مصوری کے فن سے دلچسپی رکھنے والوں نے خطاطی کی شکل میں اپنے فن کا رانہ ظہار کی تسکین کا سامان پیدا کر لیا۔ آغا ز میں عربی زبان کے لئے جو خط کوئی استعمال کیا جاتا تھا اس میں کوئی حسن اور کمال نہیں تھی۔ آگے چل کر خطاطوں نے اس خط کو ترقیاتی انداز بنایا اور پھر نئے نئے خط ایجاد کیے جیسے نسخ، رقاع، ثلث، تعلیق، عتق، دیوان، نستعلیق وغیرہ۔ ان کے علاوہ ان کے خالص ترقیاتی روپ خط طغرہ، خط گلزار، خط عیار، خط ماہی وغیرہ وجود میں آئے۔ عرصہ دراز سے اس فن میں جمود طاری ہو گیا تھا۔ حالیہ برسوں میں ہندوستان اور پاکستان کے چند ممتاز خوش نویسوں اور مصوروں نے خطاطی کے ترقیاتی اسالیب کا احیا کر کے ان میں نئی نئی اختراعات کی ہیں۔ ان میں ایک قابل ذکر نام صادقین کا ہے۔ جو بنیادی طور پر ایک مصوٰف ہیں۔ اور انہوں نے خطاطی کو ایک میڈیم کے طور پر ترقی دیا ہے۔ اردو گھر کے اختراع کے موقع پر صادقین کے اثرات کی نائش کی گئی تھی۔ اردو گھر کے ایسے کا سرنامہ صادقین کے نمونے قبلہ نا شاہکار ہے۔ ادبی ٹرسٹ کے اخبار دی سٹار مندرجہ کے موقع پر ۱۹۸۱ء۔ دو گھنٹہ جناب غوث محمد کے

اردو نامہ

وقار خلیل

اردو کی علمی ادبی تہذیبی خبریں

یہ حکم مئی: مشہور شاعر جناب خیرات
 زیر تسم کے دائیں پیر کے نصف حصہ کو گزشتہ
 دونوں آپریشن کے ذریعہ قطع کیا گیا تھا
 ان دونوں اپنے گھر پر زیر علاج ہو
 ریاستی اُردو رائٹرس اور جرنلس و قلم
 فنڈ کی طرف سے طبی اعانت کے طور
 پر ایک ہزار روپے کا چیک مسٹر سر نیوا
 اہولی کی ریاستی اُردو اکیڈمی نے
 دلایا گیا۔

● جناب صلاح الدین ادیبی م۔

شرکت کی۔ اور حکومت سے اُردو
 کے مسائل کے فوری حل کا مطالبہ کیا۔
 اور ریاستی سرکاری زبان کمیشن میں
 اُردو نمائندہ کی شمولیت پر زور دیا۔
 ۲۸ مئی۔ جناب رفیع راج سکینہ عہدہ
 انجمن ترقی اُردو شہر حیدرآباد کی صدارت
 میں بمقام اُردو گھر انجمن کا سالانہ جلسہ
 منعقد ہوا، ریاست احمد شہر میں اُردو
 کے تعلیمی مسائل کا اکران کرنے کا مشغول
 اور حکومت کو ایک میمورنڈم دینے کا

یوسف نظر، راجہ لال راجہ، فاروق نیکل،
 حبیب محی، سہیل، عدیل اور راہیل نے
 کلام سنایا۔

۳۱ مئی۔ انجمن مائٹران ایام منظوم کے
 زیر اہتمام چوتھے محل ہند مقاصد میں
 مہدی ظہری دہلی، وضوان اللہ آبادی، باقر ملت
 حنائی، رازع آبادی، تقی عسکری، علی
 مقصود، ظہیر جعفری، قاسم شہیر، محمد
 علی گدہر، رضا آندھی، اور سخی شتخوٹ نے
 حصہ لیا۔

[illegible]

غالب اختر حسن مددگار معتمد ریاستی اُردو اسکول، جناب مظفر حجاز اور جناب ابو الکلام وحید علی خان نے دینی و علمی کی شان پر مضامین سنائے۔ رضافی نے اپنا کلام سنا کر داد پائی۔ کینڈہ میں عظیم حیدر آبادی شاعر اور سائیکس دان پروفسر نور احمد شمع نے بھی اس محفل میں شرکت کی۔ ڈاکٹر یوسف کمال نے نظامت کی امداد شکر یہ ادا کیا۔

۱۵/ مئی: حیدر آباد لٹریچر فورم کی جانب سے جو ان فکر شاعر جناب مظہر مہدی کے مجموعہ کلام ”لا انتہا“ کی رسم اجراء محترمہ خدیجہ عالم فونڈ میری کے ہاتھوں انجام پائی۔ پروفسر عالم فونڈ نے ڈاکٹر مفتی تبسم، بشابت علی بکملت، حسن قریشی اور صدر جلعہ جناب علی تہسیر نے مظہر کی شعری ذہانت پر اظہار خیال کیا۔ محفل شعریں مہمان شاعر نور احمد شمع کے علاوہ مفتی تبسم، تاج مہمور، رضافی، مظفر حجاز، ریث متین، رؤف خیر، مسعود عابد، طب فونڈ میری، علی الدین نوید، اور ٹیپلر نے کلام سنایا۔ حسن قریشی نے شکر یہ ادا کیا۔

۱۶/ مئی: دکن کے بالکل اور نامور شہنشاہ محض سکندر علی وحید کا ۷۰ سالہ عمر میں بھارتیہ قلب اور نگ آباد میں انتقال ہوا۔ وحید کا شمار علامہ

عثمانیہ کے سپروں اور حیدر آباد کے ماہر ناز شعراء میں ہوتا ہے۔ جناب حامد علی عباسی صدر ادارہ ادبیات اُردو، ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اُردو، حافظہ ابوالوسف صدر ریاستی اُردو اکیڈمی نے تقریری بیانات میں شہر و جبکہ عزیز دست خراج عقیدت ادا کیا ہے۔ اور انہی وفات کو اُردو شاعری کا نقصان بیتا ہے۔

۱۷/ مئی: اُردو دوست اور سب رس کے قدیمی خریدار جناب عبدالرشید شریف رشید لاٹریجری عثمانیہ یونیورسٹی نے ادارہ ادبیات اُردو کے لئے ٹرسٹ کے قیام میں اعانت کی خاطر ۱۰ روپے کا عطیہ جناب عابد علی خان بانی ادبی ٹرسٹ کے حوالے کیا۔

۲۱/ مئی: نظامت اُردو ٹرسٹ لاٹریجری کے اسٹیڈی سرکل حلقہ آراب باب ذوق کا ماہانہ اجلاس ڈاکٹر مفتی تبسم ریڈیہ شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں ہوا۔ جناب مظفر حجاز نے جو ان فکر اور ذہین شاعر رؤف خیر کے شعری مجموعہ ”ایلاف“ پر ادبی تبصرہ سنایا۔ محفل شعریں ریث متین، رؤف خیر، رضافی، طالب فونڈ، مصلح الدین سعدی، علی الدین نوید، مظہر مہدی، ڈاکٹر راہی، روشن خیال اور ستارہ صدیقی نے کلام سنایا۔ ابتداً حضرت سکندر علی وحید کی وفات پر جناب

محمد منظور احمد معتمد حلقہ فکر و نظر نے اُردو تقریر پیش کی۔ اور وحید کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے خراج عقیدت ادا کیا۔

● ڈیپو کرٹیک یوتھ فورم کے زیر اہتمام جہیز کے خلاف ایک موضوعاتی مشاعرہ جناب امیر احمد خسرو کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ کنڈل پریشاد کنڈل، علی احمد جلی رحمن عباسی، صلاح الدین نیر، صادق نقوی، رئیس اختر، منیع الحسن خیال، منیر الزماں منیر اور عزیز النساء عباسی نے تقریریں سنا کر داد پائی۔ اسماعیل القادری کنڈنیر نے شکر یہ ادا کیا۔

۲۲/ مئی: جناب پروفسر محمد اکبر الدین صدیقی معتمد شعبہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو نے ادارہ کے مالیہ کے استحکام کو عزم کرتے ہوئے ادبی ٹرسٹ کی طرف سے ٹرسٹ کے قیام کا اپیل پرانہ راہ معادرت کو بازی ایک ہزار روپے کا عطیہ مرحمت کیا۔

● عثمانیہ یونیورسٹی میں رویشیہ سیم کے تحت ممتاز ادیب ڈاکٹر زینت ساجو صدر شعبہ اُردو کے عہدہ پر فائز ہوئیں۔ موصوفہ نے ڈاکٹر منام عمر خان مصنفہ عہدہ کا جائزہ حاصل کر لیا۔ علی وادی حلقوں میں ڈاکٹر ساجوہ کے صدر شعبہ اُردو ہونے پر خوشگوار رد عمل کیا جا رہا ہے۔

ماہنامہ "پروم" کے اعلان کے مطابق مختصر اس کا شعری شمارہ "زینت" ساجد بکسر منظر عام پر آئے والا ہے۔

۲۳ مئی: گرلزٹن جوبلی تقاریر لاداء ادبیات اردو کے سلسلے میں ڈاکٹر رورسکی ۵ کتابوں کے نئے جوبلی ایڈیشن شائع ہوئے جن میں دکنی ادب کی تاریخ داستان ادب حیدرآباد، تاریخ ادب اردو، سیر گوکنڈہ اور تذکرہ خطوط مجلد دوم شامل ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت کے لئے نظامی اردو ٹرسٹ نے مالی اعانت منظور کی تھی اور یہ کتابیں پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی کی نگرانی میں طبع ہوئیں۔ مرکزی وزارت تعلیم کی احانت سے تذکرہ خطوط اداء مجلد ششم مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی صاحب و ڈاکٹر محمد علی انور کی اشاعت بھی اس دوران عمل میں آئی۔ اردو اعلیٰ اسکول لغاب میں شامل دو کتابیں مولانا ابوالکلام آزاد و قاری خلیل اور اشوک اعظم مرتبہ سیدہ مہدی جعفری کے نئے ایڈیشن بھی ادارہ ادبیات اردو نے شائع کئے ہیں۔

● اسماء اردو ماڈل اسکول واقع قلعہ گوکنڈہ کا جلسہ سالانہ تقسیم انعامات کا انعقاد بعد ازاں جناب منیر راج سکینہ محل میں آیا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

کے علاوہ منظور ظفر اور میرا غلام علی نے اس مثالی درس گاہ کے طریق تعلیم کی مثال کی۔ جناب غلام صادق الدین بٹائی اسکول نے دیوبند سنائی، محترمہ فوزیہ بیگم نے غیر مقدم کیا اور محترمہ ظہیر بیگم انچارج نے شکریہ ادا کیا۔

۳۴ مئی: ادبستان دکن کا ادبی جہان اردو گھر میں بعد ازاں ڈاکٹر راج بھادوہی منعقد ہوا۔ ڈاکٹر جمید بیدار نے سراج اورنگ آبادی پر مقالہ، جناب محمد منظور احمد نے عید حیدرآبادی پر مضمون اور جناب احسن علی مرزا نے سکند علی وجد کے فن اور شخصیت پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ شعری نشست جناب علی احمد طیبی کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔

طمس الدین تاباں، وقار صدیقی، روفی قادری، منظر مجاز، محمد منظور احمد، ڈاکٹر یوسف کمال، ڈاکٹر راہی، جیلانی بیگ صادق، خلیل عمرانی، روفی رحیم داؤد نصیب، اسماعیل ظریف، اختر واجد، نذیر تیز، حفیظ ساکت اور دلاور علی تریں نے کلام سنایا۔ یحییٰ جمیل نے شکریہ ادا کیا۔

۲۹ مئی: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر زینت ساجدہ صد شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں بمقام اردو ہال منعقد ہوا۔ جناب طیب القاری پکوانہ گورنمنٹ کالج ملیر گئے وہ اردو تہذیب کا تائیدہ شاعر و جدہ کے زیر عنوان

محزون ستا یا ابتداً جناب صلاح الدین میر مقدم اردو مجلس نے حضرت وقید کی وفات پر قرارداد تعزیت پیش کی۔ محفل شعریں طمس الدین تاباں، حفیظ النساء حنی، روفی رحیم، میر الزماں منیر اور صلاح الدین یقین نے کلام سنایا۔ انجمن ترقی اردو اور اردو مجلس کی طرف سے ڈاکٹر زینت ساجدہ کو شعبہ اردو گھر پر تمکین ہونے کی مسرت میں مبارکباد پیش کی گئی۔ ●

بقیہ صفحہ ۳۶ سے آگے.....

مرقعے تیار کئے ہیں۔ اپنے مرقعوں کے پڑ میں کچھ گہری یک رنگ سطح سے کام لیتے ہو کچھ "بری" کے نقش پر معروف و کلام کی اس طرح تزیین کرتے ہیں کہ متن کی ز اور معنویت ابھر آتی ہے۔ مادین گٹ دار اور قوس قمریہ کے برخلاف غوث محمد صاحب کے حروف بالعموم درجہ مستطیل تراہوتے ہیں۔ غوث صاحب نے تزیینی خطوط مثلاً معکوس، قبار اور میں بھی اختراعات کی ہیں غوث محمد کی زیانویسی (خطاطی) کی منفرد خوبی "تذوق ہے۔ ان کا ہر مرقع عباد کا رکھتا ہے۔ حول و قواح کے مطابق عقد متق و عمارت کے ذریعہ ممکن ہے یہ وصف کو شان خط کہا جاتا ہے یہ ایک قدیم ہوتی ہے۔ غوث محمد صاحب کے کتبہ کے علاوہ کے ساتھ

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of 'Idara-e-Adabiat-e-Urdu' Aman-e-Urdu, Hyderabad 500 001 A. P.

اسلوب اور انتقاد



مکتبہ رشید

سید کی



بیاد محمد اکثر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب سے

حیدرآباد

<p>مجلس مشاورت</p> <p>صدر: حامد علی عباسی</p> <p>نائب صدر: ہاشم علی اختر</p> <p>معتحد: ڈاکٹر مغنی تبسم</p>	<p>مدبر اعزازی: مغنی تبسم</p> <p>معاون مدیر: وقار خلیل</p> <p>جلد (۳۳) جولائی ۱۹۳۸ء شماره (۷)</p> <p>قیمت فی پرچہ ۲ روپے ۲۵ پیسے</p>
<p>ارکان</p> <p>پروفیسر سید علی اکبر</p> <p>عابد علی خاں</p> <p>پروفیسر گوپی چند نارنگ</p> <p>محمد اکبر الدین صدیقی</p> <p>رحمن راج سکینہ</p> <p>پروفیسر راج الدین</p> <p>محمد منظور احمد</p>	<p>ادارہ ادبیات اردو پنجہ گھر روڈ، حیدرآباد</p> <p>زیر سالانہ: بیرونی ملکوں میں</p> <p>۲۵ روپے: ہوائی ٹکٹ سے بھی ڈاک سے</p> <p>کتب خانوں سے مشرق وسطیٰ، اڈالر ۴ ڈالر</p> <p>۳۰ روپے: امریکہ ۱۶ ڈالر ۶ ڈالر</p> <p>بذریعہ خطی، ۵ روپے</p> <p>پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر ۳ ڈالر</p> <p>انگلستان ۷ پونڈ ۳ پونڈ</p>

<p>۱۰۔ بود نمود سا آشوب (کہانی) زاہدہ خوا</p> <p>۱۵۔ غزلین: تاج دار عادل</p> <p>۲۶۔ دلیلی: ایک مطالعہ نجمہ شہریار</p> <p>۳۰۔ نظم: نظام الدین نظام</p> <p>۳۱۔ درد خیال (کہانی) ساجدہ حامد</p> <p>۳۶۔ نقد و نظر: قدر امتیاز</p> <p>۳۹۔ اردو نامہ: وقار خلیل</p>	<p>۲۔ وقار خلیل</p> <p>۳۔ وعدہ اخذ</p> <p>۱۰۔ شاذ تکلف</p> <p>۱۱۔ پروفیسر مارون خاں شروانی سرخواس لاہور</p> <p>۱۳۔ میمنہ محمد</p> <p>۱۷۔ یوسف اعظمی</p> <p>۱۸۔ احمد حسن خان</p> <p>۱۹۔ صغیرا عالم علی ظہیر</p>
---	--

مدیر: علی اکبر بیگ، پبلشر: پروفیسر غلام حیدر خان، چھاپکار: محمد امجد علی، پتہ: ۱۰، لکھنؤ، علی گڑھ

اپنی بات

بزرگ دانشور اور ماہر تعلیم پروفیسر سید علی اکبر صاحب کا ادارہ ادبیات اردو سے دیرینہ تعلق رہا ہے۔ آپ کی رہبری اور مشوروں کا فیضان ہے مگر ادارہ کے اردو امتحانات جو کبھی ریاست حیدرآباد کے اضلاع تک محدود تھے اب شمال اور جنوب تک پھیل گئے ہیں۔ بحیثیت صدر اдалہ، پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے ڈاکٹر زنگہ کے بعد ادارہ کے ایک کونہ صرف قائم رکھا ہے ادارہ کے سابق معتمد اعزازی جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) حال داس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اور دیگر فنکار ادارہ کے تعاون سے ۸۶ء میں ادارہ کی مہتمم باستان گولڈن جوبلی تقاریب کا اہتمام کیا۔

گزشتہ دنوں صاحب موصوف نے اپنی پیرانہ سانس کے پیش نظر ادارہ کی صدارت سے سبکدوشی اختیار کی اور مجلس انتظامی ادارہ نے جناب حامد علی عباسی سابق معتمد قیناس حکومت حیدرآباد کو نیا صدر منتخب کیا اور کرسی صدارت سے مجلس انتظامی نے پروفیسر سید علی اکبر کی گزشتہ خدمات کو ایک قرارداد تہنیت کے ذریعہ قراج تحسین ادا کیا۔ مجلس انتظامی نے طے کیا ہے کہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں ادارہ کی طرف سے ایک نادر جلسہ تہنیت منعقد کیا جائے اور انکی جناب میں ”موشئر“ نذر کیا جائے۔ جناب بمن راج سکینہ جنھیں مجلس انتظامی ادارہ نے نیا معتمد عمومی منتخب کیا ہے، اس جلسہ تہنیت کا کنوینر مقرر کیا ہے۔ جناب سید ہاشم علی اختر سابق معتمد ادارہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انھیں نائب صدر ادارہ کے عہدہ کا پیشکش کیا گیا، جیسے موصوف نے قبول کر کے اپنی روایتی ادارہ شناسی اور ادب دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ ادارہ کی مجلس نظا نے ڈاکٹر مفتی تبسم شریک معتمد ادارہ اور ادارہ کے شعبہ امتحانات کا معتمد اعزازی منتخب کیا۔ ادارہ کے شعبہ امتحانات کو فعال اور کارآمد بنانے میں دکنیات کے محقق اور بزرگ ادیب جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے سابق میں بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر تبسم سے اردو دنیا اور تعلیمی اُفق خوش آئند توقعات رکھتا ہے، یقین ہے وہ اپنے تجربہ کی روشنی میں ادارہ کے اردو امتحانات کو ہر لحاظ سے باضابطہ بنائیں گے۔

ادارہ کے امتحانات اردو حاصل اور اردو عالم کو بہت پہلے عثمانیہ یونیورسٹی نے تسلیم کر لیا ہے، ان کے ساتھ ساتھ ابتدائی امتحانات اردو دانی اور زبان دانی بھی ہیں۔ اب یہ امتحانات ۸ تا ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو آندھرا پردیش، کرناٹک اور بہار اشتراکینیز دہلی کے مرکز پر منعقد ہوں گے۔

مجلس مشاورت ”سب رس“ نے پروفیسر سید علی اکبر کی تدریسی، علمی اور قوی خدمات پر خصوصی شمارہ شائع کیا کا پروگرام بنایا ہے۔ اردو دوستوں کے اشتراک سے ہم اس مشن میں انشاء اللہ کامیاب رہیں گے۔ ●●

وقار خلیل

وحید اختر

غزل کی مضبوط آواز

(خپل گزر سے نمو کی آگ تک)

سیاسی انقلاب کے ساتھ قیما آباد کی تہذیبی بساط بھی الٹ گئی۔ ایک نئی جاتی تہذیب کی برہمی محض معاشی سہولتوں کی چند تبدیلیوں ہی سے عبارت نہیں ہوتی، لاکھوں کروڑوں افراد کی ظاہری اور ذہنی زندگیوں میں بھی انقلاب لانی ہے۔ راستہ قیما آباد کا آزاد جمہوری ہندوستان میں انضمام، سیاسی لحاظ سے لاکھ فوٹس آگے اور آگے یہی، صدروں کے غلوں سے سینچے ہوئے معاشرے اور اس کی اقدار اور اس سے وابستہ زندگی کے لیے پیغام اختتام بھی تھا۔ نئے نظام کے خواب دیکھنے والے بد و جد کی گرا گری اپنے ماضی سے گہری وابستگی کو بھولے رہتے ہیں، لیکن جب وہ خواب حقیقت میں داخل جاتے ہیں تو انہی کی جڑیں جو ہماری رگ رگ میں دور تک پیوست ہوتی ہیں اپنے اکڑنے اور ٹوٹنے کے عمل میں روح و دل کو ہلوا لیاں کر دیتی ہیں۔ شاعر اور ادیب تہذیب سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، اسی لیے تبدیلی و انقلاب کی یکسکاش ان کے اندر شدہ پڑھتی ہے کوئی تہذیب اپنی ہی زمین پر اپنی بقا کے لیے بدلے ہوئے حالات میں نئی صورت نکال سکتی ہے کیوشش نشاۃ ثانیہ کا ایک اظہار بن جاتی ہے۔

قیما آباد کی زبان و تہذیب نے نشاۃ ثانیہ کی یہ راہ خود اپنی ہی زمین پر نکالی اس زندہ اور نواہ شائستہ اور زیرک و وسیع النظر اور روادار، رند و شرب اور صلح کل تہذیب نے جیسے فشارِ قمر کے دو ال ایک نئی کرکٹ لی۔ اور اس فشارِ قمر کے عمل سے اردو کے نئے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور محققوں کی ایک نئی فصل اجری۔ نشاۃ ثانیہ سے سلاٹ تک کے دس سال قیما آباد کی ادبی زندگی میں بڑی ہمہ جہتی تخلیقی جوش، نئی آوازوں کی پردوش اور نئے سطحوں کی تربیت کے سال تھے وہ بسا تہذیب جسے انقلاب زمانہ اپنے پڑھنے، سنے، اور کرکری ہو بہمیت خوردہ، دستوں فریب خوردہ خواہوں اور سب گزشتہ ذہنوں کے سنسان بے آب و گیاہ جنگل میں جہاں ایک طفسِ آیم رفتہ کا ماتم ہو رہا تھا وہاں تخلیقی آوازیں اسی زبان و تہذیب کی جاتہ ازہ کا جش منانے کا اہتمام کر رہی تھیں۔ یہ سکت کا عجیب رد عمل تھا۔ اسی نے بکھرتے ہوئے شیرازے کو ازسب پید کیا۔ وہ آئینہ خانہ، جویا معلوم ہوتا تھا کہ برانے مانوس چہرے بھر کر تار یک و جہراں ہو جائے گا۔ اسے نئے چہروں کی آب و تاب نے پہلے سے کچھ زیادہ ہی روش و آبا کردیا۔ ماسک بعد جب کا سفر سیاسی انقلاب سے سخت تیز و زیادہ بے رحم نکلا۔ نئی آوازوں کے چہرے جو اسے معاش میں ایسے

کچھ کے اطراف و اطراف ہندی میں دور دورہ کرتے نہیں ہیں، سرحد کا دوسری طرف بھی پہنچے اور سات سندھ پار بھی۔ لیکن یہ جہاں گئے اپنی زمین کی قوت، غور، اپنی ہندو بیڈر بال کا جوش خلقیت ساتھ لے گئے۔ ان آوازوں نے اپنے شہر کی تہذیب کے آئینہ خانے کو آئینہ زد کر دیا تھا کہ میرا آئینہ خانہ بھونکا، گم شدہ چہروں کی جگہ نئے چہرے اور دور افتادہ آوازوں کی جگہ قریب کی آوازیں ال کی جگہ لیتی جا رہی ہیں۔

ان ہی آوازوں میں جنھوں نے جید آباد کی تہذیب کے نشاۃ ثانیہ کا چراغ موڑے انقلاب کی تیزی و تندہی میں ریسن رکھا تھا ایک سماں اور نازہ کا آواز اکبر کی تھی۔ غزل بجائے خود ایک کل تہذیب ہے اکبر کی اپنی تہذیب گہری و انگی غزل کی تہذیب گہری تہذیب زقوت کی کراسی دور میں ابھری۔ ترقی پسندی غزل گہری کے بعد اپنے رویے پر نظر ثانی کر کے اب پھر غزل کی طرف رجوع کر رہی تھی۔ فحش کی دست بیا اور پھر زناں نامے کی غزل جس گلشن کی طرز فنا کی شہر رہی تھیں۔ ترقی پسند غزل کا اپنا منفرد لہجہ مخصوص لفظیات اور نئے علام و استعارات سے تشکیل یا کھا تھا اس دور کے تمام نو واردان بساط شعر و ادب کی طرح اکبر بھی ترقی پسندی ہی کی راہ سے اس میدان میں داخل ہوئے اتہا سے ان کے یہاں وہ پتھلی اور ریاضت و محنت کی رباضت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ جنھوں نے ایسے گمراہی میں ادنی ہوش سنبھالا جس میں ادب رجا بستا تھا۔ کئی سال بعد ۱۹۷۰ء میں ان کے پہلے مجموعہ "کلام" خطہ گزرت پر لکھتے ہوئے سمجھا دیکھنے سادگی و سلاست اور طراوت کے ساتھ ان کی غزل میں اس روح عمر کا احساس ہوا جو "رومانی" ذہنی اور نفسانی کیفیات کا عکس ہے، جوانان کے انفرادی اور اجتماعی طرز پر اپنی زندگی کو زیادہ معنی فیز، زیادہ باخبر اور لطیف تر اور روشن تر بنانے کی کدو کاوش کے دوران پیدا ہوتی ہے۔

خطہ گزرت کی ابتدائی ۳۲ غزلیں ان کے قیام جید آباد کی یادگار ہیں جن میں سے بیشتر ترقی پسندی کے مروجہ لہجہ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اُس وقت جید آباد میں شاہ صدیقی ایک کہنہ مشق خوشگوار اور مقبول شاعر تھے جس کی زندگی محدود اور استعارات مخصوص تھے۔ اکبر کی اس دور کی کئی غزلیں میں شاہ کی آواز کی بازگشت ملتی ہے جسے شاہ کی آواز کے آشنا صاف پہچان سکتے ہیں۔ بتلائیے یہ اشعار:

مادشات پیہم کی زردیں رو کے بھی دل نے تیرے خواب دیکھے ہیں تیرے گیت کھائے ہیں
اندھوں نے قسمت کی اک دیا بھجایا جب وصلوں نے انسان کے سودیئے ملائے ہیں
جنہیں تھا اختصار موسم عقل انھیں ہاتھوں میں پچانہ نہیں ہے

اکبر کی اس دور کی غزلوں میں ترقی پسندی کا چہرہ صاف جھلک رہا ہے۔ یہی نہیں اہمیت ان جانے کے بعد جو شہر تک سیال کا غالب لہجہ رہا۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔

غزل اور روایت کے ابتدائی دور کے بعد جب میری شاعری احساس و شعور کی منزل تک پہنچی تو اس وقت کی ادبی تحریکوں کے انداز قبول کیے بغیر رہا۔ یہ ادب میں اشتراک کی رجحانات کا دور تھا۔ اشتراک کی اور

مارکسی نظریات محض سیاسی نہیں ان میں زندگی کا ایک وسیع نظریہ موجود ہے اور سیکڑوں اقدامات ایسی ہیں جنہیں ذہن فلسفے کے طور پر قبول کر لیتا ہے۔

لیکن وہ یہ بھی مانتے اور مانتے تھے کہ اس یقین و ایمان کی منزل پر بھی داخلی کرب، احساس شکست اور اندوہ و غم کی برجستہ مثال ان کے ساتھ لگی تھیں۔ وہ تغزل اور رومانیت جسے وہ بزمِ خودیچھے چھوڑ آئے تھے کہیں کہیں اب بھی چمک اٹھتی تھی۔

کچھ خمیر تو ہے کہ ہر تمنا کروٹ سیما بدل کے سو گئی ہے

غم دور ال حقیقت ہے تو اکبر غم جاناں بھی افسانہ نہیں ہے

انتظارِ شب و عمدہ یہ سبھی موقوف نہیں یہ قیامت نو دل زاریہ اکثر گزری

ہائے وہ بھر کن آخری فرقت کی گھڑی جو کبھی وصل کی ساعت سے بھی خوش تر گزری

اسی کے ساتھ ان کے یہاں تغزل کا وہ شوخ رنگ بھی اس دور میں ملتا ہے جو حسرت کی ماسخہ شاعری اور مددِ مافیہ کی یاد دلاتا ہے۔

اکبر اس کے بعد بھی برسوں رومانیت کے تیج و تیج تہہ خانوں کی بھول جھیلیاں میں احساسِ بلا وطنی اور ہم عصر قہد کی سہاک حقیقتوں کے شعور کی شمع لے کر در تک سرگرداں نظر آتے ہیں — ان کی جستجو کا سلسلہ محبتِ زادہ اور پنہان بھی روشن و سرگرم سفرِ فطر و نظر آتا ہے۔ اس دہائیہ پن کے لیے شاعر کا اندر قابلِ لحاظ ہے۔

ہے دورِ جہد کہاں فرصتِ سخنِ اکبر روانی طبع میں مشتقِ سخن سے آئی ہے

ترک وطن سے قبل کا کچھ غم و انداں اس کے بعد کے کئی برس ان کے اشعار میں الفاظ کے تیجے ایسا محسوس ہوا

بے کاندہ زنی کشمکش اور کسی بڑے رومانی یا رومانی مادے پر غالب آئے کی کوشش میں گھر چلے۔ وہ تندر کو شاید اس سخن

الفنی کا پروردہ بنانے سے بھی گریزاں رہے ہیں — اس مادے کا سراغ ان شعروں میں ملتا ہے۔

کہا کہیں زیت تر ہے ہجر میرا کیوں کر گزری مستقل ایک قیامت تھی جو دل پر گزری

گزر چکا ہوں زندہ گی میں اس کڑے مفا سے جہاں تمھاری اد میری ہم سفر ہو سکی

فصل دیوانچی میتی تو وہ رشتے ٹوٹے علمی کبھی دست و گریباں میں شناسائی سی

بحر میں ہمارے جہد کا مقصد نہیں بیسویں صدی کے دوسرے نصف نے ہجرتوں کے آنے والے دیکھے ہیں کہ شاید چشمِ انت پر پوری انسانی تاریخ میں بیک وقت اتنے بلا وطنوں کو خسار نہ کیا ہو گا۔ ہجرتوں کا یہ لائقناہی سلسلہ کسی نئے

نمردے کی اشاعت کا ابقان خیر سفر نہیں ہے یعنی تذبذب، خوف اور اندیشوں کی سہرہ سال دستِ پائی ہے

دست کی جگہ انسانوں کے گنجان جھگڑوں نے لے لی ہے۔ جہاں ہجوم میں سب ایک دوسرے سے نا آشنا ہیں۔ مائتانی ثقافتوں

کی مکملان ہجرتوں کے اس بے کراں صحرائیں جگہ جگہ اسیر آئے ہیں سمجھ کر یہ سبھی سمجھا سکا ہے کہ ہمارے دیس کی معیشت

کے جہر کے ہاتھوں بلا وطن ہوئے والوں کے توسط دور دیسوں میں بھی جاری ثقافت اپنی جڑیں چلا رہی ہے۔ لیکن

اجنبی زمینوں میں جڑ کرنے کی یہ کوشش کتنی مال گداز اور صبر آزما ہے اس کا اندازہ انہی کو ہو سکتا ہے جو فیر ملک غیر تہذیب، غیر زبان کے دشمن ماحول میں اپنی ثقافتی شناخت قائم رکھنے پر مصروف ہیں۔

کسی اجنبی تہذیب و معاشرہ میں خود کو سمونے کے لیے غریب نہیں سلیس درکار ہوتی ہیں۔ اگر نے اس سعی لامحل کی جگہ اپنی تہذیبی شناخت کو جھکا کر ماحول میں جبراً رکھنے کی کوشش کا انتخاب کیا۔ اس عمل میں ترقی پسندی اور مارکسزم کے تصورات نے کچھ دور تک ان کا ساتھ دیا۔ خطہ گزر کی غزلوں اور نظموں میں انسان کی وحدت اور اس کی سعی فلک گیر کی فسخ مندیوں پر ایمان مستحکم نظر آتا ہے۔ لیکن شاید یہ تصورات سہاڑتے ہوئے بھی کافی ثابت نہ ہوئے۔ انہیں تلاش ذات کے معصومانہ بھرے سے بھی روح کی گہرائی میں گزرنا پڑا۔ تلاش ذات آج ادبی تنقید اور شعری محاورہ کی بیس بافتادہ اور نئی ہوئی اصطلاح بن گئی ہے۔ اگر جو صدی یکتان کے ادبی ماحول اس کی جڑوں اور اصطلاحوں سے بہت دور اور ٹری مد تک بے خبر بھی رہے، فیتس زدگی کی رو میں ذات باغزالہ ذات کاورد میں کرنے۔ ان کے مہالہ العاطفہ ان کے اپنے گہرے اور سچے روحانی تجربے سے عبارت ہیں شعر میں معتبر اور ناجہر کی لونی کسوٹی بحر ذوق سلیم کوئی اور نہیں۔ اسی کسوٹی پر کسا مائے بشر ملکہ بہ ذوق شوقی تنقید بعد سے عطا بھی ہوا ہونہا اگر کے خیرے کی سچائی اور معنوی کا احساس مہلا لازمی ہے۔

انظار را اینے بے سما، انفس را اینے بے	باس کا صحرا، سمندر اس کا ہم بھی رہے
جسم کے طمعت کدے میں صورت تبدیل ذات	سنگڑوں یردوں میں رہ کر برطام بھی رہے
یرج نہ سمار استاخم کا کبھی ایسا	گہماں نہ سجادت تنہا کبھی ایسا
جوف آنا ہے ہر مادہ مانوس سے ہم کو	کس شہر یہ تنہا سا بہ صحر ا کبھی ایسا
بجلی کوئی اعصاب سے ہونی ہوئی کرنی	جنا نہ تنہا آوار کا شعلہ کبھی ایسا
وابستہ ہیں نوہم سے زمان و مکاں رہے	سب کچھ ہمارے ساتھ رہا ہم کہاں رہے
ہستی کو ہم نے ڈھونڈ نکالا و گر نہ بسم	اک جنس نارسا کی طرح رانگاں رہے
ہے کدھر میری زمیں کس سمت میرا آسمان	کیسے ہالے میں مجھ ہر سمت سے گہرے ہوئے
نہا ستور اس کو قطع اسی جی گہرائی کا	وہ سمندر کہ سمجھتا رہا یا یا مجھے
میں جھٹکتا جی رہا پسند کے صحر اؤں میں	رات لے جس سخی نہ لوٹا مے مرے خواب مجھے
نہکت دنگ کے مانند سمن زاروں میں	ہم بھی موجود کوئی ڈھونڈنے والا نہ ملا
میں ناگہاں کے طلسمات کا سمندر میں	ہے موج موج مری مادرات کے مانند
یہ آج اس پہ عجب فریبوں کا سحر ملا	وہ کھلتا جانا ہے اسرار ذات کے مانند
برجیاں ہم کی لیے قاتل ہوا ہے اور ہم	ہر طرف اک منظر دشت فنا ہے اور ہم

سنساتی ہے فضاؤں میں ہوائے تند و تیز سامنے اک ٹٹھاتا سا دبا ہے اور ہم
کس تمنا کا تعاقب کر رہی ہے زندگی سلسلہ کوئی سراب و خواب سا ہے اور ہم
اپنی تلاش کا یہ تخلیقی عمل مخصوص تاریخی سماجی موقف (SITUATION) میں موجودگی کے شعور سے
ارہ ہے۔ موجودگی کا یہ شعور وجودیت کی اصطلاح میں وجود انسانی کو "وجود — در — دنیا" یا "وہاں
ے (TEREMESS) کا احساس بخشتا ہے۔ وہاں ہونے کے احساس میں دوسرے انسانی وجودوں سے ربط اور
میں سمجھنے اور ان کی انفرادیت کے احترام کرنے کا احساس بھی شامل ہے۔ یہ ربط انسانی روح اور بدل دونوں
لمحہ کار فرما رہتا ہے۔ لیکن اس کی مکمل آگہی شعور ذات ہی کے وسیلے سے ممکن ہے، اگرچہ یہاں وجود
نئے پھلتے ہوئے دوسرے وجودوں سے ملتے ہوئے سلسلوں کا شعور داخلی تجربے کی سطح پر ملتا ہے۔ بہنو اور
را کا اظہار اردو غزل میں اگرچہ بالکل نئی چہرہ نہیں۔ مگر صید حسیب کا انبیاء ہی وصف ضرورتاً ہی شعور
نوسلہ سماجی شعور اور اس کی یا مال اصطلاحات سے بحال کر تخلیقی انفرادی زبانی سے روشناس کرنا ہے۔ اس تک
سمجھنے کے لیے وہ ذات کے حصاروں اور دیواروں کو توڑنے کی حرا — سخی کرتے ہیں ے

دور کر کے سیل رنگ و نور سے کیسے مجھے جس رہا ہے اپنی دیواروں میں مبرا گھر مجھے
میں بدل کی سطح پر بھی جا دوں ہواؤں کا نہ کہہ کر کے دیکھ اتنی روح نے اندر مجھے
یہ رہن میری رہن بنتا جلا جاتا ہوں میں ذات میری مجھ سے کہتی ہے، بہہ کر مجھے
یوں سنگ دل جیات سے عہد وفا کا دیوار درمیاں سمیٹ کر جو، لو والہا
مٹی کا رنگ و پور سے رشتہ قدم سخا ہمارے، گئی ہے اس — رہ گیا
مجھے دست برس میں یوں دوسرے رکنا ان — رہ گیا — رہ گیا — رہ گیا
پنہائیوں میں روح کی لہنا نہ ہو وہ ساس اس لوہا رہی ہے، یہ ڈھنڈا رہا
اک یاد سخی کہ اُڑتی رہیں جس کی ہمتیں آج خواب سمیٹ کر میں جیسے سمولہ رہا
فرصت ملی نہ شیریں دیوار سے مجھے ہنگامہ کیا خبر اس دیوار کس رہا
ہم اک اصطلاح عجب خنک و تر میں تھا میں گھر میں آ رہا، ایسا، مائیکہ غبر میں تھا
یہ وہی تجربہ یہ ہے جس کو صوفیائے نقش بندہ کی اصطلاح میں شمس الرحمن فاروقی نے اگرچہ سفر وطن تجربے
سے تعبیر کیا ہے لیکن اکبر سلوک کی اصطلاح میں دوسرے مقام سے بھی گزرے اور گزر رہے ہیں جسے ذہن نے
وطن در سفر کیا ہے۔ آخری شعر میں گھر میں آ رہا تھا، مگر سفر میں تھا، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ سفر کو
وطن بنانا اور وطن میں رہ کر بھی سفر میں ہونا ایک ہی تجربے کے دو اہم تکنیکی پہلو ہیں۔ اس دو پہلو تجربے کے مدایانی
نمل کی ترکیب انسانی فطرت سے ہم آہنگی ہی میں ممکن ہے اگرچہ یہاں ایسے کئی محلوں کا تخلیقی اظہار بہت روشن

ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔ فطرت سے قربت ہی نہیں بلکہ ایک جان ہونے کا یہ احساس ان کے اشعار میں بہت نمایاں ہے جسے ہم نئی حیثیت کا متھو خانہ تجزیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس کا رو بار جان و جدیر بھماہ رکھ
ہی کسی کسی نعمتیں آب و ہوا میں دیکھ
سن تو خرام وقت میں میں کسی آٹش
کیا رنگ پریشاں ہیں فبار ہوا میں دیکھ
میں ڈوبتا رہا نیان کے سمندر میں
مری تلاش میں صحرائے صبح و شام رہا
وہ بے کنار سمندر تھا ہم کنار مگر
میں ایسا دشت طلب تھا کہ شہ کام رہا
ریگ زاروں کے دلوں کی دھڑکنیں
سہی رہے ہیں نغمہ دریا میں ہم
اسی مٹی سے تو ابھر کر ہیں ضد و خال اپنے
مسنی و حرف کا رشتہ ہے جہاں سے اپنا
نفس کو مثل نفس ہم نے سبک جانا تھا
دب گیا جسم اسی بارگراں سے اپنا
اور اس سے یہ والہانہ عارفانہ نغمہ پیدا ہوتا ہے۔

زندگیاں صبح و شام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
اک گردشِ مدام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
بے فرش و بام سلسلہ کائنات کے
اس بے ستوں نظام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
بے سال و سن زمانوں میں پیٹے ہوئے ہیں ہم
بے رنگ نسل نام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
اس دائمی حصار سے راہ مفسر کہاں
ذروں کے ارد و مدام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
تیرے، ہرے بکھرے سے ہے سارا انتشار
تریب و اہتمام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
مہراں بھی تیرے زباں سے ہے منسلک
خوابوں کے اہتمام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

یہ نئی حیثیت کی آفاقیت ہے جو ان سے کھلوا رہی ہے۔

نہ صداؤں کا ہے وطن کوئی، نہ ہواؤں کا ہے کوئی متن

ہیں ہر روش ہمیں ہر جہت، نہ جنوب ہم نہ شمال ہم
یہ ہوا، یہ آگ، یہ آب و جبل ہیں ملائش ہی ملائش

کہ قنصل شب دروز میں فقط ایک حرف سوال ہم

اکبر کے مہاں اس حیثیت نے فنا کے احساس کو منفی شکست خورہ تجربہ بننے نہیں دیا۔ محدودیت کا احساس ال کے مہاں لا محدود دہ زماں سے رشتہ استوار کرنے کی ملکہ بن گیا ہے۔ جدید حیثیت کا منفی پہلو تو ہماری شاعری میں عام ہے، لیکن اس کا بے اثباتی رُخ قنصل اکبر کے مہاں نمایاں ہے، نایاب نہیں تو کم باب ضرور ہے۔ اکبر کے فنی ریاضی، تہذیب، فنرل سے ان کی وابستگی زبان کے معاملے میں ان کی احتیاط اور لغظوں کی تخلیقی مزاج شناسی نے اس حیثیت سے مل کر فنرل کے اس مضبوط لہجے کو جنم دیا ہے جو غمو کی آگ کا شناس نامہ ہے۔

وہ موج کہ صحر کدھر آج بہا لے گئی ہم کو
یوں ہی نہ گئے اپنی تباہی کی طرف ہم
تقی بے جسی غفلت کہ خود اپنی اناستی
مصل ہی کا کیا ذکر کہ مقل کی طرف بھی
تھا ہی سمجھ کر جو اٹھا لے گئی ہم کو
ایک شکستِ بیم ورجا لے گئی ہم کو
جو شہرتِ آساں سے بچا لے گئی ہم کو
وابستگی رنگِ خالے گئی ہم کو

غزل کی مضبوط آواز حجاب تک خود کو شہرتِ آساں سے بچائے رہی اس لحاظ سے اور قابلِ داد ہے کہ اس کا چراغ سات سمندر پار ۳۵ برس سے روشن ہے۔ اکبر نے حیدرآباد کی تہذیب سے جو نور کبیکھا اسے اپنے وجود کی آگ سے انہوں نے بڑے عین سے تابندہ کر دیا ہے۔ 'نمو کی آگ' غزلوں کے ساتھ اُن کی نظموں میں بھی روشن ہے۔ غزل اور نظم کے شاعر کی تفہیم و تفہیم سے نزدیک مضموعی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ کچھ شاعر اپنے منفرد اظہار کے لیے کسی ایک صنف کو غیر شعوری طور پر محض کر لیتے ہیں۔ اختصار کا یہ عمل اکبر کے یہاں بھی ملتا ہے۔

اکبر چھوٹوں کے اس دور میں ہم کو وہ روشنی دینے آئے ہیں جسے وہ ساری ہی تہذیب سے لے گئے تھے، یہ نثری بات ہے کہ وہ حاجرت کے باوجود منغم نہیں ہوئے، اور اسی تہذیب کو اپنا وجود بنائے رہے۔ نمو کی آگ اُن کے وجود کا تخلیقی اظہار ہے اور مشرق و مغرب کی وجودی وحدتِ دہم آہنگی کا ایک دل آویز تجربہ۔ اکبر نے قدیم و جدید، ترقی پسند و غیر ترقی پسند کے ذہنی تحفظات کے لیے نیاز رہ کر اپنے انفرادی تجربے اور حسیت کو حسِ آفاقیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے وہ احمس تہمتِ آساں کی بجائے دیرباب توجہ کی مستحق بناتی ہے۔ جدید غزل میں اتنی مضبوط آوازیں جن میں کلاسیکی رجاؤں بھی ہوا اپنے انفرادی تجربے کے پُر اظہار اظہار پر قدرت بھی ہو کر ہیں۔

واپسی کا بقایا ۲۹ سے آگے

مطلودا ہے۔۔۔ بچپن جو زندگی کا خوبصورت ترن دور ہوتا ہے۔ ہماری مصوبت ہم سے جدا ہو کر جیکے جیکے روتی ہے اور ہم اپنے تجربہ سار ہوئے پر فخر کرتے ہیں۔۔۔ جس خوبصورتی سے ایک انوکھے تجربہ کو، ایک نادر لمحے کو گرفت میں لا کر پیش کیا گیا وہ نادر طبع کی عظمت کی دلیل ہے یوں کہانی بذاتِ خود ایک حسنِ شعری باقی ہے۔ اور ہماری بعیرت میں دیترا نگراں اخذ کرتی ہے جو بڑے فن کی مصراع ہے۔

شاذ تملکت ، دوغِ زلیں

کب رت چھوٹے کب محل کھلیں ہم کو پتہ کچھ بھی نہیں
یہ شہر کیا شہر ہے، آب و ہوا کچھ بھی نہیں
اپنا وجود اپنا عدم اک بند مٹھی کا بھرم
مانا کہ ہے کچھ بھی نہیں، سچ ہے کہ تنہا کچھ بھی نہیں
ہر لذت دنیا کو چلے ہر سانس کو گن گن گمے رکھ
سب جیتے جی کے ٹٹاٹ ہیں بھینا کچھ بھی نہیں
جب دل شگفتہ ہو میاں پھر لطفِ بزمِ کیکشاں
بوندیں پریں تو کیا ہوا، کالی گھٹا کچھ بھی نہیں
تو کیا بھلا دیں سب مزے، علے لطیفے رت جگے
وعدے جو ایماں بن گئے آخر یہ کیا کچھ بھی نہیں
کل چاند اتر اترے گھر آزدہ روز با چشم تر
میں نے کہا کیا بات ہے اس نے کہا کچھ بھی نہیں
جب حسنِ خود ہو منظر اے شاذ کیوں تانے پیر پھر
ناخن ہے پچ و خم کشا، بند قبا کچھ بھی نہیں

○

آنکھ ساقی کی جگر آوے دل سا غریب
جب مرے بعد کوئی تیرے برابر بیٹھے

تہ نشینی دگر چینی جنوں مانگے ہے
سوچتے رہ گئے ساحل پہ شادری بیٹھے

ایستادہ تھے جہاں صاحب دستار و کلا:
تھے اسی بزم میں ہم جیسے گداگر بیٹھے

ہم نے سرم رکے یہ اندازِ سخن پایا ہے
تم کو تو حسن ملا ہے مری جہاں گھر بیٹھے

ننگ کو سنگ نہ کہہ نجد کو صحرا نہ سمجھ
شاذ کا ٹھیک نہیں جانے یہ کیا کریٹھے

○

مسدود نیواس لاہور

پروفیسر ہارون خان شروانی

موت ابن آدم کی میراث ہے۔ جو پیدا ہوا ہے اسے ایک نہ ایک دن مرنا ضرور ہے لیکن جب کسی عالم یا مورخ کی موت واقع ہوتی ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے۔ اور یہی حال میراجی ہوا، جب میں نے ۱۶ ستمبر ۱۹۸۰ء کے اخبارات میں پروفیسر ہارون خان شروانی کی موت کی خبر پڑی۔

تاریخ یاد نہیں ہے لیکن ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ قاضی عبدالغفار نے پروفیسر عجیب کے اعزاز میں ایک استقبالیہ ترتیب دیا تھا اس میں پہلی بار مجھے پروفیسر ہارون خان شروانی سے ملنے کا موقع ملا۔ اس وقت تک وہ بہ حیثیت محقق اور سیاست کے استاد کے بڑا نام کما چکے تھے اور پڑھ لکھ طبقے میں ان کی بڑی ساکھ تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ وہی ہارون خان شروانی ہیں جو افغانیوں پر ہلکتے نہرو کے ساتھ تعلیم پانے کے علاوہ برسرطری کا امتحان بھی ایک ساتھ کامیاب کیا تھا۔ البتہ یہ آکسفورڈ کے ٹیلنٹ تھے اور ہلکتے نہرو کیمبرج کے۔ ہلڈت نہرو کے میدر آباد میں اور ایک ساتھی بھی تھے جو ہیرنڈ کے پبلک اسکول کے علاوہ کیمبرج اور قازن کی تعلیم بھی ان کے ساتھ حاصل کی تھی ان کا نام محمد شاد ارشد تھا جو عالم جماعتی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ شروانی صاحب نے کبھی اس بات کا چرچا نہیں کیا کہ وہ انگلستان میں قیام کے دوران میں جو اہرلال نہرو کے ہم عصر رہے ہیں مجھے اس بات کا پتہ تو اس وقت چلا جب کہ ہلڈت نہرو

۱۹۵۶ء میں اردو بلال کا افتتاح کرنے تشریف لائے تھے اور پروفیسر شروانی جلسہ گاہ کی اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے جب ہلڈت نہرو ڈانس پر پہنچے اور ادا انہوں نے ہارون خان صاحب کو دیکھا تو وہ فوراً ڈانس سے اتر آئے اور ہاتھ ملاتے ہوئے یہی نرم لہجے میں انگریزی میں کہہ کر HOW ARE YOU HARBON صاحب نے مجھے پتہ چلا کہ ہلڈت نہرو کا اور ان کا برسوں انگلستانی میں ساتھ رہا ہے۔ چنانچہ ہلڈت محقق لال نہرو پر ایک مضمون لکھے ہوئے ہارون خان صاحب نے قریب کیا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں وہ ایک قلعہ کی ایپیل دائرہ کرنے کے لئے الہ آباد ہائی کورٹ گئے تھے تو وہاں اچانک ہلڈت نہرو سے ان کی ملاقات ہو گئی تو انہوں نے دریافت کیا کہ تم یہاں کیسے؟ تو شروانی صاحب نے فرمایا کہ میں ایک مقدمہ میں ایپیل دائرہ کرنے آیا ہوں۔ اس پر جو اہرلال نہرو نے جو اس وقت ایف وولڈ کے ساتھ پرائکٹس کرنا تھے کہا کہ ایپیل تو داخل ہوتی رہے گی تم میرے ساتھ گھر چلو، کھانا بھی وہیں کھاؤ اور میرے والد سے بھی ملو۔ شروانی صاحب کے اس مضمون میں اس وقت کے سیاسی حالات کی بڑی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ اس وقت ہارون خان صاحب یو۔ پی۔ صوبائی خلافت کمیٹی کے مقرر اور علی گڑھ ضلع کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کارگزار تھے۔ اس واقعہ کے چند ماہ بعد ہی ہارون خان صاحب جامعہ عثمانیہ

سے وابستہ ہو گئے اور غالباً پہلے سال کے استاذ میں اس وقت تک موت وہی بے حد حیات تھے اس لئے ان کی موت سے جامعہ کا تاریخ کا یہ باب بھی ختم ہو گیا اور اب صرف اس کی یاد باقی رہ چکی۔

جب میں ہندی پرچار بھا اور اسی کے بعد انجمن ترقی اردو میں کام کرنے لگا تو مجھے ہارون خان صاحب کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انجمن میں جب میں نے ۱۹۵۸ء میں کام کرنا شروع کیا اس وقت شرفانی صاحب انجمن کے نائب صدر تھے اور برسوں اس عہدے پر فائز رہے۔ اور ان ہی کے مسلسل اصرار پر انہیں اس عہدے سے سبکدوش کیا گیا۔ جب انجمن کے صدر اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر غلام نیر خانی کا انتقال ہوا تو ان کی یاد کو باقی رکھنے کے لئے "یادگار جلد" شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اس کے لئے جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس کے صدر ہارون خان صاحب ہی بنائے گئے۔ میں بھی اس کمیٹی کا ایک رکن تھا۔ اور مجھے ان کے طریقہ کار کا شاہدہ کرنے کا موقع ملا کہ وہ کس طرح لوگوں سے کام لیتے ہیں اور کس طرح سے اپنا مقصد کام انجام دیتے ہیں۔ دو سال کی مقررہ مدت میں ہارون خان صاحب کی سچی سے یہ ضخیم یادگار جلد طبع ہو کر منظر عام پر آئی تو ہر ایک کی زبان پر سکہ حسین تھا۔ یہ ان کے علمی کام کرنے کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ مرحوم نے سلاطین بھی اور قردوں و غلا کی دکن تاریخ پر جو بحثیں کام کی ہیں اسے زمانہ بھلا نا چاہیے بھی تو نہیں بھلا سکے گا۔ ان کی ایک حادثت تھی کہ وہ کوئی کام اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑا ہچکچاتے تھے اور جب وہ کام ان کے سر منڈھ دیا جاتا تو وہ اسے اس خوبی سے انجام دیتے کہ یہ بات آج کی نسل کے لئے ایک نمونہ اور قابل تقلید مثال ہے۔

بجائے رکھ کر قانون ساز کونسل انہوں نے کونسل اردو کے مسائل پر جس بے باکی کے ساتھ حکومت کو متوجہ کیا کرتے تھے اسی کی کوئی اور مثال آج کے دور میں مشکل ہی

سے ملے گی۔ جب بھی وہ کسی مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیتے تو اس کو پاس کیس تکمیل تک پہنچاتے بغیر ان کو جین لیب نہیں ہوتا تھا۔ بسا اوقات تو وہ مولد اکٹھا کر کے لے لے اپنی چٹری ہاتھ میں اُردو حال آجملہ اور جس مواد کی انہیں ضرورت ہوتی اسے وہ اسی وقت حاصل کر کے جاتے تھے۔ اگر انہیں مواد کے حاصل کرنے میں تاخیر ہوتی تو وہ کوئی اور بات کئے بغیر اُردو حال سے روانہ ہو جاتے تھے۔

تاریخ اور سیاست کے وہ کیے استاد تھے اس بات کا گواہی تو ان کا کوئی شاگرد ہی دے سکے گا۔ لیکن "سیاسیات کے اصول" یا تاریخی موضوعات پر ان کی تقریر کردہ تعریف کا جن لوگوں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے وہ ضرور اس بات کے قائل ہوں گے کہ ان کی ہر تقریر پڑھنے والے کی تشفی کا باعث بنی اچھا ادیب یا اچھا مودع آدمی اس وقت بن سکتا ہے جب کہ وہ اچھا انسان بھی ہو اور یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ہارون خان صاحب ایک سچے انسان اور ایک سچے مسلمان تھے۔ وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ دلی میں تو ایک بات پر شدید مہے مگر زبان پر وہ دوسری بات لائیں۔ اس لئے بسا اوقات بڑی اچھٹیں بھی پیدا ہو جاتی تھیں اور وہ مجلس سے اٹھ کر چلے جایا کرتے تھے لیکن وہ گھر جا کر یہ محسوس کرتے کہ ان سے زیادتی ہوئی ہے تو وہ فوراً ہی اپنی تقریر کے ذریعہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کر لیا کرتے تھے۔ یہی ان کے اندر چھپے ہوئے انسان کی نشانی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں اور بھی کمزوریاں رہی ہوں لیکن ان کی یہ کمزوریاں ایک اچھے شاعر کی کمزوریاں تھیں جس سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس لئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ حال حال ہی ایسے انسان ایسے استاد، ایسے مورخ پیدا ہوتے ہیں جنہیں ہارون خان شرفانی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ●●

پطرس کی تحریف نگاری

طنز و مزاح پیدا کرنے کے بہ شمار طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ انہی طریقوں میں سے ایک اہم طریقہ ہیروڈی یا تحریف کی شکل میں ملتا ہے۔ یہ صنف بھی مغربی ادب سے آندوئی آئی۔ جس طرح سے مغربی ادب کی کئی اصناف یونانی اور لاطینی الفاظ سے بنی ہیں۔ اسی طرح سے انگریزی کا یہ لفظ ہیروڈی بھی یونانی لفظ "ہیروڈیا" سے لیا گیا ہے۔ اصل میں ہیروڈی کا مفہوم ہی کسی بات کا جواب دینا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے لکھا ہے کہ ہیروڈی کا مفہوم یونانی زبان میں جوابی فقرہ ہے۔ ہیروڈی ایک بہت ہی قدیم صنف ادب ہے۔ ارسطو نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں "ارسطو بتا رہا ہے کہ یہ صنف پانچویں صدی قبل مسیح میں وجود میں آئی۔ اس کا خیال ہے کہ جیگوس نے پہلے پہل GIGANTO MACHIA دینا اعدوں کی جنگ لکھ کر ہیروڈی کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن بعض ادبی مورخین کا خیال ہے کہ اس سے بھی پہلے ہیونکس نے جوہر کی ایک نظم ہیروڈی کی ہے۔" ۱

آندو میں ہیروڈی یا تحریف نگاری کے ابتدائی نقش و نگار مختلف اصناف سخن میں ملتے ہیں۔ قدیم اردو شاعری میں بھی اس کے کچھ نقش و نگار، انشاد اور مصحفی کے ہاں مل جاتے ہیں۔ بعد کے دور میں اودھ پنج میں بھی تحریف نگاری کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔ جیسے سجاد حسینی، پنڈت جیمن ناتھ جیر، اکبر الہ آبادی وغیرہ کے یا ساس اس کے بعض نمونے مل جاتے ہیں۔ لیکن ہیروڈی کو شعوری طور پر استعمال، بیسویں صدی ہی میں کیا گیا۔ خاص طور پر اردو نثر میں ہیروڈی کا استعمال سب سے پہلے پطرس ہی کے پاس ملتا ہے۔

ہیروڈی وہ صنف ادب ہے جس میں کسی مشہور و معروف تحریر کی نقل اس طرح سے کی جاتی ہے کہ مزاحیہ پہلو ابھرتا ہے۔ ہیروڈی کا مقصد جہاں مزاح پیدا کرنا ہوتا ہے وہیں خوش گوار انداز میں طنز کرنا بھی ہوتا ہے تاکہ اس مشہور و معروف تحریر کی پرستش کم ہو جائے اور زیادہ توازن کے ساتھ اس ادبی تخلیق کی تنقید ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نیر اکسفورڈ ڈکشنری میں لکھا گیا ہے، "ہیروڈی کو مصنف کی کسی خاص تخلیق تک محدود ہونا چاہیے۔ اس طرح کہ اس سے اصل کی مزاحیہ انداز میں تنقید ہو۔"

پطرس نے گویا وہ ہیروڈیاں نہیں لکھی ہیں۔ لیکن ان کی ہیروڈیاں مضامین پطرس میں ملتی ہیں۔ "ایک اردو کی آخری کتاب" دوسری "امجد کا جغرافیہ" اپنی تحریفات سے اردو نثر میں ہیروڈی یا تحریف نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کی ہیروڈی کو بجا طور پر اردو ادب کی پہلی ہیروڈی قرار دیا گیا ہے۔ تمکین کاظمی بھی پطرس کو اردو کا پہلا ہیروڈی نگار ثابت کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "اردو کی آخری کتاب" یہ ہیروڈی ہے اور اردو زبان کی سب سے پہلی ہیروڈی ہے۔ آپ فرمائیں گے پہلی کس طرح

ہوئی۔ پطرس سے پہلے بھی لوگ نہ پیروڈی لکھی ہے! سماں کے متعلق میرا جواب ہے کہ پیروڈی کو پیروڈی سمجھ کر اور پیروڈی کے طور پر سے پہلے پطرس نے لکھا۔^{۱۰}

اسی طرح ڈاکٹر شریف احمد علی پطرس کی پیروڈی کو آئندہ شوکیا سب سے پہلی اور کامیاب کوشش قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ”آئندہ نثر میں کامیاب پیروڈی پطرس کی اولیا میں سے ہے۔ ان سے پہلے صرف آئندہ نظموں اور شعروں وغیرہ کی گمراہ پیروڈی کی رہی تھی۔“^{۱۱}

ڈاکٹر وزیر آغا پطرس بخاری کی تحریف نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں: ”جدید آئندہ نثر میں اس کی بہترین مثال پطرس کی تہ پیروڈی“ آئندہ کی آخری کتاب“^{۱۲}

پیروڈی کیا ہوتی ہے۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں، پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی لفظی نقالی کا نام ہے جس سے تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ تحریف کا بنیادی اور امتیازی عنصر نقل ہے۔
تحریف کا بنیادی وصف یہ ہے کہ تحریف اعمال، اشیا، یا تخلیقات کی ”خلعت“ کو زندگی کے خیر اہم مظاہر سے مربوط کر کے خلعت کے سوا ہرچہ پاک کرتی اور ناظر کو کھلم کھلا کے پہننے پر آمادہ کرتی ہے۔“

پطرس نے محمد عیسیٰ آزاد کی مشہور کتاب ”آئندہ کی پہلی پہلی تحریف کی ہے۔ یہ کتاب نصابی کتابوں میں بے حد مقبول تھی اور ساہب سال تک یہ کتاب اسکولوں میں بچوں کو پڑھائی جاتی رہی ہے۔ یہ کتاب اس کثرت اور اتنے متواتر انداز سے نصاب میں شامل رہی ہے کہ اس کو دہرے ایک ہزار گئی سی اس کے تعلق سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ کتاب ایسی زمانے میں اپنی کثرت استعمال کی وجہ سے مختلف ناموں سے پکارتے جانے لگی تھی۔ تمکین کاظمی اس تعلق سے لکھتے ہیں: ”پیروڈی کو سب سے پہلے پطرس نے اپنا یا آئندہ میں پہلی کوشش پیروڈی کی جو کہ وہ آئندہ کی آخری کتاب ہے۔ پنجاب کے محکمہ تعلیم نے مولانا محمد عیسیٰ آزاد سے ایک سلسلہ آئندہ نصاب کا مرتب کر دیا تھا جو سب ہندوستان میں لاگو کر دیا گیا۔ اس کی پہلی کتاب ہی میں ”ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔“ تھا اس لیے بچے سے ماں بچوں کی کتاب ”لکھتے تھے آئندہ نام ایسا پڑ گیا تھا کہ اس سلسلہ ہی کو ”ماں بچوں“ کے نام سے مشہور کر دیا گیا اور اس پختہ کی پہلی، ”ماں بچوں کی دور“ ”ماں بچوں کی تیسری کتاب“ کہلانے لگی۔ ہمارے بچپن میں یہ سلسلہ شریک نصاب تھا۔ اور پطرس نے بھی ابتداً اسی کو پڑھا ہے معلوم نہیں وہ کب سے اس کے متعلق سوچ رہے تھے۔ آخر وہ مذکورہ اوامروں نے یہ پیروڈی لکھ دی۔“^{۱۳}

تحریف نگاری کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ملتا ہے۔ بعضوں کے نزدیک تحریف صرف تفسیر یا پیدا کر کے لیے کی جاتی ہے۔ لیکن بعض اسے سمجھدہ مقصد کا حامل قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ تحریف کے ذریعہ بڑے بڑے ادیبوں کی بے اعتدالیوں کو مد کٹا کر اس کی اصلاح کرنا ممکن ہے اور یہی اس کا بنیادی مقصد ہے۔ اصل میں اچھی تحریف میں یہ دونوں ہی باتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ تحریف نگار اس طرح ایک تو کسی بھی کلام یا کلام کے تعلق سے کتاب کے مسلسل استعمال

۱۰ رسالہ نقوش“ پطرس نمبر“ مضامین پطرس کا مطالعہ“ از تمکین کاظمی ص ۱۲۰

۱۱ ”مشاہدے“ ڈاکٹر شریف احمد ”پطرس بخاری“ ص ۱۱۰ آئندہ ادب میں طنز و مزاح“ از ڈاکٹر وزیر آغا ص ۲۶

۱۲ رسالہ ”نقوش“ پطرس نمبر“ پطرس کی تحریف نگاری از وزیر آغا ص ۱۱

۱۳ ”نقوش“ پطرس نمبر“ مضامین پطرس کا مطالعہ از تمکین کاظمی ص ۱۲۰

جو بیزار کوئی فضا پیدا ہوتی ہے اس کو ختم کر کے تفریح کا سامان ہم پہنچاتا ہے۔ دوسری طرف وہ اس فلسفہ کو بھی ٹھیک ہے جو کسی کتاب یا کلام کے تعلق سے پیدا ہو جاتا ہے اور میں جدت اور تازگی کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے۔ پطرس کی آمد کی آخری کتاب ”میں یہ دونوں ہی مفاد حاصل نہیں کرتے ہیں۔ پطرس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی کتاب ”الحقین“ کے اس طرح سے دونوں ہی مفاد حاصل کر لیے ہیں۔ ان کا مضمون آمد کی آخری کتاب اس طرح سے شروع ہوتا ہے: ”ماں بچے کو لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پر رہا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہ سے اس کو دیکھ رہی ہے اور باپ سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے۔“

(۱) وہ دن کب آئے گا جب تو شیخی شیخی باغیں کرے گا۔ (۲) بڑا کب ہوگا؟ مفصل کہو۔

(۳) وہ کب آئے گا، اور دھکی کب بھاگے گا؟ اس میں خیر مانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ہم بڑے کب ہوں گے؟ (۵) تو کب کھائے گا۔ (۶) آپ کب کھائے گا، اور ہمیں کب کھلائے گا،

باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنکر واضح کر دو۔ بچہ مسکراتا ہے، اور کیلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل

باغ باغ ہو جاتا ہے۔“

اسی طرح سے ان کی پوری پیروڈی مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب ”آمد کی پہلی کتاب“ کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور انھوں نے بعض الفاظ کی تبدیلی سے بڑے دلچسپ اور مزاحیہ پہلو پیدا کیے ہیں۔ پیروڈی عام طور پر تین طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو عقلی جس میں ایک لفظ کے بدل دینے سے اصل تحریر مضحک ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یہ مشہور شاعروں کے کلام میں کی جاتی ہے اور ان کے بعض بہترین اشعار کو صرف دو ایک الفاظ کی تبدیلی سے مضحکہ خیز بنا دیا جاتا ہے۔ پیروڈی کی دوسری قسم طرز ہوتی ہے جس میں کسی مصنف کا طرز تحریر کی نقل کی جاتی ہے۔ اس طرح نقل کی جاتی ہے کہ وہ مزاحیہ بن جائے پیروڈی کی تیسری قسم موضوعاتی ہے۔ جس میں مصنف کی تحریر اور اس کے الفاظ بھی کو نہیں بلکہ اس کے انداز فکر کو بھی بدل کر کچھ نیا بنا دیا جاتا ہے اور خود جس موضوع پر مصنف نے لکھا تھا۔ اسی کو مضحکہ خیز بنا دیا جاتا ہے۔

پطرس کی پیروڈی میں یہ تین باتیں ملتی ہیں۔ وہ الفاظ میں بھی تحریف کرتے ہیں۔ مصنف کی طرز کو بھی اپنا کر اسے مضحکہ بنا دیتے ہیں۔ اور اس کے موضوع کو بھی مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پطرس کی پیروڈی کو مختلف نقادوں نے اردو کی بہترین پیروڈی قرار دیا ہے۔

پطرس کی دوسری پیروڈی ان کا مضمون ”لاہور کا جنسہ رافضیہ“ ہے۔ یہ پیروڈی بھی پطرس نے اسی وجہ سے لکھی ہے کہ جغرافیہ کی کتابیں مدخل سے ایک انداز اور ایک ہی طرز پر لکھی جاتی ہیں۔ صرف مقام اور مجرودوں کے نام کی تبدیلی ہو جاتی ہے باقی پورا انداز تمام جغرافیہ کی کتابوں میں ایک ہی سا ہوتا ہے۔ تمکین کاظمی پطرس کی دوسری تحریف کے تعلق سے لکھتے ہیں: ”دوسری کوشش بھی پطرس ہی نے لاہور کا جغرافیہ کے عنوان سے کی ہے۔ جو معانی پطرس کا آخری مضمون ہے۔“ آمد کی آخری کتاب سے زیادہ لمبی اور بڑی ہی نہیں ہے۔ پہلے آپ لاہور کا کوئی ایسا جغرافیہ لیجئے جو آج سے بیس سال پہلے وسطانی جماعتوں کے لیے لکھا گیا ہو پھر اس کو سامنے رکھ کر پطرس کی پیروڈی کا مطالعہ کیجئے۔“

اس طرح سے پطرس نے اس زمانے کی جغرافیائی کتابوں کا مضحکہ بڑی خوبی سے اڑایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے خود لاہور کے حالات پر بھی بڑے ہی احیاء انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ ان کی تحریف یوں شروع ہوتی ہے: "تہبید: تہبید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دیوانہ وقت ہونے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے، اس لیے دلائل دہرایا ہے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ محل طہ: لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی زمیں میں اب صرف سارے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ اب بہنے کے قابل نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف" کہتے ہیں۔ طے کا پتہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہوئے ہیں۔ ان کا نیچے ریت میں یہ دریا بہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصہ سے بننا ہے۔"

لاہور تک پہنچنے کے لیے کئی رستے ہیں۔ وسطی ایشیاء کے علاقہ پشاور کے رستے اور یو۔ پی کے علاقہ اور دہلی کے رستے وہاں ہوتے ہیں اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ مگر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں بدلتی دیکھتے ہیں۔

آب دہرا والا بہر کی آب دہرا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں کا حال یہی ہے یہ غرض ظاہر کی تھی کہ شہر میں طرح طرح کی آب دہرا دی جائے۔ لیکن بد قسمتی سے گیس کی پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لیے لوگوں کو چاہت کی گئی کہ صفا و عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہر اکابرے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شماری سے کام لیں۔ چنانچہ لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ گیس نے ہا بجا دھواں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے لاہور کے مرکز کھل دیے ہیں۔

صنعت و حرفت: اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ سازی اور سب سے بڑی انجینی سرائی ہے۔ پیداوار لاہور کی سب سے مستبعد پیداوار یہاں کے طلباء ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دواں کچھے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرمایہ بولی جاتی ہے اور معمولاً ادانہ بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔ طبی حالات: لاہور کے لوگ بڑے خوش طبع ہیں۔

پطرس نے اپنی اس پیروڈی میں مختلف عنوانات کے تحت لاہور کے جغرافیائی حالات کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے اور خود اہل لاہور کو بھی اپنے مزاح کا ہدف بنایا ہے۔ کہیں کہیں ان کے پاس اس مضمون میں طنز و انداز بھی ابھرا ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے مزاح کی خفیا پرے مضمون پر حاوی ہے۔ بہر حال پطرس کی یہ دونوں تحریروں اور دہنر کی تحریف نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر دیر آفٹن لکھتا ہے: "انہو نثر میں تحریف نگاری کے سلسلے میں پطرس کو ایک مقام امتیاز حاصل ہے۔ یہ اس لیے کہ پطرس نے غالباً سب سے پہلے نثر میں پیروڈی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے۔ پطرس سے قبل اردو شاعری میں پیروڈی کے نمونے تو ملتے ہیں اور اس ضمن میں دکن ماتھ سرشل اکبر الہ آبادی اور دھرجے کے بہت سے مساد میں کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن نثر میں پطرس سے قبل اصل تو سپرہوڈی کا نمونہ بھی شکل سے ملتا ہے اور کہیں ایک آدھ چیز نظر بھی آئی ہے تو اس کی اپنی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں۔ چنانچہ بعض دوسرے اوصاف کے علاوہ پطرس کی تحریف نگاری کو تاریخی اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے اور طنز و طرائف کے طالب علم کے لیے اس بات کو طوفا رکھنا ضروری ہے۔" ۵۵

یوسف اعظمی تین غزلیں

تو آدمی کو حسن، یقیں، اعتبار دے رشنوں کا جھوٹ موٹ لبادہ اتار دے
آنکھوں میں جم رہے ہیں مہو سالِ گلِ گرد رفتار ہو صبا کی وہ لیل و نہار دے
بگد کی چھاؤں میں تراوقہ حسین ہے وقفوں کا سلسلہ نہ مگر بار بار دے
کچھ لوگ مانگتے ہیں تری زینت کا حساب تو ان کو چاکِ پیرِ مہن تار تار دے
آنکھوں کی شوخیوں میں نئی گفتگو تلاش شاداب آئینوں کو صبا یار بار دے
لے اعلیٰ یہ بیسوادِ دنیا سے کچھ نہ مانگ
دستِ طلب کو رحمتِ پروردگار دے

ہم سفرِ ساخِ صبا کے ہے مرا گم دیکھو
میری آواز کا بہتا ہوا منظر دیکھو
روٹھ کر جائے ہے اس شوخ بچے کی کیسے
سونہی مٹی سے بنا دھوپ کا ساغر دیکھو
ڈھونڈتے کیوں ہو مٹینوں میں نمل کا شباب
چنچ صدیوں کی میسر جسم کے اندر دیکھو
جس کی بنیاد ہو پر ہے وہ طور ہوں میں
نم میری روح کے اندر کا جس گور دیکھو
وہ صبا جسمِ تکلم ہے، ترنم، کیا ہے!
اس کی سرگوشیاں لہجے میں ڈبو کر دیکھو

نوازی خموشی کو لفظوں نے لوٹا
لعل لبِ تنہا رہے کہ سناٹا لوٹا
علامات صبا کے اُڑتا پرندہ
ابھی ساتھ تھا اور ابھی ساتھ چھوٹا
جہاں کا ہوا فرخش پر چاندنی کا
کہ آوار کا نرم آئینہ لوٹا
بننا سیر ہن بے بسی کا مقدر
مے ہد میں ہے نیا سچ بھی جھوٹا
مولے موت سائے کی تعبیر تھے تم
جہول کی سیاہی میں کیوں ساتھ چھوٹا
ہر نفسِ پاب بھی محوِ نظر ہے
ہوا زل کی دیوار سے میں نہ لوٹا

احمد حسین خاں نظر سحر اثر

نکھل سکا تیری نیچی نگاہوں کا جو ہر
ہمارے سحر کیے اور پڑھے کئی نہ
اٹھی تو پار گئی سات آسمانوں کے
جھکی تو دھنس گئی پاتال کے بہت
نظر حیات فزا اور نظر حیات اثر
چھپے ہیں اس میں کئی موت و زیست
نظر میں شعلہ تو گرے میں آب و تاب ہے
کرشمہ سازی برق تباہ ہے تیرا
نظر طے جو کسی سے تو پھر وہ اٹھ نہ سکے
یہ ایسا وہ کرے اس کو جو گرا ہو بہ
نظر میں شور قیامت نظر سکون نواز
ہر اک بات ہے اس کی تضاد کا منہ
دو چشم نیم خار و نیم ہوش اگر
غلط ہی مجھ پہ جو پڑ جائے تو رہوں مغنا
جیوں تو جی نہ سکوں اور مریں تو مرنہ سکوں
نفس کے تار میں گونہ صلی میں شاکے گوہ
نظر لگے نہ تجھے اے نظر نواز میرے
تیری نظر ہے میرے جبر و قدر کا منہ
چپا لے آنکھ میں اپنی اگر زبے قسمت
بنوں محاشم فراز و نیگوں میں کل نہ
تو راز سارے زماں و مکاں کے کل بائیں
نیاز و ناز نہ ہو اور نہ ہو اقل اک
یہ فرق ماوشما کا ہمیشہ مل جائے
میری خودی یہ بتادے کہ چیز کیا ہے نہ

چیزے ہستم

الفت کے راز و تیر خفی کا فسانہ ہوں
اس کو چھپائے رکھنے کا جیل بہانہ ہوں
اپنی خودی پہ خوش ہوں جنوں کا دنیا ہوں
دار فکی ہوش ہوں یکتا یگانہ ہوں
مینا نہ مغال کی میں پی پی کے ارغواں
مستی کُناں ہوں تقویٰ سے کسر بگیا ہوں
خاک ہوں گرچہ سوز دروں ہے مہر بہشت
شکوں سے بجلیوں کی بنا، آشیانہ ہوں
نیرنگیاں ہوں قدرت پروردگار کی
مجھ کو بُرا بھلا نہ کہو میں زمانہ ہوں
اچھا ہوں یا بُرا ہوں میں جو کچھ بھی ہوں مگر
امید دار رحمت و لطف، شہانہ ہوں
آدم کا نام دیتے ہیں کتر و بیاں مجھے
پزند آتش بے مثال کا تصویر خانہ ہوں
میری کندہ ذوق میں نیر ذال بھی ہے اسیر
سُترِ اَلست دراز بلی کا خسرانہ ہوں
مجھ سے ملا لکڑ کو ازل سے ہے اختلاف
وجہ طلاف و سببِ شافانہ ہوں
شاعر ہوں میں شعور ہے میرا جنوں نواز
سوئی ہو ہی خرد کے لیے تازیانہ ہوں

صغریٰ عالم

درد و غم، رنج و الم اور دعا ساتھ رہے
میں ناپاک میں رہوں اور خدا ساتھ رہے

بہری محفل میں اکیلے نہ کبھی آؤں تم۔!
نکتہ گل بھی ہو رفتار صبا ساتھ رہے

سکر فکر کو عسریاں نہ کرائے نرم ادب!
مہرین لفظ کا معنی کی ردا ساتھ رہے

داٹھا شاخِ تمنا کو ذرا اور بلند
بل رہوں اور مدامتِ رسا ساتھ ہے

اگساروں میں وہ آداب کہاں ہیں صغریٰ
موربہ درد ترا عہد وفا ساتھ رہے

علی ظہیر

البوذرغفاریؓ

وہ کبوتر
جواڑتے تھے
تاج و تخت و کاخ و پرچم سے بلند
وہ ابھی لوٹے نہیں ہیں

وہ اکیلا
آسمان اور ریت کے ٹیلوں کے بیچ
ایسے دفنانے کسی کا نقطہ

اذان

سروں میں گنبدوں کی گونج بھر کر
صنوبری پھیلوں کے حوض پر
اتریں گے جب
اڑتے کبوتر
موذنؓ
آفتابِ عصر کی جانب
صدائوں کے علم اونچے کرے گا

زادہ چا بود و بود کا آشوب

امیدوار ہیں یہ بچھو گیا تھا، دوشتوں کمرات کی رانی میں اتر گیا تھا، فکلیں کریموں میں گھل گیا تھا۔
 میں دعویٰ سے صبر سے ہوا ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی تھکن مہی مہیوں اور نلوں میں
 رچ گئی تھی۔ اسی لیے میں اپنے تنویر اور اس کے دوستوں سے معذرت کر کے باہر چلی گئی اور برآمدے کے ٹنڈ
 فرش پر تنگے پاؤں ٹپکنے لگی تھی۔
 ڈرائنگ روم کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور روشنی کے فیلے برآمدے کے فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ آہستہ
 درپردہ کرکے جیسے گا آہستہ آہستہ یاد آتا۔ جب ہم اپنے گھر کے آگے آئے ایسے ہی بڑے اور جیوئے قتلوں کو پہچان گئے تھے
 اور جب کسی کا یہ مطلب سے روشنی کے کسی قتلے پر پڑا تو سنرا کے طور پر سے چور بناداما۔ پھر ہم سب کچھ سمجھ کر
 بھاگ کر دوڑنے اور چور بننے والا لکڑی مانگ سے ہمارے سجھے بلکنا۔ اس وقت روشنی کے سارے قتلے ہمارے
 پرولٹے رونڈے حانے اور انہ معسر کے نام گوتے ہماری بھول سے بھاگتے۔
 اُس رات جب میں برآمدے کے ٹنڈے فرش پر تنگے پاؤں ٹپکنے لگی تھی تو یوں ہوا کہ ڈرائنگ روم کی کھلی
 کھڑکیوں نے سب کچھ اگل دیا، سب کچھ گھل لیا۔
 میں اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ مرنے لگا یہ تنویر پر پڑی، وہ ہاتھ بڑھا کر اسٹریو کا سوچے آن کر رہا تھا
 BONEYM کی صیغی ہوئی آواز اٹھی۔

PARA-RASPUTEEN میں نے دہشت زدہ ہو کر ان سب کو دیکھا، اندر جا کر
 دوست نئے شراب کے نئے میں ڈو لے ہوئے، فقیر لگاتے ہوئے۔ اور سامنے کتابوں کی الماری پر ایک تصویر تھی
 انہوں میں سفید تھروں والی ایک جھیل پہاڑی تھی۔ اُس پہاڑی کے ایک مختصر حصے کو سنراش کر ہوا کی سنرا
 دے دیتی تھی، اور دیا میں ایک سلاح دار دروازہ لگا تھا جس میں آہستہ فعل تھا اس دروازے سے پرے ایک غار
 تھا اور محراب تھی، محراب سے پرے بھی ایک تنگ و تاریک غار تھا، اور اس غار سے پرے ازل تھا، ابد تھا اور
 لامہایت بند تھی جو زندوں اور مردوں کے درمیان عدل کرتی ہے۔
 میں بھی اس تصویر میں تھی، دروازے کی ایک سلاح کو بھاگے ہوئے اور غار کے اندر جا نکلتی ہوئی جبر و غفلت

کی سمت اور پشت کیسے کرنا سنا کرتی ہوئی اور اسی تصور کے برابر کالسی کا ایک مجسمہ تھا۔ غار کے قیدی کا یہ مجسمہ میں نے اسی کے شہر سے خریدا تھا۔

جب میں نے یہ تصور کھینچا تو اسی لمحے میں میں نے یہ مجسمہ خریدا تھا، اس لمحے میں نہیں جانتی تھی کہ ایک ماٹ ایسی بھی آئے گی جب میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہو ایک شخص اس تصور پر درجہ کو دیکھ کر ایک جگہ کہے گا اور پھر اندھیرا روشنی کے تمام فکروں کو نگل لے گا۔

میری نگاہیں جھکیں اور کت بول کی الماری کے مقابل رنگین ٹیلی ویژن پر گرم ٹیلی ویژن کنڈیساڈ فرم میں جڑا ہوا ایک فوجی اعزاز سمجھا تھا چند مفتوں پہلے یہ اعزاز میرے شوہر کو اعلیٰ پیشہ ورانہ نمائندگی کے صلے میں عطا ہوا۔ کچھ دیر پہلے کا وہ لمحہ میرے اندر راز کی طرح منجھنجا جڑا رنگ روم کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے میرے خیال کے عزیز ترین دوست کی آواز آتی تھی اور اس آواز نے یو جھا تھا "ہاں، یہ سلاح دار دروازے کی تصویر کیسی ہے؟"

تب میرے شوہر نے بنا با کہ یہ اس بوڑھے فلسفی کا بد فائدہ ہے جس نے یہ کہہ دیا ہے کہ انسان میں مہال نہیں دن اور نہیں راتیں گزاری ہیں۔

یہ سن کر میرے شوہر کے اسی عزیز ترین دوست نے فہم لگاتے ہوئے کہا تھا: "مہال نے اس کمرے میں خراب تصاویر اکٹھا کیا ہے، ایک طرف صدیوں پہلے رہنے والے بوڑھے کے منہ خانے کی تصویر اور اس کا مجسمہ بنا اور دوسری طرف تمہیں ملے والا اعزاز سمجھا ہے۔"

"ذرا آہستہ لو۔ تمہاری سمجھائی نے سن لیا تو قیامت آجائے گی! میرے شوہر کی صدا تھا، مریخ سے

آ رہی تھی۔

"م تو مجھ لوں خاموش کر رہا ہوں جیسے مہال بھی بوڑھی ڈلوٹی کے مارے میں لپکتی نہیں معلوم۔"

اسے پہلی ہوئی آواز نے کہا۔

"اُسے واقعی کچھ نہیں معلوم۔"

"لیکن وہ تو اس تقریب میں شریک نہیں جس میں تمہیں یہ اعزاز ملا تھا۔"

"ہاں وہ شریک تو تھی لیکن اُسے نہ اس اعزاز کا پس منظر معلوم ہے اور نہ میری مہکاری مصروفیات کے

بارے میں کچھ علم ہے۔" یہ اس شخص کی آواز تھی جو مجھے ماں سے عزیز تھا۔

وہ باتیں کر رہے تھے میرے شوہر کو داد دے رہے تھے، وہ تنظیم جیسے میں بہت عزیز رکھتی تھی اس کے کمال

دے جانے کا سہرا میرے شوہر کے سر باندھ رہے تھے بلکہ میں جڑا ہوا اعزاز میری نگاہوں کے سامنے تھا اور اس شخص کا جہرہ بھی جسے یہ اعزاز عطا ہوا تھا کیا بدیہی شخص تھا جس سے میں نے گفتگوں اور تاریخ کے معاملات پر

باتیں کی شخصیں جرموں کا دلدادہ تھا، کہ ان کا منہ بانی تھا اور فلسفہ مارچ جس کا محبوب موضوع تھا۔

کہا یہ واقعی اُسی شخص کی آواز تھی؟

میری ٹانگوں میں دم نہیں رہا تھا، میں وہیں بیٹھ گئی۔ آواز بے جھٹک آتی رہی۔ یہ انسانوں کی آوازیں تھیں یا بیٹریوں کی غراٹیں؟ وہ ان لوگوں کے نام لے رہے تھے، ان کی باتیں کر رہے تھے جن میں سے کئی کو میں نام بنام جاکر تھی۔ ان سے میں نے ادنیٰ نشئیوں اور بچی مصلوں میں گفتگوں باتیں کی تھیں، ان کے ساتھ میں نے کئی ایسا مذہبیتوں کا سفر کیا تھا، لیورہ طائغ اور ان میں سے والے محروم ترین انسان جن کی زندگی کی جستجو کا شہر میں رہنے والے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ ایسا مذہبیتوں میں رہے والوں کے ساتھ ان ہی کی طرح رہتے تھے۔

میرا ہی دلوں میں ابلی تعلیم کے لیے ابھرتی گئی۔ وہ مرا ابلی سفر ختم ہو رہا تھا تو میری ملاقات اس شخص سے ہوئی۔ خواب میرا سوہنہ اور ان دلوں کی ٹریسنگ کے سلسلے میں ابھ گیا ہوا تھا۔ یہی کوجب معلوم ہوا کہ میں اس سے شادی کی خواہشمند ہوں تو اسوں نے مجھ سے یہ جھگڑا کیا میں اب بوجی کے ساتھ زندگی گزارنے کی استطاعت بھی رکھتی ہوں؟ وہ میری ادا طبع سے بخوبی واقف تھے۔ میرے سیاسی نظریات سے آگہی رکھنے سے اور اندیشہ ہائے دور دورہ راز میں مبتلا ہو گئے تھے۔

مجھے ان پر ہنسی آتی تھی۔ آخر سطرط نے سچی قولوں کی راست کے کسی عام سیاہی کی طرح حلف اٹھایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ ”میں اپنے ہتھیاروں کی بے حرشی ہتھیاروں کی بے حرشی کر دوں گا اور میدان جنگ میں اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو چھوڑ کر نہیں چھوڑوں گا اور دیوتاؤں اور انسانوں کی جنموں کے لیے جنگ کروں گا۔“

میں نے کانوں سے سب کچھ سنا کہ جیسے انسانوں کی ادا طبع نہیں بدل سکتے، یہ تمام باتیں میں نے سمجھا سے کبھی نہیں اور وہ دب ہو گئے۔ میں بھی خستہ کے سامنے دلیں بارہانی میں سب دیکھ ہی بار گئے۔

تادی کے کچھ دیوں بعد وہ دیوں وطمس واس آگئے۔ میں بائیں برس ملک سے باہر رہی تھی اور جب واس آئی تو خواہش کے وجود پرانے دوستوں سے رستہ اسوارہ ہو سکا۔ جبر کی فضا میں اضافہ ہوا تھا، لوگ کچھ سے گئے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ کچھ لوگوں نے مجھ پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں ان کے خیال میں TROJAN HORSE تھی، وہ مجھے قلب شکریں کس طرح لے کر جاتے۔

یہ اسی فادہ کی اذیت تھی کہ اس کا اظہار بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں اپنے اندر سب کچھ چھپا کر رہ گئی۔ وہ بھی دوسرے سے اور ساتھ میں بھی درس سنی کہ خستہ کی بیمار تھی۔

اس وقت یہ لوگ جن کے نام لے رہے تھے ان کی گرفتاری کی خبر چارہا والی کے چند ہفتوں بعد ہی چھپی تھی۔ خبر آئی کہ ان کا معاملہ ایک عوامی ٹریبونل کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے اس معاملہ پر بات کرنی چاہی لیکن وہ مال گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ان میں سے کئی میرے ذاتی دوست ہیں۔ وہ تفصیلات بتا کر مجھے اذیت نہیں دینا نہیں چاہتا تھا۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک شخص فساد کی تاب نہ لا کر ختم ہو گیا۔ اور اس کی لاش لاوارضوں کی طرح ایک چوڑے سے شہر کے قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ اس کی قبر کو کوئی کتبہ نہ تھا، وہ گناہ سپاہی کی قبر تھی۔ اس کی بیوہ اور اس کے ضعیف ماں باپ کی آرزو زاری کی ایک کالمی خبریں آئیں اور پھر سب کچھ بول بھلا دیا گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی موت کی خبر نے مجھے کئی روز تک ملایا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ روشن دماغ اور روشن ضمیر انسان مہجہ سکا، وہ زبان جو دانائی کے موتی روئے نہ تھکتی تھی وہ گویا اُن سے محروم بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ہاتھ جنہوں نے ہمتہ سیج لکھا تھا وہ پیوند زمین بھی ہو سکتے ہیں۔

میں نے بے یقینی کی قبلی دیوار کی گنگر کو تمام کر یقین کی تھیری زمین اک پہنچا پا لیکن یہ بتلی دیوار کا فائدہ کم ہو رہا تھا، میری انگلیوں کے درمیان سے ریت پھیل رہی تھی، گرتی تھی۔ آوازوں کا گنگھلا ہوا، دھکا ہوا سیسہ، بہتا ہوا میری سماعت تک آ رہا تھا۔ یہ لوگ مار مارا اس شخص کا نام لے رہے تھے جو موجود انسانوں میں میرے لیے بہت محترم تھا۔

وہ ہنس رہے تھے، وہ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ انہوں نے اسے کس کس طرح کی اذیتیں دیں۔ اس کی اسٹیوئوں سے ناخن کس طرح کھینچے گئے، اسے کتنے گھنٹے صرف کی سل پر لٹا گیا اور کتنی مرتبہ بجلی سے جھکے دیے گئے۔ تب میں نے جانا کہ وہ ہلاک ہونے سے بھولے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اسے پاپیل کی طرح چلے رہا تھا اور کیا گیا اُسے سر نہ کر کے غلاط کے تالاب میں غوطے دے گئے، پیروں میں درل ماندہ لرا اور کلاؤں کو آہنی مفلوں میں جکڑ کر جھٹ سے لٹکایا گیا۔

اذیت، ہر وہ اذیت جو صرف ایک انسان ہی سوچ سکتا ہے اسے اور اس کے ساتھیوں کو دی گئی صرف اس لیے کہ وہ ان حکمرانوں سے اختلاف رکھتے تھے جنہوں نے انسانوں پر مباحرام کر رکھا تھا۔ یہ حکمران حال نہ خال نہ خالہ وہیں برما کے نائب ہیں اور خدا کے نائبین سے زیادہ بھلا اور کون صل کر سکتا ہے، سوا انہوں نے بھی صل کیا سرائوں کا ملکاں اعلیٰ اندر بیٹھا تھا اور ہنس رہا تھا، اب اس کی بھرائی میں ال سب لوگوں کو سزائیں دی جا رہی تھیں۔ ال پر دنیا کی ہر راجت خرام تھی اور جب ال پر عقوبت کا ہر در کھلا تھا، انہی دنوں میں نے اس عقوبت کے نگرال کاہر شام بنائی سے انتظار کیا تھا اور ہر شب، شب بصری کی تھی۔

کٹام گتا بچے، رپورٹیں میری نگاہوں میں تھے۔ INTERNATIONAL PROTECTION OF HUMAN RIGHTS کی رپورٹ آن مارچ۔ انعام متحدہ ۲۰۰۰ UNIVERSAL DECLARATION OF HUMAN RIGHTS جس پر سیکرٹری ہر کے سامنے موجود حکمرانوں کے دستخط تھے جس کی پہلی شق یہ تھی کہ تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وہ یکساں حقوق اور مساوی رتبے کے حامل ہیں۔ جس کی نویں شق یہ تھی کہ... لیکن صرف پہلی اور نویں شق کا ہی ذکر کیوں؟ اس دستاویز کی تیسری شق میں لکھا ہے

غزلیں

تاج دار عادل

ہر ایک چہرے پہ دل کو گماں اس کا تھا
بسانہ کوئی یہ غالی مکان اس کا تھا
میں بے جہت ہی رہا اور بے مقام سا وہ
ستارہ میرا سمندر نشان اس کا تھا
میں اس فلسفے سے باہر کہاں تک جاؤں
فضا کی تھی مگر آسمان اس کا تھا
سلیقہ عشق میں جاں اپنی پیش کرنے کا
نہیں بھی آیا تھا ان کو ہی دھیان اس کا تھا
یہ میرا اس کے بعد کوئی بات بھی ضروری نہ تھی
مرے خلاف سہی وہ بیان اس کا تھا
ہو آنے اب کے بلائے حیران رستے میں
کر میری راہ میں عا دل مکان اس کا تھا

زخم لکھوں کہ ماجرا لکھوں
یاد آتا ہے وہ تو کیا لکھوں
حوصلہ زندگی کا کیا لکھوں
محبول جانے کا مرحلہ لکھوں
شدت عشق کا لقا ضا ہے
قربتوں کو بھی فاصلہ لکھوں
اس کی ہمراہی کو بیان کر دوں
یا کسی خاک سے ہوا لکھوں
دل کی خواہش ہے اس کے لیے کچھ
ایسی تنہائی کی دوا لکھوں
اک دے کی مزا حمت دیکھوں
یا مہو آؤں کا فیصلہ لکھوں
خواہشوں کے مجھ کو عا دل
اس کے رستے کا قافلہ لکھوں

نجمہ شہسوار

واپسی۔ ایک مطالعہ

(نوٹ۔ اصل کہانی سب سے رس کے شمارہ نومبر ۱۹۸۲ میں شائع ہو چکی ہے ذیل میں اس کہانی کا بجز۔ بیس ہے)

کہانی کی وہ تہ لہ کہ کسی ایک خاص لمحہ کو گرفت میں لانے کا نام ہے۔ وہ تہرتے بہتے ہوئے لمحے جو مہوایز میں مشکل سے آنے میں آتے ہیں مال کو لازماً الٹا کرنا ان کو بیان کرنا کہانی کا اصل مقصد ہے نہ بہت قابل قبول ہے کہ ان کہانی بذات خود شعر بن جاتی ہے اور اس طرح تبسہ ہے جو درجے کی صنف سخن کے الزام سے خود کو بچا لے مانی ہے افارٹ کی یہ کہانی ایک ایسی ہی کہانی ہے یہ وہ مختلف سطحوں پر چلی ماسکتی ہے وہ سطحیں جو کسی بھی عظیم فنکار کے کی بہترین کسوٹی ہیں کہ۔ اس سے بچے ما نام قاری بھی محظوظ ہو سکتے ہیں سانچہ ہی مشکل پسند یا بچہ ذہن رکھنے والے بھی اس میں جہاں معنی پیدا کر سکتے ہیں۔ مہی میں کی معراج ہے۔ شاید پیکر اور اس کے بعد کو لرج اور در زور تھو اسی لیے دنیا کے عظیم فنکاروں میں سے ہیں!

اس غلامی کہانی میں دور صید کے انتشار اور مادیت، حالانی فزول اور فانی رستوں کو پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی وہ حال اور عقل کے مابین جو شکست ہے اس کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں یہ کہ موت انسان کو نباہ کر دیتی ہے لیکن اس کا تصور اس کو زندگی بخشتا ہے اور یہ بھی کہ زندگی ایک مسلسل بہتا ہوا چشمہ ہے جو اپنی راہیں توسل سکتا ہے پر رکتا نہیں!

اس کہانی میں مرکزی کردار اورال کے سانچوں کے مابین ایک تضاد ملتا ہے مٹھ لوکس جو ایک سیدھے اور سادہ لوح انسان معلوم ہوتے ہیں ان میں سمندر کی گہرائی ہے ان میں وہ مصوبیت ہے جس کو کہ در زور تھو اور بلیک ووفل نے اپنی شاعری کا موضوع بنا لیا تھا۔ مٹھ لوکس کے دل میں فطرت کی سچی محبت سمائی ہوئی تھی۔ وہ ایک عارفانہ بھرے کے ذریعے قدیم یونان کی روحانیت کو لیا لیتے ہیں ایس اگر ان میں کمی تھی تو یہ کہ وہ اپنے ساتھیوں کی طرح اچھے پانچول میں پھرنے سے قاصر تھے۔ وہ ساتھی جو سطحی بھی تھے، وہ پرتھن رہا کار اور دنیا دار بھی جو کہ لوکس کے قدرتی حس کے بارے میں چرب زبانی سے بات تو کر لیتے ہیں۔ اس نگر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے تو لاسکتے ہیں لیکن جن میں احساس کی شدت اور مصوبیت کا فقدان ہے وہ ساتھی مٹھ لوکس کے گہرے احساسات کو سمجھنے سے قاصر تھے اور اسی لیے لوکس عدم گوبانی کا شکار ہوئے یوں وہ آج کے جدید انسان کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں جو احساس نہ بنائی کا

ہے۔ عام ذہن یا COMMON SENSE کے لیے جو زندگی ہے وہ مٹر لوکس کے بے موت کے مترادف ہے۔ حالانکہ وہ زندہ رہتے ہیں لیکن روحانی موت مر چکے ہیں۔

مٹر لوکس کو سمجھنا ان کے کوٹھیلے اور سطحی سمجھوں کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کو خوب خوب آلو بنایا گیا۔ وہ سب کچھ سمجھتے رہے پراختیاں بنے رہے اور یوں بظاہر بیوقوف بن کر بیوقوف بناتے رہے، وہ عدم گروائی کا شکار ہوئے۔ جو کہ عام انسانی رشتوں کے ٹوٹنے کی علامت ہے۔ لوکس سمجھ کر ان کے مخصوصات کو کوئی سمجھ نہیں رہا ہے غامضی کو ترجیح دیتے ہیں اور جو کچھ بولنے میں وہ بھی زبردستی جب کہ وہ جذبات کی غیر معمولی شدت، معصومیت، سادگی اور خلوص کی دوسرے اپنے تمام آداب پرست سمجھوں سے برتر ہیں۔ لوکس کو دیکھو اور سمجھو کہ روزمرہ کا ایک سائٹل THE WORLD IS TOO MUCH WITH US باراتا ہے۔

روزمرہ اور بلیک دونوں کی تاغری میں معصومیت اور تجربے کے درمیان ایک تضاد اور کشمکش کا احساس ہوتا ہے۔ کہانی کا موضوع معصومیت اور تجربے کی ماہی کشمکش ہے۔ مٹر لوکس معصومیت اور ان کے ساتھی تجربے یا EXPERIENCE کے ظہور میں یہاں لفظ "تجربہ" دنیا داری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اوڈیسیس OEDIPUS کی روایت LEGEND کا کہانی سے براہ راست تعلق ہے۔ اوڈیسیس کو لوکس سے مماثلت ہے اور انہی گئی کو استعمال سے۔ اوڈیسیس کی پوری زندگی ایک طامت ہے روح کی آلودگی اور بے راسخ کے ذریعہ اس روح کی نجات یا DELIVERANCE کا مٹر لوکس ایک سیاح کا حیثیت سے ہوا آئے تھے۔ انہیں ہمت یہ محسوس ہونا رہا سمجھ کر انگلستان کی مادی زندگی نے ان کی شخصیت کو یارہ یارہ کیا ہے، ال کا روح میں زیر نگین دیا ہے۔ کو کوکس میں آکر اس کو محسوس ہونا ہے جسے ال کی خوابدہ روح مانگ گئی ہو، بیدار ہو گئی ہو..... ایک عالم جہت میں وہ ادھر ادھر گھومتے ہیں۔ اس فکٹ جگہ پر مٹا ہوا یا فی زندگی کی زیر فیزی کی طامت بن جاتا ہے۔ جیتے ہوئے یا فی کا ترنم اور موسیقی اپنے اندر بگڑے معانی رکھتے ہیں۔ یہ ہم کھیل کے کیا یاد دلاتا ہے کہ اوڈیسیس نے ایسا کیا اپنے گناہ گیارہ کو بادل کا سما۔ اب اس جگہ پر وہ اب بکسر ملا ہے انسان ہے۔ وہ سب کو بولی کر رہا ہے کہ تباہ اس کا آسف محسوس کے پاسوں لو سکون بخش دے۔

مٹر لوکس پٹر کے نئے کے اندر TRANCE کی اس کیفیت میں اسی۔ روحانی ارتقاء کو سمجھتے ہیں۔ کول جانے ال کا مٹر لوکس میں بن سکے کا نہیں۔ لیکن ان کے نعیم میں تو انگلستان وایس ما کر اس اچھوئے تجربے کو بکسر قبول جانا تھا۔ کہ یہی ان کا المیہ تھا۔ اس کہانی کا تعلق پوسی دان (POSEIDON) سے بھی ہے جو کہ یونانی اساطیر کے مطابق زلیخوں کا دیوتا ہے۔ وہ زمیں کو ہلانے والا ہے اور اسے زیر خرناتا ہے۔ کہانی پٹر نے دف ہم شقائق السماء اور سوسن کے پھولوں کی جگہ سو نگتے ہیں اور یہ ان کی موسیقی سننے میں بخیر زمیں۔ اوڈیسیس اور ساو جی مٹر لوکس کی روح کے بخیر کی علامت ہے۔ اور یہ حشر آنا ہے جو کہ زندگی کا طامت بن جاتا ہے۔ نری سے ہنسا پانی اپنی راہیں بدلنا حشر زندگی۔ مٹر لوکس صرف اپنے گرد و پیش کے جس سے باخبر تھے۔ ال لمان میں جب کہ وہ درخت کے کوٹھیلے کے اندر بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ ال کو محسوس ہونا تھا جسے ان کی روح اس ہستی میں غفلت ہو رہی ہو

جبر ساری مائٹ میں جاتی و ساری ہے : از رو اسلہ ذیل حقیقت کا اذکار کر رہے ہوں جو عقل انسانی کی مدد سے پرے ہے۔ وہ خفیی صدافٹ کے متلاسمی تھے اور اس کے لیے انھوں نے خوراستہ اختیار کیا تھا وہ دعبان یا مراۃ کاراستہ نہا۔ وہ لمحہ جب کہ وہ ایک جدب کی کیفیت سے سرشار تھے۔ ال پر حیت تر و مجیر کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جدا ن طاری تھے۔ کبانی کا وہ حصہ ٹرید کریم کو ورڈز درسخ کی غظیم نظم

TINTERN ABBEY کی با آبی چس میں ایک بگ ستاء کنا ہے :-

میں خطِ رکانہ دل سے منوں ہوں
جو مختلف بدے میری نذر کرنی ہے
اور مجھ ال لحام سے دو جا رکرتی ہے
جب مجھے محسوس ہوا ہے کہ جیسے
ایک اسخانی، ال دیکھی دن کا راز
مجھ پر تکلف ہو رہا ہو۔
اور مجھے لگتا ہے
جیسے فطرت کے حسن میں
میرا جسم تحلیل ہو رہا ہو
جیسے میرے خون کی گردِ سر رک گئی ہو
ایسے لحام میں ہم جسمانی طور سے سوماتے ہیں
اور ایک زندہ، تجسم روح میں تبدیل ہوماتے ہیں

مگر لو کس کو سخی ال لمحات میں (جب کہ وہ درخت کے تنے میں بے حس و حرکت کھڑے تھے جیسے انھیں سکے ہو گا) محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی روح مجسم ہو گئی ہو، جیسے ہر شے کے معنی بدل گئے ہوں اور ان میں چیزوں کے آبراز کئے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو جسے کہ TRANSCENDENCE کہتے ہیں۔ ال لمحات میں انھوں نے سارو دماغ اور زندگی کی اصل روح کو میچاں بلاتا تھا۔!

مگر لو کہ کسی نے خواہش کر دہ اس فرد گاہ میں ایک مکمل انسان کی شبیہ آویزاں کریں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان کے اندر اپنی ذات کی تکمیل کی شدید خواہش اور آرزو ہے۔ نہ جانے کتنے عرصہ کے بعد ان کو یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک مکمل انسان ہیں جیسے ہر چیز ان کے لیے با معنی ہو گئی ہو سوائے کے وہ غریب باسی ان کو بہت دکھ اور محروم معلوم ہو رہے تھے اور ایسا اس لیے ہوا کہ وہ اب پرسکون تھے۔

موت انسان کو تباہ کرتی ہے لیکن اس کا تصور اس کو زندگی بخشتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مسٹر کس کو تباہ

بولس لے جایا جا نادر اصل ان کو اس نجات یا SALVATION سے محروم کرنا تھا جو وہ حاصل کرنے جا رہے تھے ہم شٹر لوکس کی ہارپرکف افسوس ملتے رہ جاتے ہیں جیسا کہ لٹانی کے اصل عنوان ROAD FROM COLONUS کے ادا اس لفظ "FROM" سے ظاہر ہوا ہے۔ اگر وہ رک گئے تو بے موت کی آغوش میں منہج کراہی سکون حاصل کر لیتے۔

موت کا شعور ان کے لاشعور میں تھا۔ اس جگہ ہراں کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک نیراک ہول دیو لوہانی سمندروں سے جنگ کر رہے ہوں اور میرا یہ ہول کہ لا آخرال کو سمندر کی لہریں کنارے کی طرف لے جائیں گی۔ اُسی سلول کے لمحے میں وہ مرنا نایا ہنسنے لگتا تھا کہ وہ لمحہ لامانی بن جائے۔ اوڈی بس سچی ایسی زندگی کے آخری لمحوں میں اسی مگریرا تھا (جب کہ وہ ادھا ہو چکا تھا) اگر وہ ایسا گناہ کی تلافی کر سکے حوالہ ملی جس اس سے سرزد ہوا تھا۔ اس کا سارا غصہ، غرور، تمکنت اس جگہ آ کر ختم ہو گیا تھا اسے احساس تھا کہ اس کی موت کا لمحہ قریب آ رہا ہے اور یہ کہ وہ اس مقدس کتب میں موت سے ہلکا رہا ہے آیا ہے اسی احساس اور اس تلافی کے دریدہ ہی وہ اپنے کھوے ہوئے وقار کو حاصل کر رہا ہے۔ شٹر لوکس میں اوڈی کا وہ المیہ دہدہ تو نہیں اور نہ ہی ان کی موت اس جگہ کوئی اہم واقعہ مونی۔ تاہم وہ عارمانہ لمحہ جس سے وہ گزرے جب لال کو موت کے بخرے کا احساس ہوا اور جسے انہوں نے قبول کیا ان کو بہت ہلکا کر دینا ہے۔

انگلستان پہنچ کر شٹر لوکس بھر دی پہلے جیسے غصہ ور اور جڑ پڑے ٹوڑے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جسے کچھ سے عزت ہے جسے گنہگار ہونا خواہ نہ ہو لگتا ہے جسے ہم نے ہونے یا نہ ہونے سے بنی ہوئی ہے۔ وہ اپنے اس مسہور کی بخرے کو کبکس فراموش کر چکے ہیں۔ اس بخرے کا دامن اس ہونا ایک زبردست طہ ہے۔ اس پورے مادیانامہ میں اس کو وہ جسمانی طور پر زندہ ہیں جن میں چہروں نے یونان میں اپنے معانی مل دیئے تھے اب وہی رہیں یہاں انگلستان میں ان کے لیے بے معنی اور بے حصول میں شٹر لوکس کو کہ جسمانی طور سے زندہ ہیں لیکن روحانی موت چکے ہیں اور ان کی مٹی اس روحانی موت سے مسہور ہے۔ دراصل ہم سب کا المیہ یہ ہے کہ ہم معصومیت سے عاری نہیں ہیں اور نالال بھی۔۔۔۔۔ اور یہ کہ ہم کو اپنا بچس یاد نہیں رہتا۔

لٹانی کی ایک اہم خوبی اس کی تہداری اور سنجیدگی ہے جتنی مارٹر حو اباب بیان معنی ملتا ہے نئے نئے مارٹکف ہوتے ہیں۔ یہ مارٹا نہ تجسیرہ فارٹر کا دراصل اپنا ذاتی بخرہ تھا جو کہ اب بارواناں سال کو ہوتا تھا۔ تجسیرہ چونکہ ذاتی تھا اس میں غلوں سچائی اور گہرا تاثر پایا ہے۔

طرز کے مختلف مناظر بہت ہو پائی، پھول ہمارے سامنے مختلف نفاذ پیش کرتے ہیں اور فارٹر ناز سے اپنے ایک مارٹ کی صورت میں آتے ہیں۔ درڈر دور تھا اور بلیک کے ساہلوں کو طوں لیے۔ یہ لٹانی ہمارے دور کا المیہ ہے، یہ دور درجنیت اور تنہائی کا دور ہے کہ ہم نے اپنے بھوکے (بغیر صلہ رکھنے)

نظام الدین نظام آخری دوست آخری شکار

دو بہاروں کے ٹکرائے کا منظر عجیب ہے
 دریا چھٹک — پڑے
 آبشار منتشر ہو چکا — اور
 ہوائیں چٹکھارنے لگی ہیں
 کون جانتا ہے کہ خدا برہم کیوں ہے؟
 اپنے جسم کے تاریک غار میں،
 ہم سب قید ہیں
 ہماری رو میں دیواروں سے سر ٹکراتی میرتی ہیں
 دریا — آبشار — ہوائیں،
 خدا کے عذاب کی زد میں ہیں
 اور
 جسم کے غار میں ایک آواز گونجتی ہے
 ”خدا میں فضلِ ربی“
 — آواز روشنی ہے
 روشنی رہنا ہے
 ہم سب روشنی کے پیچھے چلنے والے سائے ہیں

_____ اور سائے مر بھی سکتے ہیں۔
 روشنی ہمیشہ رہے گی۔
 ہمارے بعد بھی — ہم سے پہلے بھی تھی۔
 دو بہاروں کے ٹکرائے کا حادثہ نیا نہیں ہے۔
 آسمان گرا ہی دے گا۔
 زمین شاہد ہے۔

_____ اور پھر یہ حادثہ
 آخری بھی نہیں۔
 حادثہ کبھی آخری نہیں ہوتا
 ہاں، شاید
 یہ نئی نوع انسان کی آخری نسل ہے
 ہمارے بعد کون آئے گا؟
 ہمارے بعد کون آسکتا ہے؟
 زمین کے آخری دوست،
 آسمان کے آخری شکار،
 ہمیں تو ہیں۔

ساجدہ عابد

دردِ پنہال

آج فضا بکراؤد ہے اور کالے بادلوں کے جھنڈے آسمان پر آہستہ آہستہ بغیر کسی آہٹ کے جمع ہو رہے ہیں بالکل اُن ادارہ لڑکوں کی طرح جو ادھر ادھر سرائیں کرتے اور دنناتے میرتے ہیں۔ باوجود مارش ہونے کے بھی فضاء گئی گئی سی لگ رہی ہے ہوا کے تیز و تند جھونکے چل رہے ہیں جس کی وجہ سے فضا میں مٹی کے گجروں سے ہر طرف غار سا اٹھ رہا ہے اور ایسا ہی ایک غار میں سے ذہن پر چھایا ہوا ہے جو رہ کر جھلکنے والی حسین یادوں کا ایک مہر بن گیا ہے۔ یادوں کے اس مہر میں روشنی کی ایک کرن نظر آ جاتی ہے فوس لرزا سنتی ہوں، پریشان ہو جاتی ہوں زندگی کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد بھی میرے ذہن میں دنیا کی چھینے والی نگاہوں کا خوف اسی ماتی ہے جو باوجود کوشش کے بھی اب تک میرے دل سے دور نہیں ہو سکا ہے۔

میں اپنے کمرے پر نظر ڈالتی ہوں۔ ہر طرف دواؤں کی شیشیاں اور نسخوں کے پیٹے بکھرے ہیں جن کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ میرے دل کی ویران بستیوں میں ایک مازہر سوئی ہوئی یادوں کو محفوظ جھنڈا کر رکھا دوں۔ میں اپنے بیٹے، بیٹی، جو آسمان کی طرف دیکھنے لگی ہوں اور مارتی ہوں کراہنے ملے ہوئے دل کے الاؤ کے قرب بیچ کر اپنی تھکی ہوئی زندگی میں ایک بار پھر سے نئی جاں ڈال دوں مگر مضحک اور تھکی ہوئی روح کی تھکلا سلا ہوائی کے آواز دینے والے وقت سے بھی کہیں دور ہو سکتی ہے؟

اتنے میں مینا میرے پاس آتی ہے میرے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں دو الگ الگ گولی خزانے ہوئے کہتی ہے۔
”نانی اماں گولی کھا لیجئے۔ پانی کا گلاس میاں رکھا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ چلی جاتی ہے میں اسے پکارتی ہوں۔ ”مینا میری سچی۔ آج مجھے کمزوری بہت ہے ذرا پانی یاد دینا۔“
اور وہ ٹری بیزارگی سے گلاس اٹھاتی اور پانی سے سحرتی ہے اور میرے منہ کے قریب لاتی ہے۔

”نانی اماں جلدی سے بگولی کھا لیجئے اور بس آرام سے لیٹ جائیے۔ آرام یہ لفظ میسر لیے کچھ غیب سا لگتا ہے ہماری اوتھنہائی میں آرام ایک نہریلے سانپ کی ٹھسار لگتا ہے جو بار بار انسان کو ڈنسا ہے مہلا ذہنی بیمار کے لیے بیٹنگ پر پناہ کسی کام کے لیے پناہ اور آرام لینا ایسا ہی ہے جسے مشرق کو مغرب سے ملا دینا۔

اس نے مجھے پانی پلایا اور دھناتی ہوئی شیرمیاں اترنے لگی مینا میری نواسی جسے اس کی ماں کے مرنے کے بعد

میں نے ہی یا لاوسا اور بڑا کبا تھا وہی آج میری تنہائی کی साथی ہے اور تباردار بھی —
 ”منا میری سچی مجھے بول اکیلا جوڑ کر نہ مارتا۔ وہ لٹیٹی ہے اور رٹتی بڑا لگے سے بگڑے ہوئے لہجہ میں کہتی ہے۔ ناخانا
 آپ خواہ مخواہ چھٹی رہتی ہیں۔ آپ کو کچھ سہی تو نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے عرفِ امام لیے کے لیے کہا ہے۔“ ہاں۔ میری سچی ڈاکٹر ہر مرض
 کا علاج کر سکتا ہے مگر بڑھاپے کا نہیں۔“

اور مجھے ایسا وہ بھیلانہ یاد آ جاتا ہے جب رامبری مال کے گزر جانے کے بعد میری مانی اماں بھی اسی طرح دن
 رات بستر پر بڑی رہتی تھیں اور اپنے ہر کام کے لیے مجھے ہی بلایا کرتیں۔ جس طرح میں سینو کو بلاتی ہوں۔ میری مینو بہت
 اچھی ہے پر میں اظہر اور لٹھری سخی میں ایسا کافی وقت مکمل کو دیر داکرتی اور جب کبھی مانی اماں بلاتیں تو میں بجائے ان
 کے بڑھاپے پر رحم کھانے کے انہیں اپنے لیے ایک بوجھ سمجھتی۔

دماغی حوائج اندھی ہوتی ہے اور اس اندھیرے میں حقیقت کہیں جب کر انسان کو دھوکہ دیتی اور بھٹکاتی ہے
 حوائجِ اندھ کے لاشعری س کرا سے راستہ نہیں دکھلا سکتی انسان اسی لاشعری کو بکڑے سیانے کو ٹوٹتا رہتا ہے اور سچائی
 کو پانا اس کے پس کی بات نہیں ہوتی۔ ایک دن مانی اماں بیمار ہو گئیں اور مجھے بیکارا۔

بٹی پیاس لگی ہے یا تو لانا۔ اور میں بڑی بے دلی سے انہیں پانی پلا آئی۔ مانی اماں اس دن کمزور لگ رہی
 تھیں۔ پھر انہوں نے بیکارا۔

”بٹی مجھے دوا تو دینا۔“

میں نے بڑی بزرگی سے کہا تھا ”مانی اماں ایسے کام کے لیے کسی لازم کو کیوں نہیں رکھتیں۔“
 ”تیرے ہونے ہوئے کسی کی کیا ضرورت ہے بٹی۔“

اور میں نے کہا تھا ”نہیں مانی اماں مجھ سے بڑھوں کی خدمت نہیں کی جاسکتی۔ دیکھئے نا مجھے ابھی دوست
 کے ہاں دغوب میں مانا سما آپ کی واد سے دبر ہو گئی۔“

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بہ جواب سن کر ان کا چہرہ سوت گیا جیسے رتی کسی کنویں کے بیچ میں ہی ابھ کر رہ گئی
 ہو۔ انہوں نے سرد آہ بھری اور کہا تھا ”ماتس! آج تیری ماں زندہ ہوئی“ اور آنسو ان کی ہلکوں سے مہر بہہ کر نیچے
 گرنے لگے۔ ان کی آوازاں کے گلے میں زندہ ہو گئی۔

ما کسی کو بڑھانے کرے۔ میں نے خدا سے التجا کی۔ دینا جو انوں کے لیے ہے بڑھوں کے لیے نہیں۔ دغوب
 بڑھاپا ایک بوجھ کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں اپنے خیالات میں کبھی باقی ہوں۔ ایک آواز مجھے چوکا دیتی ہے۔

”آپ کب سوچ رہی ہیں مانی اماں۔“

”کچھ نہیں بٹی۔ انسان ہمیشہ ایسی ہی اپنے باہمی کی طرف دیکھتا ہے۔“

”جو بڑے سخی بھلا مانتوں کو زندہ کر دے۔ مالا کر لے نہی ہے اور مستقل بھگاموں سے پوشیدہ ہے۔“

”بڑی فلسفی بن گئی ہے میری بیٹی“ اور وہ اچھل کر میرے قریب آ جاتی ہے۔

”آپ جانتی ہیں آج مجھے کس کا انتظار ہے؟“

”ریاض“ میرے منہ سے نکلتا ہے۔ اور وہ شرما جاتی ہے۔ ریاض اس کے بچپن کا ساتھی جو بیٹی کی ایک فرم میں انجنئر ہے۔ ریاض جسے مینا نے بچپن سے پایا اور ریاض نے اسے۔ کبا وہ واقعی آج آ رہا ہے۔ ہاں نانی اماں! اور مینو کے کال جا کی سرحی سے لال ہو گئے۔ سر کو ابک جھٹک دے کر خوشی سے میوولی نہ سماتی ہوئی وہ بڑے بڑے دگ بھر فی ٹیڑھیوں سے نیچے چلی گئی۔ اسے ریاض کا انتظار ہے۔

کاش زندگی میں انتظار کی انسی کٹھن گھڑیاں نہ آئی ہوں۔ لیکن نہیں شاید زندگی کا دوسرا نام انتظار ہے۔ دنیا میں انسان کو بہت سی باتوں کا انتظار رہتا ہے۔ محبوب کا انتظار۔ اس کو یانے کا انتظار۔ اس سے ملنے کا انتظار۔ آرام و سکون کا انتظار اور شاید موت کا بھی۔ اس موت کا مجھے کبھی بے صبی سے انتظار ہے۔ دو شاید مجھے دکھ دے دے کر آئے گی۔ میرا سکوہ میں جمعیں کر آئے گی۔ اور نظر با تڑیا کر آئے گی۔ مجھے اس گری اور کڑواہٹ کا تھکا ہوا انتظار ہے جو مجھ زندگی کی سہم با کاموں کے تھکا ہوا احساس سے جھپٹنے کے لیے سخت دلا دے۔ اور مجھے پھر ٹھیل کی یاد آنے لگی۔ ٹھیلانے کے ماحول میں اسے بھلا نہ سکی۔ اس کی لغو سڑا جی میری بھائیوں میں کھڑی میری سہم با کاموں کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اتنے سال گزر جانے کے باوجود میرے ذہن میں اب بھی اس کا نام چلایا ہوا ہے۔

ٹھیل جس نے آسمانی شہزادے کی طرح مزین زندگی میں قدم نہ لہا تھا جس نے مجھے سب کچھ دیا۔ محبت دی۔ زندگی دی۔ اور زندگی کی ایک نئی جہت بھی دے دی ریٹو۔ میری اکلونی بیٹی۔ اور آسمان کے اس شہزادے سے ریٹو لودے کر مجھے ایک اور چیز بھی دی۔ دھوکہ۔ دھوکہ میں کاشیں زندگی کا دھوکہ۔ وہ آ۔ مانی شہزادہ کی طرح دینا دینا ہوا آیا اور دینا دینا ہوا آسمان کی ملنے والی میں کبھی کوئی اور مجھے زندگی کے دور ہے یہ کبلا جھوٹ کر مل دیا ای دوسری دسا سارنے کے لیے۔ کہہ کر گیا کہ وہ کسی ٹریننگ کے لیے جا رہا ہے۔ جدا رہا۔ بعد آئے گا۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ چند سال تک اس کے غلط آنے رہے بعد میں وہ بھی نہ ہو گئے۔ سا کہ اس نے دوسری سادہ کھڑی۔ وہ کہاں ہے۔ کہاں ہے؟ معلوم نہ ہو سکا۔ ادھر میں انتظار کی گھڑیاں کاٹتی رہی۔ زندگی کی طویل مسافت کیلئے طے ہوئی یہ میں بنی ماسی ہوں۔ بوٹری ہوئی۔ بیاہ ہوا۔ اور مینو کو میرے چھوڑ کر وہ بھی اس دنیا سے چل بسی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے انتظار کرنے کے لیے کہ کب میں اپنی ریٹو سے ماطوں۔ لیکن ریٹو کے پاس میں ماسکا۔

اس غم کے انتہا سے۔ ماسکا۔ ماسکا۔ ماسکا۔ دل کی گہرائیوں میں حسرت کا ایک آواز آتا ہے۔

کب بچپن میں نہ دے دو۔

میں کاسپ اٹھی۔ میں جو سدا بیمار رہتی ہوں۔ یلگ۔ میری زندگی ہے۔ دوا میں میری غذا۔ میرا تحفہ و نزار حرم

کو کبھی راستہ نہ دکھلا سکیں گے۔ نیز جوانی اور اس کی بلہائی یعنی زندگی کے تندو تیز طومالوں کو آگے بڑھنے سے روک سکیں گے۔ تجھے کبھی زندگی نہ بخش سکیں گے۔ تجھ میں نئی روح نہ بھونک سکیں گے۔ یہ آنسو بہتے ہی رہیں گے اور تیری ناکامی کا مذاق اڑانے لگیں گے۔ نیز بڑے عاشقوں گالوں سے بہ بہرہ گیری تیرے داس میں جذب ہوتے ہیں گے، تو اپنی قیمتی زندگی کی کٹھن راہوں پر ان ننھے بچوں کی طرح بن جا جسے طوفان اور آندھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ورنہ سترے لڑکھڑاتے دم زندگی بھر کے اسخانے راستوں اور اسخانہ راہوں پر اندھیرے میں یوں ہی بھٹکتے رہیں گے۔

مگر نہیں مٹو تو ابھی کچی ہے۔ وہ اس فلسفہ کو بھلا کہا مانے۔ میں نے اس کے سر پر تشفیت کا بانہ لکھا اور اپنی طبری طبری تہستوں والی کٹھن میں سے دیکھا کہ گھٹنوں پر اس کی مسلسل رستی ہوئی نویدیں صلیب کے ساتھ آئندہ میرے پھیل چھل کر مٹو کے آنسوؤں کی طرح نیچے گر رہی ہیں۔ آسمان پر اادل بھٹکتے ہارے مسافر کی طرح ادھر سے ادھر گھوم رہے ہیں اور دور بہت دور ایک درخت پر تھکا ہارا زرد داہے سا مہموں سے بھر کر مٹو کی طرح اداس بیٹھا ہے۔

”دودھو د کا آغوش“ ص ۲۵ سے آگے

بس کا ہے لیکن جب یہ مری موجودگی محسوس کر لیں گے تو یہ جھٹک کر اپنے بھڑاچہ زل زکروں کے ماسک جڑا س گئے ال کی غراہیں گھٹی گھٹی مہیانی آوازوں سے بدل جائیں گی کہا جاتا ہے کہ نہ جاننا سب سے بڑی نعمت ہے کچھ نہ جاننے کی کبھی ہاں لے کچھ اس طرز سے کافی ہے کہ آج سرے دونوں ہاتھ خالی ہیں

انہوں نے میرے فیصلوں کی پیاس لی ہے اور وہ ملتی جلتی جلدی جلدی بلروں کے ماسک ہیں۔ بت ہیں۔ میں اپنے سوہرے کے دیے کو دیکھتی ہوں اس شخص کو میرا نام ماسک کہاں ہے کیا یہ اسے بس رکھ لیں گے۔ یہ وہ بستی شخص ہے۔ ”نی مہراز مان؟ آوارہ لڑا کر رہی ہے۔“ FIL WAS STEPPE 'SWOLF میں اس کے وسط میں لہو ن موں سام رہے تہ سبیل مجھ پر بکڑ میں اور سب سے ختم لڑوہ آواز۔ لٹا ہوا منہ بھاڑے مری طرف تھا۔ ہے میں

بقیہ اردو نامہ ص ۲۵ سے آگے

”اس نامہ نگار شام سری سری کی یاد میں ایک طلبہ غائب“ آخر ص ۵ کی صدارت میں منظر ہوا۔ اردو ہندی ٹیگلو اور مہاشی کے قمار خان صاحب نے شرکت کی۔ ۲۹ جولائی میٹر پی ہندوستان اور سنی وزیر مال نے صحافت کو بابا کر اردو کے لعلی سے کام کو لسی حکومت ہندی نے اور زبان ہندی کی مہر کی صفت تھا۔ اس کے بر خلاف نگار شام نے اپنی بی بی کے سر انداز حکومت اس کے خیال ہے کہ وہ اردو کے سر کا مل تلاش کرنے کی خاطر اہمیت کرنا چاہتی ہے کیونکہ ہماری حکومت اردو زبان کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں کمزور و ناتجربہ رہی ہے۔ یہ بات اردو کے مسائل کو کاغذ میں پیش کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا مقرر کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں)

نام کتاب: ”بہت دیر کر دی“ ناول، علیم مسرور
پھلی رباعی صدی میں ادبی اور معیاری ناولوں
کی رائے سے تیز نہیں رہی ہے۔ اس کے باوجود چند ایک
ناول اسے شائع ہوئے ہیں جن کے بغیر اردو ناول کی تاریخ
ادھوری سمجھی جائے گی۔ ان انگلیوں پر لگے جاوے تو
میں، یں علیم مسرور کے ناول ”بہت دیر کر دی“ کا شمار کرتا
ہوں۔ گو کہ یہ علیم مسرور کا پہلا ناول ہے لیکن یہ ناول
اپنے فنی رچاؤ، موضوع اور مواد، فکر و شعور کے اعتبار
سے قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ ناول کردار نگاری، واقعہ نگاری،
مکالمہ نگاری اور فضا و آفرین کے سبب دلپس سے بڑھ جائے گا۔
ناول میں اتنا جہاڑ ہے کہ قاری کو اپنے ساتھ پہلے جاتا ہے
یہ ناول جہاں صحت فروشی کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتا
ہے۔ وہیں طوائف کی نفسیاتی کمزوری کو بھی سامنے لگاتا ہے۔
اور وہ کمزور ہے گھر بھانے کی۔ سلطانہ کہنے کو طوائف
ہوتی ہے اور یہ صحت فروشی اس کو مال سے ورثہ میں ملتی
ہے۔ وہ آنکھ ہی طوائفوں کے ماحول میں کھولتی ہے۔ اسی ماحول
کی پروردہ ہوتی ہے لیکن چند دن کے لئے اس کو عارضی طور پر
داؤد کی نفسیاتی بیرونی بننا پڑتا ہے تاکہ داؤد کو خیال میں رہنے
کا حکمانہ بل سکے۔ داؤد کو اسے ساتھ ساتھ رہتے ہوئے وہ جہاں
طر پر اس سے دور رہتی ہے اس کے دل میں خواہش ہوتی ہے
کہ وہ داؤد کے گھر کو سنوارے اور خود کو گھر میں بیوی بنا
کرے اور اس مقصد میں وہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ داؤد

کی بے قریب زندگی میں سلیقہ آج آتا ہے۔ وہ اس کے گھر
پینے، آرام و آسائش کا ایک حقیقی بیوی سے زیادہ خیال رکھ
ہے۔ کسی کی بیوی بچنے کی یہ دینی ہوئی خواہش جو ہر طوائف
ہوتی ہے داؤد کے گھر میں عارضی طور پر پوری ہوتی ہے۔ وہ
پڑوسنوں سے خوشگوار تعلق رکھتی ہے۔ اس کی سلیقہ شعاری
باعث سانسہ چال میں بہار آجاتی ہے۔ وہ دو دن کے لئے
اپنی مال کے پاس جاتی ہے تو اس کی عبدائی داؤد اور پروین
برداشت نہیں کر پاتی ہیں۔ سلطانہ کی شکل میں علیم مسرور
بڑا احسان کر دے اور داؤد کو دیا ہے۔ سلطانہ کے اسٹے ٹوڈ
پہلے کے باوجود داؤد اس کو حقیقی بیوی نہیں بنا پاتا
اس لئے کہ وہ طوائف ہوتی ہے۔ آخر معاہدہ کے مطابق سلا
کے ٹوٹ جانے کا وقت آتا ہے۔ داؤد دل پر جبر کرے
اس کو شہر کے بدنام غنڈے کریم کے پاس چھوڑ آتا
جس نے داؤد کی مشکل دور کرنے کے لئے سلطانہ کو اس کے
حوالہ کیا تھا۔ سلطانہ کو داؤد چھوڑ تو آتا ہے لیکن اس
سامن کسی چیز میں نہیں لگتا۔ اس کے اندر سا مردانہ
اٹھتا ہے۔ وہ سلطانہ جو اس کی عنایت و آبرو تھی یوں
اس کی آبروریزی کرے، وہ تسلیم اٹھتا ہے۔ وہ کریم
یہاں سے سلطانہ کو ہمیشہ کے لئے لے جاتا ہے۔ وہ اس
کو اپنے لئے لے لیتا ہے اور جاتا ہے۔ آخر کریم سے لڑ کر
سلطانہ کو لے آتا ہے اور اس کو اپنی جھوٹی کائنات
یہ کہہ کر مہلتا ہے کہ یہ عیسوی بیوی ہے جو مجھ سے لڑ کر

ابابیل اور طلسمات شامل ہیں۔ اس کے بعد ایک ناولٹ ”آگ اور گھرا“ ہے۔

قمر امین کے یہ افسانے اساطیری داستان اور تہذیبی پس منظر پر مبنی ہیں۔ تہذیبی بازیافت، شخصی تشخص اور ذہنی متاؤ کی ایک رد ان کے اکثر افسانوں میں ملتی ہے۔ انہوں نے جہاں افسانوی اظہار کے لئے علامتوں کو اختیار کیا ہے وہیں استعاراتی اور تمثیلی اسلوب کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ان کے یہاں عقائد، اہام اور اسرار کچھ اس طرح جگہ پا گئے ہیں کہ بقول قلمس الرحمن فاروقی ان کی ذاتی تہذیبی شخصیت انہیں اہام و عقائد و اسرار میں دلیلِ صبح روشن دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ کچھ ہی کیفیت ”آگ اور گھرا“ میں ملتی ہے۔

قمر امین نے ذہن کے افسانہ نگار ہیں۔ انہیں چند افسانوں میں افسانوی اظہار میں جو تجربے ہوئے ہیں اس کی نمائندگی ان کے افسانے کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کڑیاں ٹوٹی ہوئی اور بکھری بکھری ملتی ہیں۔ انتظارِ صبح کی طرح ان کے افسانے مربوط نہیں ہیں۔ ان کے پسند آنے والے افسانوں میں ”سانپ“، ”ابابیل“، ”سیلیمان سریرہ زانو“ اور ”سبا ویمان“ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

کتابت اور طباعت خاصی اچھی ہے۔ قیمت پچیس روپے ہے جو مناسب ہے۔ لمبائی سائز کے ۲۵۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب جو خوبصورت گٹ آپ سے مزین ہے، ”شبِ خون“ کتاب گھر الہ آباد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ (مدیر امتیاز) نام کتاب ۱۔ ”ایلاف“ شاعر: رؤف خیر کرؤن سائز، جلد صفحات (۱۲۶) قیمت: ۱۰ روپے، ناشر: جی نو پبلی کیشنز، چھتہ بازار، حیدرآباد۔ ۲۔

اردو ادب میں تراکیب کے صنف کو جن شعرا نے باغیچہ برتا اور اختیار کیا ہے ان میں رؤف خیر بھی ہیں۔ آٹھ

عظیم مسرور نے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں اور مسائل کو بڑی خوبصورتی اور دلچسپی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مکملے نفی اور برصیت ہیں۔ سندربائی کی حیاں کا نقشہ اور اسکی عقلا مینا بکڑی اور اور مینا بکلیشن کا ماحول اور کریم کے ٹھکانے کی تصویر کشی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ ساری قصا و نظروں کے آگے رچھ آتی ہے۔ بھٹی کی زندگی کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے اس ناول کا شمار بھٹی کے ماحول پر لکھے گئے چند ایک اچھے ناولوں میں ہوتا ہے۔ کہانی کا تجسس آخر تک برقرار رہتا ہے۔ کہیں ناول غیر دلچسپ نہیں لگتا۔ عظیم مسرور ہر مقام سے نکلنا رنہ طور پر گزرتے ہیں۔

انصوبی کہ اتنا پیارا ناول لکھنے والا ناول نگار اب ہم میں نہیں رہا۔ پہلے ناول پر اس کو نظر لگ گئی۔ عظیم مسرور مرحوم کے اس ناول کو دوبارہ اہتمام سے شائع کر کے اردو اکیڈمی اتر پردیش نے ایک مستحق اقدام کیا ہے۔ جو لائق ستائش ہے۔ یہ ناول ہر اس قاری کے لئے دلچسپ ہوگا جس کو اچھے ناولوں کی تلاش رہتی ہے۔ نور و پے کے حوض یہ ناول اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ سے خریدا جاسکتا ہے۔

(قلیدار امتیاز)

نام کتاب ۲۔ ”آگ، آلاؤ، گھرا“ مصنف: قمر امین

قمر امین کے اس افسانوی مجموعہ میں افسانوں کے علاوہ ایک ناولٹ بھی شامل کیا گیا ہے۔ افسانوں کو انہوں نے تین عنوانوں کے تحت تقسیم کیا ہے۔ پہلا عنوان ”آگ“ ہے جس کے تحت تعاقب، قادیان، دھورے اور صحرہ - میم - قہ ہیں۔ دوسرا عنوان ”آلاؤ“ ہے جس کے تحت بریدہ، صبور کو بکھانے والا بولہ لھا، پہلا چہرہ + چوتھا چہرہ = دوسرا چہرہ، سب، رو میں ہے، دھن عمر اور تو یغ شامل ہیں۔ تیسرا عنوان ”گھرا“ ہے۔ اس کے تحت آخری تنہا دھن، نیا منظر نامہ، سیلیمان سریرہ زانو اور سبا ویمان، قلیدار اور ہما، یا مصطفیٰ

اب رتجکے ہیں جیسے لہریں رپے ہوئے
کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

دنیا نہیں بدلی زمانے ہی تو بدلے
ہم خانہ خوابوں کے ٹھکانے ہی تو بدلے
عنقریب کہ رُوتِ فیروزِ خٹہ ذہن اور خوشگوار فکر
کے شاعر ہیں۔ تو قہقہے کہ فن اور فکر کا یہ امتزاج ابھی
شاعری کے میدان میں آگے لے جائے گا، اور ان کی شاعری کی
خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ (قدیر امتیاز)

بے باکی فکر و وسعت نظر اور جرأتِ اظہار کی روشنی میں
ڈاکٹر مظفر حنی کے تنقیدی اور تحقیقی مقالات

جہات و جستجو

ان مضامین میں اردو کے اُن تمام اچھے اور بے تعلیق کاروں
کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کے ساتھ
جاری پیشہ ور تنقید عام طور پر بے اعتدالی برتا کر رہی ہے۔
بہترین آئینہِ حیات اور میراثِ ادب کے ساتھ ساتھ قہمتِ یقین اور بے
ناظر نگاہی، جامعہ لکھنؤ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵۔

بحیثیتِ موزع، سیاست دان اور ادیب ملک کی مایہ ناز
شعیت پروفیسر جلاوون خاں فیروزی (پدم بھوشن)
کی ادبی خدمات پر ایک مکمل اور جھرو بھڑا

پروفیسر جلاوون خاں فیروزی کی اردو خدمات

مصنف: صادق نوید ایم۔ اے (عثمانیہ) قہمت: ۵ روپے
مجلد: خوبصورت کتابت - ۱۹۹ صفحات
پتہ: توسط نیشنل ایسوسی ایشن، چھتہ بازار، حیدرآباد۔

معروف کے تراشیے میں دنیا کے عقائد اور اس کے موضوعات کو
سمیٹنا کچھ دشوار طلب کا ہے۔ اختصار اور جامعیت کا امتزاج میں
طرح و رباعی اور قطعہ کے لئے ضروری ہے یہی تراشیے کے لئے بھی ورنہ
ہے۔ رُوتِ فیروز نے ایک ذہین شاعر کی طرح عقائد و تجربات
کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے تراشیوں میں بالکل ہی نہیں ندرت نگر
ہجے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اپنے پڑھنے والوں کو دعوتِ نگر دیتے
ہیں۔ اعراف، کارِ جہاں دراز ہے، بازی کر، دگھڑ کوہِ نڈ
دبیل، دہائی جاک، وسفید ہاتھی، اور رات کو رٹ ان کے
کامیاب تراشیے ہیں۔ ان تراشیوں میں زندگی کے قلعے سے شاعر
کا اپنا نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔

”ایلات“ کا بیشتر حصہ تراشیوں پر محیط ہے اس کے
بعد کچھ مختصر سی نظمیں بھی ہیں۔ جن میں ”چم نبتِ خاک را بہ عالم
پاک، تم کہاں کھڑے“ وہم تو مائل بہ کرم، خود بینی، اور واقعہ
نعت ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ تراشیوں کی طرح نظموں میں
بھی غریبی روایات، تعلیمات اور مذہبی اساطیر کو کام میں لایا گیا
ہے۔ تہذیبی بازیافت اور مذہبی قصے سے رُوتِ فیروز کی دلچسپی
نظری ہے جس سے ان کے مزاج کی بھی تشکیل ہوئی ہے۔

ان کی عنذ لیں غزل کے لئے مزاج کو سامنے رکھ کر لکھی گئی
ہیں۔ ان میں روایتی مضامین کم اور نہ ہونے کے برابر ہیں۔ غزل
کا لب و لہجہ جو حبانِ مشاراقت اور ان کے بعد کے شعراء کے یہاں
ملتا ہے وہی اندازِ رُوتِ فیروز کے یہاں آیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ
ہوں۔

کیا جھڑے آسماں آخر ہاتھ خالی ہو گئے
کب ہوا گزری تھی یونہی ڈالی ڈالی کھیلتے

تو نے خود اپنے سلاو سے خوش، ہم سے خفا
اندھیر کس قدر ہے یہ موزن کے شہر میں

اردو ادب کا

وقار خلیل

اردو کی علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

یوسف نظر، بے حس الہ آبادی، محسن نقاشی
اور کئی ساحروں نے کلام سنا

۶ جولائی۔ حیات سیر اعظم علی مالک

نیشنل پریس و بک ڈپو کا حارسہ قلب انتقال

ہوا، امرخوم سسکس اور ازارہ اوسان

اردو کی مطبوعات کے زٹر ارمادو، دوس

فرد تھے، علامہ غفر مائے

۹ جولائی۔ طامس اردو ٹرسٹ

لاہور سے لے اسٹڈی سکرل ملکہ فکر و طر

کا باہانہ اجلاس حیات احسن مددگار

معتمد اردو الہ آبادی کی صدارت میں منعقد

ہوا ڈاکٹر جمہور صابن نے طنز و مزاح کی

چاکر لال (سنی سانی ایلین) ملاح

جواہر خواہ ارشد اللہ رس، چند کلبال

نشاط کی اور بان حسن اور شوستے

از راستہ ملی مال) بیادنی جعفر سنا، خا

محمد مطور احمد سکریٹری بے تکبر، انکا

● اردو اسوسی ایشن ممکندہ آلتا

کی طرف سے منعقدہ ادبی اجلاس میں سب

نرمندہ لکچر، اکرام حادہ، مسیح انجم نے

منعنا میں سائے مشرق احمد بیرنارڈ انٹر

راسی پٹنل سروسس نے صدارت کی

اور جنی جس کے اسکا جن معمول اور

کا انگریزی ترجمہ کیا، واد پانی

۱۰ جولائی۔ ابراہیم کلام آزاد انجیل

انٹی ٹیوٹ کے جلسہ اور بے میں سہ خدی

اتر فخر مند میری، سرپٹ حیدر آبادی

بے درنگ مدراسی نے کلام سنا

۷ جولائی۔ ساونو انڈیا اردو

ایڈیٹری سٹی بونٹ کی طرف سے اردو کے

موقوف اور مسائل پر ایک سمینار پریس

سراج لکس کی صدارت میں منعقد ہوا

مسز عابدہ صدیقی، اکرام جاوید اور

ام اے آر بنگ نے محاط کیا خواب

خواجہ ناصر الدین نے احاطت کے

فرائض انجام دیے۔

● ایوان ادب کا مشاعرہ جاتا

بشوارق کی صدارت میں آراسہ کہا گیا

بھگور کے خواب طلب سسل وہان خصوصی

محمد صدر اور بہان کے علاوہ صابر

کو سگوسی، اسد انعامی، عابدہ فارسی

عبد الحیم شفق، بیسورام میر شاہ اور

دیگر ستر، نے کلام سنا

● بزم خزان ادب کا مشاعرہ ڈاکٹر

اکبر بوسنی کی صدارت میں ہوا۔ بہان

شاہ صبح اللہ شفق (بہار) کے علاوہ

۳ جولائی۔ بزم نگ ادب کا مشاعرہ

ادبی اجلاس و مشاعرہ جناب تاجر

حیدر آبادی کی صدارت میں منعقد ہوا

معراج صوفی، شاعلی ادیب اور

بوسنہ کی نے ادبی موضوعات پر تحلیقات

میں کیں محفل شعر میں باہر، غلظت

حیدر آبادی، بے حس الہ آبادی، اکبر

بوسن، اقبال ہاشمی، شاعلی ادیب

سمیع اللہ شفق اور شکیل منجری نے

کلام سنا

۴ جولائی۔ اردو اسوسی ایشن

ساونو سنٹرل ریلوے کا سالانہ ادبی

اجلاس و مشاعرہ ریلی نیلام میں اساتذہ

بہار سرجی سی سرپو استوانہ صدارت

ن ادبی اجلاس میں ڈاکٹر حبیب ضیاء

اور مسیح انجم نے فکاتی معامین سائے

ورداد پانی محفل شعر میں غیاث متین

ڈاکٹر یوسف کمال، معطر حجاز، رؤفہ خیر

حسن مالکانوی، جمیل شیدائی، طالب میرزا

مصلح علی بیگ، علی الدین نوید، فکر و ادبی

حبیب ضیاء نے نظامت کی۔

۱۷ جولائی۔ تلگو کے جید ادارہ

انقلابی تاجر سری سری (۱۹۱۰ء)

۱۵ جولائی ۸۳ء کی وفات، پرنس ڈاکٹر

شاہ جنرل سکویٹری، راسنی انجمن ترقی

اردو نے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ

سری محمد آفرین شاعر تھے، جمہوریت

سوشلزم کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ

پیش کی گئی، انسانیت کی سرمد نبی ال

تقدیر کی کاربند رہا ہے آنجنابی تلگو

ترقی پسند تحریک کے بانی رہنماؤں میں

۱۹ جولائی۔ ادارہ ادبیات

کی مجلس انتظامی کا اجلاس ایوان اردو

میں منعقد ہوا، جناب حامد علی عباسی

(آئی اے ایس) ریٹائرڈ کوآرڈر کا

صدر منتخب کیا گیا، سابق صدر ادارہ میر

سید علی اکبر صاحب نے باری مزاج کے

اعت سے صدر کے انتخاب کا مشورہ دیا

اس کے علاوہ ادارہ کے معتمد قومی جناب

سید اسلم علی اختر وائس چانسلر عباس

یونیورسٹی کوآرڈر کا نائب صدر اور جناب

میر راج سنگھ نے اکرادار کا معتمد

نائب صدر کے طور پر منتخب کیا۔

معتمد کیا گیا، اس موقع پر باری مزاج

علی اکبر صاحب کی زیرینہ ادارہ سے

پیشکش کی گئی، ان کے علاوہ اس کا

ایڈیٹر ڈاکٹر انیل کو ان کی کچھتی سے

جہالت خدمات پر عائد کیا، سوشل

کیا گیا، جناب کنول پر شاد کنول اور

بانو طاہرہ سعید کو ان کی شہری خدمات

کے اہم ان میں ایوارڈ دیئے گئے جناب

آصف یا شاہ صدر راسنی انجمن ترقی

نے جناب کا محفل شعر میں کنول، بانو

سعید شہیدی، علی احمد علی و فاضل

خواجہ شہین صلاح الدین، صادق

نظام جیلانی صادق، آغا شہین و دیگر

شعاع ناروٹی اور انور ہاشمی نے کلام

سنا، مگر جسید آبادی اور علی احمد علی

نے غیر مقدم اور شکر بہادری کا

● محفل خواتین کا ادبی و شہری

اجلاس محترمہ بشیر قرآن علی (آل انڈیا

ریڈیو) کی صدارت میں ہوا، ڈاکٹر

ناصرہ بیگم اور محترمہ شکرہ بیگم نے شہری

نخلیات اور خواتین شعرا نے کلام سنا

۱۵ جولائی۔ انڈین اردو کالج

کے اساتذہ و طلباء کی طرف سے ڈاکٹر

زینت ساجدہ کے صدر شاعر اردو

خواجہ یونسوٹی مقرر کیے جانے کی مسرت

یہ انیسویں سال کے صدر اساتذہ

کی صدارت میں منعقد ہوا۔

کی شخصیت پر اساتذہ اور صدر طلبہ

نے اپنے اپنے کلمات کا اظہار کیا، ڈاکٹر

کی شہری خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا

گیا، جناب بابر اکبر علی خاں ساقی گوشت

لونی نے صدارت کی، جناب اصغر اختر

جناب خواجہ محمد احمد ڈاکٹر الشیخ بیٹ

نے بھی خطاب کیا۔

● سٹریٹ یونیورسٹی جسید آباد نے

واحدہ و فراہ کوآرڈر میں ان کے مقالہ

تعبیر الدین ہاشمی حیات اور ادبی کارنامے

پر مہم کی ڈگری کا سخن دار دیا، بہ معاملہ

ڈاکٹر سید جعفر کی نگرانی میں سنا ہوا۔

۱۸ جولائی۔ ادارہ جدید فکر و شعری

رحمانات کی طرف سے محترمہ صفہ اریب

کی منہ کتاب "باد اریب" کی رسم اجراء

جناب اختر دس کے ہاتھوں انجام پائی

پین ممبر عالم خود میری نے صدارت کی۔

یہ ڈیپٹی سراج الدین، ڈاکٹر معنی قسم ڈاکٹر

انور معتمد، جناب غوث سعید اور جس مرغ نے

اریب، صا اور جسید آباد کے ادبی ماحول

پر اپنے جانا، کا اظہار کیا، سرکار

کے پورٹریٹ کی علی مارنے کے سنا کی

جناب قدیر زوال نے نظامت کے فرائض انجام

دیئے۔

● جولائی میں سید فخر الدین صاحب

قومی انسداد مینی کی طرف سے سہ ماہی

میں انجمن ساقی حبیب غفر کی صدارت

میں منعقد ہوا، ڈاکٹر جسید شکر ریڈی

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Ikhtilaf-e-Urdu"; Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)

اسلوب اور انتقاد

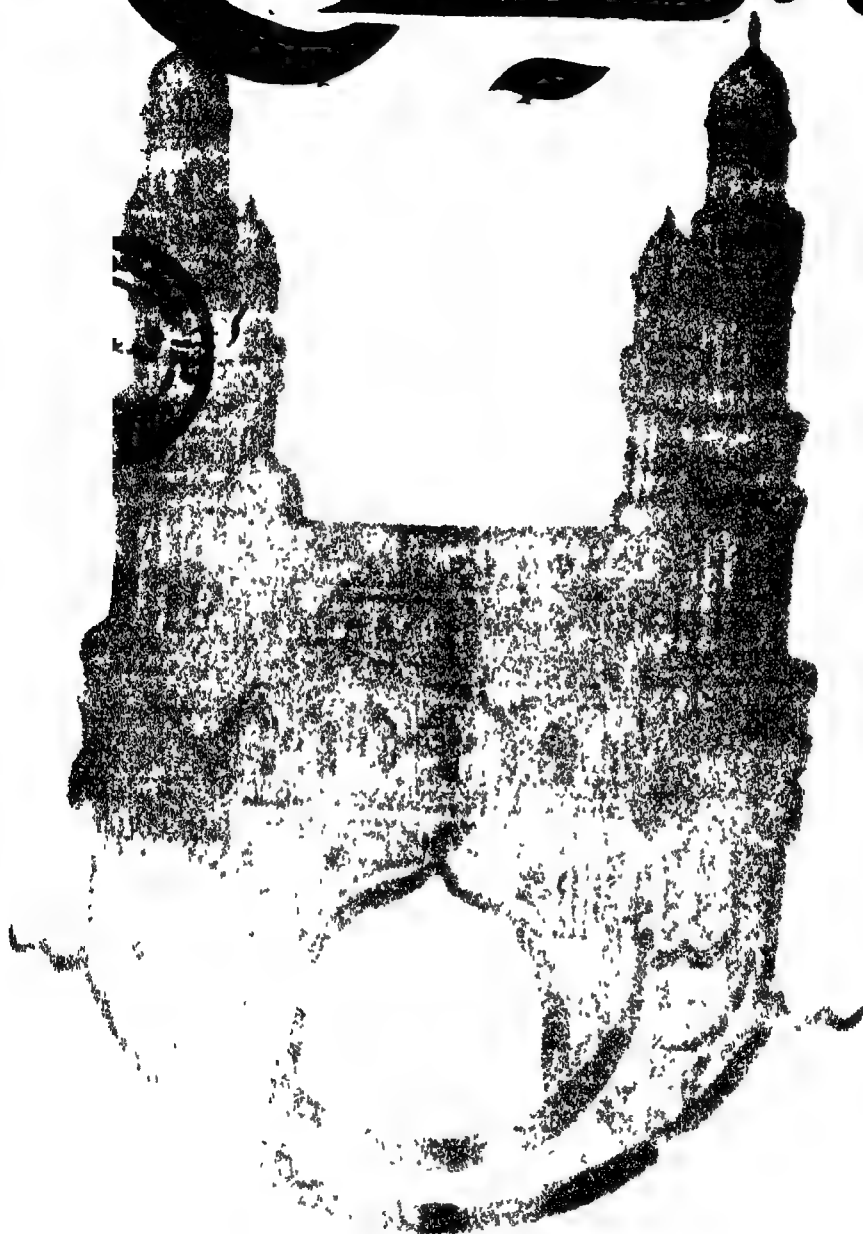


بال حبشہ

ضرب کلیم

مکتبہ رشید

سید



فون نمبر ۲۸۴۶۹

ان اجراء: ۱۹۳۸ء

بیادگار ڈاکٹر سید محمد الدین قادری زور
ماہنامہ

سب

حیدرآباد

مدیر اعزازی معاون مدیر لہ (۳۳) اگست ۱۹۸۳ء شمارہ (۸) قیمت فی پرچہ ۲ روپے ۲۵ پیسے	مجلس مشاورت صدر نائب صدر معتد پروفیسر سید علی اکبر عابد علی خاں پروفیسر گوپی چند نارنگ محمد اکبر الدین صدیقی رمن راج سکسینہ پروفیسر راج الدین فخر منظور احمد
رسالہ اشاعت ۲۵ روپے ہوائی ڈاک سے تب فالوں سے مشرق وسطیٰ ۱۰ ڈالر ۴ ڈالر ۳۰ روپے امریکہ ۱۶ ڈالر ۶ ڈالر بزرگ رجسٹری ۲۵ روپے لسان، برا، سیلون ۸ ڈالر ۳ ڈالر ٹکٹ تان ۴ پونڈ ۳ پونڈ	

ترتیب

۱۰۱	مفتی تبسم	۲	اعظم صاحب	۲۶	ڈاکٹر سلیمان الہر جاوید
۱۰۲	سید سبط حسن	۳	نظمیں	۳۰	الہ غوری جمید عثمانی
۱۰۳	فضا ابن فیضی	۱۶	غزلیں	۳۱	ظہر ہاشمی ظہیر غلٹ
۱۰۴	زبیرہ تحسین	۱۷	الفاظ (انشائیہ)	۳۲	محمد اقبال انجم
۱۰۵	باشہ آذہ سیٹا ظہیر	۱۹	نقد و نظر (نئی کتابیں)	۲۵	دقار لیلیٰ و باب خدیب و مار فیل
۱۰۶	محمد احمد سبزواری	۲۰	اردو نامہ		دقار غلیل

سید علی اکبر ٹیڈر پبلشرز پرنٹرز نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھو اکبر حیدر آباد ۴۰۰۰۰ سے سائیکلی

اپنی بات

اردو زبان کی بقاء اور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے رسم خط کو زیادہ سے زیادہ عام لکھائے تاکہ جو لوگ اس زبان کو بولتے سمجھتے ہیں وہ اسے لکھ کر پڑھ سکیں۔ ہندی گو اگرچہ ہمارے ملک کی سرکاری زبان ہوئے گا احرارِ قلم کے لیے لکھنا بہت مشکل ہے کہ جو زبان لکھوں میں گلی کوچوں اور بازاروں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے وہ اردو سے زیادہ سب سے بڑی زبان اور غریبوں کی کاسکی کی ہے۔ اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لے تمام حالت میں یہ اردو زبان اور فہم ہے۔ اردو رسم و ادب سے دلچسپی رکھنے میں لکھنا اردو رسم خط سے زیادہ اہم ہوئے کے باعث رسالوں اور مجلات لکھ سکتے ہیں اور کاروبار میں بھی اس کی مدد ملے گی۔ اردو کے لیے اردو لغتیں کی سہولتوں میں کمی اور بعض دوسری وجوہات سے اردو سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ آگے بڑھتی ہوئی ۱۔ اردو کی آقا کا انحصار اسی پر جو ان نسل پر ہے اگر اسے اردو لکھنا پڑھا اور لکھنا سیکھ کر دیا جائے وہ خود اپنی تہذیب و ادب سے بے بہرہ ہو کر ادھر سے کسی کا شکار ہو جائے گی اور اس آئے والی نسلوں کے لیے وہ کوئی تہذیبی و ادبی چیز نہیں رہے گی۔ اردو سے بہرہ دہی رکھنے والوں اور اردو تخریب کے رہنماؤں کا اہل سنت و اہل فہم کے لیے اس خط کی مثال اور ان کے لیے اس خط کی مثال دیکھ کر یہ سوچنا چاہیے کہ اس خط کو کون سی مثالیں مل سکتی ہیں۔

بطریقہ قلمی ماہر ہے کہ اس رسم خط میں کمال ہے اسی معرکہ کی بنا پر لکھنا لوگ رسم خط کو بدلنے کی سعادت حاصل کریں اور لکھنا لوگ اس کی اصلاح کے لیے سجادہ میں کمر لے سکیں۔

یہ شخص اباب مغالطہ ہے۔ جیسا کہ خاتمہ باب اللہ صاحب (مائب صدر جمیوریہ ہند) اور بعض دوسرے بہت خوبان اردو کا محاسبہ ہے (حمولے رضا کار اور بطور بعض لوگوں کو اردو لکھنا پڑھا سکتا ہے) چار چیزیں میں آسان اس رسم خط کی سب سے زیادہ مصلحت ہے۔

ایک ایسی ایج دی نظام اس اردو ڈسٹ نے غرضی ذرائع سے اردو رسم خط سکھانے کے لیے ایک بیرونی ملک میں لیا ہے اور حجاب خواہ عبدالعزیز صاحب (ڈائری آف لے۔ اس) نے ایک ابا سہل طریقہ دیا ہے کہ اس کے ذریعہ کوئی شخص جید گفتگو میں بہ رسم خط سیکھ سکتا ہے۔ اس پر وہ ملک کے سخت و ٹیڈیو بٹ سہمی نہ کرنا چاہیے میں جن سے وہ لوگ عام طور پر سعادہ کر سکیں گے جو بیرونی ممالک میں مقیم ہیں اور جو اپنے بچوں کو اردو زبان سکھانا چاہتے ہیں۔ اردو کی تدریس کے سلسلے میں یہ اپنی نوعیت کا سفر اور انقلابی قدم ہو گا اور امید ہے کہ اس کے بہرہ مندانے بڑے کام ہوں گے۔

معنی تبسم

سید سبط حسن

بیمان و فاقی تجدید

سفر حیدر آباد (۱۹ اکتوبر ۲۱) (کتبہ بینش ۱۹۵۸ء کے مآثرات)

وقت کسی سے نفرت کرنا ہے نہ محبت ،
وہ کسی سے رعایت بھی نہیں کرتا ۔
وہ پیدا بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے ۔
اور جب ساری دنیا سوتی ہے وہ تب بھی جاگتا رہتا ہے
وقت باقی ہے بقیہ ہر شے فانی ہے ،
جوانی ، حسن ، زندگی ، تندرستی ،
دولت ، دوستی کسی کوششات نہیں
بھی نہیں کہ اب بڑی ہو کر کئی بچوں کی ماں بن چکی تھی ۔
رپ دان و نکل میں برس کے بعد گھر لوٹا تھا اور میں
۳۵ برس کے بعد اپنے منہ بولے وطن حیدر آباد جا رہا تھا ۔ رپ دان
و نکل نے میں سال سو کر گزارے تھے ۔ مگر میں نے ۳۵ سال لڑائی
ہوش و آس دیں پر دیں میں بسر کیے تھے ۔ میرن ذہنی
کیفیت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکے ہیں جو طویل مفارقت کے
بعد اپنے کسی محبوب سے ملے ہوں ۔

دہلی سے حیدر آباد تک کا مختصر سفر نہ پوچھیے کہ کس
اضطراب میں گذرا ۔ ہوائی جہاز میرے جذبات سے نکلے
ہوا میں سینہ جاکر کرتا اور فراتے بھرتا شہر انگاراں
کی جانب بڑھتا جا رہا تھا اور میرے دل میں حوفاں برپا تھا
بادوں کے شب چیراغ کبھی جلتے کبھی دم ہو جاتے ۔ ۔ ۔ یہ
اخبار پیام کا دفتر ہے ۔ یہ قاضی عبدالغفار ہیں ۔ یہ میرا پیرا
دوست محمد دم ہے ۔ ۔ ۔ دل فگاروں اور دل فزادوں کا
جھپٹا ۔ نازنینوں اور نازیر داروں کا مسطور نظر اور دکن کی
بے چینی روح کی مٹا ہوا علامت ۔ ۔ ۔ یہ بلی ہند کا
" آستانہ زریں " ہے جہاں انجن ترقی پسند شخصیتوں کی ملاقات
پڑی تھی ۔ دل کہتا کہ حیدر آباد مانا کہ اب ان ہستیوں سے ملانی
ہے ۔ مگر وہ جو جیسا کہ ۳۵ سال کی طویل مدت میں ان کے
مزاج اور غور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہوگی ۔ کبیرا وہ
مجھ کو پہچان لیں گے ۔ ملاقات کا جو اشتیاق مجھ کو کشاں کشاں
یہ جا رہا ہے کیا وہ اس کی شدت کو محسوس کر سکیں گے ؟

(مباحثات)

رپ دان و نکل کا قصہ آپ نے سنا ہوگا ۔ توصیف
کو کام کاج سے بالکل دل چسپی نہ تھی ۔ بس سارا وقت بیٹھے پور
نوجوان بیویوں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے ۔ گھر والے اس کے
نکھڑیوں سے عاجز تھے ۔ ایک بیوی سے کسی بات پر جھگڑا ہوا
نوپ دان و نکل نے خفا ہو کر جنگل کی راہ لی ۔ وہاں اس کو
جھلنے لے جو بیٹھے دارو پی رہے تھے ۔ انھوں نے رپ دان
دکھ کی خوب خاطر تواضع کی اور جب رپ دان و نکل مدہوش
ہو کر سو گیا تو نکل نے غائب ہو گئے ۔ رپ دان و نکل سوتا رہا ۔ سوتا
راہاں تک کہ بیس سال گذر گئے ۔ آنکھ کھلی تو سر کے بال
خافہ تک بڑھ آئے تھے ۔ ڈارم نے بیٹے پر سایہ کر لیا تھا اور
نئی لکڑیوں کے برابر بچے ہو گئے تھے ۔ رپ دان و نکل بہت حیران
ہوئے ۔ ان دنوں آپس آیا تو کتے اس جنگلی آدمی کو دیکھ کر بھونکنے لگے
مگر نے تا میاں بجانا مشروع کر دیں ۔ اور حویلی گھر میں سے
مگر کسی نے رپ دان و نکل کو نہ پہچاننا ۔ ۔ ۔

کیا زمانہ میری خاطر بھیجے کی طرف مدد ملے گا۔ کیا دلوں کی قریب فاصلے کی طنائوں کو توڑ سکے گی؟ اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟ اگر اس دیارِ حسن نے جہاں میں نے "محبت کے سبق کی ابتدا کی تھی" مجھ کو یہ یاد سمجھا تو؟ میں اسی ادھیر دہن میں تھا کہ جب اندکے حملے کی طرف سے بیٹی باندھنے اور کسی پر سیدھا ہو کر بیٹھے گا اعلان ہو گیا۔ میں کھڑکی کے شیشے کے باہر جھانکنے لگا۔ شوقِ دید و رخصتوں، پہاڑوں اور تالابوں سے اپنے شکوکِ آمیز سوالوں کا جواب طلب کر رہا تھا۔ لیکن ہر لمحہ بدلنے منظر کے یہ خاموش تماشا ہی مجھ کو کچھ نہ بتا سکے۔

میں جانتا تھا کہ ہوائی اڈے پر دوستوں میں سے کوئی نہ ملے گا کیونکہ میں معینہ تادیخ سے ایک دن بعد پہنچ رہا تھا پھر بھی مشتاقِ نظریں اجنبیوں کے ہجوم میں یاروں اُستناؤں کو تلاش کر رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ کاش کوئی جان پہچان، ہکا مل جانے تو دل کی دھڑکن کچھ کم ہو سیکے لیکن ہوائی۔ سامان لے کر باہر نکلا تو ادھیر عمر کا ایک ٹیکسی والا میری طرف بڑھا۔ اس کے چہرے شہر سے پتہ چل رہا تھا کہ خالص حیدرآبادی ہے۔ مجھ کو نہ جانے کیا سوچھی کہ بے اختیار اس سے بغل گیر ہو گیا۔ وہ پہلے حیران ہوا پھر مسکوانے لگا۔ میں نے نادام ہر کر معافی مانگی تو وہ خالص دکنی بھجے میں بولا۔ کوئی بات نہیں جناب۔ آپ گلے ملے ہیں گا لی تو نہیں دی ہے۔ کہاں جائیے گا۔ میں نے کہا حایت نگر میں ایک جگہ مقدم بھوں ہے۔ کیا آپ مانتے ہیں؟ ہنس کر بولا۔ کیوں نہیں جناب۔ "مقدم بھوں" تو ہمارا اپنا ہے۔ اس کو نہ جانیں گے۔

صبح کا وقت تھا۔ اور دہلی کی شدید گرمی کے بعد دکن کا خوش گوار موسم بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ موٹر پوری رفتار سے فاصلے طے کر رہی تھی اور میں سر دھڑکن کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اتنے میں جیسی ساگر دکھائی دیا۔ اردوں کی شہنشاہیاں بچے لگیں۔ "پیار کی چاندنی، چمکتے کی خوشبو، سادھی کے پلوؤں کا ہوا میں وقص، دھبی ب دکن کے گیت، حافظہ دھانی فافوسوں کی مدھنی سے

جگہ گانے لگا۔ کئے کی سر دھڑکن اب پہلے سے زیادہ کٹھن ہو گئی تھی۔ کئے کے نشیب میں باغیچے اور چوڑوں کے جھولے بھی تھی چیزیں تھیں۔ البتہ سر دھڑکن کی بائیں جانب جگہ جگہ اشتہاروں کے جھوٹے سائیں بود دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی۔ نہ جانے بازارِ نہ ہنیت کو حسن سے اتنا پر کیوں ہے۔ خالق نے خالق کا بازارِ نہ ہنیت کا ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

خداوند گمراہِ ناموس نہ ہو گمراہِ ہوس نہ

کیوں شاہِ گل پاغ سے بازار میں آئے

مگر سرمایہ داری نظام میں شاہِ گل ہی پر کیا منحصر ہے انسانیت

اخلاق، مردت، محبت، دوستی، ادب سب بازاری مال ہیں

گئے ہیں۔ پھر بھی جھوٹا اگر چاند سورج کو دیکھ کر کہے کہ

"بابا مجھے تو سب نظر آتی ہیں دوٹیاں۔" تو بات سمجھ میں آتی ہے

لیکن مال داروں کی بد مذاقی کا کیا جواب ہے؟

(۲)

ڈاکٹر ماج بہا در گودے دہلی میں ملاقات ہو چکی تھی۔

یہ حضرت کسی زمانے میں دبے پتلے نوجوان طالب علم ہوتے تھے

اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے روحِ مدافعت تھے۔ اب دیکھا

دھڑا جسم، بال کچھ دی، کسی کے دادا، کسی کے نانا مگر تیزی طرار

اور پھر قی میں کرنی فرق نہ آیا تھا۔ پہلے یار دوستوں کے محبوب تھا

اب ان کا شمار ملک کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ سیاہ

لیڈر بھی ہیں اور اردو کے معروف ترقی پسند ادیب بھی۔ نے

ہی ڈانٹے لگے کہ کل تمہارے عاشقوں کی قوج لے کر ایروڈ

گیا تھا اور گالیاں دیتا واپس آیا۔ اچھا ای سے طویہ پر دھب

نرسنگہ راؤ ہیں۔ تمہارے پرانے دوست نرسنگ راؤ ڈائریٹر

ہفت روزہ رعیت کے صحیفے اور شہاب الدین کے یار۔ جو

تہلے ٹھہرے ٹھہرے کا انتظام کلب میں کیا تھا۔ سردار جعفری اور

کیفی وہیں ٹھہرتے ہیں مگر نرسنگہ کی حیدرآبادی ناک بہت کم

ہے۔ کہتے ہیں کہ تیس چالیس لاکھ کے شہر میں کیا ایک ٹرمی

نہیں جس میں پاکستانی جہان کے لیے ایک چادر پائی بچ جائے۔ ہا

۸۴ سے وہ تمہارے مسیذبان اور غم ان کے مہمان ہیں۔

کی گود میں گریں گی۔ مگر اس کا دل اور گوشہ نشین انسان میں نہ جانے کیا کشش ہے کہ ہر شخص اس کو پیار کرنا ہے۔ شاید اس کا غلوں اور بے عرق منا جلتا ہی لوگوں کو اس کی طرف کھینچ لیتا ہے۔

ہندوستانی پاکستانی دونوں ملکوں میں ایک نہایت بیہودہ بلکہ توہین آمیز دستور پولس میں اندراج کا ہے۔ یہ بتاؤ فقط ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لیے مخصوص ہے (کسی اور ملک کے باشندے کو ہندوستان یا پاکستان میں یہ دلت برداشت نہیں کرنی پڑتی) بستہ بند اور پیشہ ور گندوں ہندو معاشوں کی طرح اپنے آنے جانے کی رپورٹ پولس کے دفتر میں لکھوانی پڑتی ہے اور وہ بھی ۲۴ گھنٹے کے اندر ورنہ خود اندر۔ پولس کمشنر کا دفتر شہاب کے کھوکے پاس تھا لہذا میں نے کہا کہ اس کا خیر سے بھی کیوں نہ لگے ہاتھوں سبک دوش ہو لیا جائے۔ زنگ نے کہا کیا چھوڑ دوں گی۔ یہ حیدرآباد ہے دہلی نہیں۔ یہاں کس کی مجال ہے جو تم سے باز پرس کرے مگر میں نہ مانا۔ خیر صاحب، پولس کمشنر کے دفتر میں حاضری رہی۔ سارے دس بج چکے تھے لیکن دفتر میں سناٹا تھا۔ اسٹنٹ پولیس کمشنر تو موجود تھے البتہ عملہ غائب تھا۔ اُن سے رجوع کیا۔ بڑے اخلاق سے اٹھ کر طے۔ حاضری کی غرض بیان کی۔ معذرت کرتے ہوئے بولے، آج دسپرو ہے اور کل بقرعید۔ پرسوں آجائے۔ میں نے کہا مگر جناب حکم تو یہ ہے کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر حاضری لکھاؤ۔ ہنس کر کہنے لگے بس آپ کے درستی ہو گئے ہیں رپورٹ ہے۔ اب جس دن جی چاہے آجائے گا۔ باہر نکلے تو زنگ نے بڑے ناخوانہ انداز میں کہا "ہم نہ کہتے تھے کہ یہ حیدرآباد ہے، دہلی نہیں ہے" شہاب نے لقمہ دیا "کام آرام سے کرنا چاہیے۔ جلد بازی سے صحت خراب ہو جاتی ہے"۔

مال کہنا تو بھل ہی گیا کہ شہاب اندر سے تیار ہو کر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک لٹا تھا تھا لٹا فاذ اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں چھ سات چھٹے چھٹے فوٹے تھے جو ۲۲۰۲۱ میں اس وقت کھینچے تھے جب شہاب لکھتے آئے تھے۔ ان تصویروں میں شہاب ہے، مجاز ہے اور میں ہوں۔

اٹھ دس آدمیوں کو پولیس نے بلا دیا پکڑ لیا ہے۔ ان کو ضمانت پر دیا کرنا ہے۔ اور وہ مجھ کو زنگ ملاؤ کے حوالے کر کے یہ جا وہ جا۔ زنگ راؤ طالب علمی کے زمانے میں آل ہڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری رہ چکے تھے۔ ملکا نہ تحریک کے زمانے میں گرفتار ہوئے مگر اب انوار العلوم کالج میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں۔ کچھ لگے گھر چلتے ہیں لیکن ذرا شہاب کو لے لیں۔ سامان گاڑی میں رکھا گیا اور موٹر حیات ٹنگے سے نقل پورہ کی سمت روانہ ہو گئی۔ راستے میں عابد روڈ سے گزرے، میں نے پہچان لیا یہ دیہاتی بونٹ ہے جس میں میں نے کچھ دن قیام کیا تھا۔ یہ معطم چاہی نہ بٹ ہے۔ میں نے پہچان لیا پھر موسیٰ ندی کا پل آیا اور اس کے کنارے واقع آصفیہ مدر کی عالی شان عمارتیں نظر آنے لگیں۔ فانیہ ہسپتال، کتب خانہ آصفیہ فانی کورٹ۔ پتھر گئی، چار کمان سکد اور چار مینار سب جلنے بیچانے لگے

شہاب الدین حیدرآباد میں میرا سب سے عزیز دوست ہے۔ اس سے آخری ملاقات ۳۵ برس گزرے ہوئی میں بولی تھی۔ جب میں امریکہ جا رہا تھا اور شہاب ریلوے اسٹیشن پر کچھ کو رخصت کرتے آیا تھا۔ خط و کتابت کا وہ چنداں قائل نہیں البتہ مرزا ظفر الحسن جب حیدرآباد سے کراچی واپس آئے فانی سے شہاب کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ شہاب سے لڑ کر جو خوشی ہوئی سو ہوئی لیکن یہ کچھ کہ بیت فضا آیا کہ اتنا دور گزر جانے کے با وصف موصوف میں بیٹھا ہر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ دقن و قوش میں نہ عادات و اطوار میں وہی بوٹا سا۔ کہ یہ فرہی، قد وہی سر کے سیاہ بال، اوپر سے پردہ ہی لے نکلی اور شاہانی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ کا دیر زندگی سے ان کو کبھی دل چسپی نہ تھی۔ دولت و ثروت کو انہوں نے کبھی خاطر میں نہ لایا۔ بال بچوں کا گھسیلا اس نے کبھی نہیں پالا کہ اس سے لذت میں نسل بڑھنے کا خطرہ تھا۔ کتابیں جمع کرنا، کتابیں پڑھنا اور آدم کرنا شہاب کے میں مجاہتے مشاغل ہیں اور وہ اس دیرینہ ثابت گو رہی و مننداری سے نیاہ رہا ہے۔ خود دم کہا کرتا تھا کہ جب سب کتابیں حشر کے دن چھوڑ کر پھر دیکھ کر اپنے مالکوں

قبروں پر دیتے جلاتے ہیں اور بھر کھائی کر چلے جاتے ہیں۔ زنگ نے کہا کہ قبرستان کی وجہ سے اس مکان میں نہ مالک مکان خود رہتے تھے اور نہ کوئی اس کو خریدتا تھا۔ بلکہ مشہور ہو گیا تھا کہ اس میں بھوت ہیں۔ گاہک آتے، دیکھتے اور واپس چلے جاتے تھے۔ میں نے یہ مکان خریدا تو مالک مکان نے میرا بہت شکریہ ادا کیا کہ جان چھوٹی۔ اب میں مذکور بھوتوں کا حضور رہا ہوں مگر ہم خود اتنے بڑے بھوت ہیں کہ چھلے موٹے بھوت ادھر کا رخ نہیں کر سکتے۔

حیدر آباد میں میرا قیام ایک بھتے رہا لیکن یہ خوش گور شب در در پل چھپے گذر گئے۔ دوستوں اور کوم فتنہ ماؤں نے نرسہ میں پتہ ہی نہ چلا کہ شام کب آئی اور صبح کب ہٹا۔ اس دوران میں نرسنگھ شاہ ہی ایک دورہ نہ کالے گئے ہوں۔ میں مار وقت موٹیلے جھ کو سیر کر داتے رہتے تھے۔ سیر کیا لوگوں سے ملواتے رہتے تھے۔ پھر بھی افسوس ہے کہ کئی گھروں پر سلام کے لیے نہ جاسکا۔ میری وجہ سے ڈاکٹر مسٹر منگولٹا زنگ راڈ کو کی بار شیکسی پر آما جانا پڑا۔ وہ صبح کے وقت سرکاری زمانہ ہند میں رخصتوں کو دیکھتی ہیں اور شام کے وقت اپنا ذاتی مطلب کرتی ہیں۔ ایک رات ہم لوگ عالم سہ در میں بیٹھے دکنی ضیافت کے مزے کھاتے رہے تھے کہ زنگ کرا چانک بیوی یاد آگئی۔ تب یار غضب ہو گیا۔ میں نے منگولٹا سے وعدہ کیا تھا کہ واپسی میں نہ کو لینے چلیں گے۔ مگر اب تو بہت دیر ہو گئی۔ میں نے کہا فوراً اٹھ چلو۔ شاہ یہ انتظار کر رہی ہوں۔ چنانچہ بھاگ بھاگ پہنچے تو دیکھا کہ مطلب کھلا ہے اور ایک موٹر بھی باہر کھڑی ہے۔ زنگ منگولٹا گئے تو منگولٹا بہن باہر آئیں اور سکا کر بولیں مجھ کو معلوم تھا کہ حبیب اللہ کی محفل میں تم لوگ مجھ کو بھول جاؤ گے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں ایک بیٹے کو دیکھ رہی ہوں۔ اس کے والدین مجھ کو فہم پہنچا دیں گے۔ تم لوگ جاؤ۔

ڈاکٹر منگولٹا بچوں کی بے حد مقبول ڈاکٹر ہیں۔ گھر پر نہیں دیکھتیں حتیٰ کہ اپنے نام کی تفتی بھی نہیں لکھاتے۔ پھر بچہ

مجازی بڑے بانجیس سے شمال اوٹھے اور کلاں کی کیے بیٹھا ہے مجاز کی اتنی بیماری تصویر میں نے کہیں نہیں دیکھی اور اور اس کے ساتھ بھی میری کوئی اور تصویر نہیں ہے اور نہ شہاب کے ساتھ۔ مجاز کی ان تصویروں کو دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ مجاز جانی میں ہم لوگ کتنے خوب صورت تھے، آپ اپنے کو بھی خوب صورتوں میں شامل کرتے؟ یہ کہتے ہوئے قسم آتی ہے کہ شہاب کتنا خوب صورت تھا۔

یہ تصویریں ہم نے راج بہادر کے فوٹو گرافر کو دیں کہ ان کی کاپیاں نکال دو تاکہ میں ساتھ لے جاؤں مگر وہ غائب ہو گئے۔ تصویریں مجھ کو نہ مل سکیں۔ خدا کرے انھوں نے گم کر دی ہوں۔

زنگ راڈ باہر بنگلہ پنج راہل پر ایک پُر فضا پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ البتہ بنگلے کے سامنے اور مارو میں دو عجیب و غریب قبرستان جن میں

رنگ، رنگی چھتہ قبریں بنی ہیں۔ میں نے زنگ راڈ سے پوچھا کہ یہ قبریں کس کی ہیں۔ بولے ہمارا دیس پرانی قوموں کا گہوارہ ہے یہ قومیں تمہارے سہمیں جہ دور اور ہڑپہ کے رشتہ دار ہیں اور یہ قبرستان ایسی ہی کسی قوم کے ہیں۔ جس زمانے میں یہ جگہ سنسان ویرانی ہوتی تھی اور ہمارے یہاں آکر ڈیرے ڈالتے تھے تو وہ اپنے مردوں کو یہیں دفن کرتے تھے۔ اب یہ علاقہ بچوں پر مشہور میں آگیا لیکن قبروں کو کون ہٹائے۔ زندوں کی بھر پوریاں ہوتیں تو فوراً بلا تکلف اٹھادی جاتیں لیکن مردوں کو کس دل سے چھوڑا جاسکتا ہے۔ ہم کو زندوں کے آمام آرائش کی پروا نہیں ہوتی۔ لیکن مردوں کا احترام ہماری تہذیب میں داخل ہے۔ میں نے کہا تم اپنا لیکچر بند کر دو اور مجھ کو اس قوم کے بارے میں بتاؤ۔ زنگ راڈ نے کہا کہ یہ نیگن (NAGAN) لوگ ہیں نہ ہندو نہ مسلمان۔ وہ سال میں دو بار جمعرات کے دن یہاں آتے ہیں۔ قبروں کی صفائی کرتے ہیں۔ ان کو رکھتے ہیں، کڑھائیاں چڑھاتے ہیں، لگاتے جلاتے ہیں۔ شام کے وقت

موتیں چالیس چالیس میل سے بچوں کو لے کر وقت بے وقت گھر بے
آباتی ہیں۔ اور ڈاکٹر منگرا انکار نہیں کر پاتیں۔ کہتے ہیں کہ بیمار بچوں کو
کو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ مجھ کو اپنے بچوں کا بچپن یاد آنے
لگتا ہے۔

(۳)

مجھ کو اردو اکیڈمی نے پریم چند سینار میں شرکت کیلئے
مدعو کیا تھا۔ یہ بہت فعال سرکاری ادارہ ہے جس کا مقصد اردو زبان
و ادب کی اشاعت اور اردو ادب کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔
اس قسم کی اردو اکیڈمیاں بڑی، بھاری، بنگال، بہار، شہر
بلکہ قریب قریب ہر ہندوستانی ریاست میں قائم ہیں۔ اردو
ایڈمی آندھرا پردیش کا دفتر ایک دو منزلہ عمارت میں ہے
اس کے ڈائریکٹر مسٹر سری واسو جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل تھے
دانش ور ہیں۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے اکیڈمی کی سرگرمیوں کے
بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے اور اردو اکیڈمی کی مطلوبات
بھی عنایت کیں۔ وہیں جناب اختر حسنی سے بھی ملاقات ہوئی جو
مسٹر سری واسو کے رفیق کار ہیں۔ اختر حسنی میری یرانی یاد اللہ
ہے۔ وہ میرے بعد اخبار پیام سے وابستہ ہوئے تھے۔ اور قاضی
عبد الغفار مرحوم نے علی گڑھ جاتے وقت پیام انہیں کے سپرد
کیا تھا۔ اختر حسنی اردو کے معروف ادیب ہیں اور کئی کتابوں کے
مصنف۔ حال ہی میں انھوں نے غالب کی مشہور مثنوی ابرگہ باز
کا مسموم اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ ایک نسخہ مجھ کو بھی دیا لیکن
اس تک اس کو پڑھنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔

اردو اکیڈمی کے دفتر سے اٹھ کر سیاست کے دفتر
عالم علی خاں سے ملے گیا کہ ۱۹۵۵ء جب میں آخری بار حیدر آباد
آیا تھا تو ہی صاحب جو اس وقت صاحبزادے تھے انھیں ترقی پسند
مصنفین کے متہمت تھے اور انھیں کی اس تاریخی کانفرنس کو کامیاب
مانے میں بیس بیس جیس کو کرشن چندر نے "بودے میں" اور
سی جی بھیر نے "روشنائی" لکھ کر زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ عالم علی
خان نے البتہ جگہ، احسن علی مرزا اور دوسرے کئی دوستوں
سے ملوث نہ ہو گئی۔ عالم علی خاں نے اپنی اس عدم موجودگی کی تلافی

بعد میں ایک پر تکلف دعوت سے کر دی۔ کام وہیں کی لذت تو وقتی
ہوئی ہے لیکن ان کے لطف و عنایات کا نشہ ہنوز باقی ہے۔ وہیں
عزیزم ناہ علی خاں نے سیاست کی مطبوعات بھی مطالعہ کیں۔ ان
ان کتابوں میں محمد دم کے نثری مضامین کا ایک مختصر مجموعہ پڑھنے کے
پچھے لڑکا بھی تھا۔ جس سے میں بالکل بے خبر تھا۔ دہلی اور حیدر آباد
میں اردو کی نئی نئی مطبوعات کی فراوانی دیکھ کر اپنی نادانیت کا
احساس بڑی شدت سے ہوا۔ امریکہ یا انگلستان میں کوئی کتاب
شائع ہو تو ساری دنیا کے انگریزی دانوں کو خبر ہو جاتی ہے، لیکن
اردو بے چاری اس سعادۂ خود سے محروم ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان
اقتصادی پاکستان کے درمیان قریبی ہم یہ ہونے کے باوجود کتابوں
اور رسائل کی ایسی دین مذہب ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی بیشتر
اردو مطبوعات سے پاکستان کے لوگ اور پاکستانی مطبوعات سے
اہل ہند بے خبر رہتے ہیں۔ کاش کوئی سودا اس دیوار چین کو توڑ
سکتا۔ کیونکہ ان کتابوں سے سراسر زبان اردو زبان داد
کامیاب ہے۔

پہلی تقریب جس میں حیدر آباد کے ادیبوں سے ملاقات
کا موقع ملا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے اردو ہال میں
منعقد ہوئی تھی۔ اردو اکیڈمی کی مانند اردو ہال بھی نئے دور کا ادارہ
ہے۔ اس کے بانی ایک مخیر بزرگ حبیب الرحمن صاحب ہیں۔ وہ
ریٹائرڈ مصلیٰ سرفراز ہیں انھوں نے تہرہ کے وسط میں اپنی کئی ایکڑ زمین
اردو کے لیے وقف کر دی ہے اور نام و نمود سے بے پروا بڑی مذہبی
سے اردو کی خدمت کرنے رہتے ہیں۔ اردو ہال کی عالی شان عمارت
کا افتتاح پرنس جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ اردو کالج بھی اسی
احاطے میں ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پہلی ملاقات جناب
حبیب الرحمن سے ہوئی۔ وہ منتظلی کے ہمراہ باہری کھڑے تھے
حیدر آباد کا رعایتی لباس یعنی ترکا ٹوپی اور بندھلے کی شیر دانی
اور تنگ ہری کا پاجامہ زیب تن تھا۔ نہایت دبے پتلے مگر بڑی
بڑی روشنی آنکھیں۔ اور چہرے پر کبھی سالی کے کئی آثار نہ تھے
گندھرا پردیش کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتد
عمومی ڈاکٹر حسینی شاہ ہیں۔ وہ اردو کالج کے پرنسپل ہونے کے

علاوہ پرانی دکنی اردو کے گھناؤنے متحرک ادیب بھی ہیں۔ اس تفسیر کے اہم جی دہی تھے۔ یہ دیکھ کر غرضی ہوئی کہ پرانی نسل کے جانے پہچانے ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ نئی نسل کے ادیب بھی برہمی قلم میں موجود تھے۔ ہر شخص جاننا چاہتا تھا کہ پاکستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کس حال میں ہے۔ میں نے پاکستان کے ابتدائی دور کا ذکر کرتے ہوئے کیا کہ سسہ سسہ سسہ سسہ ہمارے انجمن پاکستان کی سب سے سرگرم ادبی تنظیم تھی۔ ملک کے اکثر بیشتر ادیب انجمن سے وابستہ تھے اور مولوی عبدالحق، مولانا جعفر علی حسرت ایڈیٹر مولوی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا صلاح الدین ایڈیٹر ادبی دنیا اور مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب کے بزرگ بھی تحریک کی حمایت کرتے تھے بلکہ ۱۹۵۳ء میں انجمن کی جواکھرنس کراچی میں ہوئی تھی اس کی صدارت مولوی عبدالحق مرحوم نے کی تھی۔ البتہ ۱۹۵۴ء میں جب امریکہ کا عمل دخل پر مہر گیا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کو خلاف قانون جماعت قرار دیا گیا اور لاہور، کراچی، ملتان، حیدرآباد اور پشاور میں انجمن کی جو ہفتہ وار میٹنگیں ہوتی تھیں وہ بند ہو گئیں۔ اس طرح تنظیم باقی نہ رہی لیکن ادب میں ترقی پسند رجحانات انجمن سے پہلے ہی موجود تھے۔ اود آج بھی ادیبوں میں غالب و بھمان بھی ہے۔ بیشتر ادیب گرد و پیش کی زندگی کی تنقید کی جانب مائل ہیں اور معاشرے سے وابستگی کا دم بھرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی جہد گیری کا اعتراف اس کے مخالفوں کو بھی ہے۔ چنانچہ سرکار پرست نقاد جناب سلیم احمد نے حال ہی میں جماعت اسلامی کے اخبار جماعت میں اپنے ہم خیال ادیبوں کو بہت آڑے ہاتھوں لیا ہے کہ ان کی ادبی تخلیقات محض قبول سے محروم ہیں۔ وہ نہ فنی محاسن کے اعتبار سے ترقی پسند ادیبوں کی ہمسری کر سکتیں اور نہ ان میں وہ حقیقت شناسی، حسیت اور خلوص کی حرارت پای جاتی ہے جس کے باعث ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں آج بھی زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔

ہینٹ کے نئے تجویز کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ ہینٹ کے جھریے ہر دو میں ہوئے ہیں۔ نئی نئی علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال، نئے حسی تجویز کے لیے نئی

اور اظہار بیان کا نیا انداز اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان نثر اور رواں دواں زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ البتہ ہینٹ کے تجویزوں کی آڑے کر پاری کر چوٹ لگنے یا محروم کرنے کی خاطر بے مقصد اور بے معنی مہل ادب تخلیق کرنا ادب کی خدمت نہیں ہے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ جدیدیت کے نام پر اس قسم کے تجربے دی ادیب کر رہے ہیں جن کا کوئی واضح نصب العین نہیں ہے یا جو یاسیت، شکست خدگی، تنہائی اور بے چارگی کا شکار ہیں۔ ان ادیبوں کا انسان اور انسانیت پر سہا مہیا ساٹھ گیلے۔ وہ اپنی ذات ہی کا کچھ بھیٹے ہیں اور اپنے ذاتی آلام و مصائب کا رشتہ غم زمانہ سے نہیں جوڑ پاتے۔ یہی آلام و مصائب ترقی پسند ادیبوں کا مقدر بھی ہیں مگر فیض، جمیل، جالب اور احمد فراز وغیرہ کے کلام پر دہم دم میرا کی کے آثار ملتے ہیں نہ بے بسی، ہوسیت اور اکیلے پالا احساس ہوتا ہے۔

انجمن ترقی اردو کی تفسیر میں موضوع گفتگو پاکستان میں اردو کی ترویج و ترقی تھا۔ حیدرآباد کے لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ آئینی طور پر پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان اردو ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی اقتدار کی زبانی ہنزہ، انگریزی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس رکاوٹ کے باوجود نہ صرف اردو بلکہ علاقائی زبانیں اور ان کا ادب روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ افسروں کی بارگاہ میں ترقی ایک انگریزی اخباروں اور رسالوں ہی کو باریابی کا شرف حاصل ہے لیکن اردو اخباروں کی اشاعت انگریزی اخباروں سے کم ہے زیادہ ہے۔ اور طباعت و کتابت کے اعتبار سے بھی ان کا بھ بہت بلند ہے۔ میں نے مجلس ترقی ادب لاہور، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ترقی اردو بورڈ اور اس فورم کے قلمبرے اداروں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے سید احتیاز علی تانہ کی خدمت کو سراہا جو مجلس ترقی ادب کے پہلے ڈائریکٹر تھے۔ انھوں نے اردو کے کم و بیش سارے کلاسیکی ادب کو ٹائپ میں لیکھا سار پر شائع کیا تھا اور قیمت بھی بہت معقول تھی مثلاً سر سید کی

اگست ۸۳ء

پاکستان میں اگر علاقائی زبانوں کو فروغ ہوگا تو اس سے اردو کو بھی بہت فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ آج بھی جس طرح آپ کے دیس میں اردو کا دامن تلگو ادب کے نئے پھانے شاہکاروں کے ترجمے سے بھر رہا ہے اسی طرح پاکستان میں بھی علاقائی زبانوں کے ترجمے سے اردو کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ ہو رہا ہے علاقائی زبانوں کا قریب قریب سارا لوگ اور کلاسیکی ادب اردو میں ختم ہو چکا ہے۔ مثلاً شیخ ایاز نے جو سندھی کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور اردو میں بھی فکر سخن کرتے ہیں سندھ کے ہر دل عزیز قومی شاعر شاہ عبداللطیف جھٹائی کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ علاقائی زبانوں کے میل جول سے بے شمار نئے الفاظ اور محاورے اردو میں رائج ہو رہے ہیں اور علاقائی زبانوں کے نئے ادیبوں کی تحریریں اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو رہی ہیں۔

حیدر آباد آصف جاہی دور میں اردو زبان و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی مگر ان کے فیصلے اور دفتری دستاویزات سب اردو میں لکھے جاتے تھے۔ ذریعہ تعلیم بھی ابتدائی جماعتوں سے لے کر جماعتوں سے اعلیٰ جماعتوں تک اردو ہی تھا۔ یہ صورت حال انضمام کے بعد وزیر اعلیٰ بی رام کشن راڈز میرے میزبان رینگ راڈ کے عایہ کے زمانے تک باقی رہی البتہ مشعر میں جب ہندوستانی صوبوں کی لسانی بنیادوں پر از سر نو تشکیل ہوئی اور آئندہ ہر پمیش وجود میں آیا قدامی ریاست کی سرکاری زبان تلگو قرار پائی مگر آئندہ ہر پردیش ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں اردو کو تلگو کے پہلو پر علاقائی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے اور اردو زبان زبان و ادب کی جو کمششیں ہر سطح پر دہلی ہو رہی ہیں وہ قابل تعریف بھی ہیں اور حوصلہ افزا بھی۔

سرچہ بہادر سپرو نے ایک بار کہا تھا کہ اردو زبان ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی نشانی ہے (یہ فقرہ انجمن ترقی اردو کے سرکاری ترجمان "ہماری زبان" کے سرورق پر برسوں لکھا رہا) سرچہ کے اس فقرے کی سبائی کا شاہد حیدر آباد ہے جہاں وہ غیر مسلم ادیب اور دانش ور بھی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔

قریبی جو بالکل نایاب تھیں سترہ اشعارہ جلدوں میں شائع ہوئی ہیں اردو ان کی مجموعی قیمت فقط ساٹھ روپے ہے۔ اسی ادارے نے فرٹ ویم کاراج کی مطبوعات جس میں جان گلکرسٹ کی تصنیفات بھی شامل ہیں شائع کی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام انسائیکلو پیڈیا اسلام کے اردو ترجمہ کی بھی سترہ اشعارہ نہایت ضخیم جلدوں میں ٹائپ میں شائع ہوئی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی ہی سے "تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" کے نام سے ایک کتاب پندرہ جلدوں میں بھیجی ہے۔ اس میں عربی، فارسی، اردو، بنگالی، سندھی، پنجابی، بلوچی اور پشتو کے علاوہ بلٹی (بلتستان کی زبان) شنادگلکٹ کی زبان) بروشلی (ہنزہ کی زبان) کھوار (چترال کی زبان) کشمیری، ہندکو، سرائیکی (لہائی) اور برابھٹی (بلوچستان) زبان و ادب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور ان قوموں کی تاریخ و تہذیب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترقی اردو بورڈ کراچی تعسیر بنایس برس سے اردو کا ایک نہایت جامع لغت مرتب کرنے میں مصروف ہے۔ مگر کچھ کوہ مانتا پڑا کہ ہر چند کہ پاکستان میں علمی اور ادبی کتابیں کثرت سے شائع ہو رہی ہیں لیکن ابھی وہ حالات نہیں پیدا ہوئے ہیں کہ ادیب اور دانش ور فقط اپنی تصنیفات کے سہارے زندہ رہ سکیں اور فکر معاش سے آزاد ہوں۔ ان کو ٹی وی، ریڈیو، اخبار، سرکاری دفتری اس قسم کے دوسرے اداروں میں ملازمت کرنا پڑتی ہے۔

اردو اور دوسری پاکستانی زبانوں کے باہمی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اردو کا کوئی بھی خواہ سندھی، پنجابی، پشتو یا بلوچی گوئی کر کے اپنی زبان کا سکھ نہیں چلانا چاہتا۔ کیونکہ اولیہ ممکن نہیں ہے۔ دو شخص اردو ہمیشہ ملاداشتی اور بھائی چارے کی زبان رہی ہے۔ آج اگر یہ زبان اس کماری سے درخیز تر ہوگی کسی نہ کسی انداز میں بولی یا بھیجی جاتی ہے تو اس میں جسب اور دھونس کو فلی نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اردو میں رابطے کی زبان بننے کی قدرتی صلاحیت موجود ہے میں نے کہا کہ اردو کا کسی زبان سے جھگڑا نہیں ہے اور نہ وہ کسی زبان کو کسی کے جائز حقوق سے محروم کرنا چاہتی ہے۔ بلکہ ہمارا خیال ہے کہ

اردو کی ترویج و اشاعت میں پیش پیش ہیں۔ ان میں سرفہرست جناب ایم۔ باگا ریڈی، صدر اردو اکیڈمی اور وزیر پنجایت راج ہیں۔

وہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں اور انگریزی اردو، ہندی، تلگو، کنڑی اور مراٹھی کے علاوہ فارسی، برہمی، پوری، قدرت رکھتے ہیں (وہ جامعہ نظامیہ کے منشی فاضل ہیں) جہاں تک اردو سے محبت کا تعلق ہے مسٹر باگا ریڈی اردو اکیڈمی کے ڈائریکٹر مسٹر سری و۔ ستوا کے بقول بلاشبہ اپنے قول و فعل میں فرزند اردو ہیں۔ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلوانے میں مسٹر عظیم سنجواریڈی صدر جمہوریہ ہندوستان (جن کا تعلق آندھرا پردیش سے ہے) کے علاوہ مسٹر باگا ریڈی کی انھیں کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ وہ اردو میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ اپنی کتاب آندھرا پردیش میں جو "مادر جامعہ" کے نام سے مشہور ہے اداقبال کے

شعرا سے

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق بجلی

اندھ کے مرحلہ شوق سے ہوتے

سے شروع ہوتی ہے۔ سچ لکھتے ہیں کہ "اس علاقے میں بسانی عصبیت کا دور دورہ تک وجود نہیں ہے بلکہ تلگو اداوارو ایک دوسرے کو بڑھا دیتی ہیں اور ایک دوسرے کی اشاعت و ترقی کی آرزو کرتی ہیں۔ زبانوں کے اس مخلصانہ آہنگ و مترجاع نے یہاں کے پورے ماحول کو محبت، رزق اور علم و ادب و فنون کا ایک دل کش گہوارہ بنا دیا ہے خصوصاً تلگو اور اردو اس ریاست میں شانہ بہ شانہ ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہیں اگرچہ اردو کا جسم شمالی ہند میں ہوا لیکن یہ انھا آندھرا پردیش کو اس ہے کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ آسی سرزمین کا شاعر اور فرماں روا تھا۔

حیدرآباد میں اسکولوں، کالوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ میرے عزیز ڈاکٹر مجاہد حسین نے جو حیدرآباد یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں مجھ کو بتایا کہ ہندوستان کی ۶۶ یونیورسٹیوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہے اور اردو کے چھ سو اساتذہ یہ فرائض انجام دے رہے ہیں۔ حیدرآباد

میں اردو اکیڈمی، انجمن ترقی اردو، ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ انجمن ترقی اردو، انجمن ترقی پسند مصنفین، اداوارہ ادبیات اردو کے علاوہ متعدد ادارے اردو زبان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان اداروں کو مالی امداد بھی ملتی ہے۔ ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ کے ناظم میرے بہت کرم فرما جناب فضل الرحمن ہیں۔ ایک تقریب میں ملاقات ہوئی۔ برسی شہقت سے ملے۔ کہنے لگے میرے گھر صدمہ آنا۔ یہ وہی مکان ہے جس میں قاضی عبدالغفار رہتے تھے۔ موصوف نے اپنی ایک نازہ تصنیف بھی مجھے عنایت کی۔ میں شرمندہ ہوں۔ وعدہ کرنے کے باوجود ان کی خدمت میں حاضری نہ ہوسکا البتہ ان دنوں اردو کی جوائنٹلیکلو پیڈیا مرتب کر رہے ہیں اس کی تفصیلات ان کے مددگار مسٹر کلیم اللہ سے معلوم ہوئیں۔ کلیم اللہ کسی زمانے میں ہمارے ہمسفر اور ہم عصر تھے۔ اب ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کل ہمد اردو بورڈ کی سالانہ گرانٹ ایک کروڑ روپیہ ہے۔ ترقی اردو بورڈ کا بنیادی کام اردو نصاب کی کتابیں تیار کرنا اور مختلف علمی اور تحقیقی منصوبوں کی مالی امداد کرنا ہے۔ ترقی اردو بورڈ نے انسٹی ٹیوٹ یا مرتب کرے گا کام ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ کے سپرد کر دیا ہے یہ انسٹی ٹیوٹ پیڑا بارہ جلدوں میں ہوگی اور اب تک اس کی چار جلدیں تیار ہو چکی ہیں۔ اردو کا ایک جامع لغت بھی زیر ترقی ہے حیدرآباد میں میری آنکھیں روزنامہ "میرام"، "سیر دکن"، "صبح دکن"، "مشیر دکن" اور رحمت کو تلاش کرتی رہیں کہ مہذہ تصنیف کے ممتاز اخبار رہی تھے۔ لیکن ان میں اب کوئی بھی زندہ نہیں ان کی جگہ اب سیاست، رہنمائے دکن اور مصنف ستارہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی اور تلگو کے اخبارات بھی ہیں اردو اخباروں کی مجموعی اشاعت اگرچہ ایک لاکھ سے زیادہ نہیں (جو تلگو اخباروں سے بہت کم ہے) لیکن حیدرآباد کی سیاسی و تہذیبی زندگی میں اردو اخباروں کو جو اہم مقام حاصل ہے اس کا اندازہ ان کی تعداد و اشاعت سے نہیں لگانا چاہیے۔ اردو اخبارات پاکستانی اخبارات کی مانند آفس ہو چکے ہیں لیکن ان کی کتابت اور طباعت کا معیار اہمیت بخو

نہیں ہے۔

جب ان کی کہانیاں ہفت روزہ میل و نہار لاہور میں چھپتی تھیں ان کے اور درجہ تبسم کے انساؤں کے ذریعہ میں حیدرآباد کی نئی نسل کی ادبی سرگرمیوں سے تھوڑا بہت روشناس ہوا تھا۔ اسی دوران میں پتہ چلا کہ وہ علامہ حیرت بدایونی کی صاحبزادی ہیں علامہ حیرت مرحوم پیام کے مہجرتاری عباس حسین کے دوست تھے اور میں کبھی کبھار قاری صاحب کے ہمراہ علامہ حیرت کے گھر جایا کرتا تھا۔ جیلانی بانو سے ملاقات اس وقت ہوئی جب ان کی بیوی گزرے وہ انور معظم صاحب کراچی آئے اور میرے مکان کے قریب ہی اپنے غریبوں کے پاس ٹھہرے۔ وہ پچھلے سال بھی کراچی آئے تھے مگر فقط ایک بار ملنا ہوا تھا۔ انور معظم صاحب اسلامیات کے پروفیسر ہیں لہذا ان سے دور حاضر کے اسلامی افکار و احوال پر گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن ہنس مکھ ہونے کے باوجود صرف صاحب بے حد کم سخن واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے زیادہ وقت ادبی مسائل ہی پر گفتگو ہوتی رہی۔ چلتے وقت جیلانی بانو نے اپنے افسانوں کا نیا مجموعہ "یرایا گھر" عیاں کیا۔ ہماری خاتون افسانہ نگار نہ چلے اتنے حقیقتوں سے لبریز افسانے کیسے لکھ لیتی ہیں۔ برصغور کیوں لکھتا ہے گویا ساری دنیا دیکھ چکی ہیں اور ہر قسم کے حسی تجربیات سے آگاہ ہیں مگر انسانی رشتوں کے بیچ و خم اور ہم ہستی کے اظہار کا بہتر ان کو کون سکھاتا ہے؟

ایک شام حیدرآباد کے نوجوان اور صاحب ذوق شاعر راشد آزاد کے ساتھ گزری۔ وہ میرے جہاں مرگ دوست مصطفیٰ زیدی کے مداح نکلے۔ اپنے آخری جھوٹے گوہ غانا کا مسودہ مصطفیٰ زیدی نے خود کشی سے فقط تین دن پہلے مجھ کو اساعت کے لیے دیا تھا اس کی ایک نظم کا ہدف فیق صاحب اور میں گن۔ راشد صاحب کے استفسار پر میں نے بتایا کہ تین دنوں ہم لوگ کراچی سے میل و نہار شائع کرتے تھے تو مصطفیٰ زیدی ایک نظم اشاعت کے لیے لائے جس کے آخری شعر میں حیدر پاکستان کو ملک کا جیلر کہا گیا تھا۔ وہ زمانہ جنرل یحییٰ خان صمد پاکستان کے مارشل لا کا تھا۔ ہم نے مصطفیٰ زیدی سے کہا کہ یہ شعر نکال دو ورنہ پرمچہ بند ہو جائے گا۔ تم ایسے کون سے قوی رہتا ہو جس کے

منشی پریم چند کے صدمہ یوم پیدائش کی تقریبات ان دنوں ہندوستان کے گوشے گوشے میں منعقد ہو رہی ہیں۔ حیدرآباد کا پریم چند سینما راسی سلیس کی ایک کڑی محی۔ یہ سینما راسی سلیس کی جانب سے اردو ڈال میں بڑے اہتمام سے منایا گیا اور مجھ کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ حاضرین کی تعداد دہلی کے چار روزہ سینما کے اجلاس سے زیادہ تھی۔ اس سینما کا حاصل محترمہ ڈاکٹر زینت ساجدہ کی تقریر تھی۔ اس طوطی شیریں بیانی کی خوش مذاقی اور توفیق گھار۔ کا تھوڑا سا تجربہ بھوکھ پہلے ہی دن دوپہر کے کھانے پر ہو گیا تھا۔ وہ میرا بان تھیں لہذا ہر شخص موقع پا کر ان پر نفرت جست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ اکیلے کچھ منشی لڑ رہی تھیں۔ ان کے ناک و نلق دلب سے کسی کو مغر نہ تھی اور میں انتظار میں تھا کہ دیکھیں یہ برقی میری طرف کب رخ کرتی ہے۔ لیکن شاید مجھ کو جہاں سمجھ کر کش دیا گیا۔

پریم چند سینما میں زینت ساجدہ کی تقریر کا موضوع "منشی پریم چند کے نسوانی کردار" تھے۔ پریم چند کے ناول اور افسانوں میں عورتوں، بیوی، بیٹی بھی ہے اور طوائف بھی۔ بھائی وضع کی گھر گھر ہستی بھی ہے اور نئی طرز کی سوسائٹی لیڈی بھی مگر زینت ساجدہ کے بقول عورت کی شخصیت کا احترام اور اس سے بے مینا ہر عہد دی کا جو جذبہ پریم چند کی تحریروں میں ملتا ہے وہ شاید ہی کسی ادیب کو نصیب ہو۔ بلکہ بیشتر ادیبوں کے افسانوں میں تو عورت فقط لہستہ کی زینت اور ہوس کی بے شرمیوں کا نشانہ بنی رہتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ:

"پریم چند کی کہانیاں اور ناولوں میں مرد کی لگام ہر گز کسی نہ کسی عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

اب راستہ صاف تھا اور زینت ساجدہ ادب کی لگام ہاتھ میں بے نکانہ دوڑنے پر آمادہ مگر ڈاکٹر حسین شاہ نے جو سینما راسی کے سکرٹری تھے اپنا حق سنوہری استعمال کر کے اس چمکتے جلیں کا منہ سد کر دیا اور سینما پر ایکس پڑ گئی۔

بقرہ حید کی شام ہونے پر وہیں انور معظم اور جیلانی بانو کے ساتھ گزری۔ جیلانی بانو سے میں اس وقت سے واقف ہوں

اگر کوئی امداد دا یہ ماننا چاہے کہ ہندو مذہب، ہندو فلسفہ یا بدھ مذہب یا جہودی مذہب یا عیسائیت کے بنیادی اصول کیا ہیں تو اس کو نا کاسی ہوگی۔ میں نے مغربی محققین کی علمی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر مائیکو مری فائٹ *Monk* *gomeray watt* اور پروفیسر جی وغیرہ کی کتابیں اسلامیات کے نصاب میں داخل ہیں۔ لیکن کیا کسی مسلمان محقق کو گوتم بدھ حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ پر کوئی کتاب لکھنے کی توفیق ہوئی ہے۔ اس کو نا ہی کے اسباب و مطلق پراسوس ہے کہ زیادہ بحث نہ ہو سکی کیونکہ کالج کی شام کی شفقت کا وقت ہو گیا تھا۔ بہر حال میں کالج کے پرنسپل صاحب اعدا سا تذہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری گزارشات بھلہ دی سے سنیں۔

ایک دن زرننگہ راؤ چھ کو تو کو فلم بھجویں ہمارے زمین) دکھانے کے لیے گئے۔ میں نے اب تک کوئی ٹو کو فلم نہیں دیکھی تھی۔ البتہ جاں نثار اختر مرحوم کے بیٹے جاوید نے کراچی میں بنایا تھا کہ ٹلگو میں فلمی صنعت نے بہت ترقی کی ہے اور ہندوستان میں بے شمار ٹو کو فلمیں بن رہی ہیں۔ مابھجی حیدر آباد میں بنی ہے اور اتنی مقبول ہے کہ اس کے دوسرے سے زیادہ شہر ہو چکے ہیں لیکن ٹکٹ گھر کے سامنے شائقین کی قطاریں سترہ لگی رہی ہے بیرون ملک کے لیے مکالمے / ٹائٹل زرننگہ ماؤنٹ لکھے ہیں۔

مابھجی "یادش بخیر تلنگانہ کے بارے میں ہے۔ دی تحریک جس کو محمد وہنے "مراثیات"، میری کائنات، میری حیات" کہا تھا (اس فلم میں ٹریڈ یونین لیڈر کا کردار محمد دم ہی کا چوہ) فلم میں آصفی عد کے کسانوں پر مقامی زمین داروں کے مظالم سرکاری عملے اور زمین داروں کی ظلمت اور آخر کار اس جو وستم کے خلاف کسانوں کی مسلح جدوجہد کو برقی دلیسانہ فکری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کسان زمین داروں کو مار بھگتے ہیں اور زمین آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ اسی اثنا میں ہندوستانی فوج ریاست میں داخل ہوتی ہے۔ کسان خوش ہیں کہ اب ان کو زمین داروں کی ٹکٹ کھسٹ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے گا۔

ایک شعر پر ہم اخبار کو سترہ بان کر دیں (دو جنرل بھی خاں سے اس وجہ سے خائف تھے کہ سرکاری افسری سے ان کی برطرفی جنرل بھی خاں کے حکم سے ہوئی تھی) زمین نہ مانے اور نظم واپس لے کر چلے گئے۔ مگر دوسرے ہی دن پھر آئے اور ہماری قرامت کردار کے خلاف ایک طویل طنزیہ نظم ہمارے سامنے رکھ دی اور کہنے لگے کہ بہت ہو تو اس کو چھاپ دو۔ ہم نے چھاپ دی۔ "جیلر والی نظم اور یہ نظمیں دروڑوں کو ہذا میں موجود ہیں۔

ماشد میں تجریدی شاعری کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تین مجموعے بھی کو دیئے اور میں نے ایک رات میں پڑھ لیے۔ ان پر جو جانکاہ سا نگہ راؤ اس سے وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکے۔ اس صدمے کا اثر ان کے کلام پر بہت گہرا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری محبوب کہ دائمی مفارقت کا فوہر بن گئی ہے۔ ان کے جذبے کے خلوص اور احساسات کی سچائی سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن پیمانے زخموں کو خون دل بلا کر تازہ کرتے رہنا صحت مندی کو زیب نہیں دیتا۔ ہم ذات خواہ لکشا ہی پیارا ہو زندگی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ ہم ذات کو ہم کائنات میں حل کر دینا آسان کام کام نہیں اور نہ ہر شخص کا مزاج اس کو قبول کرتا ہے۔ البتہ اس کو کشش میں ہم ذات کی شدت اگر کم ہو جائے تو بھی قیمت ہے مگر ماشد میں کو مشورہ دینے والا میں کون۔ ان کو چارہ ساز دل اور تلنگانہ کی حاجت ہے۔ نا صحوں کی ہیں۔

ایک شام انوار العلوم کالج کے اساتذہ اور پیر سرچ اسکالروں سے گفتگو کا موقع ملا۔ اجتماع چونکہ تحقیقی کا تھا لہذا میں نے البیرونی کی کتاب "الہند"، ابن ندیم کی الفہرست اور شہرستانی کی الملل و النحل کا حوالہ دیتے ہوئے عرض کیا کہ ان بزرگوں کا تاجرتی کا جذبہ اور حصول علم کی خواہش ہمارے لیے کج بھی مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔ ان کو کبھی یہ خیال نہیں آیا مختلف مذہبوں اور معاشروں کے مطالعے سے ان کا ایمان خطرے میں پڑ چلے گا۔ لیکن ہمارے دانش وروں نے مدت ہوئی یہ روایت ترک کر دی ہے۔ یہ سب کہ آج اردو زبان میں کسی قدیم مذہب یا معاشرے

دیوی روسا و دکن کے ایک پرانے ادب نواز خاندان کی نور نظر ہیں۔ آبائی محل میں رہتی ہیں مگر چھوٹے بڑوں کا خواب دیکھتی ہیں انگریزی میں شعر کہتی ہیں۔ حالانکہ خود حافظ شیرازی کی مجسم غزل ہیں۔

ان کا فانیانہ تعارف تو خدوم کے مجموعہ بساط رقص کے ذریعہ ہو چکا تھا جس میں اندر دیوی کی دہ نظموں کے ترجمے بھی شامل ہیں البتہ ملاقات اب کے پہلی بار ہوئی۔ اور جیسا تھا ویسا ہی پایا بلکہ کچھ زیادہ ہی۔ اندر فانی دیوی محل کے جس گوشے میں رہتی ہیں وہ

دکنی تہذیب کے امیرانہ لوازمات سے بچا ہوا ہے۔ آسمانی رنگ کی نیلی چھت جس پر ستاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے طلائی نقش و نگار، بتدی جھار فانیوں میں برقی شمعیں روشن ایرانی قالین اور ازلی صوفے لیکن پرانی دھن کے جو مشرقی مذاق کو گراں نہ گزریں۔ غرضیکہ بہشت کے اس گوشے میں ذوق نظر کی تسکین کا پورا سامان موجود تھا اور کام دہن بھی لذت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لیکن وہاں بجلی کے کچھ نہ تھے اور ہم گری میں پیسے سے تر ہو رہے تھے۔ ہمارا کوئی ارادہ جہنم میں جلنے کا نہیں ہے۔ لہذا دل ہی دل میں سوچتے رہے کہ اگر بہشت میں بھی ایسا ہی ماحول ملا اور بجلی کے کچھ نہ ہوئے تو زندگی کیسے بسر ہوگی۔ اپنے اندیشے کا اظہار چپکے سے شہاب سے کیا تو وہ بولا "جنت میں تو ایرکٹ ڈیشنرنگ ہوئے ہیں۔ ہم نے کہا پھر اندھا جمائو ایرکٹ ڈیشنرنگوں نہیں لگواتیں۔" اس نے جواب دیا "اُن کو گری نہیں لگتی۔" اور واقعی میں نے دیکھا کہ اندر فانی اور شری ششدر دونوں آرام سے میٹھے تھے۔ ان کی پیشانیوں عرق اُود نہ تھیں۔

شری ششدر مثرانہ لکھ کے مشہور شاعر اور نقاد

ہیں۔ اب تک ان کی ۴۳ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ انھوں نے مجھ کو اپنی تین تصانیف عنایت کیں ایک مجموعہ تلگو نظموں کا جن کا ترجمہ خود انھوں نے انگریزی میں کیا ہے۔ دوسری انگریزی خطوط کا مجموعہ جس میں محام اودادب کے حوالے سے بحث کی گئی ہے اور تیسرے "میری دھرتی میرے لوگ" جہاں کی جدید و زمیہ نظم ہے۔ اس کا ترجمہ مناب اختر حسینی

کی وفا داری کا دم بھرتے تھے کھد کا کوتا اور گاندھی ٹیپی پہنی کر دیش بھگتوں کا دوپ دھار لیٹے ہیں۔ سرکاری جیپوں میں بیٹھ کر اپنے حلقے کا رخ کرتے ہیں۔ اور پولیس اور فوج کی مدد سے کسانوں کو شکست دے کر زمینوں پر دوبارہ قابض ہو جاتے ہیں۔ اس فلم میں فنی خامیاں ضرور موجود ہیں لیکن طبقاتی جدوجہد کے سچے واقعات پر مبنی اتنی تیز و تند اور مفاہمتوں سے پاک فلم شاید ہندوستان میں بھی اب تک نہیں بنی ہے۔

ایک روز خدوم کے بیوی بچوں سے ملنے گیا۔ میں نے ان کی بڑی بیٹی اسادتی کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ چھ سات سال کی تھی۔ بہیم خدوم اور دوسرے بچوں سے ملاقات کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ سب لوگ اب آرام سے ہیں۔ خدوم کو تو دوسروں کی چارہ گری سے کبھی اتنی ذہت نہ ملی کہ اپنے جیب و گریباں کی فکر کرتا البتہ خدوم کے شدیدائوں کی کوشش سے دو مکان خدوم کی بیوی اور اسادتی کو لالہ کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان کے دونوں بیٹے نصرت اور نعتہ لازم ہیں۔ میرے پاس پڑھے کے لیے الفاظ نہ تھے۔ سارا وقت خدوم کی پوتیوں، نواسیوں کے ساتھ بیٹھا جتن خدوم کی تصویروں کا اہم دیکھتا رہا۔ وہاں سے اٹھ کر سیدھے درگاہ شاہ خاموش گیا جہاں راج بہادر گھوڑیوں کی چادریں بے منتظر تھیں۔ ایک چادر شاہ صدیقی کی قبر پر چڑھائی اور دوسری خدوم کی قبر پر جو "سو گیا ساز پیر سر رکھ کے سحر سے پہلے" عجیب اتفاق ہے کہ خدوم سے میرا تعارف شاہ صدیقی ہی نے ایک مشاعرے میں کر دیا تھا۔ ہم لوگ چلنے لگے تو قبروں کے نگراں نے شکایت کی کہ خدوم صاحب کی قبر کے گرد لہجے کی جو سلاخیں نصب ہیں بچے ان پر جھولا جھولتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک سلاخ ڈھیلی ہو گئی ہے۔ اس غریب کو کیا معلوم کہ خدوم کو بچوں سے کتنا پیار تھا۔ اور بچوں کی ان خیر خواہی کو اگر وہ دیکھ سکتا تو کتنا خوش ہوتا۔

ایک شام شری متی اندر فانی دھن راج گیر اور ان کے توہر ناٹھار شری ششدر مثرانہ کی صحبت میں گزری۔ اندر فانی

جس کی بھیاں عشق بھیاں کی طرح بہت باریک اور نازک ہوتی ہیں
بٹیوں کو چھو تو وہ لجا کر اپنا بدن سکیر لیتی ہیں۔ کہتی ہیں ہم کو
بس دوسرے دیکھو بھی دگے تو ہم مرجھا جائیں گے۔ پھر تھوڑی دیر
میں ہوا کا کوئی جھونکا آلتے اور ان کی شرم کی چادر سر کا ڈبٹا
ہے۔ بٹیوں کے لب دوبارہ کھل جاتے ہیں۔ اور بلیکس جھپکنے لگتا
لگتی ہیں۔ مگر اندر نا دیوی کی نظم میں موس کا کوئی درخت ہے جس کے
تلے دو دل ملے اور جدا ہوتے ہیں۔ اس قسم کے موس سے بڑھتا
نہیں۔ ممکن ہے یورپ میں ہوتے ہوں۔

یہ نظم وقت کے محدود پر گھومتی ہے۔ وقت جو ابدیت
کے دوش پر سوار، مقام و منزل سے بے نیاز، مگر دوش بیل و
تیار کے منظر دکھاتا اور فنا و بقا کے اسرار بتاتا، ہستی کے سینے
میں اترتا اور کائنات کی پہنائیوں میں حل ہوتا، تاریخ کے ورق
الٹا اور تہذیب کو چلاتا مارتا، انسانی شعور کو میدانِ کار کرتا اور
تحقیق ذات کے امکانات روشن کرتا گزر جاتا ہے۔ لہذا
زندگی کے بدلے ہوئے مومنوں کی نگاہوں سے ۱۰۰۰۰ حیات بشر کے سفر
میں بہار و خزاں کی آویزشیں اور عرفان ذات کی جستجو
سب وقت ہی سے وابستہ ہے۔

ان کے دوسرے مجموعے *Poems of National Memory* کی نظمیں اگرچہ بے

جذباتی ہیں۔ لیکن عام فہم بھی ہیں اور بہ اعتبار معنی موسیٰ والی
نظم سے مختلف بھی۔ موسیٰ والی نظم میں اندر نا دیوی انسانہ
آفتاب کی بوتلیوں کے حوالے سے بیان کرتی ہیں۔ قوی یاد رکھو
انسانوں کا دکھ ہے "جن کی زندگی عبارت ہے آسمان کی کھلی
پچھت کے نیچے عزت اور بھوک سے۔ نظمیں قومی یادیں ہیں
"یادیں جو فقط میری نہیں ہیں اور نہ محض میرے اندر کے ستارے
کی ہیں بلکہ قومی حافظہ تو تاریخ کے ہر لمحے کو یادوں کی زمین پر
پرٹنے والے ہر قدم کے نشان کو محفوظ کر لیتا ہے / میرا رنر
اور اس کے باجی اجتماعی حافظے میں محو ہو کر ایک ہو جاتے ہیں

اندرا نا دیوی زیادہ وقت اردو ہی میں گفتگو کرتی ہیں
وہ پریم چند سمیت اردو میں شریک ہونا چاہتی تھیں لیکن تاریخ کے بارے
میں دھوکا ہوا اس لیے نہ جاسکیں۔ جی چاہتا تھا کہ ان کی نظمیں ان کی
زبان سے سنوں مگر فراموشی کی جراثیم نہ ہوئی۔ اردو کی مشاعر
ہوئی تو ہم کو کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی، وہ خود سننے لگتیں
کہ اردو شاعر اپنا کلام دوسروں پر مسلط کرنے کو اپنا حق سمجھتا
ہے۔ وہ شعر نہ سنائے تو شاید اس کا کھانا ہضم نہ ہو۔ اور ہم تو
وہ سخت جان ہیں جس نے کھنوس میں ایک شاعر صاحب کے خیال
اور اپنے نثر میں سننے اور اب تک زندہ ہیں۔ انھوں نے کہ انگریزوں
میں شاعرے کا رواج نہیں ہے لہذا انگریزی کے شاعر غریبوں
میں بھی اپنے شعر شاد دنا دہی سناتے ہیں۔ اور ہم نہ سخن فہم نہ
سخن و پھر اندر نا دیوی ہم کو کہیں سنائیں۔ البتہ انھوں نے
بھی اپنی دو تصانیف عنایت کیں۔

بعض اوقات جلال ملکھی پہاڑ کی چوٹی پر برف جم جاتی
ہے اور سادہ لوح سمجھے ہیں کہ پہاڑ کا دل بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔
ان کو کیا خبر کہ لا وال اندر ہی اندر پکڑا رہتا ہے اور جب بھونکتا ہے
تو اس کی ہیبت ناک آتش فشاں سے موت بھی لرز اٹھتی ہے۔
اندرا نا دیوی کی رفتار و گفتار میں اتنا ٹھہراؤ تھا۔ ان کا چہرہ
اتنا پرسکون تھا کہ مجھ کو ان کی روح کے ہیجان و اضطراب کا
اندازہ نہ ہو سکا۔ اور نہ ان کے شاعر ذہن میں جذبات و احساسات
کی جواگ بھرک رہی تھی اس کی تاثرات محسوس ہوتی بلکہ بار بار
یہی خیال آتا کہ یہ آسودہ حال خاتون لاکھ دل کش بھی مگر شعر
کیا کہتی ہوں گی۔ درد مندی ان کی خاکوں ہو اور زندگی کی المناکیوں
سے ان کو کیا سروکار لیکن ان کی نظمیں پڑھیں تو اپنی بدلتی پر
سخت ندامت ہوتی۔

ان کی نظم *Paradise in Mimosa* علامتی ہونے کی وجہ سے مشکل سے گرفت ہر آتی ہے۔ موسیٰ کو
ہماری زبان میں چھوٹی مٹی کہتے ہیں۔

لیکن شاعر کا زخمی ضمیر کراتا نہیں بلکہ لٹکا رہا ہے۔ ہم ان غاروں میں کیوں رہیں۔ دکھ کے آنسو کب تک بہائیں گے اور کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرتے بیٹھے رہیں گے۔ درد کے ان دنوں کو اجتماع بن کر بھگتنے سے کب تک روکتے رہیں گے، احتجاج، لوک نیک اپنا وجود بنائیں گے۔
"میرے لوگو!

ہماری جدوجہد زندگی کی خاطر ہونی چاہیے
انسانی وقار کی بحالی کی خاطر۔

ہمہماں جلال کو مجرد ہستی کے تجربے سے باہر آنا چاہیے۔
اور کھلے آسمان میں

خوابشوں کے شہسپا کی مانند پرواز کرنا چاہیے۔

وقت سے اس وعدوں کو چھپتے کر پھینکنے کی خاطر

اس کے چہرے کی چھوٹی نقاب کو ہمیشہ کے لیے نوچ پھینکے کی خاطر۔

۵۵

لغہ شیشول کا میسج صاف ہے آگے

کی ہیں اور سب جیل نے نئی منہ کی صلاحیتوں کو خوش آمدید کہا ہے۔

تجربہ کرنے در سب ہی احرا کیا ہے کہ میں نے

ان خوابوں کو ذہن کے کاسے میں بٹھا کر مندرجہ

کیا جبے ترائی جیتے سے آخری بوندوں کو سنبھالنے اور پھر

اس عام من میں نے زندگی کی کچھ طرح جھجھل کو گھول دیا اور

اور جب میں نے اس کا ستر سریر نظم ڈالی تو یہ راز مجھ

یہ خیال مہیا ناگیا کہ اس میں میرا اپنا ہی غلغلہ نظر آ رہا

ہے۔

بہ ناولٹ نئی دنیا کے بوطیوں اور بندل ہونے ساظر میں

ہر آئینہ ملی العادرا سعادہ کی سحر پور مناظر کا حامل

ہے جس کی اشاعت یہ نغمہ شہید و کار کا دیکھ سخی ہیں۔

(دعایا طبل)

در ایک مشترکہ ۱۰۰ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور شاعر جس کو
کرنارنجی حقیقت کا شعور ہے اپنے کام میں لوگوں کے اجتماعی
شعور کو اپنی علامت بنالیتا ہے ہر ملک کا ادب اپنے زمانے کے
اختلاف ہی قلمبند نہیں کرتا بلکہ انسانوں کی تقدیر اور ان کے
رہنمائی کی از سر نو تشکیل بھی کرتا ہے۔"

اندرا، دیوی کی نظریں دراصل فرد جرم ہیں اس سماجی نظام

کے خلاف جمہور اردوں برکس سے ہم پر حاوی ہے اور جس نے

نشان سے اس کی انسانیت، اس کی انفرادیت، اس کی خودی

سب چھین لی ہے ان کے نزدیک یہ صدی اندھی صدی ہے،

سیرت سے محروم جس میں جھوک اگتی ہے۔ جھوک کے پھول کثرت

سے کھلتے ہیں، جنگلی کی طرح گنجان، باغ کی طرح بھر پور۔ ان

زائر زد ہے کہ میرا قلم کسی بھوکے پیٹ کا خاکہ کھینچ سکے، ایک

ہو کی صدی کی سچی تصویر میں بختہ انسانیت کی تصویریں باقی

رہتی، مول مہاں تک کہ یہ صدی بول اٹھے اپنا نا انصافیوں

نے جو اس میں۔

ان کے ضمیر میں پوشیدہ جھوکا انسان پہنچتا ہے کہ آسمان

بہا سانس لے رہا ہے میرا گھر ہے میں ایک پر شکستہ پرندوں کو

میں پر رہتا ہے یہاں میری انزہ یوں میں جھوک ایک بدما

جس بھول گیا مانند اندھ سی اندر اگتھے ہو کہ جس کی کوئی شکل

ہیں کوئی جسم نہیں کوئی نام نہیں کیونکہ اس کو نام کبھی نہیں ملا

نہ بھول جس کی کوئی شکل نہیں کوئی جسم نہیں اس صدی کو نام

دے دیکھ اسے تو برا غلطوں کو بھی نام دیا اور میں ایسے ہی ایک

عمم کا ماس ہوں جہاں لاشیں کتب خانوں کے ارد گرد لٹائی

جاتی ہیں اور حنوط شدہ انسان فی چڑیا گھر دیں دفن جوتے

میں جھوک ہمارے ضمیر کی بولتی دستاویز ہے ہمارے عہد کی

کئی آپ جیتی یا مخصوص اس برا عظم کی پس ہم لپے اصلی چہرے

سہ مریوں چھپائیں؟

مرد و پھر سے مگر وہ چہرے قابل نفرت چہرے زخموں

نہ ہونہاں اور زمانے کے ہاتھوں بدنام اور مریوں چہرے۔

فضا بن فیضی

طرز احساس نیا، اور اچھوتا اسلوب
 ہے مد اسب کے اسالیب اپنا اسلوب
 کوئی اظہار یہاں مانع ترسیل نہیں
 شرط یہ ہے، کہ نہ گنجلک ہو مارا اسلوب
 سب کی آواز کی پہچان ہے اس پھر میں گم
 ڈھونڈتے پھرتے ہیں خود اپنا ہی چہرہ اسلوب
 دوڑ تک تازگی فکر کی مٹی نہیں دھوپ
 دی سچ بستہ سے جدیہ، وہی ٹھنڈا اسلوب
 بات کہنے کا سلیقہ ہے بڑی چیز یہاں
 کھر درے سے یہ سائل، یہ دھکتا اسلوب
 ذہن گھینے معنی ہے تو نکراس کی کلید
 کھولتے ہیں در گھینے معنی اسلوب
 مختلف ذہنی رویوں کی دھنک میں ہم تم
 ہی اپنا ہی ہو کیوں ہے جو تمہارا اسلوب
 بات کیا ہے، کہ نہ بات اس کی دلوں میں آری
 طرز اظہار تھا پامال، نہ پھیکا اسلوب
 آتش جاں نے مری گود میں پالا اس کو
 جب بدن مل کے ہوا رکھ تو ٹھہرا اسلوب
 تو قلم سے کبھی ظالم کا سر ایا لکھا
 نوک تیشہ سے کبھی ہم نے سنوارا اسلوب
 کچھ اسی سے ہے یہاں خوش منری کی پہچان
 مرا اسلوب، کہ ہے بے منری کا اسلوب
 ڈھنگ سیکھے کوئی اس شخص سے فن کاری کی
 بات سادہ ہے، مگر تازہ ور عا اسلوب
 پھر سے نکلو فضا تم کو صد اخود سے نکلا
 منفر د سا کوئی لہجہ، کوئی تازہ اسلوب
 ۵۵

بات رسیلی سب کی سب، لہجہ البیلا سب کا سب
 ہم مصرعوں میں بانٹ چکا میں اپنا سونا سب کا سب
 کس سے پوچھوں کیوں ہیں یہ ترسیل کے پیکر بے چہرہ
 لفظ مکمل سب کے سب، ابلاغ ادھورا سب کا سب
 لوگ پرانی قدروں کی تجدید سے خائف ہیں کتنا
 ڈال دو میرے دامن میں یہ کھوٹا سب کا سب
 تو صیفی جملے بھی اُس کے ہیں طنز یہ تمثیلیں
 پی جائیں گے مینے دانے، میٹھا کر دوا سب کا سب
 دن جب لہریں تھکے تو اک دن یہ راتیں کام آئیں گی
 اچھائے جھوٹی میں بھر لو، کالا اجلا سب کا سب
 تم بھی عصری آگاہی کا اک پیکر بن جاؤ گے
 وقت چھالے جائے گا، جب تم نکلیں چہرہ اسب کا سب
 کس کی بلا بھی کس کے سرانی، دھوٹی ہے رسوائی رات
 ڈوبتا سورج چھوڑ گیا تھا، اپنا اندھیرا سب کا سب
 میں بھونز تھا، ساری تہمت میرے سر کا بوجھ بنی
 دھوپ ہوانے جیکے جیکے شہد پھر اسب کا سب
 معنی کے انجانے رشتے لفظوں کی الجھی ڈوریں
 میرے ہی صفے میں آیا انا سیدھا سب کا سب
 پہلے تباؤ خود کو شعور نقب و نظر کی بھی میں
 یہ کیا بس کاغذ یہ اگل دو کتیا لگا سب کا سب
 پہلے ہی اپنی باتوں میں شہرتی پنچہ کم تو شہر
 در دھکتا تو اور ہوا احساس ریکارڈ سب کا سب
 ۵۵

زمیہ تحسین

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

۱۰۰۰ جامہ عثمانیہ کو اپنے جن فرزندوں پر فرمایا
ان میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا نام نمایاں
مقام رکھتا ہے۔ آپ اچھے ادیب، نقاد، شاعر
ہیں۔ ایک کہ شورش بھی تھے آپ کے اجداد سلطان
محمد قلی کے ساتھ دکن آئے تھے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ
سید ابراہیم جنہوں نے دکن میں قندھار شریف کو
ایسا وطن بنایا۔ علم کی خدمت، مسلمانوں اور ہندوؤں
کو بھائی بھائی کی کاسبت پر رکھا۔ حضرت سید نظام الدین
اولیاءؒ کی فیض صحبت سے استفادہ کیا۔ ان پر
حضرت کی خاص عنایت و شفقت رہی۔ شیخ کا لقب
آپ ہی نے عنایت فرمایا۔ آپ کے بزرگوں میں سید ستار
ملا الدین رفاہی و سید شاہ بدر الدین رفاہی
نے شہرت حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار
سید شاہ غلام محمد تھے جنہوں نے شہرہ آفاق و فنیہ میں
سائنس کی پھر سب چھوڑ کر علمِ نون کی ترقی اور
دعوتِ اشاعت اور ترویج کے لیے اپنے آپ کو
فدا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے مزید ریاضات
نوبہ ہرگز تیرہ اور درگاہ کی احاطہ میں غافلانہ قہم
کرائی۔ ان کا عرس ہر سال بڑے اہتمام سے منایا

جاتا ہے۔
ڈاکٹر زور ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی
تعلیم کی تکمیل مغیہ الاسلامی اسکول سے کی پھر
اورشٹمانیہ یونیورسٹی سے امتیاز سے ساتھ کامیاب
حاصل کی اور ڈاکٹر یٹ کے لیے ۱۹۰۷ء میں سرکاری
طوبہ برائے انگریز بھیجے گئے۔ ۱۹۱۱ء میں پی ایچ ڈی کی
ڈگری لی اور پریس ہوئے ہو۔ حیدر آباد واپس
ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ ارسطو میں عیسے
آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ پروفیسر شعبہ ادب اور
طبیعیات القدر و روح پر فائز رہے۔ عیشیہ
ہو گئی سے وظیفہ حسن خدمت پر بکثرت مشغول
کشمیر، ترمو یونیورسٹی پر بحیثیت صدر شعبہ ادب و
کرائی قدر خدمات حاصل کیا اور ان کے لیے
بہت سے پرائز دیے گئے۔ ان کی خدمات
ڈاکٹر زور نے ان کی خدمات

یا دگار۔ یہ ڈیڑھ بی بی چند ایک۔ آپ
محمد عثمانی میں اردو کی ترقی اور تہ پار
اردو کے سالیب میں لائے کر اردو مخطوطات
محمود علی کی بزم ادب روح منقبہ اور ہندوستانی

وغیرہ وغیرہ۔

مختصر نظام: عثمان علی خاں کے ۲۵ سالہ

تجربات میں جو اردو زبان کو ترقی ملی ڈاکٹر زود نے

’عہ عثمانی میں اردو کی ترقی‘ نامی کتاب میں اس کا تفصیلی

جائزہ لیا ہے اس کتاب میں دو باب ہیں ایک میں مختصر

نظام کی سرپرستی کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے اور

دوسرے میں ان کی اردو فوائد یا بیان کی گئی ہیں۔

یہ حصہ میں ’اردو شاہوں‘ انشاء پر دازوں کی قدر

افرائی‘ رسائی و اخبارات کی اجرائی‘ جامعہ عثمانیہ کی

جیل اور دارالترجمہ کے قیام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ادارہ ادبیات اردو، کتب خانہ ادارہ ادبیات

اردو، ماہنامہ ”سب رس“ اور ایوان اردو اپنے

مبسس کے نام کو زندہ کر رہے ہیں اس کتب خانے

کا شمار آج ملک کے نامور سب خانوں میں ہوتا ہے جس

میں شرفی موم کی نادر و نایاب کتابوں، فائیلوں، رسالوں

اور خطوط و دستاویزات وغیرہ موجود ہیں اور جن سے ملک و

بہرون ملک کے اسکالرس استفادہ کرتے ہیں ایوان اردو

’زیادہ یا نوادرات کا ذخیرہ‘ شمار ستوں و متاویزات

’نادر و عجزہ پرستل‘ سے اردو زبان کی ترقی ’بقا‘

نور و دانش و فن سے اردو زبان کو زندہ کر رہے جو خون جگر

ہیں کیا وہ اچھے بچے کی طرح رہا ہے اردو لکھانے

کا حق قرار دینا۔

کچھ ان کے اوہان حبیہ و اخلاق جمروت

سزا بھی کرتی چلی چلی کہ تہنہ ”سب رس“ کی

قلمی معاونت میں یہ اشتہار ہوتا ہے اس رشتہ سے

ان سے زخم رہے۔ پانچویں، ان کے انگریزی اور اردو

کے کسی وقت میں نے انھیں عیب کی مبارک باد نہ دیا

مگر جس کے جواب میں آخر تک حمید و بقوہ رہا۔

مبارک باد اور دعاؤں کے خطوط لکھتے رہے۔ میں

اپنے فرزند کے کالج میں داخلہ کیلئے انھیں دیکھا

انھوں نے لکھا کہ آپ کے فرزند کو صیغہ آباد کا پوچھ

ہاسٹل میں داخلہ کیلئے ہے۔ لڑکا بہت شرمسلا ہے

مجھ سے ملایا نہیں اور مارا مارا پھر تار ہا۔ میری جگہ

اگر ماہ نامہ سب رس کے لیے ذبیحی جائیں تو دونوں

وقت و آمد میں شائع کی جائیں۔ ان دنوں میں غم

میں تھی انھوں نے لکھا کہ آپ نے عثمان آباد میں

کی شاخ قائم کی ہے جو ہمارے لیے باعث شرف ہے۔

انھیں دنوں شوم اور دونوں بچوں کے ساتھ مہر

آنے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر صاحب سے بھی ملا

انھوں نے ہم سب سے ادارہ ادبیات اردو کے

کی خواہش کی اور کہا مجھے اپنی بیاض دے جائے تب

کلام کو ادارہ کی جانب سے کتاب کی شکل میں شائع

جائے گا۔ میں نے معذرت چاہی کہ ایک ہی منتخب کلام

کی بیاض ہے پھر انھوں نے جناب سرور کی تہنہ

پاس کلام روانہ کرنے کی خواہش کی لکھا اپنی بیاض

کی وجہ کلام روانہ نہ کر سکی ورنہ بہت ممکن ہے کہ کلام

کلام کی دوسری یا تیسری کتاب نظر عام برآئی۔ میرا

غرض و مخلص محسن کی جتنی بھی توفیق کی جائے کم ہے

ہزاروں سال تک اس اپنی بے غوری پہ روئے ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے جن میں دیدہ و سید

دیوم زور کر ادنیٰ تہنہ۔

راشد آذر

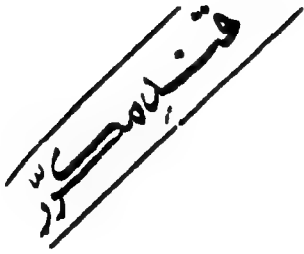
سید علی ظہیر

زخموں کی زباں

ایک نظم

جو گھاؤ سینے پہ ہیں
مجھے ان کا دکھ نہیں ہے
یہ انکا ایسی زبان نہیں ہے
جو تم کو تم سمجھ نہ پائے
تم ان سے نظریں چراؤ لیکن
تفقیقوں کو نظر کا دھوکہ نہ کہہ سکو گے
تم اپنے خنجر چھپاؤ لیکن
ہوئی کارے کشا استیں کا
زخموں کی زباںوں کی چھوٹی چھوٹی
نہمہ کی چیخ بن گیا ہے
میر میں گم قسم یہ سوچنا ہوں
جو زخم دل میں چھپے ہوئے ہیں
میں ان کا اظہار کس زبان میں کروں
کہ قرآن کو دیکھ جاؤ
نعمتہ اللہ کے لیے بتاؤ
مجھے خدا کے لیے بتاؤ

جبر اور ظلم، و دھاری تلوار
لوٹی ہوئی چیز تو نہیں ہیں
لیکن جب بھی جیتی ہے نئی لگتی ہے
میں زبان میں عجیب چھپا ہوا ہے
راقوں میں یہ زبان آسمان سے ملکتی رہتی ہے
اور دن کے آجائے میں صاف چھپ جاتی ہے
اس کی نوک پر چپکے ہوئے ہزاروں ماٹھیا ہوں
کسی پھٹے ہوئے لمحے میں
لیکن پھلتا ہوا کوئی لمحہ
ان کو نہیں بچا سکتا
صرف گرم ہاتھوں اور بلنا ہوا دفن ہی
انشاء اللہ انھیں بچائے گا۔



محمد احمد سبزواری

سکندر علی وجہ چن یادیں

اورنگ آباد دکن برصغیر کی تاریخ میں کافی اہم مقام رہا ہے اورنگ آباد جس کا یہ نام کبھی مہاراجہ کے دور میں ایک جہتی سردار ملک غنیمت کا مستقر رہا ہے جس نے اکبر اور جہانگیر کی فوجوں کو بڑا شکست کھا کر مہاراجہ کو نظام ستانی فوج میں بھرتی کر کے جہاں پالائیاں کا طویل سلسلہ شروع کیا جو شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد نامہ ماری رہا اور دکنی بہات کے ذیل میں اورنگ زیب کو مستقل دکن میں سکونت اختیار کرنا پڑی۔ اس کی عکاسی بعدہ دورانِ یکم کا یہیں انتقال ہوا اور ان کا مقبرہ تاج محل آگرہ کے نمونے پر اورنگ آباد ہی میں واقع ہے۔ خود شہنشاہ کا انتقال احمد نگر میں ہوا مگر وصیت کے مطابق ان کو اورنگ آباد کے قریب قلعہ آباد میں دفن کیا گیا۔

اردو کے ابتدائی شعرا میں سے تاج کی بدائش میں کی جس کی شہسواروں کو اردو شہسواروں میں ماحول مقام مائل ہے بیسویں صدی کے جیسے جیسے فترے میں جب سکندر وہاں طالب علمی کی زندگی گزار رہے تھے اس دور اورنگ آباد کی یہ حالت تھی

یہ ریاست کے چار صوبوں میں سے ایک کا صدر مقام تھا، ریاست کے جملہ محکموں کے دفاتر یہاں تھے۔ جامعہ نہایت کے قیام کے بعد بلوچہ حیدر آباد اور تینوں صوبائی مستقروں پر انٹر میڈیٹ کالج قائم ہو چکے تھے مولوی عبداللہ اس کالج کے پرنسپل تھے جس کے ساتھ ہائی اسکول کی جامعیت بھی شامل تھیں انجمن ترقی اردو کا دفتر اور پرنسپل بھی یہیں تھا مولوی صاحب نام کے پرنسپل تھے مگر ان کو اورنگ آباد کا بے تاج بادشاہ سمجھنا چاہیے مولوی صاحب کافی عمر سے یہاں تھے اس لیے سب سے واقفیت تھی مولوی صاحب کی علمی شخصیت سے بھی لوگ کافی متاثر تھے۔ ان کے اثر سے مولوی صاحب بہت کام لیتے تھے اور ضرورت مندوں کے لئے کام کر دیتے تھے اور ان میں طالب علم بھی ہیں جو نے حال کو خوشی کا لالہ سکول سے بڑی محبت تھی۔ اورنگ آباد میں جس کی کتب سکول پران کی خاص نظر عنایت رہی ان میں سب سے زیادہ گینش بہت تھے اور سکندر علی وجہ فاضل طور پر نمایاں رہے۔ وجہ خلق اورنگ آباد کے تعلق بجا اور کے رہنے والے تھے ان کے والدین نے ان کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اورنگ آباد آگئے اور وہیں سے بی اے اور ایم اے کی تعلیم حاصل کی۔

بجی صدیقی، عبدالحق، میر محمد علی خاں لکھنؤ وغیرہ شامل تھے۔ باہر سے محمد وحی الدین، مرزا ظفر الحسن، جبرسن اس
میں شامل رہتے تھے۔ سکندر بھی اس کے ایک اہم رکن تھے۔ کچھ سے نو اس لیے ملے سما کر وہ ہم جماعت بنے اور کچھ سے
ادب آباد کے نئے تعلقات تھے۔ مگر یہ ہمیشہ لیے دیتے رہتے تھے۔

اس زمانے میں مہال دیکھا جی اور نظامہ (حیدر آباد کے دو مشہور ہوٹل) کی شائیں کھل چکی تھیں اس میں جائے
ماستر پیٹر وغیرہ مل جایا کرتی تھیں۔ مگر بعد مغرب بند ہو جاتی تھیں جب کہ ٹیڑھا کو ماسٹر ٹیڑھا کو لڑکوں کو دس گنا
ہائے کی تلاش ہوتی تھی تاکہ چائے کی ایک سیالی بی کر مزہ ڈیڑھا کی کر سکیں۔ حالانکہ کافی حد درجہ کے بعد چائے پینے
کے بعد زیادہ مزہ چائے نوش بسنوں میں دس کر سہرے سپنے دیکھا کرتے تھے۔ اس وقت استاد اس رطلب ماسٹر
کا ہوٹل فراہم کیا کرتا تھا جو ایک جھگی میں واقع تھا اور دن بھر جامعہ کے مزدوروں کی طلب پوری کیا کرتا تھا
رات کو طلبہ کی ٹولی یہاں پہنچتی، ماسٹر کو بھجایا ماما، وہ گیس کی لالٹیں اور چولہا ملا اور اسٹیو کی لٹ کو دوڑا
کرے کے لیے گراموفون کے ریکارڈ بجاوا، اور بالآخر تھکاموں کی سہرا بجاتا۔ جب ماسٹر کی خوب رو ہوئی تو کوئی
لے ڈراو ماسٹر بھی ہوٹل بدر کر کے اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، اور اب اس کی جگہ آنا یورپا لے لی اس کی ایک
خصوصیت یہ تھی کہ یہ اڈہ مار دینے میں بڑا فراخ دل تھا اور دوسرے گولڈ ملک کو "گولڈ ماسٹر" کہا جاتا تھا
کی سب اس ہوٹل کا نام ہی "گولڈ ماسٹر" پڑ گیا۔ سکندر وقت کی طور پر ایسی ادا کو دیا کہ کہہ کر اس ہوٹلوں پر آکر
تھے۔ انھوں اس زمانے میں جب کہ وہ حیدر آباد سول سروس کے امتحانی معاملے میں سرکٹ کی بنیادی
کر رہے تھے۔

اس ٹولی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ کالی گلوچ کے ماہر تھے۔ ایک دوسرے کو ننگی محالیاں نہ دیا۔ جی
نہیں۔ لطف کی بات یہ بھی کہ نہ صرف کالی کھانے والا بدہ نہ ہوتا تھا بلکہ دوسروں کے ساتھ لطف لیتا تھا
اور محالہ کو راجہ دیا جالی دینے کی سوجنا تھا مگر سکندر کی محالیاں بھی مخصوص شخص، وہ ال کو ایسی بوجی سمجھا
تھا جس کو ہر کہہ دیر لگا نہیں جانتا تھا۔

لوگ نہیں تھے، منسٹر تھے، مغز بازی میں استاد، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے
تھے۔ سکندر گنگا نے کی حادثہ تھی۔ اشفاق نے اس کے کمرے کا نام رکھا "سماخ خانہ" محمد علی میکس کے کہہ رکھا
"مہا" "بھیا"۔ ایک کمرے میں دو بلند قامت بھائی رہتے تھے اس کا نام رکھا "سنہ خانہ"۔ ایک رونا شعلہ
دل لے نام گنار ہاتھ کہ محمد نے پوچھا "اور خود تیرے کمرے کا نام کیا ہے؟" اشفاق نے کہا "چائے خانہ"۔ کسی
کو "بھیا" "سنہ خانہ"۔ سکندر سے بولا "چائے خانہ" اور پوچھا "سیلاب ادا آیا۔"

میری قدیر اس جماعت سے متصادم تھیں مگر پھر بھی معلوم نہیں کیوں یہ سب میرے پارے تھے اور میں
بیاہا ابتدا میں گالیاں کھاتی مگر جب جواب میں خاموشی رہی تو انہوں نے گالیبوں کو مناجا ہونے سے

سکندر کارنگ صاف اور مکمل صورت اچھی ممتی، آواز سہیلی جھانے اور اداکاری کا بھی شوق تھا۔ کالج کے احوال سے ال پرانے رانی ڈیٹا بنایا۔ سہ وہاں الدین شمیم دکنگو کے رہنے والے تھے کالج میں معاشیات کے استاد تھے۔ گرواجی ہرمن مولانہ غیر متعزاد اب تقریر، ترجمہ اور ادبی نگاہی اداکاری اور فنس سب سے دلچسپی تھی اور ہر صنف میں کافی ملکہ تھا۔ یہ کالج کے افامت خانے کے وارڈن تھے اور ساختہ کالج کے دو ماہر سالے "پورس" کے نگراں مدیر یوم کالج میپال تیری دوم دوم سے مسابا مانا تھا جس میں وہ بڑوں اور بچوں کے مقابلے، تقریری، باغیچے، متاع بے ادب ڈرامہ ہوا کرتے تھے جس میں نہ صرف دیگر اصلاخ ملکہ بلکہ سے جہ دیکھتے تھے جیسے بلڈر جہاں شرکت کیا کرتی تھیں ہر ازہب اللہ بگ دہلوی کا مشہور متاعہ "دلی کی آفری" سب سے پہلے مہیں ۱۹۲۹ء میں اسٹیج پریس کیا گیا تھا

شمیم صاحب کی سرپرستی نے سکندر کی ساغر انہ صلاحیتوں کو اسرار اور رہتھر کہنے لگے۔ افامت خانے میں اب باریکی مصلحتیں مہیں جس میں سارے طالب علم (جن کی تعداد ۲۴، ۲۵ ہونی تھی) ایک طرف مہنے تھے اور ہمارا سا، دوسری طرف شمیم صاحب کی انگریزی تھوڑی سا یاد آتا ہونی اللہ بہ شمع کہہ لیا کرتے تھے سکندر بھی ان کی ہر وی میں شعور موصوفہ کر نہ لگے جب یہ اعلیٰ اے کے سال دوم میں آئے تو "پورس" کے نائب مدیر بنادیتے گئے جس کا اعزاز پہنچی سات روپیہ ماہانہ ملتا تھا۔ سکندر کے اعلیٰ رانم الجوف نے بہ حدت دو سال انجام دی اسی سال بہ افامت خانے کے سنٹر ہاؤس مانیٹر بنا، نے گئے۔ کالج کا بائسل، فلوارک میں ایک پرانی کوٹھی میں مہا اور کے حصہ میں تمام صاحب رہا کرتے تھے اور انہوں نے اپنے ساختہ والا ایک کمرہ سٹوڈنٹس مانیٹر اور سٹوڈنٹس ہاؤس مانیٹر بنادیتے گئے رکھا تھا اس طرح سکندر راہ پری لٹرل میں رہتے تھے اور اپنے سامیوں پر رعب جھاڑا کرتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں جب میں اورنگ آباد میں تھا اس وقت سکندر جہڑا یاد چلے تھے مگر کالج، افامت خانہ اور ادبی محفلوں میں ان کا نام کوسھی کرتا تھا اسی سال جب موسم سرما میں وہ کالج ڈے کے سلسلے میں اورنگ آباد آئے تو ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ آج سے پورنی لکھنوی کی بانہ بنے۔

دو سال بعد جب میں جہڑا آباد پہنچا تو سکندر نے بی اے کر کے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا، اور اڈیکٹ کی بی شاید ارمات کے ہاسٹل "اے" کے ایک انفرادی کمرے میں مقیم تھے ہوٹل کی عمارت اپنی نوعیت کی واحد عمارت تھی اور اس وہب مکرم غیر کی کسی جامعہ میں ہوٹل کی انی شاید ارمات موجود نہ تھی۔ کمروں میں سلوک کے چکنے تھوڑے کا فزٹل تھا۔ ڈاؤن روپ، میز، کرسی برا بھلا کی ہوا کرتی تھیں۔ فصل خانوں اور واش بیسنوں میں گرم اور ٹھنڈے پانی کا انتہام تھا صبح وغیرہ اور اعلیٰ اسم کے فریج سے مہرین کامن روم تھے۔ یہ ساری چیزیں طلبہ کے مزاج جھاڑ دینی میں ہر سکندر جیتے شخص کو ہم چڑھا کر بنا دینے کے لیے کافی تھیں۔

اس زمانے میں افامت خانے میں ایک جماعت تھی جس میں سید اشفاق حسین، شہاب الدین جمیل احمدی

میلایا جامہ جس کا کبھی ایک پانچویں اور دوسرا اونچا، چٹے موزے، میلی سی شہروانی جس کا ایک آدھ ٹن غائب ہو
پر کرکسی جس کے کناروں پر لکی کی تہہ رنگت آجوسی، آگلیں چمکدار اور روشن جن میں شرارت ناچتی ہوئی، کچھ دالیاں
کاٹنا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس ظاہری تضاد کے باوجود ابتدا میں دونوں کے خیالات میں بڑی ہم آہنگی تھی، رومانوی
کلیفٹ اور وارڈ بے قلب نایاں ہوا کرتی تھی۔ مخدوم کی ایک ابتدائی نظم یوں تھی:-

یہیں لی تھی محبت نے سب کی ابتدا میں نے یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے خستہ ناز و اندازو جیا میں نے یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کیوں میں پانی کے کنار۔ یاد ہے اب بھی

وجہ نے کہا ہے تری رنایوں میں اپنے شعروں کو بسایا ہے
تری تعریف کا نغمہ تجھے پہ رول رلایا ہے

کچھ آگے بڑھتے ہیں تو مخدوم نے کہا:-

تنب کے جاگے ہوئے نازوں کو بھی بند آئے لگی آپ کے آنے کی امید تھی اب جانے لگی
وجہ نے کہا: سن کے مجرم کیوں رہائی کا پیام
ذیر تک لپٹا رہا زنجیر سے

اگلے قدم میں مشاعروں کو سماجی، انصافیوں معاشی مشکلوں اہل ہنر کی ناقدیوں کا احساس ہوتا ہے۔
مخدوم سرایہ داروں کی پرانی حویلی کا ذکر یوں کرتا ہے:

جن میں رہتے ہیں ہمارے جن میں رہتے ہیں اہل جن میں سستی کے جڑ میں جن میں کبے کے فیر
رہنروں کا قہر شورائی قاتلوں کی خواب گاہ کھمکھلاتے ہیں حیرانم، جگمگاتے ہیں گناہ

نوجہ نے ناقدی ہنر کا شکوہ یوں کیا:

ناقدی ہنر کی شکایت فضول ہے آئیں نیا نہیں یہ پُرانا اصول ہے
اصلاحِ اشتیاق وطن تیری بھول ہے اہل ہر گدے کی پٹیو پہ اطلس کی بھول ہے

اس میں چند شعر اور اضافہ کر کے بہ انداز استغاف کر دیئے، دراصل یہ اس جاگہ دارانہ ماحول پر جو بول رہا تھا
جس کا تاناک سورج اپنی پوری سمت سے دکن کی سرزمین پر چمک رہا تھا اور جس کی گرمی سے مقامی باشندے
ہی زیادہ مجلس رہے سنئے اور اسی کی لگائی ہوئی آگ نے وہاں ملکی غیر ملکی کا سوال کھڑا کیا جس میں اکثر دونوں ہی
طرف کے اہل ہنر رہے۔ مخدوم محی الدین سید اشفاق حسین، محمد احمد سبزواری سب ان ہی تیروں کے زخم خوردہ ہیں۔
میں مخدوم کھلم کھلا باغی ہو گیا اور دیارِ مہدیں طحانہ کو آزادی و انقلاب کا رہبر بنا کر بولنے لگا:

پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربتِ کاری حضور آصفِ سابق ہے فشی طاری

وہ بھی کچھ اسی قسم کی بات کرتا مگر اپنی ذاتی صلاحیت اور مولوی عبدالحنی کی کوششوں کی بدولت وہ حیدرآباد سول سروس کے امتحانی مقابلے میں کامیاب ہو گیا۔ رل سروس اکیڈمی میں ٹریننگ لے کر حکمہ عدالت میں سب جج مقرر کر دیا گیا اور اب اگر وہ آصف صاحب کی مدد سرائی نہ کرے یہاں تک کم از کم ال پر ذاتی حلوں سے گریزاں ہو گیا، اور بول ختم ہو اور وہ دایسی الگ الگ راہوں پر چل کھڑے ہوئے جو ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں جاتی تھیں۔

وہد کی آب خونی باخصویت یہ بھی رہی کہ اس کو شہرت اور تحسین نامتناہی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہر اسے جس کی تعریف کے ڈونگرے سیکھتا نہیں یا ہنسنا۔ اسی وہ سے وہ طالب علمی ہی کے زمانے سے صرف جامعہ کے متاخرین یا محضون بھی متاخرین میں شرکت کیا کرتا تھا۔ عام متاخرین میں شرکت کو قطعاً پسند نہیں کر اسما اور نہ ایسا کلام ہر رسالے یا اخبار کی زینت بنانا جانتا تھا۔ سول سروس میں آنے کے بعد ال فیوڈ کی پابندی اس پر سرکاری اور دینی طرز پر خود بخود لگ گئی اور وہ عوام سے بالکل کٹ گیا۔

عوام سے کٹاؤ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ عوام سے الگ ہو گیا یا عوام اس کو سول سروس کے وہ عوام کا پسندیدہ شاعر رہا اور اس کے کلام میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سن سکتی ہیں۔ اس کی معرکتہ الآرا الطیوں میں جہاں محلّی بلدیہ اور خیالات کا تنوع موجود ہے وہاں اس بات کا بھی برلا اظہار ہوتا ہے کہ وہ ناح محلّی اجدہ اور جامعہ سمانہ کے حسن و نازک گوشوں کی تعریف کرتے ہوئے اس حقیقت کو فراموش نہیں کریا گواں کے صنّاعوں کا رگڑوں، مضبوطی اور ہر دوروں کے نام سے کوئی واقف نہیں مگر اپنے بائے ہوئے معوس کی وہ - وہ عرصہ دماز مکاتی ہیں آئیں کالج جامعہ عثمانیہ کی نظم کا آب مصرع ہے :

کام جیوڑا ہے کہیں نام نہیں جیوڑا ۔

یا اجنتہ کی منہور نظم کا آب شعر ہے :

زمانے کی جبین پر عکس جیوڑے ہیں جھکا ہوں کے

ہیں گے نفس ال کے نام مٹ جائیں گے شاموں کی

اور یہ حقیقت خود وہ قدر بھی صادق آتی ہے کہ شاموں کے نام مٹ رہے ہیں اور مٹتے جائیں گے مگر اس

کے شعر زندہ رہیں گے۔ (بشکوہ سب رس سوانحی، ۱۸۸۳ء)

علیہ رحماتی یم اے عثمانیہ کی اہم تعینات

ڈاکٹر زور : شخصیت اور کارنامے

قیمت: ۵ روپے

پیش لفظ سید ہاشم علی اختر

ناشر: ادارہ شریعت و حکمت حیدرآباد

اعظم صاحب

۱۔ میر اعظم علی خان، ۱۰ سالہ بچہ، پرنسنگ پریس اور سینٹرل بک ڈپو کا بھائی، ۶ جون ۱۹۳۷ء کو لاہور میں
انقلابی، بہ نیک، موصوف نے اپنے لکھنؤ پارادوکس جو خدمات انجام دیں ان کا اعتراف ضروری ہے۔ ادارہ ادبیات
اردو کی مہینہ نامہ ۱۰ ہمارے سب سے اعلیٰ شاعری کی شاعری میں مرحوم نے اپنے والد کی معافی اور دوستی کو نادم نہیں
بھل رکھا۔ ڈاکٹر جاوید کا یہ خاکہ اردو والوں سے ان کی رفتار سے تیار کیا گیا ہے (ادارہ)

میر اعظم علی خان، ۱۰ سالہ بچہ، پرنسنگ پریس اور سینٹرل بک ڈپو کا بھائی، ۶ جون ۱۹۳۷ء کو لاہور میں
انقلابی، بہ نیک، موصوف نے اپنے لکھنؤ پارادوکس جو خدمات انجام دیں ان کا اعتراف ضروری ہے۔ ادارہ ادبیات
اردو کی مہینہ نامہ ۱۰ ہمارے سب سے اعلیٰ شاعری کی شاعری میں مرحوم نے اپنے والد کی معافی اور دوستی کو نادم نہیں
بھل رکھا۔ ڈاکٹر جاوید کا یہ خاکہ اردو والوں سے ان کی رفتار سے تیار کیا گیا ہے (ادارہ)

آج، اعظم صاحب کی فائزہ دوری میں کہ ان کا طوطا بیٹا جلا گیا۔ ان کی اہلیہ کے دل پر بھی گزری ہوگی اس کا براہ کرم
ہمیں نہ کہنا۔ ان کی لڑکیاں اپنے باپ کے غم میں سو گوار ہیں اور لڑکے متناقی اور احتیاطیاب کا ذکر اس حسرت سے کرتے اور
ہیں کہ قصا دردناک محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہی ہوگ غم زدہ، لعل خاطر اور با چشم نم ہیں۔ آج تو اور کئی بھی نوہرہ بہ لب میں
ان کا سہارا ٹوٹ گیا۔ ان کا سر پرست اٹھ گیا اور ان کا نگہبان اور رکھوالی کرنے والا نہیں رہا۔ اور ان کے انتقال کے بعد
آج ان کے رستہ داروں اور ملازمین سے جو واقعات سے میں آتے ہیں تعجب ہوتا ہے کہ وہی اعظم صاحب تھے جو ذیل نڈل
اعلیٰ سے نظر ہر نام پسند اپنے آپ میں گم، چپ چاپ اور دھڑلے سے بے پرواہ دکھائی دیتے تھے۔ نہ جانے انھوں نے کتنو
کی رشتہ دلور میں خواہ وہ اپنے عزیزوں کی ہمنما غیروں کے دل کھول کر ملائی، کتنوں کے انتقال پر ان کے تجزیہ و تفسیر سے
کیے۔ کتنے وہ اعلیٰ علم کی فیصلہ ادا کی اور کتنوں کے لیے کیسے وقت کام آئے۔ اور یہ سب کچھ اس انداز سے کہ کوئی خاص بات ہی
میں یہ ان کے حالات میں داخل تھا اور یہ سب نہ ہوتا تو وہ بھی نہ ہوتے سوہ ہتے بھی تھے ایسے خاموش خاموش سے۔ ایسا

اگست ۱۸۳۳ء

کلمہ میں نیشنل بک ڈپونے خاطر فواد حصہ ادا کیا ہے۔ اعظم صاحب اور ان کے والد مفید جناب میر احمد علی صاحب نے اردو کے کئے ہی ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کی کتابوں کو اپنے طور پر شائع کیا۔ جنہوں نے چاہا ان کو معاوضہ بھی دیا بلکہ بعضوں نے تو کچھ زیادہ ہی حاصل کیا اور جن ادیبوں اور شاعروں نے کتابیں اپنے طور پر شائع کیں ان کی کاغذ کی فراہمی میں مدد کی اور طباعت وغیرہ کا معاوضہ جتنا بھی ادا کیا ہو لے لیا۔ تقاضہ کیا ہو لیکن ایسا تقاضہ نہیں کہ شاعر یا ادیب کا موقف مجروح ہو۔ اور وہ قلمبند کی محسوس کرے یا اس کی کتاب کی رسم اجراء یا ناکامی متاثر ہو۔ ادیب شاعر ایسے بھی ہے کہ معاوضہ جلد ہی ادا کرے گا ورنہ اس کے رسم اجراء کے لیے کتاب کی چند جلدیں لے لیتے اور پھر بیسوں غائب الاعظم میاں جنہوں نے ایسا سرمایہ ان کتابوں پر لگایا ہوتا حال تو کچھ جلتے۔ اگر کوئی توجہ داتا تو یہ کہہ کر دے کہ کیا کریں اردو دلوں کا حال ہی اسی ہے۔ گویا سارے نکلے تمام سوئے۔ اس جواب میں وہ۔ چھوڑنا میں بہت سے دیگر کتب خاص طور پر کلامی کی اشاعت میں نمایاں ہے۔ ادیب "شاہنامہ اسلام" غائب، میر اور دوسروں کے دواویں کی اشاعت، رسمی توجہ دی۔ یا کتب کس کا سلسلہ آگے چل رہا ہے ہو گیا اور خاص مجاہدتی دنیا دونوں یہ لیکن نیشنل بک ڈپو نے یا کتب کس پر اس وقت توجہ دی تب تک ابتدائی دور تھا اور میر اس کی شائع میں اردو کے نامور اساتذہ کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا۔ کتب اپ میں بھی یہ یا کتب کس اپنی مثال آپ رہے۔ آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

نیشنل پریس میں ہر نوعیت کی چیزیں شائع ہوتی ہیں اور ہر پریس کی طرح۔ لیکن علمی و ادبی جرائد پر اعظم صاحب کی نظر تاملت چھڑا رہی تھی۔ زیادہ نہیں۔ وقار خلیل اور عتیقہ کاس صاحبان سے بوجھ لیتے "سب رس" اور "تذکرہ" کی اشاعت سے انہیں صاحب کو ایسی دل چسپی تھی گویا علمی ادبی نام اعظم صاحب کا کام ہوتا وہ اس خصوص میں جو بھی ہوسکتا کرتے۔

میں کہ مکتبوں کی گھر گھر ادب میں ان کی آکاؤں کی محنت تھی۔ مکتب کے مکتب میں نے انہیں کبھی زور سے اور تھر گنگو کرتے رہا۔ نہ وہ تیز چلتے نہ کھاتے اور نہ چلتے ہو کر پانی تیز پیچے۔ اس کی ہر بات میں اعتدال، توازن اور معائنہ روی پائی نہ تھی۔ میانہ قدم و قاست۔ چلتے بھی تو ایسے جیسے سوچ سوچ یہ جو تک بھونک کر قدم رکھ رہے ہوں۔ گنگو محسوس ہوتا وقت کرتے جب سامنے والی بات کہتے کرتے تھک جاتے یا یہ سب فکر میں ڈوکی انہوں نے ہو جانے یا شاید کبھی غائب رہنا مقصود ہوتا۔ گنگو کر لیتے۔ حتیٰ کہ پیسے لینے دینے۔ معاوضہ وغیرہ کے لیے میر کا حانہ بھی کھولتے تو تکلف سے گویا۔ اندے کا گھل رہا ہو۔ پریس میں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ میر کو زور سے آواز دیتے ہوں۔ ملازم دد رہتا تو اشارہ سے وہ قریب آتا تو جو بھی کہنا ہو کہتے۔ گھر میں بھی یہی حال۔ ہر چند کہیں کہیں نہیں ہے، کی طرح کہتے۔ ادیبوں نے ۱۸۶۰ء سے بھی ان کے ماسم کچھ الفیاد ہی نوعیت کے تھے۔ اعظم صاحب اپنے ڈھپ کے مطالعے میں خاصا وقت دیتے۔ گھر پر بھی اور خاص طور پر پریس میں اندے کے کتب میں ہر کے کھانے کے بعد وہ تھوڑا بہت وقت مطالعے کے لیے دیتے۔ اعظم صاحب نے ادیب تھے نہ شاعر، لیکن ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حیدر آباد میں کتنے ادیب اور شاعر ہیں جن کی تصانیف کو انہوں نے پورے سے آراستہ کیا۔ حیدر آباد میں اردو کے موقوف اور دلوں کی تعداد کے تناسب سے بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں نہ اندازہ نہ تو کوئی مناسب اشاعت گھر ہے اور نہ کتابوں زور سے ادارے خاص طور پر ادبی کتابوں کے لیے طبع و اشاعت ہے۔ ادیب اور شاعر اپنے طور پر کتاب شائع کر رہے ہیں تو لکھنا ہی نہیں کہتا کہ نیشنل پریس اور۔ زور سے اس خلا کو پورا کر دیا تھا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اس خلا کو ممکنہ ذریعہ

کوٹے کر کے ان تک پہنچنے میں ایک آدھ منٹ لگتا۔ اس دوران مصافحہ کے لیے وہ اپنا ہاتھ اس تکلف واس اجہام اور اس دلمنازی کے ساتھ آگے بڑھاتے، گویا کسی خزانے کی جانی حوالے کرنے والے ہوں۔ ہر تاجی ہی کہ ان سے مصافحہ کے بعد ایک گونا گونہ اطمینان سا ہوجاتا۔ کام ہوا بھی نہ ہوا، اس کے اسلوب گفتگو سے پھر بھی سکون مل جاتا گویا کام ہو چکا ہو۔ اعظم صاحب سے رشتہ داری بھی تھی لیکن رشتے داروں جیسے تعلقات نہ رہے اور کاروبار بھی یہاں لیکن کاروباری رنگ نہ انھوں نے رکھے اور نہ میں نے۔ یہ ان سے بھی ممکن نہ تھا اور نہ میرا مزاج ایسا ہے۔ نہ لین نہ دین، نہ لکھت نہ پڑھتا ہیں میں نے کہہ دیا انھوں نے ہاں کر دی۔ انھوں نے کہا، میں نے مان لیا۔ ایک کتاب شائع ہوتی تو دوسری کے لیے کہتا، دوسری کتاب کی تیاری شروع۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ ملک انتقال سے ایک آدھ سال قبل میں نے ایک اور کتاب کا تقریب نصف مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔ پتہ نہیں کیا اور کیسے پریس میں وہ مسودہ غائب ہو گیا۔ لاکھ ڈھونڈا گیا۔ نہ ملتا تھا۔ میں کیا کرتا۔ سوائے اس کے کہ دوبارہ مسودہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور ایک دو ماہ میں مسودہ دوبارہ ان کے حوالے ہوا آخر صاحب اگر مہیعت بھیک نہ ہوتی یا کوئی گھر بلیو مصروفیت ہوتی تو پریس نہ آتے۔ ایسی صورت میں جس کو شش کرتا کہ گھر بلاق ہو لیکن اس کو نگر جانے کے لیے وقت کم ہی ملتا۔ عموماً فون پر بات ہوتی۔ جی ہاں گذشتہ ۶ مئی۔ میں ایک آدھ روز کے لیے حیدر آباد آیا تھا۔ پریس میں پتہ چلا کہ وہ گھر پر ہیں میں نے فون پر گفتگو کی، اخلاص نے بتایا نصائی کتابوں (۴) مصروفیت ہے۔ جن کے پہلے پہلے میں میری کتاب کی کثافت شروع ہو جائے گی میں بوجہ بھی نہیں سکتا تھا کہ اعظم صاحب سے فون پر یہ آخری گفتگو ہو رہی ہے۔ اس وقت تو ان کا مزاج بھی اچھا تھا کسے پتہ تھا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد، جون کے پہلے پہلے کسے ختم ہوتے ہوتے، جون کو اعظم صاحب بھی داعی اجل، کولیک کہہ دیں گے۔ غم

شعر و ادب کی خدمت کے کھڑا دیئے ہیں کئی انداز، کئی طریقے۔ میر احمد علی صاحب اہر ان کے بعد اعظم صاحب نے تعزیر کہا جو، نثر لکھی ہو لیکن جس ناول سے شعر و ادب کی خدمت کی اس کا ادب کی تاریخ میں کچھ نہ کچھ بیان ہونا ہی چاہیے یہیں بے حیدر آباد میں اردو ادب کی تاریخ لکھنے والے بخشل پریس اور کراچی کی خدمات کو فراموش نہیں کریں گے۔

اعظم صاحب کو میں نے کئی حالتوں میں دیکھا۔ برائیں میں بھی اور اچھے پر بھی۔ خالص کاروباری گفتگو کرتے ہوئے بھی اور بے تکلف بات چیت کے دوران بھی اور خوالی کی محفلوں میں بھی۔ ایک مرتبہ ان کے ہاں میرے مرن کی قوالی تھی۔ میں حیدر آباد میں تھا مجھے بھی قوالی اور عشائیہ میں شرکت کی دعوت دی۔ پر تکلف اور سامے ملازمت کے ساتھ عشائیہ میرے لیے تعجب خیز نہیں تھا۔ لیکن مہبلہ کی تواضع، قوالی میں داد کا انداز اور خوال کو نوازے کی ادا کہ کہ بس دیکھا چلے۔ میں بھی دیکھتا رہا۔ یوں بھی وہ سیر و شکار کے رسیا اور دوست احباب کو کھلانے پلانے کے شوقین تھے۔ کھانے کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے بلکہ یہ ایک طرح کی کمزوری تھی۔ ان کے قریبی عزیزوں کو ان سے یہ شکایت تھی کہ وہ پرہیز نہیں کرتے۔ کئی ہی روک ٹوک اور احتیاط کی جائے۔ وہ موقع نکال ہی لیتے ہیں۔ پس سے پہلے بھی دو مرتبہ ان کے قلب پر حملہ ہو چکا تھا۔

سوائے اس کے کہ گرمیوں کی چھٹیاں ہوں اور میں ایک
دینچہ ماہ کے لیے حیدرآباد میں رہوں، ورنہ انظم میاں سے میرا
مخاکم ہی ہوتا۔ راجا حیدر آباد جب بھی آتا ان سے ملنا ضرور
کہ میری کسی نہ کسی کتاب کا سلسلہ جاری رہتا اور ویسے بھی ان
سے ملاقات کے بعد واپس ہونے کو بھی جی نہ چاہتا اور ملاقات کا
بسا بوقت بارش یا دھرم کا نئے کے سامنے سے گزر کر سیدھی
طرف مڑ جائے اور پھر بائیں طرف۔۔۔ نہ تاجپور اٹھائے محال
اگر ہوں تو سامنے پرلیس میں وہ اپنی کرسی پر بیٹھے دکھائی دیں گے۔
میں بھی بائیں سمت مڑ کر ان کے پڑھتا اور اسی پرلیس کی سیڑھیوں
کے قریب ہوتا کہ انظم میاں ایستادہ ہوتے نظر آتے شہزہ

ظہر غوری

معصوم شہسین

حمید عثمانی

نظم

شہر، لول کے چہروں پہ پتر مردگی
آنسوؤں کی ٹھکن اور آزر دگی
رودمیک اب کی تہ سے چھلکتی ہوئی
جان پہچان کی نو مستستی ہوئی
مصطوبہ دم بخود

جانتے ہو یہ معصوم، کون ہے
آگہی سے تھی، آشتی سے تھی
چار جانب تسنّع کی گلکاریاں
کس کا مقدر ہیں

کون غالب ہوا، کون مغلوب ہے
کس کی دہشت سے چہرے اترنے لگے
خالی خالی سے آنکھوں کی پہنائیاں
جن میں محرمیوں کا بدن قید ہے
تسلی شنگی

بے کسی بنے کسی
غور سے بھانک کر دیکھنا تم کبھی
اپنے باحول کی اجنبی بھڑ میں

اوپنچے اوپنچے درختوں کی آغوش میں
جانی پہچانی سسی یہ حسین رہ گذر
اس کے سینے پہ شام ہوں اس وقت بھی
میرے اور تیرے قدموں کے دمنڈے نشان
سوچتا ہوں میں ان پر جی گرد کو
دمیرے دمیرے ہٹا کر ذرا دیکھ لوں
کس طرف ہم روانہ ہوئے تھے کبھی

سہ د آشاؤں اور صفہ ناب خوب سے

دور مات کھمے بکھرے نظر آئیں گے

ظفر ہاشمی

منظروں کی ایسی عرفانی رہی
میکر اندر ریزہ طغیانی رہی
جو سفر بھی پتیس آبا تھا مجھے
اس سفر کی راہ انجانی رہی
دل سمندر کی تہوں میں جھپ گیا
سا طول پر رات طوفانی رہی
زندگی نخی یا کوئی اک مددنا
لحمہ لحمہ مجھ کو قسیرانی رہی
سامنا دشت لا کا وہ ہوا
ریت بھی میکر لیے پانی رہی
دوئے لفت، جگات سے، تہز عم
ساری چیزوں کی فراوانی رہی
میں فرازوں پر ظفر ہاشمی کا منزل
اور نشیوں کو پریشانی رہی

ظہیر عظیمی

رقصِ شام و سحر رہا جاری
زندگی کا سفر رہا جاری
راستے خوف، اک نئے لکھن
راہِ دُ کا سفر رہا جاری
کلی کشت سے مہنجی زوالِ نام
ہوئے محلِ قاصد رہا جاری
وہ سپرادل گئے اک دل
خاشی کا سفر رہا جاری
زندگی بھر نئے لکھن رہا جاری
تیر سامون پر رہا جاری
رہا شبوہ ہمارا غنی گوئی
کام کے ظہر رہا جاری
یہ کمالوں کی حکم رانی بھی
قتلِ اہلِ دین رہا جاری
لفظ و معنی کا انشلاطِ طینت
سام سے ماتہ سحر رہا جاری

محمد اقبال انجم

الفاظ

ایک دن میں چند الفاظ کے معانی کی تلاش میں لغت کی ورق گردانی میں معروف تھا۔ لغت کیا تھی الفاظ کا
 ایک بحر سیدراں تھا اس میں قسم قسم کے الفاظ دیکھ کر یوں لگا جیسے گل کدہ الفاظ کا کوئی جس آباد ہو جس کی خوشبو اس کے
 جمال معانی میں قدموں میں ورق التبار اور نہ لگی الفاظ کا مشاہدہ کرتا رہا۔ صفحے پر پسپوں الفاظ یوں محو استلحاح
 نغمے جیسے ذہن کے نگار خانے میں خیال بادل کے آباد جزیرے میں امنگیں بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ شعر و نثر فقط ترتیب
 الفاظ کا نام ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو لغات کی مختلف کتابیں نو بازاروں میں باطل جاتی ہیں۔ شخص ذخیۃ الفاظ کے
 بل پر ادیب شاعر کیوں نہیں بن جاتا۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بعض سائنس کی کتابیں پڑھ کر کوئی سائنس دان
 نہیں بن سکتا اور علمِ عمر و دین کا مافط ضروری نہیں کہ شاعر بھی ہو اسی طرح سے

ماہرِ جغرافیہ کتنا ہی لکھا ہے بیچ و ناب

مل نہیں سکتا اسے سبائحِ عالم کا خطاب

لغت میں لکھے ہوئے الفاظ اپنے اپنے معانی کے ہمراہ ورق نشین نغمے لیکر سحر بھی محض ان پر تیزوں کے کنبوں کا گمان ہوا
 حیرت یہ ہے کہ لغت ان الفاظ کی موجودگی کے باوجود خاموشی سے الماری میں پڑی رہتی ہے لیکن جب یہی الفاظ زماں و
 قلم سے ادا ہوئے ہیں تو کہیں قہقہوں کے فوارے ابلتے ہیں اور کہیں درد کی ٹیسس ابھرتی ہیں۔ الفاظ ہی رشتوں کی دیا آکر بنے
 ہیں اور الفاظ ہی رقابتوں کے کھنڈر استوار کرتے ہیں، الفاظ ہی زخم لگاتے ہیں اور الفاظ ہی مرہم بن جاتے ہیں۔ الفاظ اگر
 پھول کی پنکھڑی ہیں تو تلوار کی دھار بھی ہیں۔ الفاظ ہی شاعروں کے رفیق ہیں اور الفاظ ہی ادیبوں کے جلس نامی۔ الفاظ
 جن شاہوں کا حکم ہیں اور فقیروں کی صدا بھی۔ الفاظ طنز کے نشتر بھی ہیں اور الفاظ ہی تعمیرِ عمارت اور مریخ کی فذر نامی ہیں۔
 میر نے بہت غور کیا کرتے الفاظ کیسے جو بڑے آگے بھیجیں یہ ان کی نوعیت اور تعداد پر نظر کر کے معلوم ہو کر دنیا میں
 انسان کے اپنے وجود پر زندگی کی جان دار اور بے جان چیزوں سے درجن و مذہب سے خدا اور انسان سے تعلقات کے تقابلی
 و تالیفی نام، رشتہ کو اپنی اپنی جگہ ملنے رکھنے کے لیے جنے حیرت اختیار کیے ہیں اتنے ہی اس نے الفاظ وضع کر لیے ہیں
 یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں الفاظ کی حکمرانی ہے۔ وہ ہیکے الفاظ کی رنگوں سے جذبات کا فون بچوڑ لیا گیا ہو ایک کلمہ
 تو اس انسان میں رکھی دعا بچے کی زبان کے بغیر ناکمل ہے۔ عموماً تبصرہ زبان کے ایک پہلو کو اجاگر کرتا ہے کہ "انسان کلمہ"

س کے دونوں جبڑوں کے درمیان ہے؛ لیکن زبان کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ اپنے الفاظ کیجہ کو انسان کے بہ عزت اور دولت خرید سکتی ہے۔ انسان الفاظ کے سازیرنگناتا ہوا فغم ہے اور یہ دنیا بازیچہ الفاظ ہے۔

الفاظ کا اپنا کوئی سرئی جسم نہیں ہوتا۔ الفاظ تو اشیاء کی صوتی تصویریں ہیں۔ اس لیے جب ہم بھولوں کا ام لیتے ہیں تو یاد ہیں خوشبو سے ہلکے اٹھتا ہے بیشیشے کا تصویر کرتے ہیں تو الفاظ کے نازک جسم میں کہ چوں کی جھجنا بٹ سائی دے جاتی ہے۔ الفاظ سے بنی ہوئی کالی کسی کے تن بدن کو ہلا کر راکھ کر سکتی ہے۔ الفاظ تو مفلس کی جیب ہیں۔ وہ تو آواز کے زیرِ دم ہے انسانوں کے نشیب و فراز سے اور مچھ کے انار چڑھاؤ سے نرگزی یا تے ہیں۔ الفاظ کی ترانوں میں معاصد کا خولہ ڈرا۔ نودہ معاشرے کو زبردگی اور تھرکوں کو انقلاب کی نوید دیتے ہیں۔ خطابت الفاظ کی ساحری ہے۔ الفاظ مشائے لولہ بنگی حس ہلا کرتے ہیں لغظوں سے بنے ہوئے شعور دلوں کے ترچاں ہوتے ہیں لیکن الفاظ جذب و لگن کے بغیر اس پر مدد کی تہ ہوتے ہیں جو ہر دلوں سے محروم ہوں۔ یہ نولے نہیں ہو سکا کہ حال پہلے وجود میں آتا ہے یا الفاظ۔ کیوں اکثر اوقات بالان دین کے کسی گوشے میں کھلاتے رہتے ہیں لیکن ان کے لیے یہ راہِ اظہار باسبب الفاظ نہیں ملے اور بعض دفعہ الفاظ قدرت کے باوجود خیالات نہ ہوتے ہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ خیالات الفاظ کی محفل میں بیٹھ کر سفر کرتے ہیں۔ اسی لیے اس اختلافات کو روکنے کے لیے اخباروں پر سنسز اور زبانوں پر پیرے ہوا مادی ہے۔ لکن خیالات یا فنی کے تیر بہاد کی راج انار اسنہ تلاش لیتے ہیں۔

شوقِ مطالعہ کے آغاز میں ایک طالب علم کتاب کے خوبصورت الفاظ و فقرات ٹننے کی کوشش کر رہا ہے لیکن کثرتِ طالعائے طلقہ الفاظ سے کمال کرنا تھرکی دنیا میں لے جاتا ہے اور مانرینج ہو کر بصیرت کھلاتا ہے اور اہلِ بصیرت قوموں کو تھی دنگ اور الفاظ کی نئی جینس طاکرتے ہیں اگر ہم اس کی مثال ڈھونڈنے کی کھس لو اقبال اس کی زندہ مثال ہیں۔ اچھولے لغظ س کوئی نہنگی اور خردی کو نیا مفہوم دیا ہے۔

نئے میں دولتِ دہلنی چھاؤں ہے۔ آج ایک کے لیے و ہر افتخار اور کل دوسرے کا طرہ دستار نکلن شاید کم لہجوں علم مولد دولت کی طرح الفاظ بھی بہت ہرجائی ہوتے ہیں۔ یہ بھی اس الوقت سیاستدانوں کی طرح ایک زمانے سے دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں یہی نہیں بلکہ خود زبانیں بھی اپنا زخمہ الفاظ بڑھانے کے لیے مددِ بالحر کار کا بکارتی ن صدیوں سے یہ عمل اتنے تو اتار سے جاری ہے کہ آج اکثر الفاظ کا چہرہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ لٹانی اور عربانی نے غری میں ماب کیا۔ انگریزی نے عربی اور لاطینی سے بہت کچھ حاصل کیا اہل فارس نے عربی کو مقس کر کے اپنا دامن بھریا۔ فارسی اور ہندو کو جو جنم دیا اور اردو نے سب جوفت کو پیچھے پیچھے دوسری زبانوں پر زردہ دھاوے مارے کہ آج وہ بلبل ہزار داستان ہے۔ میں نے ایک لفظ ”نیلام“ لغت کے صفحے سے اٹھایا اور اس سے پوچھا کہ حضرت آیہ کہاں سے تشریف لائے ہیں براہِ وطن پر بحال ہے۔ وہاں مجھے ”نیلام“ کہتے تھے میں شوقِ سفر میں یہاں پہنچا تو مجھے اردو کے بازار میں ”نیلام“ کہہ دیا گیا۔ لہٰذا ایک جگہ کہا تھا کہ ”الفاظ پر ہی لڑکھیں، جوانی اور بڑھاپے کی نعائیں جھاتی ہیں۔ زندگی کے مختلف مراحل طے کرنے کے

ہے شرط جیسے ہندوستان اور پاکستان کے سفری پرواز تازہ میں یہ صوفیانہ خود سپردگی اور دلہانہ پن — میں شامل ہو جاتی ہے۔

حبیب صاحب نے انگلستان میں ”مبسی کتاب کیا لکھی ہے انگلستان کے جھل تین جھل“ لکھا ہے سینکڑوں سادہ ادبی مغللوں، دوستوں کی دعوتوں، قوالی اور موسیقی کی نشستوں کے ریکارڈنگ ذکر سے انگلستان کے سرد اور مطلوب موسم جس گرمی اور رونق کا ثبوت دیا گیا ہے، اور سب سے بڑھ کر مائیکہنڈل میں ہم وطن مغللوں کی صبح سے شام تک کی مصروفیتوں کو ریکارڈ کر کے ہندو پاک کی روحانی اور ثقافتی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا ہے (دوقار لطف، لندن)

نام کتاب: البیرونی اور جغرافیہ عالم
مصنف: (امیلانا) ابوالکلام آزاد کو ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز مامعہ طیبہ اسلامیہ نئی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے جس سے البیرونی کی تصحیح اور علمی کارناموں خصوصاً جغرافیہ عالم سے متعلق اس کی سب سے تحقیق اور زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ البیرونی کے علمی کارنامے ایک عرصہ تک پس پردہ رہے مگر جب اس کی گراں قدر تصانیف کا سراغ ملا تو محققین نے اسے اسلام کا علم کا مآبندہ ستارہ قرار دیا۔ البیرونی کو ریاضی، ہسٹری، نجوم، حکمت، مہدنیات، پیمائش ارض، نباتات، علم الاقسان اور جغرافیہ میں امتیاز حاصل تھا خصوصاً ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور علم و دانش سے اسے بے حد لگاؤ تھا۔ اس نے کوئی بارہ تیرہ برس

اور آجکل نئی نسل کے سینکڑوں ”جدید“ شاعروں نے اس بلند و بالا مینار کا سا رویہ اختیار کر کے اپنی ادبی شخصیت کو ”کنافوں سے لوث نہیں ہونے دیا اور اپنے EUSIS اور ”سلک کو“ ”عظیم“ ”امید“ ”کامیاب“ اور ”مشہور“ لوگوں ہی سے مل کر مزید ان چڑھایا۔

اب حبیب صاحب نے ایک صاحب دل انسان مجھ سے ان کو اس دلچسپ پسندیدہ ماحول: بعض افہام کی طرح بغیر میر کے ہی آن بیٹھے جو غم نے پیار کیا کی جلتی پھرتی تصویر میں بعض نعلانی ان کو پیار کرنے والے کی تعداد بھی سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اسی لیے ان سب سے امید ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اسی فی صد تجربات کو نظر انداز کر کے صرف ان پر اپنی نوہم کنیز لیں گے جس سے ان کا کوئی ادبی مفاد وابستہ چشم زلفی ہو گا۔

اس کے برعکس انھوں نے ”لندن کے شاعر“ جدید مضمون کی تحقیق اور تیاری میں جس محنت و جانفشانی کا ثبوت دیا ہے وہ حیرت انگیز ہے جیوٹے اور بڑے کا شخصیت تو کجا انھوں نے ہر اس شارے مارے میں جنھیں وہ جانتے ہیں سیر حاصل تعارف لکھنا اپنا فرض سمجھا ہے، اور جہاں یہ تعارف مختصر ماادہ اور اسباب اس کی وجہ خود شاعر کی مابلی ہے جس نے انھیں مزید مواد فراہم نہیں کیا۔

ان کی یہی رواداری اور انسان دوستی الف سے یا کہ ان کی کتاب کے صفحہ میں جھلکتی ہے ”ہمارے مسائل“ اور انگلستان کی معیشت اور ہم جیسے مسائل میں جہاں بہ انسان دوستی شہید حقیقت پسندی اور سیاسی چمکتی کاروبار دنیا بنی ہے وہیں دوسری جگہ ”سفر

ہندوستانی علوم سیکھنے اور ہند کی تہذیب و ثقافت سمجھنے میں صرف کیے۔ اسی لیے وہ کئی بار ہندوستان آیا۔ اس نے سنسکرت زبان میں جہارت حاصل کی اور سنسکرت کی دو کتابوں ”سائیک“ اور ”پانچولی“ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ وہ بڑا جید فاضل، سائنس دان، مورخ، عالم تبحر تھا۔ اس کی تصانیف میں آثار باقیہ، کتاب ہند، اور ”القانون“ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ کئی بائیں جانشینا، عربی، فارسی، خوارزمی اور جرجانی بائیں اس کے ہم زمانہ مادی زبان کی تھیں۔ بڑے سنسکرت مانی، سریانی اور عبرانی زبانوں سے بھی واقف تھا۔ اگرچہ مولانا آزاد کو زیر نظر کتاب کا مصنف تسلیم کیا گیا ہے مگر اہل تحقیق کے لیے منبہ اس میں شبہ کی فاش ہے۔ اس کتاب کا مسودہ (مخطوطہ) انڈین نسل فار کچولر لائبریری لاہور کی اس الماری سے مل گیا ہے جسے آزاد کی لکھنؤ، امام زاد آباد، رونی، نیشنل جامعہ کالج اور ڈاکٹر لڈاکھ ڈاکٹر الحسن ٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے درمقدمہ البیرونی پر ایک جامع مضمون لکھ کر اس کتاب سے متعلق کر دیا ہے اور اس عالمائے مقدمہ کے باعث بیرونی اور اس کے علمی کارناموں سے متعلق نئی معلومات منظرِ آفتاب میں آئی ہیں۔ اس کا آمد مقدمہ کے بعد جناب مسیح المس صاحب نے اصل مخطوطے کی تصدیق بیان کرنے پر اسے احترام دیا ہے کہ اس مخطوطے سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی میں نے بہت کوشش کی مولانا آزاد کی تصانیف میں اس کے مخطوطے ہیں۔ دوسروں کی تحریروں میں مطالعہ کی مگر اس مصنف کے بارے میں کوئی سہرا نہیں ملا۔

محمد حقیق صدیقی صاحب نے انہیں بتایا تھا کہ مولانا غلام رسول جہر سے ان کی اس سلسلے میں خط و کتابت ہوئی تھی اور مولانا جہر نے انہیں لکھا تھا کہ شاید ۱۹۲۷ء سے پہلے اس مقالے کا مسودہ مولانا آزاد نے لغرض اتنا تب لاہور بھیجا تھا لیکن یہ مقالہ اس وقت چھپ نہ سکا مولانا جہر نے اپنے خط میں مقالے کے محفوظ رہنے پر خدا کا شکر بھی ادا کیا ہے مگر زیر نظر کتاب کے صفحہ ۳ کے حاشیہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسیح المس صاحب کو بھی مولانا غلام رسول جہر کا مذکورہ خط پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ نیز انہیں اس کا بھی علم نہیں کہ حقیق صاحب اور مولانا آزاد کے درمیان مراسلت کب ہوئی۔ علاوہ ازیں اس مخطوطے پر مولانا آزاد کے دستخط نہیں موجود ہیں اور یہی مخطوطہ بیس نے اس کا نام بھر کر لیا ہے۔ مخطوطے پر نام نہ ہونے کی وجہ یہ سبب ہو سکتا ہے کہ شاید مولانا کی تعریف نہ ہو اس امر کا بھی امکان ہے کہ مخطوطہ کسی دوسرے شخص نے لکھا ہو، اور مولانا آزاد نے بعد میں اصلاح کی ہو جو کہ مذکورہ تعریف کا طرزِ نگارش مولانا آزاد کی دوسری نگارشات سے بالکل متماثل ہے اور مخطوطے کے بعض صفحات پر مولانا کی اصلاحیں بھی ہیں۔ اس لیے مقدمہ نگاروں نے اس رسالے کو مولانا آزاد کی تعریف تسلیم کر لیا ہے۔ زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے جہاں البیرونی کے عہد اور اس کے کارناموں، عربی و جغرافیہ، اقلیموں کی مسافت اور کرہ کی مجموعی مسافت، خط استوا اور قریب الارض البیرونی کے اطراف اور موجودہ اطراف کے باہمی فرق اور اس کے عہد کے جغرافیائی خصوصیتوں، البیرونی اور مجید بن زکریا کے باہمی تعلقات، البیرونی کی سیاست ہند اور

ہندوستان کے بارے میں اس کی معلومات پر روشنی
ٹپک رہے ہیں پہلی بار یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ مولانا
آزاد جبرائیل دہلوی بھی تھے۔

ڈاکٹر جس انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے ۱۲ صفحات
پر مشتمل یہ جلد کتاب دیہاتی سائز میں سادہ مگر پرکار و
کے ساتھ سلیقے سے شائع کی ہے۔ کاغذ، کتابت اور
طباعت مہیا بہ عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ یہ دہلی
میں بہ کتاب مکتبہ جامعہ لٹریچر، بمبئی اور علی گڑھ سے
مائل کی جاسکتی ہے اور اس قابل ہے کہ مطالعہ کے بعد
ایسی لائبریری کی زینت میں اضافہ کر س۔
(ادب باب عندلیب)

۱۰۔ کتاب ”زندگی لے زندگی“

خلیل الرحمن اعظمی مرحوم، دیہاتی سائز (۱۱۶
صفحات) قیمت چھ روپے، ماسٹر، اردو لیس اردو
ایڈیٹی قیصر راغ لکھنؤ۔

خلیل الرحمن اعظمی برصغیر کے نامور شاعر، نقاد
نویں، اردو ادب کا سب سے بڑی تحریک ترقی پسند
مفکرین علی گڑھ کے صاحب الرائے اصحاب اساتذہ
میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بائیس سال ہو رہے ہیں انھیں
مہلاتے ہوئے ”ساجد ام“ ال کی معرزی ستاری کا پہلا
مجموعہ تھا جسے برصغیر ہندو پاک کے شعری و ادبی مطلق
میں بے نہایت شرف مقبول حاصل ہوا تھا۔ اعظمی
مرحوم کا اہم گروہ کے علی اور مذہبی یہ مدد بھی گھراں سے
تعلق رہا۔ علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی نے ان کے ذہن و
فکر کو روش کیا۔ ترقی پسند تحریک اور عصری و ادبی

رحمانات نے ان کے شعور و ادراک کو ہمیز کیا۔ وہ جامعہ
علی گڑھ کے ایسے استاد تھے جنہوں نے اپنے فکر و نظر سے
آلہ ادبی و شعری تحریک اور ذہن کی تربیت کی جیت
نفاذ انہوں نے نابھہ عصر باز فوج پوری سے داد پائی
روایا نہ و رحمان اور اقدار کی یاسداری ال کا ایسا
وصف ہے جس کی غم بہ بد میں شادی کوئی مثال
مشکل سے ملتی ہو، سگم راشدہ خلیل نے ان کے زیر نظر
دوسرے اور آخری مجموعہ ”کلام“ زندگی لے زندگی“ میں
بالکل درست لکھا ہے کہ ”موت اور مانے سے بیک
وقت واد وار لڑنے کا مدد ملے بہت کم لڑکوں میں ہوتا
ہے ہر حرم نے بغیر کسی کامد کے اس جنگ کو آخر
تک جاری رکھا۔ زندگی کے بیانی اس احوال عام بخور
کے بارے میں یہ دیکھ کر محو الحاحی چیز میں مجلس انظما کی امر
پردشس اردو ایڈیٹی نے اپنے پست لفظ میں اعظمی مرحوم
کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ہم ایسے کہنے ہی
صاحب الرائے اصحاب کی ناسدگی کا فرض ادا کیا ہے
”وہ ایک ساغر کا دل، ایک معلم کی ذہنیت اور ایک
دانشور کا داغ رکھنے والے تھے مگر انھیں، ہنسنے کے لیے
ذہنی گھولنا تھا جاں خود ان کے اپنے الفاظ میں
ایک ایک ابجیل نے اپنا مسکن بنالیا تھا۔ وہ جس ذہنی
کرب کا ستار تھے اور جس طرح انہوں نے اس
کرب سے نجات پانے کی کوشش کی یہ مجموعہ اس
کا غماز ہے۔“

”زندگی لے زندگی“ اعظمی کی ۲۲ غزلوں پر مشتمل
استعارہ، ۵ نظموں اور ۳ نعتوں پر مشتمل ہے۔ بالکل
اور ادھوری نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر

بیچ و خم اور درجہ صلوٰں کی رہنمائی اور دھنک رنگ اشاریت ملتی ہے۔ مجموعہ آفتاب طریقی پر خوبصورت چھپا ہے، اور مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔
(اقار خلیل)

”شیشوں کا میساج کوئی نہیں“ (ناولٹ) نفی خیر
۵۵ صفحات، ڈومانی سائز، جلد موگر دیس فیمہ، اردو
ناشر اردو مجلس لندن۔ ملنے کا تیرہ۔ اگورگر ۶۹۶-۱-۲۲
بازار نور خاں جید آباد۔ ۲۴-۵۰۰

نفی خیر بیچا درگھاٹ ہائی اسکول کے میرے ہم درس
جامعہ عثمانیہ کے ڈپٹی طالب علم اور جید آباد کے صحافی
ادبی اور دانشور عطف کے ماننے پہچانے نو جوان ہیں گزشتہ
کئی سال سے وہ لندن میں مقیم ہیں اور اپنے ڈپٹی ڈاکٹر کی
احسن صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مدد ف ہیں زیر
نظر ناولٹ کو پڑھ کر ان کی مجلسی صلاحیتوں کا بھرپور آگاہ
ہو پورا حراف کرنا پڑا۔ (۱)، (۲) صحفہ اور ۱۶، انوار
پرستیں اس نغمہ ناولٹ کو پڑھ کر اس کے کرداروں کے ساتھ
چل کر انہ اڑہ ہو آکر مہر نے سجا ڈھیر کے اولین ناولٹ
لندن کی آگاہی کے سلسلے فکر کو خوبی حسیئت کے سہارے
آگے بڑھایا ہے۔ سحرانگیز مناظر کا وہ جزا بند، سناخدا
کے تاریکی کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ علمی اظہار نے
زندگی کی قدروں اور فکر و نظر کے رنگ ملنے راویوں
اور متوں کو روشن بنا دیا ہے۔ تصور کے ناولٹ کے کرداروں
کو حقیقی طور پر زندہ کرنا ان کے دستانہ رنگ بھوس سے
اس ناولٹ کو سحرنا سنا دیا ہے۔ مجھ میں جگہ فارالمیف
ڈاکٹر محمد حسین رضوی نے اس ناولٹ پر اپنی آراء و پسند و
(باقی صفحہ)

نے موت کے لیے رحم رخص کے آہنگ کو غلیظ
میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ غزلوں میں انسانی
اقدار کی تعریف، محبت اور معصیت کا منفرد اور
دلہاں میں اترنے والا موثر انداز اپنی جگہ جھوڑ
جاتا ہے۔ از پریش اردو اکڈمی نے یہ مجموعہ
شایان شان نوبل ایٹ نہیں کیا پھر بھی وہ غلیل
سناسی کے باب میں قابل مبارک باد ہے۔ اچھی
اور پوری شاعری کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے
”زندگی کے زندگی“ اہم سوغات ہے۔
(اقار خلیل)

نام کتاب ”شعاع فکر“ (شاعری) وکیل سہو پانی
صفحات (۱۳۶) ڈومانی سائز جلد موگر دیپوشن
ناشر: مدھیہ پریس اردو اکڈمی برنسیر کالونی، جھوپال۔
”شعاع فکر“ اردو کے بزرگ اور کلمہ مستن
شاعر جناب وکیل سہو پانی کی (۱۳۲) غزلوں کا
خیال سخن ہے۔ وکیل تقریباً نصف صدی سے
اردو شاعری میں کلاسیکی اسلوب و انداز سے
اپنے طور پر فکر کر رہے ہیں۔ سیاب، جوش اور اثر
لکھنوی کے زمانے کی باجھڑیں گردہ شہت کہان،
مدھیہ پریس اردو اکڈمی نے ان کا مجموعہ کلام شائع
کر کے صوبہ کے بزرگ اور اساتذہ سخن شعراء کی
جانب میں اپنا اندازہ خلوص ادا کیا ہے۔ اسی جذبہ
کے ساتھ وکیل سہو پانی کی شاعری کو خرم کر
بڑھا جاسکتا ہے کہ ان کے استعاروں میں اچھے و قوتوں
کی فکر، شعری ردایات کی سنگدھ اور زندگی کے

احد و مینا

(وقار خلیل)

اردو کی علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

گھر ٹرسٹ کے بانی جناب علی غاں
ایڈیٹر سیاست اور ڈسٹریکٹ جناب سید
مکتبہ شہداء صدر ایقاعی مجلس قانون ساز
کونسل کے علاوہ جناب منور راج سکسینہ

صدر انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے
صدر ہند کا یہ مقدم کیا اور انہیں بھول

پہنائے محفل شعر میں سعید شہیدی رنلی
احمد علی کنیل پر شاہ کنول، مزید
لو تھر، خواجہ سونو، ڈاکٹر حکیم، رئیس فخر
صلاح الدین، حیات اللہ اور شریا ہر
نے کلام سنا یا۔

۲۳ جولائی: ریاستی اردو اکیڈمی
کے خزانے کے بموجب اکیڈمی کی طرف
سے محمد د محمد الدین کے شعری مجموعہ
”باطرس“ کی اساعت ہوئے والی ہے
● ریاستی اردو اکیڈمی کی طرف سے
ادبی رسائل کو گولڈنٹ کے ضمن میں

”سب رس“ کو سابقہ کی طرح اس بار بھی
ایک ہزار روپیہ کی امداد دی گئی۔
● ادبستان دکن کی مجلس انظما
نے طے کیا ہے کہ حیدرآباد کے اساتذہ
سخن حضرت صفی اورنگ آبادی
کی کلیات کی ترتیب و اشاعت کے
لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس
میں ڈاکٹر مخنی تبسم، محمد منظور احمد
شمس الدین، تابال اور ذہن فیم
(بانی ص ۲۹)

۱۴ جولائی: برصغیر کے ماورفاد اور
شاعر ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شہزادہ عثمانیہ
یونیورسٹی کی نئی اور پانچویں کتاب
”آواز راہی“ (۱۱) تنقیدی مقالوں
پر مشتمل ہے اساعت ۱۲ روپیہ ڈاکٹر تبسم
کی اس کتاب میں کلاسیک سے جدید شاعری
تک عالماد مقالے، اقبال اور غالب کے
عروضی، لسانی اور صوفی مطالعے، نئے افق
روشن کرتے ہیں۔ یہ کتاب الباس ٹریڈر
حیدرآباد سے خریدی جاسکتی ہے۔

۱۶ جولائی: بلدیہ کونسل آف انڈیا نے
جیہ ملایہ کا اہتمام کیا ڈاکٹر ایم ایل
نکمر ڈاکٹر سارا لارنگ موزیم نے اس
موقع پر کہا کہ قطب شاہی محل نے جیہ ملایہ
کو باخا بل فراموش تہذیبی اور علمی
ورثہ دیا ہے جس سے استفادہ دکن
فناسی ہوگی۔ صدر کونسل جناب تقی
بگلوا می اور معتمد جیلانی بیراک نے بھی
اظہار خیال کیا محفل شعر میں صلاح الدین
نیر اور سعید حسن نے کلام سنا یا۔

۲۳ جولائی: صدر جمہوریہ چند
گیا فی ذیل سنگھ نے اردو گھر میں ایک
خیر مقدمی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے
کہا کہ پورا شہر حیدرآباد ہما اردو
کا گھر ہے۔ آپ نے اردو زبان و ادب
کی حیدرآباد کو دایا تہ اور دکنی کلچر کو
زبردست فروغ ادا کرتے ہوئے
کہا کہ حیدرآباد ملی تہذیب
اور دکنی زبانوں کا گلدستہ ہے اردو

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)

اسلوب اور انتقاد

بالِ جوہر



ضربِ کلیم

مکاتیبِ انبیا

سید علی



.

.



27

بیادگار ڈاکٹر محمد الدین قساری زور
ماہنامہ

سبکدوش

حیدرآباد

پروفیسر علی اکبر نمبر

مجلس مشاورت

صدر: محمد علی عباسی
نائب صدر: یاشم علی اختر
معتد: ڈاکٹر مفتی تبسم

ارکان

پروفیسر علی اکبر
عابد علی خاں
پروفیسر گوپی چند نارنگ
محمد اکبر الدین صدیقی
رمن راج سکسینہ
پروفیسر راج الدین
محمد منظور احمد

مدیر اعزازی

معاون مدیر

بند (۳۳) ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۸ء شمارہ (۹)

قیمت - ۴ روپے

ادارہ ادبیات اردو - پنجگھر، حیدرآباد

رسالہ

۱۵ روپے ہوائی ڈاک سے بھری ڈاک سے

سرخانوں سے مشرق وسطیٰ ۱۲ ڈالر ۵ ڈالر

۲۰ روپے امریکہ ۱۶ ڈالر ۶ ڈالر

نریور جہزی ۴۵ روپے

بکستان، برما سیلون ۸ ڈالر ۳ ۱/۴ ڈالر

انگلستان ۷ پونڈ ۳ پونڈ

بیادگار ڈاکٹر محمد الدین قساری زور نے پیش چارگان میں چھوڑ کر حیدرآباد ۴..... ۵ سے شائع کیا

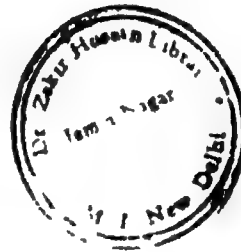
دکن میں تعلیم تدریس تہذیب اور
ادب کے ممتاز بزرگ و معمار

پروفیسر سید علی اکبر

کی خدمات کا اعتراف

ہماری تاریخ کو خراج اور تجدید عہد

منجانب



روزنامہ **سیاست** حیدرآباد

نہ صرف ریاست آندھرا پردیش بلکہ جنوبی ہند اور بیرون ملک
میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اردو اخبار

فہرست

۵	معنی ہجرت	اپنی بات
۵	پرو فیسر گوپی چند نارنگ	پیام
۶	ڈاکٹر مرزا اکبر علی بگ	جناب سلی اکبر: حالات و کوائف
۹	صاحب حیدر آبادی	قطعہ تاریخ و نظم تہنیت
۱۰	ڈاکٹر آبادی طاہرہ سعید	خارج تحسین
۱۰	وقار حلیل	فہم و دانش کا جلال
۱۱	نواب شاہ عالم خاں	انوار العلوم کا لاج کی ترقی میں جناب سید علی اکبر صاحب حصہ
۱۵	میر احمد علی خاں ادیب	پرو فیسر سید علی اکبر اور ان کے تعلیمی معائنے
۱۹	محمد منظور احمد	پرو فیسر سید علی اکبر: چند یادیں، چند باتیں
۲۲	سید کاظم	پرو فیسر سلی اکبر، ماہر تعلیم

تجارت سید علی اکبر

۲۴	پرو فیسر سید علی اکبر	سابق ریاست حیدرآباد میں تعلیم
۲۹	" "	تعلیم اور فرقہ وارانہ میل ملاپ
۳۴	" "	سردہ جی نائیڈو

۳۹	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	حضرت گیسو درار کا نظریہ توحید
۴۶	ڈاکٹر محمد علی اشرف	قدیم دکنی کے غیر مطبوعہ مرثیے
۵۰	صادق نقوی	تاریخ حیدرآباد (نظم)
۵۱	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	نصوف: اردو شاعری کے دبستانِ دکن میں
۶۱	اعجاز راہی	فنِ خطاطی
۷۵	ڈاکٹر رحمت علی خاں	فنِ خطاطی کی مختصر تاریخ
۷۹	بشیر وارثی	تہنیت نامہ (نظم)

نیک تمناؤں کے ساتھ

گولکنڈہ سگریٹ

بنانے والے

دی حیدرآباد کن
سگریٹ فیکٹری

مشیر آباد - حیدرآباد

قانونی انتباہ: سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے۔

انحصارِ بات

پیام

عالی جناب پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی خدمت کا اعتراف ایک سعادت ہے۔ حیثیت ایک ممتاز دانشور اور ماہر تعلیم کے اور بحیثیت صدر ادارہ ادبیات اردو انجمن نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہم سب کے لیے مودب شکریہ و احوال ہیں۔ انہوں نے دینی ادب، دینی تمدن، اسلامیات، خطی و دستخطی اردو زبان اس کی تعلیم کے تحت اور ترقی کے مسائل پر جو توجہ کی ہے اس سے ال کی دل سوزی اور گہری لگن کا پتہ چلتا ہے۔

خدا ان کو صدوسی سال سلامت رکھے اور دوسرے کو ال کے نفسِ عدم پر چلنے کی توفیق دے

پروفیسر گوپی چند نارنگ
(ڈس ایوانیٹر اید لکچرر، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

محیس اہل حیدر آباد کے جذبات کا ترجمان ہے ہم کو احساسِ مذہب ہے کہ محدود مالی وسائل کی وجہ سے اس خصوصی شمارے کو محدود کچھ شایانِ شان نہیں بنا سکے چہرے ہم اس تحفہ درویش کو بعد انکسار پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی جرات کرتے ہیں

گر قبول افتد رہے عمر و شرف

معنی تبسم

پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی ذات ستورہ صفا دانش و مہذب کی مجسم علامت ہے۔ ایسی شخصیتیں کسی قوم کو کھڑا ہے ماسے نصیب ہوتی ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کو فخر ہے کہ اسے اکیس برس تک آپ کی سرپرستی حاصل رہی اب جبکہ اپنی خزانہ صحت کی بنا و پر آپ دار کے قلم و صدارت سے سکدوش ہو چکے ہیں لیکن مجلس انتظامی کے رکن کی حیثیت سے اب بھی آپ کی مشفقانہ رفاقت ہمیں حاصل ہے۔

حیدر آباد کے تمام سرکردہ علمی و ادبی اداروں کی جانب سے آپ کی خدمات کے اعتراف میں جلسہ منہیت ۶ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو اجوان اردو میں منعقد کیا گیا اور ایک ڈیفنو آپ کی خدمت میں ادارہ کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اسی سلسلے میں ادارہ کی مجلس انتظامی نے طے کیا تھا کہ ”سب رس“ کا ایک خصوصی شمارہ پروفیسر

سید علی اکبر کی نذر کیا جائے۔ ہماری درخواست پر مختلف اہل قلم اصحاب نے ادارہ ادبیات اردو کی سرگرمیوں اور پروفیسر سید علی اکبر کی دلچسپی کے شعبوں کی مناسبت سے دیکھا تا سلامیات، تعلیم اور خطی کے موضوعات پر مقالے تحریر کیے جو اس شمارے میں شامل ہیں اس کے علاوہ سید علی اکبر صاحب کی علمی اور تعلیمی خدمات کے بارے میں چند مضامین لکھوائے گئے، تعلیم کے موضوع پر پروفیسر سید علی اکبر صاحب کے مضمین اس خصوصی شمارے کے تحت شائع ہوئے ہیں شعراء کا منظوم خراج

والٹر مرزا اکبر علی بیگ

جناب سید علی اکبر صاحب

حالات و کوائف

(۱) انگریزی: پہلی جماعت سے ایم۔ اے (کنٹ) تک
اب اس زبان میں تعلیم اپنی تخلیق کی زبان۔
(۲) فرانسیسی: ذوق کی تسکین کے لیے مطالعہ کیا۔
(۳) لاطینی: ایم۔ اے (ابتدائی) میں اختیاری
زبان کی حیثیت سے۔
مطبوعہ نصایف :-

طبع: اردو :-
(الف) اپریل ایکویشن کانفرنس (انگریزی رپورٹ) ۱۹۲۴ء
(ب) ایکویشن سسٹم آف میسور (انگریزی) ۱۹۲۹ء
(ج) دی جرس اسکول سسٹم (انگریزی) ۱۹۳۲ء
(د) ایکویشن انڈیا صفحہ ۱۰۰ دی یون (انگریزی) ۱۹۳۵ء
(ر) ایکویشن اینڈ ڈیٹا کرسی (انگریزی) ۱۹۵۴ء
ترجمہ :-
(الف) اپنے نفس کی شناخت ۱۹۳۸ء

نفسیات کے اہلکاروں کی کتاب

YOUR OWN MIND کا اردو ترجمہ

ترتیب و تدوین :-

(الف) ہدی نواز جنگ و الیوم (انگریزی) ۱۹۷۰ء

سید علی اکبر
اریخ پیدائش: ۱۶ اکتوبر ۱۸۹۹ء
مقام پیدائش: آصف نگر، جید آباد کس
مذہب: اسلام
والد کا نام: سید محمد صاحب مرحوم
دادا کا نام: سید علی اکبر صاحب مرحوم
تعلیم:-

(الف) پہلی جماعت سے نویں جماعت تک مدرسہ عالیہ خیل
ٹرکولیشن: ۱۹۰۵ء ولسن کالج بمبئی
(ب) انٹر میڈیٹ: ۱۹۱۰ء ولسن کالج بمبئی
(ج) بی۔ اے (فائنل) ۱۹۱۲ء ولسن کالج بمبئی
(د) بورس اسکالرشپ کے لیے انتخاب کی وجہ
سے گراجویٹس کی ٹیکل کے لیے انگلستان چلے گئے۔
(۱) ایم۔ اے (معائنات) ۱۹۱۵ء وکیمبرج، انگلستان
زبانیں :-

(الف) اردو :- مادری زبان، تخلیق کی زبان

(ب) فارسی :- موروثی زبان

(ج) عربی :- مذہبی زبان

(ب) امیر خسرو سیمار (انگریزی، اردو) ۱۹۷۵ء
غیر مطبوعہ تصانیف: مختلف جرائد میں شائع شدہ اُنکے
معائن کا مجموعہ، ادارہ ادبیات اردو کے سلسلہ
اشاعت میں شامل ہے جس کی فہرست مندرج ہے۔

سر اس سعود (مطبوعہ سیاست حیدرآباد ۲۶
جنوری ۱۹۷۰ء ماہنامہ سب رس جنوری ۱۹۷۰ء)
نواب سر محمد یار جنگ (مطبوعہ حیدرآباد پچیس ۱۹۶۸ء)
مس چوہا دھبا (مطبوعہ سیاست ۲۴ جون ۱۹۶۸ء)
سر دھنی نائیڈو (۱۰ اراگت ۱۹۶۸ء
(نسط اول و دوم)

جب ہم طرحے تھے (مطبوعہ سیاست حیدرآباد
مطبوعہ ماہنامہ سب رس جون ۱۹۷۰ء)
سجاد مرزا: فعلی اور تعلیمی خدمات (مطبوعہ روزنامہ
سیاست حیدرآباد (م ۳) رزوری ۱۹۷۰ء
سید علی بلگرامی (مطبوعہ سالانہ انوار) (انوار
العلوم کالج حیدرآباد ۱۹۶۷ء)

نواب اعظم جنگ (مطبوعہ سیاست حیدرآباد)

اخلاقی امور کا تجربہ :-

(الف) صدر قلمیات، مجلہ کہ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۳ء
(ب) صدر قلمیات، حیدرآباد کہ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۸ء
(ج) نائب ناظم قلمیات، حیدرآباد کہ ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۵ء
(د) پرنسپل نظام کالج، حیدرآباد کہ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۵ء
(ر) ناظم قلمیات ریاست حیدرآباد کہ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۸ء
(س) پہلے پرنسپل حیدرآباد ایوننگ کالج ۱۹۷۸ء تا ۱۹۷۹ء
(ام) پرنسپل انوار العلوم کالج حیدرآباد ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۶ء
ادارت اور صحافت کا تجربہ :-

(الف) حیدرآباد پچیس (انگریزی) دسمبر ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۸ء

(ب) حیدرآباد پچیس (اردو) نگران ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۸ء
(ج) ماہنامہ سب رس حیدرآباد نگران ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۳ء
تدریسی تجربہ :-

(الف) مددگار پروفیسر تاریخ و معاشیات نظام کالج

۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۲ء

(ب) پرنسپل نظام کالج کی حیثیت سے دو سال انٹر میڈیٹ کو
انگریزی اور بی اے طلبہ کو سیاسیات پڑھائی سکائی

(ج) پرنسپل حیدرآباد ایوننگ کالج کی حیثیت سے چار سال تک

بی اے کے طلبہ کو سیاسیات پڑھائی ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۰ء

(د) پرنسپل انوار العلوم کالج کی حیثیت سے (۱۲) سال

پی بی سی کے طلبہ کو انگریزی اور بی اے کے طلبہ کو

سیاسیات پڑھائی ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۷ء

دیگر سرگرمیاں :-

(۱) ادارہ ادبیات اردو کے چرم بن ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۳ء

(ب) صنوا ہمایوں مزار وقف کے چرم بن ۱۹۷۵ء سے

(ج) صفدریہ بانی اسکول کٹی کے صدر ۱۹۷۵ء سے

(د) پولیس انکیشن کے بعد کی تحقیقاتی سہ رکنی کمیٹی

کے معزز رکن ۱۹۷۸ء

(ر) آل انڈیا فیدریشن آف پچیس کے وائس پرنسپل

۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۸ء

(س) سنر سرجی ایڈووکیٹس ٹرسٹ کے ٹرسٹی ۱۹۷۸ء سے

مشادی :- میجر محمد علی مرزا صاحب رجوم کی صاحبزادی

شاہجہاں بیگم صاحبہ سے ۱۱ جون ۱۹۷۸ء

اولاد :- چار صاحبزادے اور بن صاحبزادیاں

صاحبزادے :-

(۱) سید حمید اکبر صاحب پیدائش ستمبر ۱۹۷۸ء جنرل

پنجر (حال میں پاکستان)

- (۲) سیر عظیم، اکبر صاحب بدائش جولہ ۱۹۲۳ء
(ڈاکٹر کریم لاکھو لکھی)
- (۳) سید سعید اکبر صاحب مرحوم بدائش ستمبر ۱۹۲۹ء
وفات ۹ جولہ ۱۹۲۹ء (کپٹن انڈین آرمی)
- (۴) بد سراج اکبر بدائش ۱۶ مارچ ۱۹۳۸ء
(ریجنل منیجر، ویکو، بیلٹی)

معاذ اذبال :-

- (۱) محمد عظیم، صاحب مرحوم (الہیہ رحمہ اللہ) صاحب
بدائش ۲۴ ستمبر ۱۹۱۹ء وفات، اگست ۱۹۸۳ء
- (۲) محمد عظیم صاحب (الہیہ رحمہ اللہ) صاحب
آئی۔ اے۔ ایس ریٹائرڈ ریڈر انگلش خانہ
یونیورسٹی جہاد آباد بدائش جولہ ۱۹۲۶ء
- (۳) محمد سعید صاحب (الہیہ رحمہ اللہ) صاحب
سکریٹری سینک بورڈ ریگنل ریڈیو ڈسٹرکٹ ایف بی
بدائش اپریل ۱۹۲۸ء
- بیردنی سفر :-

- (۱) محبت طالب سلم ۱۹۱۲ء انگلستان
- (۲) اپریل ایجوکیشن کانسٹبل کے سائنس کے
حقیقت سے ۱۹۲۶ء انگلستان، جرمنی

- (۳) انجینیئر دورے میرزا - صاحب جاء کیمبرج ۱۹۳۱ء
انگلستان، جرمنی، فرانس، اٹلی، سوئٹزرلینڈ
اسکاٹ لینڈ۔
غزرات :-

- (۱) تمذہ آصفی، خدمات کے اختتام میں ۱۹۴۶ء
- (۱) لائیس کلب آف سکندر آباد کی جانب سے
مبٹوہ ستمبر ۱۹۴۵ء

- (۳) انوار العلوم کالج میں سید علی اکبر ہال کا قیام ۱۹۴۵ء
(۴) خدمات کے اختتام میں کئی علی، ادبی اور ثقافتی
اداروں کی جانب بمقام ایوان اردو ایک
ظہیم الشان جلسہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ ۶
اکتوبر ۱۹۸۳ء : تعدادت حبیب الرحمن صاحب
پروٹیسٹ حبیب الرحمن صاحب صاحب اکبر علی خاں
صاحب سالی گوڈرٹ ریسید جناب محمد علی عباسی
صاحب صدر ادارہ ادب اردو
جناب مایہ علی خاں صاحب نواب شاہ عالم
خال صاحب، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، صاحب
سید کاظم صاحب نے آیہ کی علیی اور سماجی
خدمات پر روشنی ڈالنے پر سے مرآت
نخستین کیا۔ جہاں سے ملے ہوئے ہیں
محترمہ بانو طاہرہ سعید اور عظیم الدین خاں
صاحب جہاد آبادی نے منظوم ذراچہ تحریر کیا
پدم شری عابد علی خاں صاحب اٹھارہ
سیاست نے جناب سید علی اکبر صاحب کی
خدمت میں ادارہ کی طرف سے مہربانی پیش کیا۔

دکنی ادب کی تاریخ

مرتبہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

~~~~~ (صلے کا پتہ) ~~~~~

سب رس کتاب گھر ایوان اردو

جہاد آباد، ۴۔۵۔۱۹۸۳

# صاحب حیدر آبادی قطعہ تاریخ و نظم تہنیت نذر پیر و فیئر سید علی اکبر

فیصلہ ارباب دانش کا ہوا صورت پذیر  
ہے دیر روشن کن برق خیال اہل فہم  
سال صاحب کو ملا سب لے کیا جب اعتراف  
جس خدمات علی اکبر کمال اہل مہم  
۱۹۸۳ء

یہ فطیم خم ہیں سر دیہاں ارباب دانش کے  
رہے ہم ناظم تعلیم رسول اس رہا سب کے  
سرافت کے سموئے اب بھی کج بجاتی ہیں دنیا  
تمہیں جس نے بھی دیکھا اُس نے ہنڈیٹ کن دیکھی  
صدارت پر تمہاری یہ ادارہ ناز کر رہے  
ہیں جتنے اہل محفل سب ہر نل سے معترف اس کے  
تمہارا جس کر کے جیسے اپنی پوشندی کو  
علی اکبر بھی اک واجب ذمہ دار اندو ہیں  
نہ جائے گی کبھی محنت تمہاری رائیگاں ہر گز  
ادارہ زور صاحب کا قیامت تک مچلے پھولے

سارک ہو تجھیں یہ مرتبہ سید علی اکبر  
تمہاری و ص سے پھیلی ضبا و سد علی اکبر  
ہر اک نے تم سے مل کر یہ کہا سید علی اکبر  
مرغ تم ہو اس آئین کا سب علی اکبر  
تمہارا نام اس کو مل گیا سید علی اکبر  
تمہارے کام ہیں سب بے رہا سید علی اکبر  
دکن والوں نے ثابت کر دیا سید علی اکبر  
کسا وہ کام جو باقی رہا سید علی اکبر  
ہے نکل خود بھی نیکی کا صلہ سید علی اکبر  
اگر مل جائے کوئی دوسرا سید علی اکبر

رہے اردو زباں جب تک رہے ایوان اردو بھی  
بعد دل ہے صاحب کی دعا سید علی اکبر

## ڈاکٹر بانو لطافت سید خارج تحسین

و قار خلیل

### قوم و دانش کا اجالا

(پیر و فیسر سید علی اکبر کی خدمت میں)

سماج علم و فن افروز

سماج ہمدردانہ

وہ اسی شخصیت جس کی نظر روش

سخن کا ہلکا کنگ و جہن کی وادی تحقیق کا منظر

خلم لکھنوار با تعلیم کا بھد آفرین دفتر

و جس کی ذات میں اک انجمن عیسے

دلی کی سرسبز کو مخ ہے —

سید علی اکبر ساد الشور معلم اسکا اپنا ہے

میں خوش بختی پر نازاں ہوں علی اکبر ہمارا ہے

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہے، اک ادارہ ہے

ہاں عمر گریزاں وہ بڑی تقدیر والا ہے

خدا رکھے سلامت

کوہ نور شہر دل ہے، قوم و دانش کا اجالا ہے۔

ہو۔ ہمارے ہر مسلم و عکبر میں آئی ہمار  
آج سچا ہوا دل اردو کے ہے چہ نہ نہ نکھار  
ہیں ملی اکبر سے دانش وہ جان نہ نہ  
سحقیت نے جس کی بھائی ہے نہ نہ نہ نہ  
وہ جس احسن ہے ہمارے ہر نہ نہ نہ نہ  
اغراف علم ہے خود مادہ نہ نہ نہ نہ  
رہ لی میں قدر دانی ہونہ نہ نہ نہ نہ  
لطف کیا۔ گمرہ مادہ رکھ آئے بالائے ار

طاہرہ اس قوم کو صے کا حق مال ہیں  
سک کو آنا ہو۔ گمرہ عالموں سے یہ

## نواب شاہ عالم خاں انوار العلوم کالج کی ترقی میں

# جناب سیدی اکبر صادق کا حصہ

جید آباد کے علمی ادارے اپنی صورت گری اور آج نواب کے لئے نئی تحصیلات کے ترمیم و احسان رہے ہیں جنہوں نے ایسی لگن اور جوش سے علم کے لئے خیر سے ہر اس کے ایسی سوجھ بوجھ میں سید الہی کہ الہیہ انوار میں سید الہیہ بن سید اکبر جید آباد کا شاہی خاندان اس کے افراد اور اس کے حدود و احوال میں سے نئی سوجھ بوجھ ملے ہوئے ہیں۔ ایسی بنیادیں فراہم کیں جس کی وجہ سے جید آباد میں متوسط طبقے کی تعلیم و ترقی ہو سکی۔ جس کی اس سرزمین کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا ہے

نور کے ذریعوں سے قدرت نے بنائی ہیں آسمان کے ہر ایک کونے کی خاک اُلوہِ پاد سے متاثر

باقی رہیوں! جید آباد آج اک حقیقت کا گواہ ہے کہ نواب نے اپنے انوار و کائنات میں اس کا باطن دیکھ کر اسے شہرہ آفاق اور ابدی مہمان کو جنم دیا جنہوں نے نہ صرف ملک میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی نام کمایا اور اپنی صلاحیتوں کا سلسلہ جاری کیا۔ ان ہی شخصیتوں میں محرم جناب سید اکبر صادق بھی ہیں جن کے ذیل و فعل، ذات و صفات فکر و عمل میں کوئی تضاد نہیں۔ جید آباد کی علمی تاریخ میں ان کا نام اس بنا پر نہایت قابلِ ذکر ہے کہ ان کا علمی و ادبی وادبی اور حیات کے دیگر کاموں کا مطالعہ ان کی شخصیت میں ایسی شہرت ہے کہ ایک مرتبہ ملنے کے بعد ان کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے کاموں میں سائنس، فلسفہ اور مابینہ و فلسفہ کے الگ ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں ان کی اٹھنا اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے کہ ان کی ذات و شخصیت کے اندر ایک ایسی زندگی اور کمال کوئی دوسری کی۔ اس شہر میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جو تعلیم کے میدان میں زیادہ کام کیا کسی نہ کسی حیثیت سے کام کرنے رہے ہوں جس طرح اس عظیم شہر کی شخصیت نے لیا ہے ان کی غیر معمولی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے جید آباد کی حکایت نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا۔ وہاں سے لوٹے تو نظام کالج کی تاریخ کے رید بنائے گئے۔ پھر ان کے آف اسکول میں جید آباد میں تعلیمات اور پھر عام کالج کے پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے، وہاں سے بڑے توجہ سے ان کو ایوان کالج جو سارے ہندوستان میں اپنی

نوعیت کا دوا مد شینہ کالج تھا اس کے پہلے پرنسپل ہوئے کا اعجاز ملا، یہاں سے سکندرش ہوئے تو انجمن تعلیمی انوار کی عثمائی نظران پر پڑی اور وہ انھیں ایک نے لکھی اور وہ یہاں کے پرنسپل بنائے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جدید آباد نے مالان سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا انوار العلوم کالج اقلیتوں کا پہلا بڑا کالج بنے۔ یہ جدید آباد میں غامحی اعلیٰ تعلیم کے لیے انوار العلوم کے علاوہ کوئی دوسری بڑی درس گاہ نہ تھی۔

۱۹۵۳ء میں وہ یہاں کے پرنسپل ہوئے جب کہ کالج ممتاز مشن میں تھا، جہاں آئرس اور کاکرس کی کلاسز قائم تھیں طلباء کی تعداد صرف ۲۲ تھی۔ سید علی اکبر صاحب نے یہاں اس بات کی کوشش کی اور مالے سے مواقع پیدا کیے کہ انوار العلوم ایک تنظیم انسان درس گاہ بن جائے جو جدید علوم سائنس سماجیات کاکرس کے ساتھ ساتھ دیگر علوم، امن اور سکس ہو جائے جہاں حیرت انگیز اخلاقی اور تعجب خیز نتائج و نتائج قدم کے درمیان فراہم کیے جائیں۔

انوار العلوم میں دس گاہ اور عظیم سائنس کی تخیل و تہذیب و تمدنی خرم کماں کے کم ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جہاں تار سیاسیات، عمرانیات، معاشات، نظم و نسق، طبیعیات، کیمیا و حیوانیات، نباتات اور عصری لٹریچر کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی ابتداء میرے عظیم ترین نسل کی آزادی کے بعد جیسی صنعت طوع مونی بھی اس میں جدید آباد کے خواہ اور خاص اقلیتوں کو نیند سے بیدار کرنا تھا اہم کام تھا۔ انھیں نے ذخیرہ علم کے ساتھ نئے ماحول میں لاکھ لاکھ کرنا تھا۔ سہ علی اکبر صاحب مختلف طالب علموں کو ایسے ہاں ملائے اور اپنی داد و پیش کے مطابق ان کے حوصلے بڑھاتے جس طرح نسیم سحر خیز کہہ گدا گدا کر مہر مہر کا پیام دیتی ہے اسی طرح انھوں نے طالب علموں کو ان کے مستقبل کی راہیں بنائیں۔ اس علم دوست شخصیت نے اس کالج کو آگے بڑھانے کے لیے سائنسی علوم کے ساتھ مخلوط تعلیم کی طرف بھی قدم اٹھا دیا۔ ۱۹۷۱ء میں اس جانب اقدام کیا اس طرح نہ درس گاہ چھلنے چھوٹنے لگی اور اب ایک نیا درخت بن گیا انوار العلوم کے منہ اب آپ کو ملک اور برون ملک کے ہر گوشے میں ملیں گے۔ اس ادارے نے درجنوں صاحب علم اور اہل دل افراد پیدا کیے جو اپنی زندگیوں میں علمی و ادبی جدوجہد میں گزار رہے ہیں۔ سید علی اکبر صاحب نے علم و ادب اور علم پرور فضا میں دوسروں کو جتنا سکھایا خود بھی سکھایا ہے، انھوں نے جن جن کراہیے اساتذہ کو انوار العلوم میں جمع کیا ہے جس کی مثال دوسری درس گاہوں میں نہیں ملتی یہاں کے جو بھی اساتذہ اب رہ گئے خوب نام کیا اس درس گاہ نے یہاں کے طالب علموں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا جو سالانہ جمع کیا اور علم و عمل کے جو جوہر کھلائے اس کی تفصیل اس مختصر مضمون میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ وہ درس گاہ ہے جس کی آغوش تربیت میں

جدید آبادی اور کئی بیرونی طلباء کی تربیت ہوئی یہاں سے کئی سپوت جو ذہنی و اخلاقی جلا کے ساتھ باہر آئے ملک اور بیرون ملک زندگی کے کئی شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوار رہے ہیں۔ علی اکبر صاحب کے دور میں یہاں کے فرزند درختان نتائج کے ساتھ اس طرح جگہ جگہ لگے کہ کئی دوسری درس گاہیں ٹٹھکتی رہ گئیں۔ اب یہ ایک درس گاہ ہی نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی جامعہ ہے۔

میرے بزرگ محترم نہ صرف اس کالج کے نکاحاں سے بلکہ خود بھی درس و تدریس کے فرائض بڑی خوبصورتی سے انجام دیتے تھے۔ لڑکوں کو انگریزی کی تعلیم دیتے اور خوب دیتے۔ ذاتی طور پر طالب علموں کی پڑھائی میں دلچسپی لیتے، غریب لڑکوں کو وظائف دلانے نظام ٹیسٹ کو ان کا ایک خط چلا جاتا تو فوراً اس کا لکھنا شروع کر دیتا۔ اچھے اور پوٹیاں طالب علموں کو *ACADEMIC* کرنے کے لیے اپنی طرف سے انعام دیتے۔ سید علی اکبر صاحب کا چونکہ محکمہ تعلیمات سے کئی برسوں تک تعلق رہا تھا اس لیے انتظامی معاملات میں یہاں دشواریاں مائل نہیں تھیں۔ اس وقت کے ڈائریکٹر تعلیمات اور وائس چانسلر سے خاصہ تعلقات تھے۔ وائس چانسلر جناب ڈی ایس ریڈی صاحب نے ایک مرتبہ کالج کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ *I DO NOT CALL THIS COLLEGE AS AN INARUL OF COLLEGE IN ALL* *AXELI COLLEGE* اس سے علی اکبر صاحب کی معمولی معمولی اور تحسین کا اعزاز ہوتا ہے اور جس انبارالعلوم کا جتنی آرٹیکل کیا جائے لو بے مانہ ہو گا۔

جن لوگوں کو بھی اس شخص نے کالج کے قریب کیا یہ نہیں کہ ان پر کیا سچو نکا جا کر ال میں ابلا *DEDICATION* پیدا ہوا ہے کہ وہ کالج کا ہو کر رہا۔ گروہ یہاں سے چلے جی مانے زندگی بھر کالج کو نہیں چھوڑے اس کالج میں علی اکبر صاحب نے تمام میں طار میں کی سہولت کے لیے *DIPLOMA IN* *CERTIFICATE* کی کلاس شروع کیں۔ افسوس کہ وہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکیں انبارالعلوم الونگ کالج میں ال ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ لڑکوں میں یہ معمولی ڈسپلین بنا ذاتی طور پر یہ جو کلاس لیتے اور دوسروں کو پڑھانے کی ترغیب دے، اسہا یہ کہ انوار کو بھی کلاس لیے اور جتنی میں کالج آنے اگر نیری اخبار لاکر لڑکوں کو پڑھاتے اور اس میں غلطیاں ہوئیں اس میں غصے نہ کرنے اور درست کرنا۔ امتحانات کے بعد جب ساچا کھلے اور نتائج انچھے ہوتے تو ایسے خوش ہوتے کہ جسے یہ خود امتحان میں کامیاب ہوئے ہوں اور دوست احباب سے کہتے پھرتے کہ دیکھئے ہمارے کالج کے نتائج کتنے اچھے ہیں۔ اتنے درم اول میں کامیاب ہوئے ہیں وہ غیب۔ علی اکبر صاحب پڑھائی کے علاوہ اسپورٹس میں بھی کافی دلچسپی لے، خود بھی کرکٹ کھیلے۔ ڈریسل اور وقت کے باندھواؤں کا طرح چھڑی ان میں موجود تھی اور آج بھی یہ بات میں محسوس کرتا ہوں۔

انبارالعلوم کالج بڑا خوش قسمت ہے کہ اسے علی اکبر صاحب جیسا ایک اچھا نگرہ کار اور ماہر تعلیم پسند ابتداء بن سے ملا جس کی وہ سے بہ کالج اپنے آغاز ہی سے ترقی کر آیا۔ ہمارے شہر میں کئی ادارے کامیابی کے لیے برے ہیں کہ ان میں اچھے لوگ نہ مل سکے۔

علی اکبر صاحب نے یہاں جو اساتذہ جمع کیے انہوں نے نہ صرف تعلیم کے اسلوب کو بنایا، طالب علموں کو زندگی لے سبے سکھائے بلکہ ان کے ذہن کو علم سے بھر دیا، اس لیے کہ کالج کا رخشاں نور کہنا چاہیے۔



اب دارالمقصد علی اکبر صاحب کے نفیس قدم پر چلتے ہوئے اس کا لچکرائی دنیا کی زریب و زینت بنانا اور یہاں کے طالب علم کو اس قابل بنانا کہ وہ اس ملک کی زندگی کے ہر شعبہ ہائے حیات پر چھا جائیں اور یہ ان کی میزبان بن جائے۔ اس وقت کالج کی عمارتیں اپنے طول و عرض کی دلکشیاں کے ساتھ ایک نئی دنیا معلوم ہوتی ہیں اس کے نشیب و فراز اور مختلف مہواریں میں جو کیف ہے وہ اور جگہ نہیں۔ اس کی عمارتیں جدار آباد کی لطیف تہذیب کی زندہ یادگار ہیں علی اکبر صاحب کے درخیز بچوں کی بدولت یہاں بڑی جواہر تہذیباً نمودار ہوئی اور میری بڑی خوش قسم ہے کہ میں نے انھیں زریب سے دیکھا ہے، اور کسی کسی حیثیت سے مجھے ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے۔ انوار العلیم کہ مرنے میں ان کا جو حصہ ہے اس کی وجہ سے انوار العلیم کو ان کے بغیر نہیں پہچانا جاسکتا، اور انوار العلیم کے ایک عظیم معیار کی حیثیت سے ان کا کارنامہ آخر عمر لی ہے۔ انھوں نے اس کی مدد اسٹام دی ہے اس وجہ سے اس کالج کے CENTRAL HALL نو علی اکبر ہائی کام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر لیورے کالج کو بھی ان کے نام سے موسوم کر دیا جائے تو بھی کامیاب ہو گا۔ یہ مجمع بہ کہ میرے بزرگ محترم اسی ذات سے جو دایاں ادارہ ہیں

سہ علی اکبر صاحب بحیثیت پرنسپل انوار العلیم کالج میں ۱۹۶۷ء تک رہے۔ اس کالج کی تعمیر زریب و خوش حالی میں ان کے تراجم سے اس کے لیے بنا و فراہمی میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انوار العلیم کے بارے میں مستحکم کرنے کے لیے کہہ کر جا کر معطل جمع کیے۔ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے علامہ ہونے کے بعد بھی وہ انوار العلیم کو کچھ قبل سوسائٹی میں معیار اور کالج نوڈ کے ممبر کی حیثیت سے بڑی حوصلہ کام کر لے اور دستور سے دیتے رہے۔ کالج سے ان کے لگاؤ اور محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے اسی سیرا سالی اور جانی صحت کے باوجود اس کی سلور جوبلی تعاریب میں شرکت فرمائی۔

علی اکبر صاحب ہمارے لئے طائف کا آب بننا رہیں، ان کی موجودگی اور مشورے ہم میں حالات کا معاملہ کرنے کی ہمت اور صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ مرنے سے پہلے کہ ممبر بزرگ ہمارے درمیان فرید موجود رہیں مگر ہم ان کے تجربے اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکیں اور مقصد کو حاصل کریں۔ علی اکبر صاحب نے جو کام کئے ان کا گہرا اس سادہ وادی میں ہے، جہاں ان کے لیے پھول ہی پھول ہیں۔ میری تمنا ہے کہ وہ ایت دامن کر ان پھولوں سے بھر لیں۔

اب حالات بدل چکے ہیں وہ ماحول وہ مضافات نہیں لیکل میں ابوس نہیں بولیں۔ علامہ انما کے الفاظ میں

مضطرب باغ کے ہر غنچہ میں ہے بوئے نیاز  
تو ذرا چھپ کر نوڈ سے تشنہ مغرب ہے ساز  
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے جھلنے کے لیے  
طوڑ مضر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

## میر احمد علی خان اویب چیدر آبادی پر وفیسر سید علی اکبر اور ان کے تعلیمی معائنے

شخصیت اور ذہنیت دونوں لحاظ سے انفرادیت کے استعمال سے آئے ہیں ان میں لحاظ ہر امت مسلمہ ہوتی ہے لیکن دراصل یہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں فطرتاً ہر شخص کی الگ خصوصیت و بہت ہوتی ہے۔ اگر اس میں اسی بھی یکتا کا شائبہ یا امامیہ کو امر میں کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں بالکل اسमान و بھمی جاتی ہیں اس راؤنگہا سے لے استعمال میں کو یہ لکھا جائے تو کھلم کھلا حوالہ کیوں ہمارے آکھول کے آگے اموجود ہوا ہے۔

مستحق تہذیب و تمدن کی دنیا میں سک و بہ لب و بلند کا جو معیار کسی زمانہ میں نہیں رہا وہ آج مفقود ہے اس کے باوجود اگر صرف ربروں میں سونے کا آک آدھ دیکھی دیکھائی دے تو اسے دیکھنے والا بہ لالہ لائے گا کہ ناسو نابی ہے اور ٹیٹھی ٹیٹھی۔

مادر وطن کی مردم جبر سے جس سیرتوں کو جنم دیا ان میں سے ایک حاج مولوی سید علی اکبر صاحب ہیں جو اپنے احمد کے ہم نام ہیں۔ آج ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو چیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اس زمانہ مدرسہ عالیہ میں تعلیم پانی جب کہ وہ صرف رئیس زادوں کی تعلیم کے لئے مختص تھا جو ولس کالج سے اسٹریڈنٹ کے بعد بی۔ اے کی تکمیل کے دوران میں یورپین و طبیعہ پر انکلتل سمجھنے جہاں بہت کوسوٹی سے آکر درجہ دوم کی زنی و گری حاصل کی۔ یورپ کے سفر سے چیدر آباد لوٹے ہی مددکاری و ویسٹ مارکج و معاسبات نظام کالج کی جنس سے رہوئے چیر چیئرس ۱۶ برس کے بس میں صدر مہتمم تعلیمات بلکہ ہونے کے سلسلہ تیرہ سال اس خدمت کو سہماں چلے کے بعد چند مانتب مانتب تعلیمات رہے اور دو برس نظام کالج کی پرنسپل کی اس کے بعد مانتب مدرسہ تعلیم چیدر آباد کے صدر مانتب مانتب ۱۹۸۳ء میں و خلیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اس میں اپنے ابتدائی زمانہ طالب علمی کے دو ایک ہستم و مدد و فحہ جہاں لڑنا چاہا جہاں کہ لڑ مولوی سید علی اکبر صاحبیت صدر مہتمم تعلیمات بلکہ اپنے ہمدم و برہنہ مولوی احمد حسین مال کے مشہور و معروف مدرسہ مولانا "علیہ السلام" اند معائنے کی غرض سے فصلی سال کے آخری ماہ آمان میں دورہ کیا کرتے تھے۔ کوئی ڈیپلومی مانتب مانتب کہ عام مدارس تعلیمی معائنے کے موقع پر متعلقہ ہبدا سٹر اور دورہ کفندہ امیر سنجہا ہوں یورپین کو یہی مانتب مانتب مانتب میں گزراں تعلیم معائنے میں مولوی احمد حسین خاں اور مولوی سید علی اکبر کا سبائی چاراکر سالہ لے سے سب مانتب مانتب نے بھرے دہول سے

تعلق رکھتا تھا ہر معائنے کے موقع پر اس میں خال صاحب کا معمول یہ تھا کہ وہ انہی سنی بیٹ بچوں میں لے جاتا جو اسے  
صدر مہتمم صاحب کے ہمراہ یکے بعد دیگرے ایک ایک درجے میں داخل ہو کے پورا معائنہ مونیٹنگ متعلقہ درجے کی دیوار  
بالکون سے ٹیک لگا کر جیب جاپ لکڑے رہتے۔ ہماری تقریری جماعت کے معائنہ کا اضافہ کہ میں معائنے کے دل صبح کو  
موسلاہ مار مارا کرش ہو کے تمام ملکی تھی اور اسکول کے وسیع صحیح لکھی جتنے میں ہائرس کا جمع شدہ بانی دکھائی دے  
رہا تھا۔ مولوی علی اکبر صاحب نے اس صاحب کے ایک کم عمل لکڑے سے جبرامیہ کا یہ سوال کیا کہ ہائرس کے پانی کے جاروں  
طرف جو فضلی کا حد ہے اس سے بہتر نہ کہلائے گا یا جزیرہ سا لکڑے کے اس کا ملاحظہ داتا تو صدر مہتمم صاحب نے  
ازراہ نقشنی پریسل صاحب کو Look at him Mr. AHMAD HUSAIN سے مخاطب کرتے  
ہوئے اس معائنہ جاری رکھا۔

راقم الحروف دارالعلوم میں تدریس سے ہٹ کر کلکاس، اسٹریٹریٹ اور اگگری، فارسی اور اردو کی مدد کی ہے  
ساتھ ہی میں لسی مدت سہ ماہی میں صدر مہتمم صاحب اپنے معائنے کے وقت کبھی اگگری کی مارت حوائی اور  
اطلاؤسی کے بعد متعلقہ صاحب کے طلبہ سے چند اردو طویل کا اگگری نیز کر کے فرد افراد پوری صاحب کے لکڑوں کی کاپیاں  
جانچنے اور اراقم الحروف کی سامنے کبھی ۵۵۵ ن اور کبھی VERY GOOD تحریر دیتے ہیں اس صاحب سے لے نہ سہاتے  
اجمہ میں مال صاحب کے مانیس مولوی سید ظہور علی صاحب سنی خوب آدمی تھے، باوجود فاسکل و شبہات اور سفہ  
مراقب سنی گمنی ڈاکری سے وہ سہ سہ کے فنی معلوم ہونے سے پرانی سالی کے مادہ و جسمانی صحت اور انصاف بدل کی  
پھر قی اس فنی کی بھی لگو باکائی کے بنے ہوئے ہوں والی فنی کی انشائی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اگگری  
گریہ اور رجمے کے من براغبس ابسی مرمولی قدرت مائل بھی کہ بری طرک اور طرک کے طلبہ کو اگگری کا مقررہ لکھا  
پڑمانے کے علاوہ اگگری سے اردو اور اردو سے اگگری میں معارفی ترجموں کے ایچے اچھے نمونے اور گریہ کے بیانیہ  
مگر فل اسکیب سائز کے کاغذات پر لکھے فلم سے لکڑے ہر جگہ بلاناغہ نوٹس بورڈ پر آویزاں کروانے سے پھر نوٹس  
بورڈ سے کوئی کام کبھی بھی نکالا نہیں مانا مانتا کہ متعلقہ طالب علم دبیر ماسیو بران کم باب بخروں کو تمام نکال  
نقل کر لیں مولوی ظہور علی صاحب کے عہد صدارت میں ایک مرتبہ جب مولوی علی اکبر صاحب کا معائنہ ہو رہا تھا اس  
سائرس درجے میں زیر تعلیم تھا۔ حسب عادت معائنہ اس طرح شروع ہوا کہ اگگری کی کتاب کی کاپی لکھی گئی تھی  
جسے عادت خوانی گرائی گئی اور ڈیکشن کے بعد اردو کے چوڑے چوڑے جملے اگگری میں ترجمہ کرنے کے لیے دیئے گئے  
میں سے ایک جملے میں تو یہ الفاظ استعمال ہوا تھا جس کا اگگری مترادف میں نے HOPE لکھ دیا جب ترجمہ نہ  
صاحب کی نظر سے گزرا تو انہوں نے اسے فلم دکر نے ہوئے مجھ سے فرمایا ابھی ابھی آپ نے اپنی کتاب میں EXPECT  
کا لفظ پڑھا ہے پھر HOPE کہوں لکھا میں نے عرض کیا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ ہم کتابی لفظ کی تقلید کریں۔ فرمائے گئے  
لیے اگگری میں EXPECT ہی استعمال ہوتا ہے اور امید کے لیے HOPE۔ اس طرح دوسرے سال کے معائنہ میں

انگریزی ترجمہ کی غرض سے ہمیں بدستور اردو جملے لکھوا گئے، ایک جملہ ”اگرچہ“ سے شروع ہوا اور اس کا دوسرا جز ”لکھا“ سے مبرے تمام ساتھیوں نے ”لکھا“ کا ترجمہ ”BUT“ کیا اور میں نے مطلوبہ ترجمے میں YET رITHOUGH کا جمل استعمال کیا۔ اس ترجمے کی جانچ کے وقت میری کاپی پر VERY GOOD لکھ کر مولوی اکبر صاحب نے یہ جملہ WHO IS THIS BOY? انگریزی، باضی اور تاریخ ہندیز معدود سوالات کر کے صدر مہتمم صاحب اپنی کرسی سے اٹھنا ہی جاسنے چکے میں نے کلاس مانٹر کی صحبت سے انھیں یاد دلایا کہ فارسی اور اردو کا خمیوں معائنے سے رہ گیا۔ یہ سب کر محو سے لوجھا ”جی“ میں نے ایسا جملہ دہرایا تو مولوی ظہیر علی صاحب پریسل وقت سے انگریزی میں معاملہ ہوئے کہ ”پیر کا بڑا شوخ اور گستاخ معلوم ہوتا ہے، مجھے سکھانا ہے“ اس وقت مولوی ظہیر علی صاحب میری بیچ سے متصل میری طرف متوجہ کیے کھڑے ہوئے تھے جیسے سے میری جانب اس طرح ایلے جیسے ڈرل کرے والے بچے ڈرل ماسٹر کا کاس ہالے ہی ABOUT TURN کرے ہوں۔ ایک درخیزہ ہو کر مجھے گلو کی دی کہ ”سمیں اس سے کما مطلب“ میں اس وقت زیر لب مسکرا کر چپکا ہوا ہر جہر میں نے کلاس رجسٹر کے امدادات دیکھا کہ صدر صاحب سے دستخط لیا پڑنا تھا اس لیے مذکورہ بالا معائنے کے چند ہی روز بعد جب میں اجلاس پریسل رجسٹر لے ہوئے مینیجنگ مولوی ظہیر علی صاحب نے فرمایا ”صدر مہتمم صاحب نے تم کو ”شوخی“ گستاخ“ میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسرے ہفتے میں میں وہی الفاظ سنئے پھر بھی چپ رہا تبسہ جیسے میں جب اس جملے کا اعادہ ہوا تو ظہیر علی صاحب سے میں نے کہا کیوں صاحب کیا یاد دہانی بھی داخل جرم ہے؟ مجھے موبے جواب دینا سب کے لبائع یکساں نہیں ہونے تمہیں اس کا پھر یہ نہیں ہے۔

تو میں نے قلبی معائنے کی باتیں اس کے علاوہ مانتوں کے ساتھ مولوی علی اکبر صاحب کا قس سلوک میں قابل ذکر ہے۔

دارالعلوم کے بھائی روزگار اسناد اردو و اسادی مولوی مزار القصدی جس صدق مائیں مرحوم جو سرا یا مستعلیق انسان نے مولوی علی اکبر صاحب سے اتنی طافا لول کا حال اس خوبی سے بااں زمانے سننے کہ ہر سینے والے کو آنکھوں دیکھا حال معلوم ہونے لگا۔ چنانچہ موصوف نے ایک دفعہ اپنی محی طافا لول کا لفظ اس طرح کہنا کہ ”موسم گرمی ایک سپر ہو میں علی اکبر صاحب کے دولت کدے میرا اس مقصد سے بھیجا کہ انھیں اپنا نازہ ترس نصیب ساؤں جس میں اظہار مدعا نہ تھا کہ جبرآباد سے ضلع نظام آباد پر میرا تبادلہ کر دیا گیا یہ مجھے پھر جبرآباد ملا لکھنے۔ ممدوح نے قصیدہ سن کر اپنے بزرگ کو حکم دیا کہ صدق صاحب کے لیے ستر۔ فالسہ بڑا لادرا بہر میں شربت کے گلاس آگئے اور ہم دونوں ایک جڑو جڑو شربت پینے میں اتار دیا کرتے۔ یہ مولوی علی اکبر صاحب نے مبرے قصیدے کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے صلے میں نظام آباد سے آئیہ ہا کہ کر دیا جائے گا میں نے جواباً کہا کہ صلہ نہ فرمائیے۔ اگر آپ صلہ ہی دینا چاہتے ہیں تو اس کے لیے میری

تین مشیطیں ہیں نے کہا پہلی مشیطہ وہ ہے کہ نظام آباد سے حیدرآباد کے کسی اسکول میں راتا بدل کر دیجے دوسری مشیطہ یہ کہ محکمہ آرائش بلوہ کالے کلاس مکان کو راہیہ یزد لو ایسے تیسری مشیطہ یہ ہے کہ ضلع پر تبادلہ ہونے کی وجہ سے میں کافی زیر بار ہو چکا ہوں اس لیے سر رشتے سے ایک ٹسٹ دو ہزار روپے دلوائے۔ یہ سن کر فرمانے لگے آپ کی پہلی دونوں مشیطیں منظور ہیں تیسری مشیطہ سب سے دست ملنی کی جاتی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ میں آپ کو دو ہزار سے زیادہ کا نائد پہنچاؤں گا۔

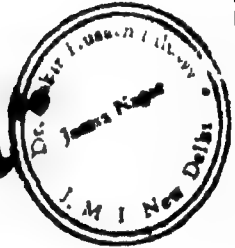
ایسے مردم شناس ماتحت فوازدوں کے مشرفانہ احاطات موزرمانہ کے ساتھ ساتھ انتخاب قلمیاریہ ہو چکے ہیں۔ المحف مولوی سید علی اکبر صاحب کا وجود ذی جو ذی ہرئیس کے استاد کمال تعلیمی نظم و نسق کے ماہر اور صاحب حمیدہ کے حامل انسان کی حیثیت سے نہ صرف قابلِ قدر بلکہ ہمارے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

ماہر تعلیم پروفیسر سید علی اکبر نمبر کے لیے نیک توقعات کے ساتھ

منجانب

ملاج ماربل ورکس

(فون - ۴۱۹۸۲)



نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد ۱۔ ۵۰۰۰۰

(ہمارے خصوصیات)

سنگ مرمر پر کتابت کی نقاشی، آثار اور عمارات کے لوح تعمیر اردو، ہندی  
تلگو اور انگریزی میں عبارتوں کی تراش و انگریزنگ، جگلوں کالونیوں اور  
گھروں کی ماڈرن سماوٹ کے لیے ایک بار  
ہم سے مشورہ ضرور کیجیے

محمد منظور احمد

## پروفیسر سید علی اکبر - چند یادیں چند باتیں

شخصیت کی تسلسل و تعبیر، قوی ارادی، قوتِ غلبہ، عزیمت اور مستقل مزاجی کا کرشمہ ہے۔ نابہاد زندگی مومنوں کی حالات و حالات کے تقاضے سے شخصی خصوصیات اور جذبات کی بخشش و عطا میں ہمیشہ فاضل رہی ہے۔ بہتر طور پر اس کے اہل ہوں سے کوئی قابل ہو تو ہم شال کئی دے رہے ہیں

دعوتِ نے والے کو دنیا بھی می دے رہے ہیں

اجال نے سجا طور پر کہا تھا کہ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے، اس لیے اگر آزادی ہر وقت بیدار ہو جائے اور زندگی جیسی نعمت غیر متہ سے ہنر طور پر استعداد کی کوشش کرے تو سماج میں نہ صرف وہ خود اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے بلکہ جہ مسلسل سے انسانی سماج کی خدمت بھی انجام دے سکتا ہے۔

پروفیسر سید علی اکبر سابق صدر ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی زندگی اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار سے عبارت ہے۔ انھیں دیکھنے اور جاننے کے بعد کوئی شخص بھی انسانیت کی لغت اور تالیف سے انھیں نہیں ہو سکتا۔ یہ بات بلا تامل کہوں گا کہ پروفیسر سید علی اکبر کی شالی زندگی موجودہ بے لگام ترقی پسندی کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔

صحت مند علی، ادبی اور سماجی مصروفیات کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا سائنس کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کے بغیر

مومن طریقہ سے مسلسل مستقل طور پر کام کیے جانے والے پروفیسر صاحب کا امتیازی وصف رہا ہے۔

خاب پروفیسر سید علی اکبر کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب وہ ممبئی میں تعلیم کے لیے شہر سے گورنمنٹ ہل سکول کاچی گورنمنٹ کے معائنہ کے لیے تشریف لائے تھے۔ مرحوم عبدالسلام خاں سابق الیکٹرک ڈپلوماسٹ آف ایس کے والد ناب عبدالوہاب اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اسکول کی عمارت دو منزلہ اور ڈاکٹر عبدالغنی کی ملکیت تھی میں اس وقت ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ سال ۱۹۴۷ء یعنی آٹھ سے نوئی (۱۹۵۰) سال قبل

ہو گیا ہے۔

مجموعہ ۲۵ سال میں اصول تعلیم طریقہ تعلیم ذہنی نصاب تعلیم، طالب علم، استاد، صدر مدرس اور تعلیمات کے علی ہدیار حکومت کی مشنری کے ادنیٰ اور اعلیٰ کل پڑھوں میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں اور بعض نایاب افسانوں کے قسم کے میٹر آئے مگر شہر تین دہوں میں تعلیم کے میدان میں شکست و ریخت کی کارم بازار

زیادہ رہی۔ مثالی طالب علم اور مثالی استاد اب خال خال نظر آتے ہیں۔ پرفیسر سید علی اکبر نے اس دور میں بھی فرائض ادا کرنے میں ہمیشہ اپنے اعلیٰ معیار کو قائم و برقرار رکھا۔ حالانکہ موجودہ فضا اور ماحول میں مستقل کرنے پر مبنی اور گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔

تعلیمات کے اعلیٰ عہدیدار کے کسی اسکول کے معائنے کے لیے آنے کو ہماری طالب علمی کے دور میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ عہدیدار تعلیمات بھی پوری دلچسپی اور اہتمام سے اسکول کی ہر کلاس کا معائنہ کرتے، اور معائنہ کے بعد ایسی رپورٹ کی ایک کاپی لازمی طور پر اسکول کے صدر مدرس کے نام ارسال کرتے تاکہ وہ اپنے اسکول کے اساتذہ کی مثبت نگ طلب کر کے اس رپورٹ پر غور کرے اور رپورٹ میں تحریر کردہ بہ امتیاز اور مشورہ پر فائدہ لے کر اسے اور اساتذہ کو اس پر عمل کرنے کا پابند کر دے۔

ہمارے مڈل اسکول کے معائنہ کے سلسلے میں پرفیسر سید علی اکبر کے تشریف لانے کی اطلاع، ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے مئی ۱۹۷۱ء میں سیکرٹری تعلیم، اساتذہ صدر مدرس اور اسکول کے ذمہ دار کا پورا احاطہ کیا۔ یہ جیسے ہی اس نے اسے جانتا تھا، اسے اس وقت کے اسکول کی مضافات میں ایک سنیسی سی دوڑ گئی۔ ہر طالب علم یہی سوچ رہا تھا کہ نہ جانے ماری کلاس میں کس طالب علم سے سوال ہو جائے گا۔ سوچے جائیں گے۔ موالا کس مضمون میں غفلت ہوئی گئی اور معائنہ کے وقت ہماری کلاس میں کس مضمون کا پریڈیٹن رہا ہو گا۔ میں نے سوچا کہ مارچ، جغرافیہ، شہریت، سائنس، دینیات و اخلاقیات بارز و صے مضافات میں سے کوئی مضمون ہو تو مجھے جوابات دینے میں سہولت اور دلچسپی ہوگی۔ دل ہی دل میں یہ دعا بھی ہوئی کہ خدا کرے کہ ریاضی کا پریڈیٹن ہو، کیونکہ اس میں ایسا ٹیو، ڈریل فیسہ کا تھا۔ بلکہ سچ پوچھتے تو چلتا ہی نہ تھا۔

ادھر اساتذہ کے چہرے سندھ کی سطح کے سکول کا منظر پیش کر رہے تھے، اور وہ اپنے اپنے مضامین میں طلباء کو دینی المقدور بنایا کر دے رہے تھے۔ قاعدہ ریفرنس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس طرح معائنہ کی تاریخ آتے آتے ہر صبح میں تمام مضامین کا بڑی عمدگی اور سلیقہ سے اعادہ ہونا رہا۔ طالب علموں میں مسابقت کے جذبہ نے زندگی کی ہر دھڑادی ان ساریوں کے لیے ہر طالب علم کو بہ تمنائیں کہ سوالان سب سے پہلے اسی سے شروع ہوں۔ تشریف و اجازت جواب دہی میں پہل دی کرے گا۔ اس طرح اپنی کلاس، اپنے مدرسہ، اپنے استاد، اپنے صدر مدرس اور اپنے والدین کا نام روشن کرے گا۔ ہر کلاس کے باہر کے ذریعہ تمام مضامین کی ہوم ورک کی کاپیاں جمع کر کے سلیقہ سے رکھ دی گئیں۔ بالآخر ضابطہ کے معائنہ کا دن اور وقت آن پہنچا۔ طالب علم صاف ستھرے لباس میں ٹائم ٹیبل (نظام الاوقات) کے مطابق کما میں اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے مقررہ وقت سے دس منٹ قبل اپنی اپنی جانت میں حاضر تھے۔ پورے اسکول میں ٹکمل خاموشی تھی۔ البتہ سب کے دل سینوں میں دھڑک رہے تھے۔ معائنہ کی یہ گم دی گویا محشر کی گم دی تھی اور ہم سب عرصہ محشر میں تھے۔ اور ہمارے اعمال کے دفتر چند منٹ میں پیش کیے جانے والے تھے۔ بالآخر چہرہ اسی نے اطلاع دی کہ پرفیسر سید علی اکبر صاحب تشریف لائے ہیں۔

لیے کل چکے ہیں۔ ہمارے طالب علمی کے دور کی یہ روایت تھی اور طلباء سے اپنا فرض سمجھتے تھے کہ کلاس میں پھر صدر مدرس یا کوئی اعلیٰ نمیدار داخل ہوتا اور اُترا تا کہ پڑے ہو جائیں چنانچہ ہماری کلاس میں جیسے ہی صدر مدرس صاحب کے ساتھ جاتا ہر فیسر بدلی اکبر داخل ہوتے ہم سب طلباء متاثر ہو گئے۔ اس کے بعد جہاں محترم نے ہم سب سے کہا کہ بیٹھ جائیے طلباء بیٹھ گئے۔ معائنہ شروع ہوا، ہم درک کی کاپیاں دیکھی گئیں۔ مقررہ نصاب کے بارے میں متعلقہ مدرس صاحب سے سوالات کیے گئے۔ ختم شدہ اور ختم شدنی نصاب کی جانچ کی گئی۔ حاضری کارڈ پڑھ کر دیکھا گیا۔ انکم ٹیل کے مطابق مصموں سے متعلق جذبہ طلباء سے سوالات کیے گئے۔

پروفیسر بدلی اکبر کا پُر وقتا چہرہ ہم سب کی توجہ کام کر رہا تھا۔ اب مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ کس قسم کے سوالات کیے گئے۔ البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ مجھ سے کوئی سوال پوچھا نہ گیا۔ مجھ جیسے بعض اور طالب علم بھی تھے جو اضطرابِ استنباط کے ساتھ سوالات کے غلط جواب دے رہے۔ معائنہ کے ختم ہونے تک تمام طالب علموں پر برزخ کی کسی کیف طاری رہی۔ لیکن ہم سب کے لیے یہ بات باعث مسرت تھی کہ معائنہ الطبعان بخش رہا، اور معائنہ کنندہ خدیدا رک زراں سے تعریف و تحسین کے الفاظ سننے کا ہمیں موقع ملا۔ ان کے کلاس سے باہر تشریف لے جاتے ہی ہمارے مدرس صاحب نے طالب علموں کی ذہانت، مستعدی اور حاضر جوابی کی تعریف کی۔ اسکول کے معائنہ کے اہتمام پر صدر مدرس کی طرف سے تعطیل کے اعلان نے تمام طلباء کی مسرت میں دو گنا اضافہ کر دیا۔

یہ ۴۴ سال قبل کی باتیں ہیں اور آج ایسی ہیں جیسے خواب کی مانند۔ اب زدہ طالب علم رہے اور وہ استاد کس کس سلاٹم کریں اس کس کو رڈیں اور کب تک؟

ہر دور کے رونے کو کہاں سے جگر آئے؟

تعلیم اب عام ہو گئی ہے، حصولِ تعلیم کے سلسلے میں ہر طرح کی سہولتیں پیدا کرنے کے اخلاقیات ہونے رہتے ہیں۔ لیکن تحصیلِ علم کا شوق مازار کی کوئی مجلس تو نہیں کہ اُسے فرید کر جہاں کر دیا جائے۔

جناب پروفیسر بدلی اکبر، علم کا حقیقہ ہیں۔ ان کی شخصیت آج کے طالب علم، اور استاد کے لیے مینارِ نور ہے۔

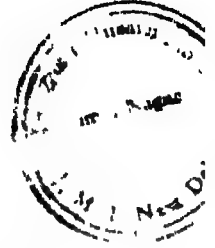
کاش! یہ مینارِ نور، طالب علم اور استاد سب کام کر لیں ہو جائے اور کتاب و فیضِ علم کا بحرِ علوم جذبہ صحیح معنوں میں عام ہو جائے۔





# سید کاظم

## پروفیسر علی اکبر: ماہر تعلیم



(پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں مسعودہ جلیہ منیت مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

(ابوال اردو) میں کی گئی ہے۔

آج ہم اس لیے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ ریاست جبراً باد میں تعلیم کی ترقی و توسیع کے سلسلے میں سید علی اکبر صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں فراح تحسین پیش کریں۔

علی اکبر صاحب نے ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ جبراً باد اور لکھنؤ کالج بمبئی میں حاصل کی بعد ازاں انھوں نے انجمن جاکر کیم جیو سنورٹی سے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں سے لوٹنے پر نظام کالج میں ان کا تقرر عمل میں آیا۔ کچھ عرصہ بعد محکمہ تعلیمات نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور انھیں پرنسپل انیسٹر آف اسکول کی حیثیت سے جاکر کیم جیو گیا بعد ازاں وہ تبدیل ہو کر جبراً باد آ گئے۔ جبراً باد پرنسپل میں وہ مدارس بھی شامل تھے جو سکندرا پور کنوینٹ اور ریڈ ڈنسی کے برطانوی زیر انتظام علاقوں میں واقع تھے۔ سہرا اس مسعود نے جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے جبراً باد میں تعلیمی اداروں کو ترقی دینے اور ان کی تنظیم جدید کے سلسلے میں علی اکبر صاحب کی خدمات کی یہ مدت اس کی ریڈ ڈنسی کی طرف سے برطانوی زیر انتظام علاقوں میں ان کی تعلیمی خدمات کو سراہتے ہوئے اظہار تشکر کیا گیا۔

اپنے پیشے سے اساتذہ کی دل بستگی میں اضافہ کرنے کی غرض سے علی اکبر صاحب نے پھر اس اسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور ایک ڈول سانی (انگریزی اردو) مجلہ "جبراً باد پتھر" کے نام سے جاری کیا۔

محکمہ تعلیمات میں انہی تیس سالہ ملازمت کے دوران میں مختلف عہدوں پر فائز رہے اور مختلف قسم کی ذمہ داریاں ان کے سپرد رہیں۔ بورڈ آف ایجوکیشن کے سکیٹری رہے۔ پھر اسپیشل افسر بنائے گئے بعد ازاں فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے جہاں انھوں نے اساسی نوعیت کے اہم کام انجام دینے ناظم تعلیمات کے عہدے پر ترقی پانے سے دو سال قبل وہ نظام کالج کے پرنسپل بنائے گئے وہ جہاں بھی گئے انھوں نے تعلیم کے جمہوری اصولوں کو فروغ دیا۔

علی اکبر صاحب، ۱۹۴۷ء میں ناظم تعلیمات کی حیثیت سے سکندرشہ ہوئے لیکن ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی غرض سے ان کو بار بار موبریکیا اور وہ جبراً باد یونٹ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس خدمت پر وہ ۱۹۵۳ء تک فائز رہے۔ یہاں سے ریٹائر ہوئے تو انوار العلوم کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کی خدمات

حاصل کی گئیں۔ انھوں نے اس کالج کو معمولی حالت سے اٹھا کر اسے ریاست کا بڑا تعلیمی مرکز بنادیا۔  
 علی اکبر صاحب عظیم ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ انگریزی اور اردو کے مصنف کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں  
 نے جرمنی کے مدارس اور تعلیمی نظام کا مطالعہ کیا اور ایک کتاب **THE GERMAN SCHOOL SYSTEM**  
 کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ایجوکیشنل سلیٹ لندن نے لکھا کہ یہ جرمنی کی مابعد جنگ تعلیمی  
 اصلاحات کا ماہرانہ اور مستند جائزہ ہے۔ علی اکبر صاحب کی اردو تصانیف میں میسر میں اردو تعلیم، ورنہ نیاب برکھوور کی  
 کتاب **KNOW YOUR OWN MIND** کا ترجمہ قابل ذکر ہیں۔

اس تمام عرصے میں وہ اسلامک کلچر بورڈ کے نائب صدر کی حیثیت سے اسلامک کلچر میگزین کے نگران رہے اس  
 کے علاوہ ادارہ ادبیات اردو کے صدر کی حیثیت سے اس کے علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں کی رہنمائی کرتے رہے۔  
 وہ اب بھی علمی اور تعلیمی میدان میں سرگرم عمل ہیں اور اپنی پیرائہ سالی کے باوجود جب کبھی کوئی علمی ادبی  
 با تعلیمی ادارہ آپ سے مسادرت کا خواہاں ہوتا ہے تو آپ بخوشی اس کے لیے ایذا دقت دیتے ہیں۔  
 ایک قابل ایڈمنسٹریٹر، بلند پایہ عالم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے علی اکبر صاحب کی شہرت مسلمہ ہو چکی ہے۔ وہ اپنی  
 شرافت طبع کی وجہ سے عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ نہایت خلیق اور متواضع انسان ہیں اور ہر ایک  
 کی مصلحت مدد فرماتے ہیں۔

جناب والا! میں اسلامک کلچر میگزین کی جانب سے آپ کی ان خدمات کے لیے جو آغاز سے لے کر اب  
 تک اس رسالے کی ترقی کے لیے آپ نے انجام دیں بدیہ تشکر پیش کرتا ہوں۔  
 اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ ہر لمحہ آپ کی سرپرستی اور رہنمائی میں یہ رسالہ پروان  
 چڑھتا رہے۔ آمین۔



تصویری اور شاعری ص ۷۷ آگے

ریا ہا نہ ہوتا تو آج کی نسل میں شاید وہ رومانی اور اخلاقی قدیریں بھی نہ ہوتیں جو ہیں۔ اگر آج کا  
 دور، نثر اور نوا اپنے ورثے کو پہچانے، اس گنج گراں مایہ کی قدر کرے اور ان بے بہا جواہر پاروں  
 سے استفادہ کرے تو یہ ہمارے کئی رومانی اور اخلاقی امراض کا علاج اور کمی دردوں کا درماں  
 ہو گا اور اس سے ایک صالح معاشرے کی تشکیل میں امانت ہو گی۔ دیکھیں یہ خواب کب  
 حقیقت بن جائے، کب اپنی منزل کو پا رہے؟

پروفیسر عسکری اکبر

# سابق ریاست حیدرآباد میں تعلیم



انیسویں صدی کے وسط تک ریاست حیدرآباد میں تعلیم کی اتنا عکس حکومت کے دائرہ عمل میں شامل نہیں تھی اور تعلیم کے لیے نہیں لیا گیا کہ نا غائی اداروں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ حکومت کی جانب سے رعایا کی تعلیم کا انتظام اولاً ریاست کے پرنس، دوسرا نائیس اور روس الخال مدارالہام سکول لاہور نے ۱۸۵۳ء میں مدرسہ دارالعلوم قائم کیا جس میں اسی مشرقیہ تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ ۱۸۵۹ء میں عوام کی تعلیم کے لیے ہر نقطہ میں دو مدارس کھولے گئے۔ ایک فارسی اور دوسرا ملاقاتی زبان میں تعلیم کے لیے۔ ۱۸۶۱ء میں سررشتہ تعلیمات کا قیام عمل میں آیا۔ مدرسہ ویکٹریس میں اعلیٰ تعلیمات تھے۔ ۱۸۶۱ء میں نواب غدار الملک اس عہدہ پر مقرر کیے گئے اور ۱۸۶۲ء میں اس کی اسکول کھولے گئے۔ لڑکوں کے لیے اور لڑکیوں کے لیے تھے۔ ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۷ء کے درمیان بلوچہ حیدرآباد میں شہابی اسکول چادرگھاٹ ہائی اسکول اور ادرا رنگ آباد اور جگر گس آب آب آب ہائی اسکول قائم کیا گیا۔ بلوچہ حیدرآباد میں جس جنازہ ادوی انگلش ہائی اسکول پہلے ہی سے موجود تھے یعنی سینٹ جارجز اسکول، آل سینٹس ہائی اسکول اور محبوب کالج سکندر آباد۔ ۱۸۶۵ء میں مدرسہ عالیہ کی بنیاد پڑی۔ اسی سال چادرگھاٹ ہائی اسکول کو سکندر گریڈ کالج کا درجہ دے کر اس کو حیدرآباد کالج کے نام سے موسوم کیا گیا اور مدرسہ سہجی نائیدو کے والد اکرم گھوڑا تختہ چڑھا دیا۔ اس کا نیپیل مقرر کیا گیا اور ۱۸۶۵ء میں یہ کالج مدراس یونیورسٹی کا سلسلہ فرسٹ گریڈ کالج بن گیا۔ ۱۸۶۵ء میں چادرگھاٹ ہائی اسکول کی کالج کی جائیداد کو مدرسہ عالیہ میں منتقل کیا جا کر اس کالج کو نظام کالج کا نام دیا گیا۔

۱۸۶۸ء میں برصغیر کے لیے ایک ناظر تعلیمات اور ۱۸۶۸ء میں ہر صوبہ کے لیے ایک مہتمم تعلیمات مقرر کیا گیا۔ ۱۸۶۹ء میں تختہ مارکس کے مدرسین کی ٹریننگ کے لیے بلوچہ حیدرآباد میں ایک گورنمنٹ مارشل اسکول کا افتتاح کیا گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں بلوچہ حیدرآباد میں آب آب آبجینرنگ اسکول، ایک میڈیکل اسکول قائم تھا۔ ۱۸۶۹ء میں اس کی زبان اسکول قائم ہوا۔ اس سے پہلے لڑکیوں کے لیے کوئی ثانوی مدرسہ نہیں تھا۔ ۱۸۶۹ء میں اس کو ہائی اسکول کا درجہ دیا گیا۔ اسی سال محبوبہ گریڈ ہائی اسکول کا افتتاح ہوا۔ اس مدرسہ میں کالج گورنمنٹ لڑکیوں کے ٹیچنگ امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے اٹھارہ سال پہلے کے چارہاٹ

اور بورڈ میں معلومات امور کی جاتی تھیں۔

۱۹۱۸ء میں جب اعلیٰ حضرت میرٹھان علی خاں تخت نشین ہوئے تو اس وقت ریاست میں اعلیٰ تعلیم کے وزارت اہل حقہ نظام کالج جو مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھا (اور جس میں ۱۵۳ طلبہ زیر تعلیم تھے) اور دارالعلوم جہاں طلبہ کو پنجاب یونیورسٹی کے السنہ شریفہ کے امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ ثانوی مدارس کی تعداد ۸۰ تھی جس میں ۱۶۳۲۶ طلبہ زیر تعلیم تھے اور مدارس تختانبہ کی تعداد ۹۲۱ تھی اور ان میں طلبہ کی تعداد ۱۱۳۸۸ تھی تعلیم پر ریاست ۴ لاکھ روپے صرف کرتی تھی۔ نواب محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کے دور حکومت میں ہی تعلیم کی بہت حالت کو محسوس کر کے ۱۹۱۸ء ایک ماہر تعلیم مٹر میسور کی خدمات دو سال کے لیے مستعار کی گئیں تاکہ وہ ریاست کی تعلیمی حالت کا جائزہ لے کر رپورٹ مہرب کرے اور تعلیمی توسیع اور اصلاح کے لیے سفارشات پیش کرے۔

مٹر میسور نے اپنی رپورٹ ۱۹۱۸ء کے آخر میں پیش کی۔ ان کی سفارشات کی بناء پر ہر ضلع کے لیے ایک ہتھم تعلیمات اور انکسپیکٹ ہائی اسکولوں کے لیے ایک ڈیپ آفیسر اور مدارس سوال کے لیے ایک ہتھم کا تقرر کیا گیا۔ مٹر میسور نے سختی ختم کی توسیع کی جو اسکیم پیش کی اس میں غل کیے جانے کے بعد مدارس تختانبہ کی تعداد جو ۱۹۱۵ء میں ۱۹۲۳ء تک ۱۹۲۱ء میں تقریباً چار ہزار ایک سو بیس کنی اور ان مدارس میں طلبہ کی تعداد ۶۰۰۰ سے بڑھ کر دو لاکھ ایک سو بیس کنی ۱۹۲۲ء میں حضور نظام کے فرائض کے دربارہ مدارس تختانبہ میں طلبہ کی فیس معاف کر دی گئی بلکہ ان کے مدارس کی تعداد ۱۹۱۸ء میں صرف ۹۰ تھی ۱۹۲۲ء تک سال کی تعداد ۸۵۰ تک بڑھ گئی۔ تعلیم مسائل میں سب سے بڑی رکاوٹ ٹرینڈ معلمات کی کمی تھی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے دوران جو بابا ذوق گل اور کاک آباد اور گلہ گرس ایک ایک ٹریننگ اسکول قائم کیا گیا۔ ذکر کر کے لے گو رنمنٹ نارمل اسکول حیدر آباد کے علاوہ گلہ گراور وگل میں بھی ایک ایک ایک ٹریننگ اسکول قائم کیا گیا۔

۱۹۱۸ء میں امتحان مدراس ٹبرک سے جو فہر معقول ہمارا سب سے انکسپیکٹ ہائی اسکولوں میں ....

..... امتحان ہائی اسکول لیزنگ سرٹیفکیٹ راج کیا گیا جس کا وجہ ان مدارس کو ترقی

دینے میں کافی مدد ملی۔ اسی اثنا میں پنجاب یونیورسٹی سے دارالعلوم کا الحاق ختم ہو گیا اور سررستہ تعلیمات کے السنہ شریفہ کے امتحانات کی ترویج عمل میں آئی۔ مدارس فوفا نبرہ جہاں سررستہ کے امتحانات مسنی و مولوی کے لیے طلبہ کی یاد کیا جاتا تھا کامیاب ثابت نہیں ہو رہے تھے۔ اس لیے ۱۹۱۵ء میں بھرتیس مدارس فوفا نبرہ کے باقی کو مڈل اسکولوں میں تبدیل کیا گیا۔ ۱۹۱۵ء اور ۱۹۲۳ء کے درمیان ۸ ثانوی مدارس کا اضافہ کیا گیا۔ ثانوی مدارس میں طلبہ کی تعداد میں ۵۰ کی بیشی ہوئی ۱۹۱۵ء میں ہر صوبہ میں ایک صدر ہتھم تعلیم کا تقرر کیا گیا اور ہتھم تعلیمات کی جائیداد کو صدر ہتھم تعلیمات کی جائیداد قرار دیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں جاگیر داروں کے لڑکوں کے لیے جاگیر دار کالج کے ایک سے ایک اتقامتی ہائی اسکول قائم کیا گیا جس میں کمیونٹ لوکل سرٹیفکیٹ کے امتحانات کا افسانہ رائج کیا گیا۔

اس برس چھ گاہ کے اخراجات کے لیے جاگیرداروں سے ان کی جاگہری آمدنی کے تناسب کے لحاظ سے حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ اٹنی پوئیں میں ریاست کے انضمام کے بعد جاگیردار کالج کو ایک پبلک سکول بنا دیا گیا۔

۱۹۱۵ء میں جامعہ عثمانیہ کی تاسیس سے ریاست جہڑ آباد میں تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ ہندو سال میں اپنی بوجہت کی پہلی یونیورسٹی تھی۔ ایک عرض داشت میں جس کو معتمد تعلیمات وقت مسٹر جیدی نے (جو بعد میں راسٹ آئین بل سے راکھ جہڑتی ہوئے) پیش چھ خسر دی میں گزرائی اور ان دشواریوں کا ذکر کیا گیا جو طلبہ کو ایک مذہبی رہاں کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے میں پیش آتی ہیں۔

ان دستوروں کے منظر جامعہ عثمانیہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا جو سرکاری زبان ہونے کے علاوہ ریاست میں نام طبر پر پولی اور سبھی حافی بھی لکھن اس کے ساتھ انگریزی بطور زبان لازمی قرار دی گئی۔ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس میں سر راکھ جیدی کے علاوہ لو اب سعید جنگ (بعد میں سر اس سعید) ناظم تعلیمات وقت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ لسانی مضامین میں نصاب کی کتابوں کی تیار کی لیے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کا پہلا امتحان مئی ۱۹۱۵ء میں منعقد ہوا۔ اور ۱۹۱۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج کا افتتاح ہوا۔ امتحان انٹر میڈیٹ پہلی دفعہ ۱۹۱۶ء میں منعقد ہوا۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیان ایک کالج قائم کیا گیا اور سٹی ہائی اسکول، زنانہ ہائی اسکول، اور گاہ آباد ہائی اسکول اور دیگر سکول ۱۹۲۳ء میں کھلے۔ ہائی اسکول کو بھی انٹر میڈیٹ کالج کا درجہ دیا گیا۔ ایک سال بعد ہائی زنانہ انٹر میڈیٹ کالج کو دیگر کالج کا درجہ دیا گیا اور اسکول یونیورسٹی کالج برائے امات کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ہائی اسکول کی حقیقت دوبارہ اب ہائی اسکول کی ہو گئی۔ ۱۹۲۶ء میں میڈیکل اسکول کے بجائے جہاں اسٹنٹ سرجن اور سب اسٹنٹ سرجن کی عایدادوں کے لیے طلبہ کو تیار کیا جاتا تھا۔ ایک میڈیکل کالج قائم کیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں بھنگ کالج اور بھنگریٹ کالج اور چند سال بعد انگریز کالج اور دیگر بھنگری کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۲۹ء میں اعلیٰ حضرت میونسپلٹی علی خاں مہار نے آرٹس کالج کی شاندار عمارت کا افتتاح کیا جو ہندو اور مسلم فن تعمیر کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے اور جس کی تعمیر پر ڈیڑھ کروڑ روپے کے مصارف چائے ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں اے ایڈنی اسٹنٹ اور اس کے بعد سائنس کالج اور بھنگریٹ کالج کی عمارتوں کی تعمیر مکمل کی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں پرنسپل آرٹس کالج کے ایک پرنسپل جاسنلر کی جائیداد منظر پر آئی۔ ۱۹۳۵ء میں بجائے پرووائس چانسلر کے ایک ہمہ وقتی وائس چانسلر کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت تک صد المہام تعلیمات بہ حیثیت عہدہ وائس چانسلر بھی ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کا آغاز ایک کالج اور ۱۲۹ طلبہ سے ہوا تھا۔ ۱۹۳۷ء تک کالجوں کی تعداد ۲۹، اور طلبہ کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

میں

عثمانیہ یونیورسٹی کے دوش بدوش نظام کالج بھی ترقی کرتا رہا۔ اس کالج میں طلبہ کی تعداد جو ۱۹۲۱ء

۳۔ تھی ۱۹۲۷ء میں... ایک ٹرہو گئی۔ اسی دوران مدارس یونیورسٹی کے امتحانات میں خراج بھی اچھے برآمد ہوتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں سائینس کے لیے ایک علیحدہ غارت کی تعمیر مکمل ہوئی۔

۱۹۲۷ء میں بی۔ اے آنرز کی جانچوں کا آغاز ہوا، اور اس کے پندرہ سال بعد مدراس یونیورسٹی کی نظری سے ایم۔ اے کی تعلیم شروع کی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں مدراس یونیورسٹی سے نظام کالج کا الحاق ختم ہو گیا اور کالج میں انگریزی ذریعہ تعلیم کو برقرار رکھتے ہوئے اس کو خزانہ یونیورسٹی کا ایک اسوسی ایٹڈ کالج قرار دیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام کے ساتھ جاہانی اور ثانوی تعلیم کے اخراجات میں قابل الحاق بنی ہوئی اور پرائمری تعلیم کی توسیع میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان صرف ۲۹۱ جدید پرائمری اسکول کھولے گئے۔

۱۹۳۷ء میں جب کہ ثانوی تعلیم پر تقریباً اکتیس لاکھ اور جامعی تعلیم پر تقریباً سو اسی لاکھ روپے کے اخراجات عائد ہوئے۔ پرائمری تعلیم پر صرف چوبیس لاکھ روپے صرف کیے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں پرائمری تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے حکومت نے ایسی پالیسی بدل دی اور ۱۹۴۷ء میں پرائمری تعلیم کی توسیع کے لیے ایک سو سالہ اسکیم کی منظوری دی اس اسکیم کے تحت لوکل فنڈ کے مدارس کو جن میں کم واجب مدرسین مامور تھے اور جن کی کارکردگی غیر اطمینان بخش تھی سرکاری مدارس کی جنب دی گئی اور حکومت نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ پرائمری تعلیم کی توسیع اور اصلاح کی ذمہ داری خود سرکار پر رہے گا اور لوکل فنڈ کی آمدنی تعمیر مکہ، فراہمی فریجنر ڈالاب یہ صرف کی جائے گی اور سو سالہ پروگرام کی بدولت پرائمری مدارس کی تعداد جو ۱۹۳۵ء میں ۲۰۵۲ تھی ۱۹۴۳ء میں ۵۳۷۵ ہو گئی اور طلبہ کی تعداد

۲۹،۸۰۰ سے بڑھ کر ۳۲،۲۵۰ ہو گئی اور اس دوران پرائمری تعلیم کے اخراجات میں تقریباً ۱۱ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا۔ پرائمری تعلیم کی اصلاح کے سلسلے میں جلسہ سرکاری بک مدرسہ مدارس کو دو مدرسہ مدارس میں تبدیل کیا گیا۔ ۱۹۴۳ء میں بھارتی ترقی تعلیم کا ایک ۱۲ سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس کے نفاذ کے بعد پرائمری تعلیم کی ترقی کی رفتار اور بھی زیادہ تیز ہو گئی۔ دو سال کی قلیل مدت میں پرائمری مدارس کی تعداد میں ۵۰۶، اور طلبہ کی تعداد میں تقریباً ۳۸ کی بڑھوتری ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں تین سو دس ہزار اسکول کیٹیاں ترتیب دی گئیں جن کا کام یہ تھا کہ مستعلقہ کاؤں میں طلبہ نامہ نوی کی نگرانی کریں اور والدین کو ترغیب دیں کہ پرائمری نصاب کی تکمیل تک اپنے بچوں کو مدرسہ ترک نہ کرنے دیں جو ۱۹۴۷ء میں چھ سال سے گیارہ سال کی عمر کے لڑکیوں کے لیے ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا۔ بشمول جید آباد جو پرائمری قبول اور چار منتخب جمعی قیام کے لیے لائن سے پہلے سال جاری تعلیم کی عمر ۶ سال مقرر کی گئی تھی اور لازمی تعلیم کی اسکیم کے نفاذ کے لیے حکومت نے اس لاکھ روپے کی متوالی رقم منظور کی اور طلبہ کو نصابی علم اور کامیابانہ اہم کرنے کے لیے ۳۵ لاکھ روپوں کی غیر متوالی رقم منظور کی گئی۔

چھ سالہ توسیع تعلیم کی اسکیم کے تحت لڑکیوں کے لیے تقریباً ستائیس سو پرائمری اسکول کھولے گئے۔ لیکن اس کے باوجود ۱۹۴۷ء میں مدارس نسواں کی تعداد نہ سو سے بھی کم تھی جن میں کم و بیش ۵۰ ہزار طالبات





پروفیسر عسکری اکبر

## تعلیم اور فرقہ وارانہ میل ملاپ

عمر جدید میں بعض ممالک جیسے روس اور ترکی نے جو ترقی کی ہے اس سے ہندوستان کو ایک بڑا سبق مل سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی ملک کے باشندے متحد ہو کر اپنی حالت کو درست کرنے کا ہتھ کر لیں تو پھر پورے میں ہنس بلکہ جدیدی سال میں وہ ترقی کے میدان میں کہاں سے کہاں بھیج سکتے ہیں ہندوستانیوں میں نہ اتفاق ہے نہ اتحاد ہے ارے ارادے کی قوت ہمارے آپس کے اختلافات اس درجہ بڑھ گئے ہیں کہ بہت سے وطن پرست ہندو اور مسلمان تائیدین جنہوں نے ہندوستانیوں کو ایک قوم بنانے کی کوشش میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا تھا وہ بھی اب اس سے مایوس ہو چکے ہیں لیکن گنہگار ہندوستان کی سیاسی کمزوری کا حل پاکستان ہی ہو سکتا ہے تو پھر بھی ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت رہی رہے گی، کیونکہ پاکستان کے مجوزہ علاقوں میں جو ہندو ویسے ہوئے ہوں وہ کہیں نہیں ماسکے اور نہ دوسرے علاقہ کے مسلمان یا کسان کو اپنا وطن بنا سکیں گے۔ بہر حال یہ ہندو مسلمانوں سے اور مسلمان ہندوؤں سے جدا ہو سکتے ہیں۔ اسی سرزمین میں ہم سب پیدا ہوئے اور اسی میں ہم کو جیسا مرنا ہے۔ اس سرزمین کی نجات و بہبود ہم سب کا مشترکہ مقصد ہونا چاہیے۔ ہمارا ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ ہم درانی مفاد یا فرقہ وارانہ غرض کے مقابل میں ملک کے اغراض کو مقدم نہ سمجھیں لگیں اور ملک کی نجات و بہبود کے لئے ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

بچوں کو تعلیم اس لئے دی جاتی ہے کہ آئندہ مل کر وہ نہ صرف ان کی ذات بلکہ ملک کے لیے بھی مفید ثابت ہوں۔ اس لیے ان کو ہندوستان کی تربیت دیا ضروری ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قومی قائد اور جب الوطن کی نشوونما میں ان ممالک کے نظام تعلیم کا بڑا حصہ ہے۔ فرقہ وارانہ تعلیمی اداروں سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ قومی اتحاد کی بنیاد ایسی دولت مضبوط ہو سکتی ہے جس کے وہ بچپن میں ہی لگائے جو بڑا ہی نقش بدتر بنا نہ ہو جائے۔ اس لیے سب سے بڑی مہذب اس بات کی بنیاد ہے کہ ہندو اور مسلمان بچوں کو ایک ساتھ پڑھ لکھنے اور کھیلنے کا موقع دیا جائے۔ جس میں خوشگوار اتفاق آپس میں پیدا ہوتے ہیں وہ آگے چل کر بھی قائم رہے ہیں اور اس دورانی اور بنگالنگ سے اس کی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔



فرقہ وارانہ ہم آہنگی بہہ اُکرنے کے لیے محض اوقات مدرس میں ان کا کچا ہونا کافی نہیں ہے۔ مدرسہ کا احوال ایسا ہونا چاہیے کہ طلبہ اسکیل اسپرٹ کی نشوونما ہو سکے اور مدرسہ سے وہ انس اور محبت کرنے لگیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنے اور طلبہ کو شہیت کی تربیت دینے کے لیے زائد از نصاب معارف اسلامیہ اسلامی تعلیمی تفریح اور اسکاؤٹنگ کا اختتام کرنے کی ضرورت ہے۔ ان معارفیات کے ذریعہ سے طلبہ کو ایک دوسرے سے دوستی پیدا کرنے کی کام کرنے اور کسی مشن کے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے اجتماعی کوشش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جب کسی مدرسہ کی فہمائے کرکٹ باہا کی ٹیم کسی دوسری ٹیم کے مقابل میں لڑتی ہے تو وہ ضرور کھیلنے والے لڑکوں بلکہ کھیل دیکھنے والے طلبہ کے دلوں میں بھی مدرسہ کی محبت موجزن رہتی ہے۔ سب بچوں کی ایک ہی آرزو ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان کی ٹیم جیت جائے تاکہ مدرسہ کی شہرت اور رتبہ نامی میں اضافہ ہو۔ طلبہ میں اس قسم کا جوش بہہ اُکرنے کا جب الوطنی کی بنیاد ڈالنا ہے۔ آج کے لڑکے کل شہر ہی نہیں گئے تعلیمی تفریح میں طلبہ آپس میں ملنے جلنے اور ایک دوسرے سے دوستی پیدا کرنے کا جو موقع ملتا ہے وہ مدرسہ میں انھیں نہیں ملتا۔ زائد از نصاب میں معارفیات میں سب سے زیادہ بوائے اسکاؤٹنگ کو حاصل ہے۔ بوائے اسکاؤٹس کے آپس کے تعلقات مزادراہ ہوتے ہیں اور ہر ایک بوائے اسکاؤٹ کو یہ اتراوٹن لڑنا پڑتا ہے کہ وہ ملک کی خدمت کرے گا اور ملالیا نظام قوم و ملت کے ذریعہ کی مدد کرے گا۔ جب کسی بڑے بکے ہندو اور مسلمان اسکاؤٹ کیمپ میں یکجا رہ کر اسکاؤٹنگ کی تربیت حاصل کرنے میں نو وہ آپس میں شیر و شکر بن جاتے ہیں اور ان کو مذہب کے اختلاف کا احساس تک نہیں ہوتا۔ بہر حال مدرسہ میں اتحاد کا سبق اسی وقت کارگر ہو سکتا ہے جب کہ طلبہ کو عمل کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے۔

میں نے نہ صرف یورپ بلکہ مصر میں بھی دیکھا ہے کہ ہر مدرسہ کا اپنا یونیفارم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں جہاں نام طو پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں فرق ہے۔ طلبہ کے لیے یونیفارم کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ مالک محروسہ راجہ عالی کے جن مدارس میں یونیفارم رائج کیا گیا ہے وہاں اس سے طلبہ میں اتحاد اور اسکول اسپرٹ پیدا کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پانے کے ساتھ اگر ہندو اور مسلمان لڑکے ایک ہی دارالافتاء میں پڑھیں تو ان کو باہم دوست بننے کا اور بھی زیادہ موقع مل سکتا ہے۔ دارالافتاء کی دوستی مدرسہ کی دوستی سے بھی زیادہ گہری اور پائیدار ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بہت کم مدارس کے ساتھ دارالافتاء ملتے ہیں اور خانگی کوششوں سے جو دارالافتاء قائم کیے جاتے ہیں وہ عموماً فرقہ واری ہوتے ہیں۔ اگر ہندو اور مسلمان لڑکے ایک ہی مدرسہ میں پڑھیں تو ان کے آپس میں اتحاد کا سبق اسی وقت کارگر ہو سکتا ہے جب کہ طلبہ کو عمل کا زیادہ سے زیادہ موقع دینا چاہیے۔

زبان کے اختلاف کے لحاظ سے بڑش انڈیا اور بعض دیسی ریاستوں میں پرائمری اور مل کی تعلیم کے لیے طلحہ طلحہ مدرسے قائم کیے گئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فرقہ واری مدارس جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینا نہایت ضروری ہے جس مقام پر وہ زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں ایک ہی مدرسہ میں متضاد جماعتیں آسانی سے قائم کی جاسکتی ہیں جس سے اختلافات میں بھی کفایت ہوتی ہے اور دو مختلف زبانیں بولنے والے طلبہ کو یک جا ہونے کا موقع بھی حاصل رہتا ہے۔ ممالک محدود مدرسہ کار مالی میں پرائمری تعلیم کا انتظام اسی طریقہ پر کیا گیا ہے جس طرح پٹواڑی کے مدارس سخانیہ میں اردو اور پٹواری ننگلہ کے مدارس میں اردو اور تلنگی اور کرناٹک کے مدارس میں اردو اور کنڑ کی جامعیں سائنس سمیت قائم کی گئی ہیں۔ لڑکوں کے لیے جنرل ادنیٰ انوی کے اختتام یعنی جماعت ہستم تک ذریعہ تعلیم مادری زبان ہے سرکاری مدارس نسواں و سٹانیہ اور فوقانہ میں پانچویں جماعت سے آٹھویں جماعت تک معالیٰ جماعتیں اسی طرح قائم کی گئی ہیں جس طرح لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس سخانیہ میں قائم ہیں۔ لڑکوں کے لیے جماعت پنجم سے ذریعہ تعلیم انوار دو ہے۔ انگریزی اور چند سال کے بعد ان مدارس میں بھی جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اردو میں تعلیم دی جا کر پھر انہیں لیسے مدارس اگر جا ہیں تو جامعہ کیرج کے امتحانات کے لیے اپنے طلبہ کو تیار کر سکیں گے۔ مختلف فرقوں میں مل ملاپ کے لیے کسی مشترک زبان کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے ملک کی مشترک زبان صرف ہندوستانی ہو سکتی ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے جنم لیا۔ ہندوستانی ممالک خصوصاً میں عام طور پر پولی اور سمجھی جاتی ہے اور ان طلبہ کے لیے جس کی مادری زبان تلنگی، مرہٹی یا کنڑی ہے انگریزی کے مقابلہ میں جو ایک بالکل اجنبی زبان ہے بہت زیادہ آسان اور مانوس ہے۔

نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ ایک طرف تو وہ مختلف فرقوں کی ضروریات کو پورا کرے اور دوسری طرف ان میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرے۔ ہندو اور مسلمان طلباء میں یکجا ٹکٹ پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سیکھیں۔ لہجہ میں دو زبانیں رائج ہیں فلمیش اور فرانسیسی لیکن ہر مدرسہ میں دونوں زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جن طلبہ کی مادری زبان فرانسیسی ہے ان کے لیے ذریعہ تعلیم فرانسیسی ہے لیکن فلمیش طلبہ زبان دوم پڑھنا لازمی ہے اسی طرح جس لڑکوں کی مادری زبان فلمیش ہے وہ فرانسیسی بطور زبان دوم کے پڑھتے ہیں۔ ممالک مدرسہ سرکار مالی میں ہندو لڑکوں کو ناصت دوم سے اردو بطور زبان دوم پڑھنا پڑتا ہے۔

چند سال پہلے مسلمان لڑکوں کی زبان دوم فارسی ہوا کرتی تھی لیکن جدید نصاب کے لحاظ سے ان کے لیے جماعت دوم سے مقامی ملکی زبان کا بطور زبان دوم پڑھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ شہری انہوں میں صرف ان لڑکوں کو جماعت دوم سے فارسی یا جماعت سوم سے عربی پڑھنے کی اجازت

دی گئی ہے جو آئندہ چل کر ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں اور ثانوی منزل میں فارسی یا عربی اختیار کرنا چاہتے ہوں۔ نیز ستہ جاری پانچ سہل سے سرستہ تعلیمات مسلسل اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ طلبہ سنیہ میں وہ لڑکے جس کی مادری زبان اردو ہے معامی ملی زبان پچھیت زبان دوم پڑھیں اور اس میں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ بعض دینی ریاستوں اور پریس انڈیا کے ان حصوں میں جہاں ہندو اور مسلمان الگ الگ زبان بولتے ہیں۔ نہ ہندو لڑکوں کو اردو اور نہ مسلمان لڑکوں کو مقامی زبان سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ہندو اور مسلمان طلبہ کے علیحدہ مدارس میں تعلیم لانے اور ایک دوسرے کی زبان سے واقف رہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ممالک محدود سہ کار عالی کے معاملہ میں ان علاقوں کے ہندو اور مسلمانوں میں زیادہ اجنبیت ہے۔

تعلیمی کتابوں کے انتخاب میں طبعی اہمیت کی ضرورت ہے۔ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی خاص طور پر اس بات کی جہاں میں کرتا ہے کہ کسی درسی کتاب میں ایک جملہ سنی ایسا نہ ہو جس میں مذہب بافرقیہ اس کے پڑھنے پر کسی قسم کا سنی حملہ ہو جو درسی کتاب میں سررشتہ کی تحریفی میں یا کرانی گئی ہیں مثلاً انھیں ترقی اردو کی اردو کتابوں کا سلسلہ ان میں ایسے سنی مسائل کے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے ہندو اور مسلمان طلبہ کو ایک دوسرے کے کلمہ سے واقف کرانا چاہئے۔ سررشتہ تعلیمات نے حاجت سوم سے حاجت پنجم تک طلبہ کے لیے تاریخ کی جو حد کتابیں بنا کر دی ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ان کتابوں کو نہایت دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی زبان بھی نہایت سہل و سادہ ہے۔

(۲) تاریخی واقعات نہایت صحیح سے درج کیے گئے ہیں۔

(۳) تاریخ ہند کے سماجی اور ثقافتی پہلو کو خاص طور پر اہمیت دی گئی ہے۔

(۴) ہندو کے کلمہ اور رکارناموں کی عظمت مسلمان طلبہ اور مسلمانوں کے کلمہ اور رکارناموں کی عظمت ہندو طلبہ

کے دلوں میں بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہر حال یہ کتابیں اسی میں جن کے طبع سے محض فرقوں کے طلبہ میں رواداری اور ملک اور مالک کی

خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

انتخاب کی ترتیب سے بھی زیادہ اہمیت کے انتخاب کا مسئلہ ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی رواداری کے نقطہ نظر سے انتخاب کتابیں میں ذیل کیوں نہ ہو اگر اسکا طریقہ دالہ تعصب سے خالی نہ ہو تو انتخاب کا یہ معیار بالکل فوت ہو جائے گا۔ ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے جہاں کے مدرسوں کی ذمہ داری دوسرے ممالک کے مدرسوں سے طبعی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے مدرسے کے لیے فرقہ وارانہ حیالات رکھنے والے مدرسے کا وجود خواہ وہ کتنے ہی قابل کیوں نہ ہو کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مدرسے کے انتخاب میں نہایت

احتیاط سے کام لیا جائے پیشہ مدرسے کے لیے وہی شخص موزوں ہو سکتا ہے جس کو بچوں سے محبت ہو، اور خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی سب کے ساتھ اس کا نزاع و مشغافہ اور سادہ دماغ کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے ہندو یا مسلمان شاگردوں میں کسی قسم کا امتیاز نہ کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ ان میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے بعض مدرسوں میں یہ دیکھا ہے کہ حاضرت میں ہندو اور مسلمان لڑکے الگ الگ بیٹھتے ہیں اور مدرسین اس طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔ مدرسین کا طرز عمل اور ان کی تعلیم اور تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ طلبہ میں فرقہ وارانہ خیالات اور جذبات پیدا ہی نہ ہوں۔ پانچ اور اگر ختمی سے پہلے سے موجود ہوں تو وہ دور ہو جائیں۔ تاریخ ہند کے پڑھانے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ مضمون ایسے مدرسین کے توجہ سے لکھا گیا ہے جس کی نظر و سلیح ہو اور حوالہ سہیل کے حالات جنہوں نے ملک کی خدمت کی ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان مثلاً راجہ بکراجیت اور اکبر اس طرح بتیں کر سکیں کہ وہ سب طلبہ بلحاظ فرقہ و اہل ہستوں یکجہ کر سکیں۔ اسی طرح دیہات اور اخلافات کی تعلیم ایسے مدرسین کے توجہ سے لکھا گیا ہے جو تعصب سے بالکل خالی ہوں۔

طلبہ میں رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مدرسہ کی کوششیں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب کہ والدین بھی مدرسہ کا بخود بائیں والدین کو چاہیے کہ طلبہ کے سامنے ایسی نگاہ کریں جس سے بچوں میں فرقہ وارانہ خیالات نہ پیدا ہوں۔ آج کل کے حالات کے لحاظ سے اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ مدرسین اور والدین متحدہ کوشش کر کے طلبہ کو سیاسی اور فرقہ وارانہ تحریکات سے باز رکھیں۔ طلبہ کو فرقہ وارانہ رنگ کے اجازت و رسائل اور کتابیں نہ دیکھ کر اور نہ مدرسہ میں پڑھنے کے لیے دی جائیں۔ سیاسیات کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے لیکن اگر وہ سیاسیات میں علیحدہ لینے لگیں تو مدرسہ کا ڈیپلنٹا متاثر ہو گا۔ کال کے خیالات منتشر ہو جائیں گے اور ان کی تعلیم میں سخت خلل واقع ہو گا۔ لہذا مدرس کا فرض ہے کہ وہ طلبہ سے فریبی ربط قائم کرے اور آج کل ان کی ذہنتوں پر ان کے احوال اور برو فی واقعات کا جو اثر پڑ رہا ہے اس کا بغور مطالعہ کر کے ان کے سرسیمینوں کے فسادات سے متصفیانہ طور پر صحیح رہنمائی کرے۔ اگر وہ اپنے مدارس کو فرقہ وارانہ دہلی سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہم کو اپنے ملک کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔

## ادارہ ادبیات اردو کی نئی مطبوعات

|                                                   |                         |
|---------------------------------------------------|-------------------------|
| تذکرہ مخطوطات (جلد ششم)                           | تذکرہ مخطوطات (جلد دوم) |
| مرتبہ: محمد اکبر الدین صدیقی، ڈاکٹر محمد علی انور | مرتبہ: ڈاکٹر زور        |
| قیمت: ۲۰ روپے صفحات (۳۳۶)                         | قیمت: ۱۵ روپے           |

صلیٰ چاہتہ: سب رس کتاب گھر۔ ایوان اردو، حیدرآباد دوم۔



اور باپ انگریزی میں گفتگو کرتے تھے۔

سردہنی دیوی کے بچپن ہی سے ڈاکٹر اگہو راتھ نے ان کی تعلیم کی جانب خاص توجہ دی تھی۔ ان کی لڑکی ماہر راسی ماہر سائنس بنے لیکن سردہنی نائیڈوکامیلاں کچھ اور تھا۔ ایک دن وہ البحر کا سیال حل کرنے میں طبعی سہاواں حل نہیں ہو رہا تھا۔ دفعتاً ان کے دماغ میں چند استعارا آئے اور انھوں نے ایک یورپی نظم لکھ ڈالی۔ اس طرح ان کی شاعری کا آغاز ہوا اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی چونکہ اس زمانے میں حیدرآباد میں لڑکیوں کا کوئی اچھا اسکول نہیں تھا اس لیے وہ مدراس بھیج دی گئیں جہاں انھوں نے مٹرک بارہ سال کی عمر میں مدربہ اول کامیاب کیا اس کے بعد وہ گورنمنٹ میڈیکل کالج میں ان کی غیر معمولی ذہانت کا علم ہونے پر نظام وقت ممبر محمود علی خاں نے جن کی وفات کے بعد سردہنی نائیڈوکامیلاں کی ہر دہائی اور جہاں کے بارے میں "محبوب" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ انگلستان میں اسی تعلیم پانے کے لیے ان کو واپس لایا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں جب کہ وہ سولہ سال کی تھیں وہ انگلستان گئیں وہاں وہ میڈیکل کالج لندن اور بعد میں گریجویٹ کالج لندن میں سترہ سال ہوئیں۔ وہ بیس سال انگلستان میں رہیں جسکے انھوں نے کوئی امتحان کامیاب نہیں کیا۔

سجائے امتحان کی تیاری کرنے کے وہ انٹرنیشنل میں ایسی کامیابیوں کا مطالعہ کرتی تھیں جس کا نصاب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جب وہ انگلستان کے مشہور ادیب اڈم گوس سے ملے گئیں تو انھوں نے اس کو ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انھیں یہ مشورہ دیا کہ انہی نظموں میں مغربی رنگ ترک کر کے ہندوستانی رنگ بنائیں۔ اس ملاقات کے بعد سردہنی دیوی ہندوستانی پس منظر کے ساتھ انٹرنیشنل لکھیں۔ اڈم گوس کے علاوہ ایک اور مشہور ادیب آر تھو سائیر نے بھی ان کی صلاحیتوں کی اور ان کی صلاحیتوں کو مدد دی۔ سردہنی نے کمرچ میں جو نظمیں لکھیں ان میں ایک نظم گریجویٹ کالج پر بھی تھی۔ ۱۹۶۲ء میں جب میں کیمپ یونیورسٹی میں شریک کے لیے مارا تھا سنٹر نائیڈ نے مجھے ایک بھاری خط لکھ کر گریجویٹ کالج کی صدر مس ماہر (۱۹۶۲ء) کے نام دیا اس وقت تک ان کی نظموں کی پہلی کتاب "گرلڈن ہنڈریڈ" (آسان عربی) شائع ہو چکی تھی۔ بلکہ بہت تیزی سے دوسری کتاب شائع ہو چکی۔ جب میں مس ماہر سے ملا تو انھوں نے کہا کہ گریجویٹ کالج کو اس کتاب پر فخر ہے کہ سردہنی ماہر اس کالج کی طالبہ تھیں۔

انگلستان کی مرطوب آب و ہوا کا سردہنی دیوی کی صحت پر برا اثر پڑا۔ وہاں سے وہ سوئٹزرلینڈ گئیں اور صحت پانے کے بعد اٹلی کی سیر کی۔ ۱۹۶۹ء میں حیدرآباد واپس آنے کے بعد وہ نے ہی عرصہ کے بعد ان کی شاعری کو لکھ کر حیدرآباد اہلکاروں کے ہاں پرکھ کر پوس کے میڈیکل انسپکٹر اور بعد میں نئی نوجوان باقاعدہ کے چیف میڈیکل انسپکٹر اور حضور نظامیہ عثمان علی خاں نے ان کی طبیعت پر مبنی اس

زمانے کے سماجی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے یہ شادی اپنی آپ نظر تھی کیوں کہ دولہن بنگالی برہمن اور دودھ لہاؤ کی غیر برہمن تھیں لیکن نہ صرف دولہن بلکہ اس کے والدین بھی ذات پات کے اعتبار سے بالاتر تھے۔

۱۹۷۱ء تک مسر نائیڈو چار بچوں کی ماں بن چکی تھیں اس اثنا میں انھوں نے کئی نکلیں کیسیں اور ساتھ ہی تعلیم نسواں اور سماجی جھلائی کے کاموں میں لچسپی لینے لگیں ۱۹۷۱ء میں محبوبہ گریڈ اسکول کے قیام میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا اور ابتدا میں اس کے انتظام کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس میں لڈی کیسیں، ڈاکٹر لڈی جہدری، بیگم خدیو جنگ اور مسر نندی کے ساتھ مسر نائیڈو بھی شریک تھیں ان کی دونوں صاحبزادیاں پرمجا اور بلہامنی نے اس اسکول میں تعلیم پائی ۱۹۷۱ء میں موسیٰ نندی کی طغیانی سے متاثر ہوئے والدین کی امداد کے لیے مسر نائیڈو نے شانہ ارضیات انجام دیں جس کے صلہ میں برطانوی حکومت نے ان کو قیصر خدیو کا

طلائی تمغہ عطا کیا ۱۹۷۹ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے آغاز سپر انھوں نے یہ تمغہ واپس کر دیا۔ سر جینی نائیڈو مور توں کو آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کی زبردست علمبردار تھیں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۱ء تک انھوں نے ملا کے مختلف مقامات کا سفر کیا اور اپنی تقریروں میں ان دونوں مسائل کی اہمیت واضح کرتی رہیں ۱۹۷۹ء میں انھوں نے مملکت میں آل انڈیا نیشنل کانفرنس میں جو تقریر کی اس پر مسٹر گوگلے نے ان کو پرجوش مبارکباد دی اکثر قومی مسائل پر وہ مسٹر گوگلے کی ہم خیال تھیں مسٹر گوگلے نے ان کو مستورہ داکرہ اپنی زندگی فدا نادر قابلیت شاعری، فوٹ تقریر و فکر اور اپنی شخصیت کی دلکشی سب وطن کی خدمت کے لیے وقف کر دیں یہی اس سر جینی نائیڈو کی زندگی کا مقصد ہو گیا۔

سر جینی نائیڈو کی نظمیں کی دوسری کتاب بڑا نفاٹا (طائریت) ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی ۱۹۸۳ء میں وہ انگلستان گئیں ۱۹۸۳ء میں گمانہ می جی جب لندن میں پہونچے تو وہاں ان سے مسر نائیڈو کی پہلی ملاقات ہوئی اس ملاقات کے بعد انھوں نے گمانہ می جی کے دو برس بعد شہر ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرنے کا عزم کر لیا۔

انگلستان میں مسر نائیڈو کے قیام کے زمانہ میں ان کے دوست اجاب اور دوسرے قدر دانوں نے ان کے اعزاز میں ایک پر تکلف خاشیہ ترتیب دیا اس میں شریک ہونے کی غرض سے میں اور سید محمد اعظم (نواب اعظم جنگ مہاراج کبیر جی سے لندن گئے اس موقع پر مسر نائیڈو کے ہندوستانی پرستاروں کے علاوہ متعدد انگریز شعراء اور ادیب موجود تھے ان کو خراج تحسین پیش کرنے والوں میں ڈوئڈ گوس، آرتھر سائیر آئرلینڈ کے مشہور شاعر شیس، سر زبیر رک پولک، مر کپشنا گپتا اور سید حسین شامل تھے۔

اکتوبر ۱۹۸۲ء میں مسر نائیڈو ہندوستان واپس ہوئے مختلف مقامات پر ان کی تقاریب کا سلسلہ بھر پور رہا ہو گیا ۱۹۸۱ء میں ان کی نظموں کی تیسری اور آخری کتاب برز کن رنگ (شکستہ پر) منظر عام پر آئی اس کے

بعد شاعری کو ترک کر کے وہ اپنا پورا وقت کانگریس کے لیے وقف کرنے لگیں۔ اس اثنا میں ان کی ملاقات جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ اور ان سے جو قریب رابطہ پیدا ہو گیا اتحاد مرحلے تک قائم رہا۔ ۱۹۴۷ء میں وہ کانگریس کا صدر منتخب ہوئیں۔ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان دو تین دفعہ جیل گئیں۔ ان کی سیاسی زندگی کی تفصیلات سے سب واقف ہیں اس لیے اس کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہیں، یورپ، امریکہ، کینیڈا اور افریقہ میں جہاں کہیں انہوں نے سفر کیا انہوں نے ہندوستانی وقار کو بلند کیا۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے کانگریس کے مختلف الحاح لوگوں کو ایک دہریہ پر لانے کی سعی کو جو بسا اوقات کامیاب رہی مقرر کی حیثیت سے مسرناٹھ دانتی مشہور مویشی بھٹی کہ شاعر کی حیثیت ان کی غاریہ سننے کا چمچہ جیٹا باد اور جیٹا باد کے باہر کئی دفعہ مرقع ملا۔ وہ جب کسی بولنے والی ہو جاتیں تو سننے والے محویت ہو جاتے۔ انگریزی زبان برائے کو غیر معمولی عبور تھا، تقریر میں آتش کی سی روانی تھی۔ در اس میں شاعرانہ انداز بھی اور بلاغت ایسی تھی کہ تقریر کے ختم ہونے پر سننے والے کو ان کے خیالات کا تجزیہ کرنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ ان کا مانعہ طلبا تھا۔ ان کی سب تقریریں فی البدیہہ ہوتی تھیں۔ ہاں تاک کہ یو۔ پی مجلس مقننہ میں انہوں نے بحیثیت گورنر بنکر کسی نوٹس کے فی البدیہہ تقریر کی جس کی نال مشکل سے کہیں ملے گی۔

مسرناٹھ کو جو جالیات کا بڑا ذوق تھا اور ان کی طبیعت میں بڑی نفاست تھی۔ گمانہ می جی کو وہ اپنا گہرہ سمجھتی تھیں لیکن انہوں نے اپنی انفرادیت کو کسی ٹٹے نہیں دیا۔ وہ اچھی غذا اور اچھے اس کی شوقین تھیں۔ لکادی کی ساڑھی پہنتی تھیں تو اس میں جالیاتی پہلو نظر آتا تھا۔ ان کے ڈرائنگ روم سے بھی ان کی خوش ذوقی کا پتہ چلتا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں یونی کی گورنری کا عہدہ سنبھالنے کے منظر پر ہی ان بعد انہوں نے لکھنؤ کے راج بھون کو ایسا بارش بنا دیا کہ سب لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔

شادی بیاہ کی فضول رسومات ان کو سخت نا پسند تھیں چنانچہ ۱۹۷۷ء میں جب میں اپنی شادی کی دعوت دینے کے لیے ان کے پاس گیا اور انھیں بتایا کہ میں شادی اس شہر کے ساتھ کر رہا ہوں تو انھوں نے ہنسنے پر آمادہ ہوئے بہت خوش ہوئیں اور عقد کے روز مجھے خود اپنی موٹر میں دیوہن کے گھر لے گئیں۔ شادی کے تحفہ کے دریا انہوں نے مجھے بڑے آف ٹائم کا ایک نسخہ دیا جواب تک میرے پاس موجود ہے اور نے میں بہت عزیز رکھتا ہوں۔

مسرناٹھ وہ بہت ہمان نواز تھیں۔ جب کسی وہ جیٹا باد آتی تھیں تو ان کے گھر پر اکثر چائے یا مائت کے ملنے کی دعوت ہوتی تھی۔ دعوت عموماً بالمشافہ ٹیلیفون پر دی جاتی تھی بعض وقت ان کو یاد نہیں رہتا تھا کہ کتنے ان آئے والے ہیں اور اندیشہ ہوتا تھا کہ ان کے کا جو انتظام کیا گیا ہے وہ شاہد کافی ثابت ہو۔ ایسے موقعوں پر



جہانوں میں ان کے جو بے محلف دوست ہوتے تھے ان سے وہ ٹیلیفون ریکوری سالن بائیس لائے کی فرمائش کرنی تھیں۔

داؤد جگ کا دلچسپ ال کو بہت پسند تھا۔ یہ معلوم کر کے جب کبھی گولڈن ٹھہر شلوڈ میں دعوت ہوتی وہ کافی معیار پر اپنے گھر سے دلچسپ روادار کرتے تھے۔ کھانے کے بعد اکثر کمیٹی کی محفل ترتیب دی جاتی تھی اور مسٹر نائیڈو کی ایک خانہ خاںوں دو سب جو سمجھ میں آجیا جاتی تھیں ایسی موسیقی سے جہانوں کو محظوظ کرتی تھیں۔ بعض وقت جب کسی نام کو مدعو کرتی تھیں تو اس کو اپنا کلام سنانے پر مجبور کر دیتیں جیسے گولڈن ٹھہر شلوڈ میں جوتس ملیج آبادی کا کلام سننے کا کئی دفعہ اتفاق ہوا۔ مسٹر نائیڈو کو اردو سادہ کا خاص ذوق تھا اور ان کو مہسبوں اشعار باد نے کبھی کبھی وہ اپنی تقریروں میں اردو کے آداب و ادب کا بھی سہارا لیا کرتی تھیں۔

حیدرآباد سے مسٹر نائیڈو کو دلی لگا ہوتی تھی۔ جب کبھی ان کو اپنی سیاسی سرگرمیوں سے فرصت ملتی تھی تو آرام لینے اور چھٹی منانے حیدرآباد آتی تھیں۔ یہاں کی معروف آب و ہوا اور سماجی قسم کی ہوتی تھیں۔ ان کے مکان پر طائرانہ تبدیل کے آنے جانے کا سلسلہ بندھا رہتا تھا۔ ان میں مختلف مکاتیب کے سیاسی کارکنوں اور رٹائرڈ بڑے عہداروں اور دیگر اداروں سے لے کر عرب طالب علم سال تھے، وہ ہر آب سے اس کی دلچسپی کی باریں کرتی تھیں۔ سیاسی اختلافات کو کسی تعلقات میں کبھی مائل نہ ہونے دینی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز افسروں سے بھی ان کے مراسم دو سادہ تھے اور حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں کے پاس بھی ان کا آنا جانا تھا۔ وہ بڑی مہربان اور درمادل تھیں۔ غریب اور نادار طلباء کو مالی امداد دیتی تھیں اور سفارش کر کے بیروزگار نوجوانوں کو ملازمت دلاتی تھیں۔

سروجنی نائیڈو ایک ایسے پھرل کی حامی تھیں جس میں ہندو مسلم اور مغربی کلچر کے بہترین اجزائیں مل جاتے تھے۔ گواں کا مسلک بڑھوسا ج تھا۔ لیکن اسلام، عیسائی اور بدھ مت سے بھی وہ بخوبی واقف تھیں اور مذہبی پیشواؤں کا ان کے دل میں بڑا احترام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا مذہب انسانیت تھا۔ ۱۹۴۹ء میں سرجنی نائیڈو کے اختلا سے ملک کے ادنی سماجی اور سیاسی حلقوں میں جو غلا پیدا ہوا وہ دنوں پورا نہیں ہو سکا۔ جو لوگ ان کو جانتے تھے وہ ان کی خوبیوں کو کبھی نہیں بھول سکتے اور وہ ہمیشہ بہادر و مہذب انسان تھے۔

حیدرآباد دکن روضہ رضواں شدہ است      ساز و برگِ طرب و عیش فراز شدہ است (عالم)  
یہ دنیا کتنی جانی ہے صداقت کی قسم کہا کر      عروج و شان و شوکت میں ذرا کمان کن دیکھو نظامِ عالم  
مجھ کو لندن کی فضا اس نہائی اب تک      حیدرآباد سادہ دار کہاں سے ملاؤں (اکبر حیدر)

ڈاکٹر شامہ فاروقی

## حضرت کیسودراز کا نظریہ توحید

توحید اسلام کی بنیاد ہے اور اس پر ہمارے علماء اور فلاسفہ نے ایسی دہرہ ریزی سے موشگافاں کی ہیں کہ ان کا سر ہی جائزہ لینا بہت دشوار ہے اس کا دامن ایک طرف عقیدے سے ہے دوسری طرف یہ فلسفہ کا ایک مہایت فنی موضوع ہے جس کے اپنے مفہومات و معانی ہیں اور جہاں عقل اپنے اپنے چیمیں سے مار باب ہو رہی ہے مگر اس کی دلائل خود ہی آیات دوسرے کی بعض میں حافی میں اور رحمت اگر یہ بہت طویل اور پیچیدہ ہو جاتی ہے مگر کچھ آسان ہیں جو بالعمول آکر جو سمجھ میں آتا ہے وہ اس کو قبول کر لیا

اس کا تیسرا پہلو جدائی ہے جسے آئیے کتنی بار دہائی بھی کہہ سکتے ہیں کشف کا اعلیٰ یہ فلسفہ ہے نہ مطلق سے لیکن ہمارے صوفیاء میں شیخ اکرمی الدین ابن العربی، امام العزالی اور شیخ احمد ربیع نے ہی یہ ہیں جنہوں نے اپنے مباحث کی بنیاد اپنے مکتوبات پر رکھی ہے ہمارے لئے دوسری صورتیں ممکن ہیں اور ہم ان کو جھٹلائیے یا ان کی تصدیق کریں پہلی صورت میں ہم صرف فلسفے سے استنباط کر سکتے ہیں جس سے صاف کو کچھ زیادہ سرور کا نہیں دوسری صورت میں بحث کی گنجائش ہی نہیں و جدال سے دلیل سامنے آئے گی۔

تاریخ ہے حضرت یوسف کے قصے میں یعقوب علیہ السلام کا قول موجود ہے الف ایجاب ربیع لا یفوت لآ ان یفوت (یوسف ۹۴) اور حضرت موسیٰ کے قصے میں حضرت خضر کی ساری دلائل کتنی دہائی ہیں لہذا کشف کو ماننا تو پڑے گا مگر میں یہ فیصلہ کرنے سے ناہم ہوں کہ ہم محض خضر کے مکتوبات پر محالہ کس طرح کریں گے اور یہ کیسے ثابت ہو گا کہ ابن عربی کو جو کشف ہوا وہ غلط تھا اور شیخ سرہندی جو کشف ہوا وہ صحیح تھا۔ آخر میں یہ بحث فلسفے میں ہی محصور ہو جاتی ہے لیکن ہمارے علماء نے اس کو فلسفے کی حالت سے نکالنے کے لیے آیات اور کارگر ترکیب استعمال کی اور ان مباحث کے لیے باقاعدہ ایک فن وضع کر لیا جسے علم الکلام کہا گیا۔ اس میں اور فلسفے میں بھی فرق ہے کہ یہاں عقیدہ بے دلیل کر دیا جاتا ہے اور یہاں وہ مافذ العمل رہتا ہے۔

اس لیے نظریہ توحید پر جو بحث ہوگی وہ علم الکلام کے دائرے میں آتی ہے۔ توحید کو امام ابوحنیفہ نے

”الفقہ الاکبر“ کہا ہے کیونکہ بہ تمام اسلامی عقائد کی اصل الاصول اور کتب لباب ہے۔ گنبدہ توحید کے سائنی کے تین محکمہ ذرائع ہیں۔ ایک علم و نظر کا وسیلہ، دوسرا مشاہدہ و عرفان کا ذریعہ ہے۔ مشاہدہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جو دلایل عقلیہ و نقلیہ پر مبنی ہو، دوسرا یعنی درجہ کشف و وجدان ان کا ہے۔ اسلام کی طرح توحید کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ ظاہر پر ہم گفتگو کر سکتے ہیں اور علم لگا سکتے ہیں لیکن اس کے باطن تک رسائی اہل دل اور اولیاء اللہ ہی کو ملتی ہے۔ جس پر توحید کی حقیقت اس طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ پھر وہ اس موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرتے۔

اسرا بردار نہ تو دانی و نہ من      ایں حرف معانہ تو خوانی و نہ من  
ہست از پس پردہ گفتگوئے من و تو      چوں بردہ بفتدہ تو مانی و نہ من  
توحید یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی ایک اعدیت ہے جس کے اعتبار سے وہی موجود مطلق ہے، وہی واجب الوجود ہے، وہی موجود حقیقی ہے، کائنات کا وجود وہی و اعتباری ہے بقول تیسر:  
یہ تو ہمسم کا کارخانہ ہے  
یاں وہی ہے جو امنہا رکیا

اس لحاظ سے موجود حقیقی کی ذات اور صفات کے سوا سب ذات و صفات صحیح ہیں ”کل من علیہا فاپ  
وَسَبِقُوا وَجْهَ رَبِّكَ ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ“

خدا کی ذات اور صفات پر بحث کا دروازہ عیسائی علماء اور فلسفیوں نے کھولا۔ اس کے برابر اثر ایک وہ گریز پیدا ہوا جو مشبہہ او مجسمہ کہلاتا ہے، یعنی خدا کے جسم اور اس کی شکل و شبیہ کا قائل ہے اس لیے دتران میں بسی آیات موجود ہیں جن سے خدا کی صانبت ثابت ہو سکتی ہے مثلاً ”ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ“ یا ”وَمَا رَحِمْتَ إِذْ رَحِمْتَ وَلَکِنَّ اللَّهَ رَحِیْمٌ“ یا ”بِذِ اللَّهِ هُوَ، رَزَقَهُمْ وَغَرَّهُ۔“

دوسرا فرقہ وہ ہوا جو صفات کا مسلہ بر گیا اور توحید خالص کی بنیاد ”ذات بحت“ کو قرار دینے لگا۔ موعظہ کہلاتے ہیں یعنی خدا کو صفات سے معطل (خالی) کرنے والے ال میں معتزلہ پیش پیش تھے۔ اسی کار صفات کی وجہ سے وہ رویت حق کے بھی منکر ہو گئے کیونکہ از روئے منطق رویت کے واسطے جسم، جیت اور لول (رنگ) ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ قرآن میں ”وَجُودٌ یَوْمُئِذٍ نَاطِقٌ إِلَى رَبِّهَا نَاطِقٌ“ موجود ہے لیکن ان کا استدلال ”لن ترانی“ سے رہا شیعوں نے بھی یہی عقیدہ اپنایا اور ان کا کہنا ہے کہ ان آنکھوں سے ہم خدا کو نہیں دیکھ سکتے تیسرا فرقہ جو راہ اعتدال پر گامزن ہوا اسے اصطلاح میں صفاتیہ بھی کہتے ہیں اور یہ جمہور مسلمین کا مسلک رہا ہے، اس کے پہلے علمبردار ابو الحسن الاشعری تھے۔ بعد میں ہمارے علماء نے توحید کے بارہ بنیادی اصول وضع کئے جن کے گروہ دار راہ اعتدال پر گامزن رہے۔

- ۱۔ یہ عقیدہ کہ اجسام حادث ہیں
- ۲۔ اس عالم کا ایک ہی خالق ہے اور وہ اللہ ہے
- ۳۔ اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک الٰہیت نہیں
- ۴۔ اُس کا کسی طرح کوئی مثل و مشابہ بھی نہیں
- ۵۔ اُس کی رویت ممکن ہے / یا نہیں
- ۶۔ اُس کی صفات ذات سے خارج ہیں / یا نہیں
- ۷۔ انسان کے افعال کا حالت کون ہے ؟ (عقیدہ جبر و اختیار)
- ۸۔ اللہ ظلم و شر کا وجود چاہتا ہے / یا نہیں
- ۹۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب کا اسباب باقی رہتا ہے / یا نہیں
- ۱۰۔ نبوت کے عمومی دلائل
- ۱۱۔ رسالہ محمدؐ کے خصوصی دلائل
- ۱۲۔ مسئلہ امامت

۔ مبادی مباحث ہیں جن پر سارے علم الکلام کی غارتگری ہے اور ان میں مباحث کے نتیجے میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے ہیں جن میں جعفری زیادہ نمایاں ہیں۔

۱۔ اہل السنۃ و الجماعۃ - ۲۔ مُسنَبۃ - ۳۔ مُعتزلۃ - ۴۔ مُرجئۃ - ۵۔ شیعہ - ۶۔ حوارج۔  
اہل السنۃ میں ابو بکر و خلفائے نے عقیدہ توحید و غیرہ کے لیے عقلی مقدمات اور دلائل وضع کیے مگر اسماعیلوں نے ہونے پر اتنا اصرار کیا کہ وہ فلسفہ عقیدے کا لازمی جز بن گئے اور اقلانی کا کہنا تھا کہ اگر دلیل کمزور یا باطل ہے تو بدلول بھی کمزور اور باطل مانا جائے گا اس لیے عقیدے کی مفسوط دلیل حرام کرنا بھی ضروری ہے اور اس پر اصرار کرنا بھی۔  
لیکن اس سخت گیری کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ فلسفے کے چٹل میں گرفتار ہو گیا اور فلسفہ کا بویہ ہے کہ وہ پہلے دلیل و حجت بنا کر اس کو پرکھتا ہے پھر یقین کرتا ہے۔

امام غزالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے عقیدے کو قائم کیا اور پھر اس کے لیے فلسفہ و دلیل ملائی ہیں مگر اسے استدلال کی قید سے آزاد بھی رکھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خندستانی فلسفیاء فکر میں توحید کا کیا تصور ہے تاکہ اس الزام کی حقیقت سامنے آسکے کہ وہ درالوجودی صوفیاء و یدائش متاثر ہیں۔ بیشک کہتے ہیں کہ واجب الوجود ایک حقیقت مطلقہ حقیقتِ اعلا ہے اس کا کوئی زیر نہیں۔ کوئی اس کے سوا موجود نہیں تمام اشیاء کا وجود اعتباری ہے۔ ایچم بہم دویتونا تھے۔ لاہو وود  
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَلا مَوْثَرٌ فِي الْوُجُودِ إِلَّا اللَّهُ۔

ایشیہوں میں خدا کو واجب الوجود کائنات کو ممکن الوجود اور صفات خداوندی کو بالفعل ظاہر کہا گیا ہے۔ شیخ اکبر انجمن نعورات کو تصور طلبتہ و انیاں ثابتہ کا نام دیتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کا کہنا ہے کہ وجود ایک نہیں ہے، دیکھئے میں ایک معلوم نہا ہے، یہی اذیت ہے۔ ہاں کہ ان کے قول سے طابق حد اے کا سب کو مرتبہ وہم میں تخلیق کیا جو میں موجود نظر آتی ہے مگر درحقیقت مہوہم ہے یعنی اس کی موجود تو ہے وجود نہیں۔ صاف اپنی ذات سے غیر متبصر ہے۔ "الان کہا کائنات" کا بھی مفہوم ہے، مگر وہ ایسی صفات میں متحرک ہے جیسا کہ "کل یوم یھوی فی شان" سے ظاہر ہے۔ وہ ذات کی طرح شکر ایا رہے کی اور وہ اب الوجود کا سطر ہے شیخ اگر بے میس ک، مگر اس کا کوئی فریبہ موجود نہیں ہے کہ سنسکا چارہ کی ستر میں شیخ کے ملاحظہ سے گزرتی ہوں، بخلاف ہر دو لول کو غور و فکر نے ایک جیسے نتائج تک پہنچا۔ غرضی فارسی اور اردو میں شیخ اگر کی متعدد ستر میں لکھی گئیں اور ان کا اساتذہ خدا درجہ مل ہوا کہ ان کے نقبتہ مندو نے افعال شیخ کو قرآن و حدیث کے معنی سے رادہ مسدود فرار دیا اور منکر دل ہے ان کی تکفیر سے بھی دریغ نہیں کیا۔ دراصل یہ مباحث غوام میں لاکر بحث کرے کے بنیادی نہیں اور ان کا طرا کشتی امور پر منحصر نہا۔ شیخ کے عقائد صاف طور پر دی ہیں جس کی تعلیم میں قرآن سے ملتی ہے اور جس کی تعمیل ارادت میں آتی ہے لیکن جہاں اسوں نے اپنے کلمتوں کا سال کیا ہے ان کی رد کر رہا ہمارے لیے ظن نہیں۔ شک و طاف و حوسہ مجدد الف ثانی کی تخریر میں بھی بکثرت بیان ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض سرعما اے امت نے شدات بھی وارد کیے ہیں

شیخ اگر کہتے ہیں کہ خدا باب ہے، وہ ایسی الوہیت میں لائے جی ہے، منتر ہے، مذہبہ موجود ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں اس لیے تمام کائنات اس سے موجود ہے اور حقیقی وجود کی صفت یہ صرف وہی موصوف ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ تجوہ، طیکا، مہسل، یا زیب، لیکن طرح طرح کے اور نہ ہی شکوہ کے روبرو ان میں مگر ان کا ایسا وجود کچھ بھی نہیں مہوہم ہے اصل وجود یوسوے کا ہے، جس سارے روبرو کمالی میں ڈال کر جہاد ہے جائے کے یوسوے کی شکلیں صاف ہو جائیں گی، صاف سو مانتی ہے رہے گا۔ "کل من علیہ" خاب و یسفی وجہہ بک دوا الجلال والا کرام" کا بھی مفہوم ہے

اس کا جو ہم نہیں جہت بھی نہیں کہ کوئی راہ اس سے محدود کر سکتا ہے نہ کسی مکان میں وہ سما سکتا ہے مگر یہاں مکان کو نہاد آخرت سب اسی سے قائم ہیں۔ وہ اپنی صفات سے بھی قدیم ہے وہ اشیا کو ان کے وجود سے پہلے بھی حاشا تھا سب کچھ اس کے علم کے احاطے میں ہے اور اس کے ارادے کے متعلق ہے اور اس کا ارادہ ازلی ہے۔ عالم بالذات معدوم اور غیر موجود فی الحارج ہے مگر ذات خداوندی میں "موجود ذہنی" کے طور پر ثابت ہے۔

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ میں اللہ کو اس کے فرشتوں کو تمام مخلوق کو اور تم کو اپنے نفس پر گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نوحہ دہائی کا قائل ہوں اور اس پر فقیدہ رکھتا ہوں، اسی طرح میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ

خلائق مبنیٰ برائیاں رکھتا ہوں اور جو کچھ احکام رسالت مآہ لاٹے ہیں میں ان سب برائیاں لایا ہوں جاہلے  
ان احکام کا مجھے علم ہوا نہ ہو۔

نتیجہ اکبر کے اصول اور عقائد کے بارے میں تو اتنا ہی جاننا سہم دست کافی ہے۔ لکن حیدر ماس ال کے  
 فلسفے کے بارے میں یہاں سال کر دینا ضروری ہے۔ وہ جرات ہے کہ "وجود مالمات" "یعنی خود حقیقی اللہ کا ہے اسو  
 کا وجود باعرض ہے اخیال تابعہ اور حقائق کو نتیجہ میرا سماء و سموات الہی کی بخلی ہوئی ہے اس سے وہ ستر اعطوں میں ہوں  
 کہہ سکتے ہیں کہ علیٰ الہی اور قدرت الہی کے لیے سے ممکنہ کا وجود ہوتا ہے اس لیے ان احوال و حقائق کے بارے میں ہم نہیں  
 کہا جاسکتا کہ وہ ایسے کبوں ہیں جو نام کا نشانہ کی سادہ چیز ہیں۔ اسلزام یہ ہے کہ شیخ فرمانے میں کہ وجود علی کو توح  
 اور وجود مارجی کو وجود کہتے ہیں لہذا اس سال اسہ جو معلما ص ہیں خرمہ وجود فی الخارج اور معدوم ہیں۔

شیخ اکبر کا انتقال ۶۳۸ھ میں ہوا اور اس سے دو سال قبل ۶۳۶ھ میں وہ مات مکہ مکرمہ میں سے قبل انطولی  
 صمدی عجمی کے آثار تک شیخ کی نعنائے جہ سانی و وفات کے طعول میں نام نہیں مونی نہیں۔ وہ الخاتم الدین اولیاء  
 کے لطیفانہ کا جو مستند دفتر ہے۔۔۔ یاس ہے اس میں کبھی شیخ الہاد ذکر نہیں آیا اور یہ سزا لکھا ہوا ہے کہ وہ ہندوستان  
 الحکم کو اپنے زہر مطاعور کھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے زمانے میں شیخ اکبر کے آثار کا تسبیح بھی لکھ لیا گیا ہے  
 انتقال کے بعد فرزند شاہ اعلیٰ کے بعد میں شیخ کی نعنائے جہ طعول میں سخت بظاہر موصوح میں علی صمدی اور ان کی ماتر  
 ان بعد کا آثار بھی ہو گا جس کا ذکر ان دونوں میں مسعودی کے آثار میں بھی کیا گیا ہے اور ان کے آثار میں بھی ملے۔ ان کی نصف  
 "مرآۃ العارفین" کا موصوح میں وجود اور کتاب لے ماحفہ صمدی طابہر پڑا ہے کہ تاریخ اکبر کے زمانہ  
 میں لکھے ہوئے ہیں۔ دفتر مسعودی کے اسی سلسلہ جہندہ طامہ میں صمدی، صاحب کلزار امارانے ان کو حضرت  
 چراغ دہلی سے مرید بابا بنے اور شیخ سید الحق محدث دہلی نے ان میں شیخ اکبر الدین فاضلہ سے متعلق جو کچھ کہا ہے اس میں  
 نے بیٹے تھے میرزا لکڑہفت نظام الدین اولیاء کی خالہا میں امامت کرنے سے اور وہیں ایک حجرے میں بیٹھے تھے اسکا  
 کے بعد بھی خالہا کے احاطے میں مذکور ہوئے تھے

[illegible]

و مدت الوجود کے نفسیاتیہ مباحث نام آدمی کے سمجھنے کے بڑے کچھ بھی رہے اس زمانے کے علماء بھی معرکہ کلی

مخالفت میں فلسفے سے بہرگماں ہو گئے تھے اور وہ ان مباحث کو بنیادی اسلامی عقائد کا نفی سمجھتے تھے اس لیے وحدت الوجود کی بحثوں میں انھیں شرک کا احتمال نظر آتا تھا۔ تاریخ فیہ در شاہی جیسی کتابوں سے یہ سبھی اندازہ ہوتا ہے کہ بعض دیندار تصوفیوں نے عقائد کا فتنہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے مسعودی اب کے قتل کا فتویٰ دیا گیا اور ان کا دہن انجام ہوا جو منصف بطاح، جس الفقہاء مدانی اور بعد میں مسعود کا ہوا تھا۔

تمبور کے حملے سے پہلے کی دہائی میں جب حضرت گیسو دراز دہائی تشریف فرما تھے ان موضوعات پر خوب بحث ہو رہی تھی جس کا نام "جوامع الکلام" سے پہلے کے حضرت گیسو دراز کے مخطوطات دہلی میں شیخ علاء الدین گواہیری نے "انوار الجالسل" کے نام سے جمع کیے تھے۔ پیش بہا کتاب اب مایاب ہے مگر اس کے متفرق حصے بعض دوسری کتابوں میں مل جاتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کی ان مجلسوں میں سید اشرف جابا گئے سمانی بھی تھے ایک مونس نے خود حضرت علاء الدین کو سنا ہے کہ ساگر اور خلیفہ میں اور حضرت علاء الدین شیخ اکبر کے سخت مخالف ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ حضرت گیسو دراز بھی شیخ اکبر کے بہت مخالف ہیں۔

اور ایک موقع پر نو تنقید وحدت الوجود کو "شرک" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی تعریف "اسرار الاسرار" کی ۸ ویں سہولتوں نے فقہ شیخ اکبر سے بحث کر کے لیے محسوس کیا ہے۔ وہ ایسے لفظیہ فوجد کو ان اسرار میں ماننے والے ہیں

آجناہ اسم باشد نے رسم نے صفت نے غش نے تری۔ اشارت نہ ترحان

جملہ کیے لود نمود از دوری اثر توحید بے مشارکت اس عاشو دمایا

اس قطرہ ز قلم توحید پیش نیست نابہ نقب حقیقت توحید در میان

ان اشعار میں نو کو کوئی بات شیخ اکبر کے عقیدے سے متاثر نہیں ہے لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ اہل تصوف کو جو توحید کا

ادراک ہوتا ہے وہ اگرچہ عالم باطن سے ہوتا ہے مگر شریعت کے موافق ہوتا ہے اور علمائے ظاہر اس میں اشتراک

انوں کی آمیزش کرتے ہیں۔ حضرت گیسو دراز فرماتے ہیں "شیخ محی الدین اعرابی (کدا) وحید مطلق متناہی انوی گویند کہ

ورائے اس وجودات وجود دیگر نیست۔۔۔ استغفر اللہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ اس سخن در میان شرک است

فی الدین عالم غیب گزشتہ است و عالم شاہد را ضعیف شدہ است۔ اذ قابل بریں صورت اشکال است کہ تشکل و تشکل را

مقبود دانہ برائے کھم کی کند از و را اوراد متورے ندارد۔ حضرت گیسو دراز نے یہ بھی فرمایا کہ اگر شیخ میرے زمانے میں

ہوتے تو میں ان شواہد سے باز رکھتا، اور ان سے زیادہ بلند مقام پر لے جاتا۔ ایسا کہ بتجدید آور دئے مسلمان

از سر شدے۔ یہ صبر و اشکال کی بحث خالص فلسفیانہ موضوع ہے میں اس پر کوئی محاکمہ نہیں کر سکتا لیکن ایک بات

یہ بھی پُر ہر سچو میں آتی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے نظریہ وحدت شہود میں جو مباحث پیش کیے ہیں ان کی ابتدائی

تشکل میں حضرت گیسو دراز کے ان فرمودات میں مل جاتی ہے۔ یہ دراصل وہی فلسفہ خودی ہے جسے اقبال نے رومی سے

فصل میں حضرت گیسو دراز کی تعبیر و تشریح کی حضرت گیسو دراز کے نظریہ توحید میں نہیں سلوک و معرفت کی بنیاد بھی عشق پر ہے



اس لیے وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب تک عاشق ہے دوئی باقی ہے، عاشق و معشوق کا وصال ایسا ہوجا جیسے ہم گوند کا کر دھ کا غنڈوں کو ہم پیوست کر دیں جو دیکھنے میں ایک ہو جائیں گے مگر عقلی طور پر اس میں دوئی باقی رہے گی۔ وہ فرماتے ہیں کہ شیخ محی الدین صاحب خصوص لکھتے ہیں کہ منصور علاج کو تجلی ذاتی ہوئی تھی اگر تجلی ذات ہوتی تو وہ ہرگز ”انا الحق“ نہ کہتا کیونکہ جو تجلی ذات میں جو ہو گیا اسے کیا خبر ہو سکتی ہے کہ میں کون ہوں کیا ہوں تجلی ذات میں کلام نہیں بلکہ تجلی صفات میں کلام ہے کیونکہ تجلی ذات مقامِ خدا نیست ہے جو اس مقام کو یا لے سکا وہ اپنی خودی کو چھوڑ دے گا، اور دونوں ایک ہو جائیں گے اور اس سکرو وصال سے ماہر نہیں آئیں گے، براحتی خاص کا حال ہے اور یہ تجلی ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیے مخصوص تھی دوسروں کے لیے نہیں ہے۔

بہر حال یہ صرف حیدرآباد کا ایک سرسری جائزہ ہے اور اس سے انما ضرور اندازہ ہونا ہے کہ فلسفہ وحدت شہود اور فلسفہ خودی کی بنیاد ہم حضرت گیسو دراز کی تحریروں میں تلاش کر سکتے ہیں۔

## اُمنگول و آرزوؤں سے لبریز خواب

ہم سب اُمنگول اور آرزوؤں سے بھرے خواب رکھتے ہیں۔ ان خوابوں کی تکمیل اس بات پر منحصر ہے کہ احتیاط سے اس کی منصوبہ بندی کی جائے۔ اس سلسلے میں آپ چنداں پریشان نہ ہوں ہم آپ کے لیے اُمنگول اور آرزوؤں بھرے خوابوں کا پلان تیار کرنے کے لیے موجود ہیں۔ اس سلسلے میں آپ اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد کی ۵۳۱ شاخوں سے رابطہ پیدا کر سکتے ہیں تاکہ آپ کے خواب شرمندہ تعبیر ہو سکیں۔

## اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد

صدر دفتر گن فاؤنڈری حیدرآباد ۵۰۰۱۰۰



طحاوی محمد بن علی اثر

# قدیم دکنی کے غیر مطبوعہ مرثیے

## ۱۔ ظہور ابن ظہوری

ظہور مادل شاہی دور کا ایک مہار ساغر ہے۔ اس کے والد نور الدین طہوری ترمیزی فارسی کے مشہور شاعر تھے جنہوں نے شہرہ میں اسراجم مادل شاہ تانی کے دربار میں رسائی حاصل کی تھی اور "نورسن" کا دیباچہ لکھا۔ مناعہ حسنہ طہوری کے نام سے مشہور ہے۔ ظہور نے بیجا پور کی اردو دیوارِ صدا میں بیرونش یانی اور عاری کے دیگر شعراء، سالک بڑی، حکیم آستی سہازی، محمد دہار مانی اور مقیمی اسٹراڈی کی طرح اردو میں بھی مداحی کی ہے۔ ظہور نے محمد مادل شاہ (۱۶۲۶ء - ۱۶۷۶ء) کے حکم سے "الکلام" میں "محمد نامہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ایک فلمی نسخہ جناب امیر محمد علی امرتسری کی ملکیت ہے۔ ظہور کی دکنی غزلوں کے نمونے "دکنی ادب کی تاریخ" اور "دکن میں اردو" میں موجود ہیں۔

ذیل میں ظہور کا ایک غیر مطبوعہ مرتبہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مرتبہ رافضی الحروف کو کتب خانہ سالار جنگ۔  
کی آبا علیہ سے درج ہے۔ ظہور چونکہ فارسی کا بھی آپ خوش گو شاعر تھا اس لیے اس کے کئی  
کلام میں بھی فارسی کے اشعار نمایاں ہیں جیسے اس مرتبہ میں بھی فارسی کے ایک اور اضافہ میں لکھی ہیں جنہوں نے ملاحظہ  
ہوں۔

ج ۱۔ یوداخ نازہ بر جگر مصطفیٰ ہوا

۲۔ انم زیر محسوس      فو غیر مزاجی

### ۳ جبرئیل کا سینا خواص حضرت مراد

۱۔ بحوالہ اکمل جمل مالی: تاریخ ادب اردو (جلد اول) لاہور ایڈیشن صفحہ ۲۷۷

۳۷ ڈاکٹر محمد الدین قادری زبور۔ دکنی ادب کی تاریخ صفحہ ۳۷

۳۷۷

ما فیہ من اشیاء کثیرة



سے پہلے ان کا کوئی کلام دستیاب ہوا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ کے ایک قدیم محط طے میں طالعی کا ایک مرثیہ دستیاب ہوا ہے۔ اس بیاض میں دکنی کے حسب ذیل شعرا کے مرثیے بھی شامل ہیں

- ۱۔ خواصی - ۲۔ ملک خوشنود - ۳۔ علی مازیل شاہی - ۴۔ فائز - ۵۔ احمد - ۶۔ خشتی - - حیدری  
۸۔ حمزہ - ۹۔ عابد - ۱۰۔ نعیمی - ۱۱۔ جلالی - ۱۲۔ عاصی - ۱۳۔ علی رضا - ۱۴۔ صادق  
۱۵۔ حسن شوقی - ۱۶۔ شفیق وغیرہ۔

### مرثیہ

لیا ہوا ہے جانہ غم کی خبر ہاے ہاے ہاے      انم گنا جہاں میں گذر ہاے ہاے ہاے  
تھمرا را کہا دلال میں جتا غم حسین کا      جس ذکر کچ زباں کی لگر ہاے ہاے ہاے  
رو رو د اسی مرانی سول بیتاب ہو رہے      مابی و مرغ و حن و بشر ہاے ہاے ہاے  
جس نے جیو میں تھے رو و فدا مت کو ماحیاں      و لیے کول یوں دیے مضر ہاے ہاے ہاے  
دیامیں دے گے حور و جاسر و در حسین      را کچھ نئے عاقبت بہ نظر ہاے ہاے ہاے  
میر سور مرثیہ یہ پڑے طالعی سدا  
رو رو د غم سول خوں جگر ہاے ہاے ہاے

۳۶۔ بیاض مرانی کتب خانہ سالار جنگ بیاض نمبر ۱۶۔ ۳۷۔ لا با - ۳۸۔ سٹار اکرونا، قیام کرنا  
۳۹۔ جس کا بدولت - ۴۰۔ دیکھ کر رکتے ہوئے نئے ۴۱۔ آکھیں۔

### ۳۔ محمد زماں فائز

فائز قلب شاہی دور کا ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ وہ ابوالحسن ناناساہ کے عہد حکومت (۱۶۷۷ء تا ۱۶۸۷ء) میں نقیہ جات تھا فائز نے ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۲ء میں "رضوان شاہ و روح افزا" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جو دبستان دکن کی آخری بلند پایہ مثنوی سمجھی جاتی ہے۔ اس مثنوی کو مولوی سید محمد صاحب نے مرثیہ کر کے مجلس اشاعت دکنی محطوطات کی جانب سے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا ہے۔ رضوان شاہ و روح افزا کے مقدمے میں سید محمد صاحب تحریر کرتے ہیں۔  
"سازم (فائز) کے حالات زندگی کے بارے میں نہیں بہت کچھ تلاش کے باوجود کوئی اطلاع نہیں ملی۔ مثنوی رضوان شاہ و روح افزا ہی اس کی واحد یادگار ہے۔ اس میں بھی اس نے اپنے حالات کی طے کر کوئی اشارہ نہیں کیا۔"



## مصدق نقوی

## تاریخ حیدر آباد

پھر ہوا یوں کہ زمین رشک جہاں کہلائی  
 چار مینار بنا اپنی بلند ی کا نشان  
 چار ستون چار کمانوں نے سنوارا اس کو  
 جن کی بانہوں میں پلا اور بڑھا عزم جواں  
 عشق نے حسن کو جینے کی ادا بخش تھی  
 حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے  
 اے قطب شاہ تری ہستی تری رفعت کو سلام  
 حیدر آباد کے بانی تری عظمت کو سلام  
 تیری انسان سے بے لوث محبت کو سلام  
 عشق صادق تھا تیرا تیری مددات کو سلام  
 چار صدیوں سے محبت کی پذیرائی تھی !  
 حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے  
 آج ہے یوم خلی آؤ ارادہ کر لیں !  
 اپنی دھرتی پہ نہ لاشوں کی تجارت ہوگی  
 فون ظالوم کا ہو گا نہ مشقادت ہوگی  
 گھر جلیں گے نہ مذاہب کی تجارت ہوگی  
 اپنی تاریخ محبت تھی محبت ہوگی !  
 زندگی پیار سے الفت سے عبادت ہوگی



سیار، اخلاص، وفا، عزم، تمنائے حیات  
 حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے  
 اس کی بنیاد ہی الفت کا جلن ٹھہری تھی  
 اس کے ذریعہ کو سکھایا گیا آئین وفا  
 اس کی بانہوں میں بنے عزم و عمل کے سانچے  
 اس کی بھلیوں میں سایا گیا آئین وفا  
 دل پہ شاہوں نے محبت سے حکومت کی تھی  
 حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے  
 یہ عمارات یہ سڑکیں یہ عسین باغیچے  
 یہ مساجد یہ منادریہ بزرگوں کے مزار  
 اینٹ مٹی سے بنائے یہ تقدس کے مکان  
 پیار کے عشق کے ماحدہ یہ تمدن کے وقار  
 ان کی دہلیز پہ شاہوں نے وفا مانگی تھی  
 حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے  
 کوئی مانے کہ نہ مانے یہ حقیقت ہے یہی  
 وقت کے تاج کے وارث نے قسم کھائی تھی  
 رد و موسیٰ کو محبت کا نگرہ کر دوں گا  
 اپنی دھرتی پہ اسی دن تو بہار آئی تھی  
 زندگادہ کے لبوں پر بھی ہنسی آئی تھی  
 حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے



کو بگڑنے لگا، ہمارے فلسفہ فلفشا اور اختلال تھا۔ بلندیاں زیر زمین ہوتی جا رہی تھیں۔ تعصبات، تعصبات، تعصبات یہاں حتیٰ کیا بھی  
نہیں اور مزاج بھی! دوسرے حالات نے بھی ان کے ذوقِ مذہب کو تقلید دی۔ تعصبات، تعصبات، تعصبات کی زلیست کام کر رہی  
محبور اور ان کی شاعری کا حاصل ہے۔ انہوں نے ماحول کے گھار کا اندازہ کیا، صحیح اندازہ اور ہر تعصبات کو خواہ کی  
ذہنی تربیت اور معاشرتی اصلاح کے لیے کام میں لایا۔ مریدین کے لیے نئی نہیں اور سب کی ہدایت کے لیے بھی تعصبات  
سے فزولی کوئی وسیلہ الہ کے پاس نہیں تھا۔ ان کی جاڑیل اور محترمہ ”مختصر تہذیب“ شہادت ”التحقیق“ فہرست نامہ اور  
”مغز مغرب“ ہیں۔ حوش نغمہ ”میں عرفان روح، عرفان عالم، عرفان ہر اعتبار عرفان ذوق نور اور عقل و عشق کے مسائل  
کی تفسیر کی گئی ہے۔ شہادت ”التحقیق“ میں شریعت و طریقت کے مسائل کی تفہیم ہوں کی گئی ہے کہ عبادتِ سبوی کی تشریح  
اور واجب الوجود و مسائل سلوک کی بحث بھی آگئی ہے۔ شہادت ”التحقیق“ کا انیازی وصف یہ ہے کہ حروف تہجی کے ذریعہ  
کسا باقی تہذیب و عرفان کے نکات بہاں کے محکمہ ”حوش“ سے یہ سحر لفظ ہو۔ وحدت الوجود کے مسئلہ پر روشنی ڈالی  
گئی ہے۔

تجربہ ہی قدرت کول زور تجھے نور پورا نا

تجھے سب کا سبھی نالغی سب میں بھگانا

مہر اجماعی تعصبات نے بجا پور کی سلطنت کی ابتدا اور بھولی تھی بوسلف مادل شاہ نے شہادت میں  
بجا پور کی خود مختاری کا اعلان کرنے ہوئے مادل شاہی سلطنت قائم کی۔ مادل شاہی فرمانروا خود بھی شاعر تھے اور  
اعلیٰ درجے کے شاعر اور اسی کے ساتھ ملے مدظل دوست شاعر دل اور ادبوں کے سرپرست اور فیاض حکمران بقول  
حمیل جالبی ”وجود کا فلسفہ بجا پوری تعصبات کا غنادی فلسفہ ہے ساری عمارت اس کی بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ یہاں اس  
نہیں فلسفہ اور تعصبات ٹھیلی دور سے گزر رہے ہیں۔ ہندوستانی فلسفہ اور اسلامی تعصبات ایک دوسرے کو لینے دیتے ایک  
دوسرے کو تار کر رہے اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوئے مارے تھے بول ایک نئی شکل سامنے آ رہی تھی جس کو  
دوبل کا امتزاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ محمد یہ کہ بجا پور کے شعر و ادب میں تعصبات کو جلد ہی اساسی حیثیت  
حاصل ہو گئی جس کی بھر پور نمائندگی شاہ مہر بال الدین حاتم متونی (۱۵۸۲ء) فرماتے ہیں: ”یہ کیا کم تھا کہ جانم بہاؤ،  
تسلی عشاق کے صادق اور غلیفہ سحر اور خود اپنے مزاج اور ذوق کے مانت تعصبات کو اپنے بل کی زندگی بنالیا  
سنا جو دی فلسفہ کی تہذیب و تخیل میں حاتم کا قابلِ قدر حصہ ہے۔ نو وجود کا حاصل یہ ہے کہ مدائے لم نیل ہر شے  
میں جاری و ساری ہے۔ وہ دردِ درہ میں علوہ سا ہے طاہر میں سخی ماطر میں بھی۔ رنگ و لہو اور نور کی شکل میں وہی اور  
وہ ہے اس کا پھر مکالم میں بھی ہے اور لامکالم میں بھی کوئی شے کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اس کا وجود نہ ہو یہ استقامت

طاہر میں وہ سب میں تو وہ دستا ہے سب نئے اپنا سا ہے

ہر اک شے میں دیکھ بھار محیط سے طہار میں طہار

و نیز تعصبات کے بیشتر مسائل کو اپنی شاعری میں سمو کر ہندوستان کے معویہ میں حاتم امتزاجی مقام کے مالک بن گئے

ہیں۔ برہاں الدین جاننے نے نظم و شعر کی کئی تعانیف چھوڑی ہیں۔ جن کا موضوع صرف اور صرف تصوف ہے۔ ”وصیت الہیہ“ بشارت الذکر ”سکھ سپلا“ ”منفعت الایمان“ ”قرآن از دیوان“ اور ”ارشاد نامہ“ وغیرہ شعری فن پارے ہیں۔ صرف ”ارشاد نامہ“ کا جائزہ لیں تو اندازہ ہو گا کہ ذات و صفات، جبر و قدر، شہود و وجود، روح و نفس، سلوک و معرفت اور تصوف کے ایسے ہی کئی نازک مسائل پر جانم نے کتنی قدرت اور بہارت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے کہ بات ایک عالمی کے فہم میں بھی آجاتی ہے۔ ان کی نظم ”منفعت الایمان“ کی یہی کیفیت ہے۔ اس نظم کے دو اشعار میں عشق کی تعقیب واضح پڑتی ہے۔

کوئی کہیں سب عشق تمام      عشق کی آنکھیں کیا ہے فہام  
عشق لیا ہے سب پھر باس      عشق تھے سگلا سھوگ بلاس

تصوف کا ایک اہم مسئلہ خدا اور بندے کا تعلق ہے۔ خدا اندے سے جدا ہے یا نہیں اور یہ دونوں میں کیوں اور کیسے؟ ارشاد اری نہائی ہے۔ ”ہم تو بندے کی شہرگ سے تجی قریب ہیں اور یہ بھی کہ ہم نے بندے میں اپنی روح چھوکی۔ اس خصوص میں جانم کہتے ہیں۔

تجوں میں داخل اچھے بول      وہ تجوں خارج دس بایکوں  
نور کوئی روح کر دتا جانوں      روح موتی میں بکریا ٹھکانوں  
تجوں میں رکھیا بول مل جائے      جوں یا نی میں یا اوسائے

اس دور کا ایک اور شاعر ہے۔ شباز حسینی قادری بجا پوری (متوفی ۱۶۰۶ء) شباز کا کلام اگرچہ زیادہ نہیں ملتا لیکن اس کے صوفی مشہر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس نے بھی تصوف کے مختلف موضوعات پر اظہار حال کرتے ہوئے خاص طور پر تجسّم قلب پر زور دیا ہے۔ ایک شعر درج ہے۔

شباز ایدہ کھونے کر، ہر دو جہاں دھوے کر  
دل جہاں اللہ کب ہوئے کرب پا بگا دیدار توں

شیخ غلام محمد داؤد (متوفی ۱۶۵۷ء) نے سراجی شمس العتاق اور برہاں الدین جاتم کی بیرونی کی سب سے پہلی برہاں الدین جاتم کے مرید تھے تصوف سے بیاد کی طور پر دینی محی کہ طریق زندگی میں نکلتا تھا۔ اور وہ مسلح بھی تھا کہ زندگی بہت کا شمع داؤد نے تصوف کے گہرے مسائل کو آسان زمان اور سیدھے سادے اسلوب میں پیش کر دیا۔ ان کی تصانیف میں ”جلد شہادت“ ”کشف الانوار“ ”کشف الوجود“ اور ”اری نامہ“ میں خاص طور پر ”جوار شہادت“ میں مسئلہ مدد الوجود پر سیر مائل انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان دینی اشعار سے اندازہ ہو گا۔

اللہ واحد سب جس ہمار      نہ نیک عالم جس بھی مار  
ظاہر باطن اپنا روپ      ات منزہ سب سے سرب





استفادہ کیا اور بیجا پور کے مقابلے میں اپنی زبان کو ہندی اثرات سے دور رکھتے ہوئے یوں کہے کہ دکنی کو فارسی کے قباب  
 ٹھکانے لگے سہی کی زبان و بیان ہی کی حد تک نہیں جہاں تک تصوف کا تعلق ہے بیجا پور اور گولکنڈہ کے صوفیاء  
 جہانات کے مابین بھی فرق آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بیجا پور میں ہندوستانی تصوف پر اسلامی اثرات واضح  
 ہیں اور جبکہ سطور بالا میں کہیں عرض کیا گیا ہے ان اثرات کی آمیزش سے تصوف کا ایک ایسا دستان سامنے آتا  
 جس کو ہم تصوف کا ہندوستانی و دستان یا ہندوستانی فلسفہ قرار دے سکتے ہیں۔

قطب شاہی سلطنت کے شاعروں میں سب سے پہلے فیروز محمد اور خیالی کے نام سامنے آتے ہیں۔ ان سب  
 نے دراصل اپنی روایات کی پرورش کی حوا کے محل کردستان گولکنڈہ علی نام آوری اور رفعت و وقار کا باعث ہوئی ہیں  
 بزرگ کا تعلق بہرے سے تھا لیکن سہمی سلطنت کے سقوط کے بعد یہ گولکنڈہ چلا آیا اس کی شہرہ آفاق تعینف پربت نامہ  
 ہے ”پربت نامہ“ کا موضوع ایک حد تک مذہبی ہے کہ اس میں غوث اعظم حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح کر کے ایت  
 رشید حضرت شیخ ابراہیم مدہمؒ کی توصیف کی گئی ہے لیکن اس میں تصوف کے مسائل کا ایسا بیان نہیں یہی حال اس  
 غزلوں کا بھی ہے جن کا مرکز و محور عشق مجازی ہے سوائے اس کے کہ کہیں کہیں عشق حقیقی کا تذکرہ ہو جاتا ہے۔  
 محمود بھی شمالی ہند سے دکن آتا تھا محمود دراصل غزل کا شاعر ہے اور ٹھیکہ غزل کا۔ اس نے ظاہری اور صوفی  
 دونوں حیثیتوں سے غزل کا استعال کیا ہے۔ شراب و تناب کے ساتھ زندگی کے مسائل ذہنی صمنی طور پر آجاتے ہیں لیکن تصوف  
 کی سمت اس کا رجحان بڑا ہے۔

ظاہری یا کاشتری سربراہیت ملتی ہے اور روحی ملتا ہے اس کی روشنی میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے فیروز  
 و محمود کی طرح حسن و صفت کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔

دستان گولکنڈہ کا نامور ترین شاعر محمد علی قطب شاہ (۱۵۶۵-۱۶۱۱ء) ہے۔ بادشاہ ہوتے ہوئے جہاں اس نے  
 شاعری کی شاعری کی سلطنت میں آج بھی اس کی بادشاہت مسلم ہے۔ محمد علی خس کا پرستار تھا عشق اس کی گٹھی میں  
 پیرا ہوا تھا اور شراب و شراب کا ربا۔ اس تناظر میں ظن ہے بعض گوشے محمد علی صوفی شاعر قرار دیں لیں کلیات فنی  
 قطب شاہ کے مطالعے سے ظاہر ہوگا کہ تصوف سے محمد علی کو فیہر معولی لگاؤ تھا اس نے مانتھ شہزادی کی گئی مزلوں کو اردو کے  
 غالب میں دھلا جس سے مانتھ کی شاعری شخصیت اور مسلک سے اس کی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے تصوف سے اس کا  
 دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ و نیز بقول ڈاکٹر زور ”اس کی مدہم آزاد روی اور ظاہر بینی کے تغیر اس کو دائمی  
 ایک پختہ کا صوفی مشرب بنادیا تھا“ محمد علی کی شاعری کے موضوعات زیادہ تر عشق مجازی سے تعلق رکھتے ہیں تاہم اس  
 لکھنے کے یہی عشق مجازی عشق حقیقی تک اس کی رسائی کا وسیلہ بن گیا۔ صوفیائے حقیقی ہر دور و دیت ہیں لیکن عشق مجازی  
 کو بھی صوفیائے نظر انداز نہیں کیا ہے ذات الہی کا رسائی اور اس کا کثاف ذات کے لیے اس کا توجہ مد کی ضرورت ہوتی ہے اور  
 صوفیائے ابتدا عشق مجازی ہی کو مرکز قرار دیتے ہیں۔ جب توجہ ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہو مانتھ ہے تو عشق مجازی کے باب میں





اس سے ولی اور دشمن اور دشمن سے ولی نے ملاقات کی جو جس قدر بھی متاثر ہوئے ہوں مجموعی طور پر سارے شاعری کے دہشتا  
دکن اور دبستان دہلی پر گہرے اثرات ترتیب پاتے ہیں۔ دونوں کی تقدیر بدل ماتی ہے۔ ولی اپنے مزاج کے اعتبار سے  
کس قدر صوفی تھے؟ عشق مجازی اور عشق حقیقی سے ان کی شاعری کس قدر ملو ہے؟ براور ایسے سوالات بہت زیادہ اہمیت  
رکھتے ہوں لیکن ولی کی زندگی اور ان کی شاعری کے مطالعے سے آسانی لیا جاسکتا ہے کہ ولی نے تصوف کو اپنی زیست  
بنالیا تھا۔ کن مسائل کا ذکر کیا جائے۔ ولی نے ان سب پر بڑی عمدگی سے مدعوئی اور خامیوں پر بطریق سے اخبار خیال  
لکھا ہے۔ یہ نہیں محسوس ہوتا کہ تصوف کے ان نازک معاملات پر ولی اخبار خیال لکھ رہے ہیں بلکہ یوں لگتا ہے کہ معاملات ولی  
کے کلام میں ایسی جگہ آ رہے ہیں۔ وحدۃ الوجود کا نظریہ اس زمانہ کا ایک عمومی اور صوفی شعرا کے نزدیک مقبول نظریہ  
نظریہ عرفا، ہر سمت خدا ہے اور خدا کے سوائے کچھ نہیں۔ ہر شے میں خدا ہے اور خدا کے سوائے کچھ نہیں۔ ظاہر و باطن، ماضی  
و غائب اور مکان و لا مکان حتیٰ کہ حق ہی میں ہیں، باطل میں بھی وہ اکا ملوہ ہے۔ جیسا کہ شیخ ابودین مغربی نے ایک شعر  
میں کہتے ہیں باطل کا بھی انکار کر دو کہہ نہ کر۔ یہی حق ہی کا ظہور ہے۔ ولی بھی وحدۃ الوجود کے نظریے کے شدت سے  
قائل رہے۔ ال کے کلام میں اس کی طور بکری اور اعلیٰ ہے آپ ہی غزل کے دیستور میں سے

عبدالہی ہے ہر طرف عالم میں جس نے حمایت کی کا  
 بغیر از مدد جبرائیل نہیں مگر میں فطرت اس کا  
 ہوا ہے مجھ کو دل شمع بزم مکہ رچی رسول بولوں روش  
 کہ ہر ذرہ آپر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا

یہی حال عشقِ حقیقی کا ہے۔ ولی نے عشقِ مجازی کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی ہے لیکن سچ پوچھئے تو بلی کا عشق خیالی یا مجازی نہیں صرف اور صرف حقیقی ہے عشقِ وہ جو قرب الہی، تہذیبِ نفس اور تزکیہ و تالیفِ قلب کا واحد ذریعہ ہے عشقِ حقیقی کا رنگ ال کے کلام میں بے مدہمگہا ہے اور اس کی فو انعامی نیز اور فاضلی سحریہ را اور پھر ولی کی زبان اس کا اسلوب، ال کا لہجہ۔ اور تعریف کے دیگر موصدات یہ ولی کے شعر ہیں۔

وہ ضم جب سول بادیہ: حیران میں آ

آتش فتنی طیرنا عقل کے سماں میں آ

سکھ کے احاطہ میں دیگر نئی : ہمیں مس ہے : لے ہم کو خبر نہیں

موجود فنا ہو کے ذات میں ملا ۛ بہ ناسا حجاب میں دیکھا

خودی سے اولاً مالی ہواے دل : اگر اس شمع روشن کی لگن ہے

عشق میں لازم ہے اول ذات کو خالی کرے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ولی کے بعد فراتی اور فقیر اللہ آزاد کے نام بھی ملتے ہیں ان کا کلام اپنے دور کے عمومی رنگ کی نمائندگی کرتا ہے اور یس! فراتی کا

بے شعر ہے منہ اس کتب مجازی میں جو خشتِ اسناد نہ ہوتا  
نومبرے دل کی کثرت کا سبق بر باد نہ ہوتا

دار و درگاہ آبادی اپنے رنگ میں کامل اور سحر پور ہے دستاں دکن میں دائہ دکنی ایسی اہمیت ہے بلکہ تصوف  
و کا مزاج نہیں رہا۔ البتہ دائہ کے بعد سراج اور گاہ آبادی (۱۵۱۵-۱۶۳۱ء) نے اردو شاعری میں تصوف کو  
سننے والی اور نئی رفت سے ہم آہنگ کر دیا حق تو یہ ہے کہ سراج اردو شاعری کا پہلا عظیم صوفی شاعر ہے ہر معنی اور  
فہم میں تصوف سراج کی زندگی تھی ال کی شخصیت تھی۔ ال کا مسلک ال کی دنیا، ال کا عقلی رویہ، عبدالقادر سیدی  
بہ سطور بر لکھا ہے۔ "سراج ایک خدا رسیدہ بزرگ اب صوفی اب مارل الدنا ملکہ ابک ولی تھے گئے اور اسی خط سے  
نہور ہوئے۔"

شاعری تو سراج کے لیے ذیلی ضمیمی حقیقت رکھتی تھی مگر کوئی حسیہ ہی نہیں رکھتی تھی۔ اہل علم و ادب ایسے ہند  
ہدایت کی قیادت کرتے ہوئے شاعری ترک کر دی اور تصوف کے ہو گئے۔ سراج صاحبِ دل بھی تھے اور صاحبِ مطلق  
نہ۔ چنانچہ جدید برسول کی سراج کی شاعری میں تصوف کے سحر پور نقوش ملے ہیں۔ ال کی شاعری شاعری نہیں تصوف اور  
نہ تصوف ہے، وہ سراج کا تصوف خانقاہی نہیں ال کے مطلق اور ال کی روح کا رحماں اور انس کا نکس ہے تصوف  
شاید ہی کوئی پہلو ہو گا جس پر سراج نے اظہار خیال کیا ہو سراج کی عود نر مل "خبر سخن سنس  
ہے فتح نظر جس کا ہر شعر تصوف کے مسلک کی جامع اور وسیع تصویر ہے۔ ال کی دیگر غزلوں میں بھی ایسے استعارے لکھے ہیں ال  
موسیٰ بوساں جال "سچی صومدار شاعری کی عمدہ مثال دار و دیوار ہے ال کی جس میں اسہول نے حسیہ کو ہمارے پردے  
ماہاں کیا ہے۔

عشق جس کے بارے میں حضرت غلام فرید نے "اسا الاسرار" میں فرمایا ہے۔ حقیقہ جواہر جہاں ہے عشق  
کوئی صورت نہیں عشق ہر صورت میں ظاہر و نہاں ہے عشق قطبِ انسان ہے، عشق رحیم و رحیم ہے، عشق ہی سے رستہ ہے عشق  
ابت شکن ہے عشق عشق خدا سے مانیں۔ "نور سراج کی رہ گئی تھی وہ کہے ہیں سے

سراج بہ مجھے اسناد ہر ماں لے کہا  
کہ علم عشق سب سے بہتر نہیں ہے کوئی سلوم  
مگر حقیقت کی سیر ہے خواہش راہ عشق محاذ لازم ہے  
اور عاشقوں مثال مجھے سم نہ بوجھو  
سب جہلائے عام ہیں میں منلائے ماں

بل گیا عشق کے شعلوں میں سراج ایسی دالست میں بے دار کہا

عشق کے شعلوں میں مل جانا ہی عشق حقیقی کی رفعت ہے سراج ہے فنا ہی عشق! عامل ہے اس کی

فنائین عاشق کی بھاد پوشیدہ ہے، بمبئی جی میں ہستی ہے کہو کہو نیستی نیستی نہیں، فنا ہونا فنا ہونا نہیں بلکہ اپنے  
میں موجود انسانی صفات کو شکر اچھی ذات میں مکمل نہ نکال سکتے تھے اللہ سیداکرنا ہے کہ اس سے بقائے دوام ممکن ہے۔

سراج نے کہا ہے ۔  
نوفنا ہو اگر بفسا جا ہے  
نیستی میں تو دیکھو مہنی ہے

صوفیائے بزرگ ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہیں کوئی امتیاز نہیں کہہ سکتے ہیں جسے ظاہر کہہ کر باطن سے جدا کر رہے ہیں وہ ظاہر ہوتے  
ہوئے ہی باطن سے جدا نہیں ہیں حال باطن کا ہے وہ باطن ہوتے ہوئے بھی ظاہر سے جدا نہیں کیوں کہ ذات الہی  
نظر میں ہی ہے۔ اور باطن میں بھی نہ ذات الہی کے لغو ظاہر ظاہر ہے اور نہ باطن باطن ذات الہی کا جلوہ سب میں موجود  
ہے۔ سراج نے استعارہ میں سے

ہو نیلہاں ابس کو دکھایا نہیں  
ہو ظاہر اپس کو چھپایا نہیں  
کبیں آپ دسنا ہے محبوب ہو کہیں آپ جینا ہے محبوب ہو

استعارہ میں لائے ہو یہ ہیں سے  
دوڑی کوں ترک کر اور آس لوں بوجہ  
سنگین کتابوں تختہ سے مس حسانی  
شراب شوق بی کرید جہاں کا جس نے غم مٹو  
حال تم افسانوں و فانی حسام ہم مٹو



بیجا پور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے سقوط کے بعد دکن اور شمال کے درمیان روابط افروز ہونے لگے  
دکن کی زبان اور ادب کی اعتباری اور انفرادی حقیقت متاثر ہوئی۔ اسی کے ساتھ شمال اور دکن نے لسانی طور  
پر ایک دوسرے کو اس حد تک متاثر کیا کہ زبان کا ایک طوائف سوائے آنے لگا جو اردو سے موسوم  
ہوا اور ہے ولی، سراج اور اس دور کے دیگر شعراء دراصل درمیان کی لڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں  
اور بسان دکن کے آخری شعراء میں شمار ہوتے ہیں بول و لسان دکن کا خاتمہ ہوتا ہے۔ لیکن دستان  
دکن کی اردو شاعری میں تصوف کی جو کارفرمائی رہی اور ہمارے شاعروں نے تصوف کو جس طرح اپنی زینت  
اور اپنی شامی ساواہ آج بھی ان کے کلمات سے واضح اور اردو ادب کا وقیع سرمایہ ہے۔ تاہم اگر  
ادبی نژادیوں سے بھی ان کی حیثیت ممتاز اور موقر ہے۔

اسی طرح صوفیانہ نقطہ نظر سے بھی آج یہ فن یارے، یہ کارنامے رشد و ہدایت کا دبلہ  
ہیں۔ عوام کی ہنر و نبیہ لمس اور تزکیہ قلب کا بڑا ذریعہ ہیں۔ ایک نیا اچھی اور سچی زندگی کے لیے  
منارہ نور اور چشمہ فیضان ہیں۔ محقق سر یہ ہے کہ اگر تصوف ان شاعروں کی حیات اور شاعری میں  
(۱۱ صفحہ ۲۳)

## انجاز راہی فن خطاطی

قوموں کے عروج و زوال کے سفر میں بسا اوقات ایسے مرحلے بھی آتے ہیں جب قوم اپنے پورے تہذیبی میلے کے سامنے تباہ و برباد ہو کر زمین کی گہری تہوں میں دب کر اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ بڑی بڑی خوبصورت عمارتیں، سائنس و ٹیکنالوجی، کھیل، عجوبہ روزگار، تعمیرات، محض کھنڈر بن کر آنے والوں کے لیے جہنم کا سامان رہ جاتے ہیں۔ علم، ادب، تہذیب، شرفی، بادشاہوں کی جہت اور فیاضی کی کہانیاں اور بہادر سوراؤں کی داستانیں یوں گم ہو جاتی ہیں جیسے ان کا وجود بھی اس زمین پر نہ تھا اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ پوری تہذیب کا نام تاریخ کے چھترے سے مٹ جاتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اس زمین پر تاریخ نے بھی کسی شائستہ تہذیب و تمدن اور ترقی یافتہ انسان کو نہ دیکھا ہو اور یوں صدیاں گزر جاتی ہیں۔

پھر کیا ایک کنواں کھودتے ہوئے، نہر نکالتے ہوئے کسی بڑی عمارت کے لیے بنادیں اٹھانے ہوئے یا بنگلے میں بکریاں چراتے ہوئے محض ایک تختی کسی کے اچھوٹک جاتی ہے جس پر اٹلے سیدھے نشان یا تصویریں کندہ ہوتی ہیں تختی (حسن اتفاق سے) مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی اسکا لرز (ماہرین آثار اور بشریات) تک پہنچ جاتی ہے اور پھر اپنا ایک جوش سے بھر پور آواز اُبھر جاتی ہے۔ ایک ہزار سالہ تہذیب، دس ہزار سالہ تہذیب، سچا سچ ہزار سالہ تہذیب، اٹھ اٹھ سالہ تہذیب اور پھر ان تہذیبوں کی آواز میں ساقی تہذیب، سومری تہذیب، اکادمی تہذیب، آستوری تہذیب، مصری، عبرانی، اٹلی اور بے شمار تہذیبیں ابھر کر نکلتی ہیں جو بڑی سی مخمخ شخص، حسیرانے بدھ، خطاط، مینیٹر، تصویریں، نظر آتی ہیں دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں سالہ تہذیب انسانی کا انکشاف بن جاتی ہیں تختی کی عبارت اور مفہوم دنا جو جس بحث کا موجب بن جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے ماہرین آثار، ماہرین خرمینا، ماہرین بشریات اور ماہرین لسانیات سہ ہزار ہزاروں تہذیبوں کے عروج و زوال کی کہانیاں جوڑنے لگتے ہیں۔ علامتیں مفہوم بن جاتی ہیں بجز یہ ہوتا ہے کہ دس سال دریا بہ ہوئے مٹی بندھنے کے لوگوں کے رنگ و نسل، اقوام، ملک و مین، فنون، لطیف، ادب و تعمیر سب بکھوڑا جاتا ہے اور جو بڑی سی تختی جس پر کسی بات نے اپنے فن کا جوہر بکھیرا تھا کھو دیتی ہوئی انسانی کڑوی کا درد بانٹ کا سبب بن جاتی ہے۔ اس سارے پس منظر کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا جائے تو کتنی جہت ہوتی ہے کہ ادب، شعر، قیاس، موسیقی، مقصوری حتیٰ کہ تعمیرات کو بھی فنون لطیفہ میں جگہ حاصل ہے مگر فن خطاطی جو ان تمام علوم و فنون کی محافظ اور تہذیبوں، ثقافتوں کی امیں ہے اسے اب تک وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کا اس متقاضی ہے عجیب بات ہے کہ ہم تہذیب کی سائنس کی بات کرتے ہیں تو یہ کہہ میں کہ وہ قوم فن و فنون سے محروم ہے۔



مگر جواب میں اس فن کو اب تک نظر انداز ہی کیا گیا۔ مثلاً اگر آپ فنون لطیفہ کے دوسرے خام موسیقی، رقص، تھیٹر، مصوری، ادب، شعر کو دیکھیں تو اردو، عربی، فارسی اور دوسری زبانوں میں ۵۰ شمار کتب مل جائیں گی مگر فن خطاطی پر نظر ڈالیں تو ماسوا بکھرے بکھرے مضامین کے کچھ ہاتھ ہمیں آتا عربی، فارسی میں نو بھر بھی کچھ مواد مل جاتا ہے مگر اردو کا اس اس فن کی تا اور ارتقاء طے طے مالی ہے۔

اور بول لگتا ہے جیسے اس فن کو اب تک فن کی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کیا اور نہ اس کی سطح پر لے جانے سے دانہ گریہ کیا گیا ہے۔ شاید اسی لیے صدیوں کے سفر کے باوجود اب تک ہمارے ہاں اس میں کوئی ارتقاء نظر نہیں آتا۔

عربوں کی ایجاد فن خطاطی ایرانی منجی نو ایرانیوں نے اس فن کو اوج شربا تک پہنچانے کے لیے نہ صرف عربی کے مروجہ خطوں میں جہاد کیا بلکہ اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے لیے کئی خط ایجاد بھی کیے یعنی اردو شرقی عرب، ملائقی، ہسپانیا، افریقہ، کس میں عربی خطوں میں اصلے اور زراہیم کے ساتھ انھوں نے اپنا رنگ بھرا۔ مگر ہم نے فارسی سے جو خط ماہم کیا اپنا سا وقت اس کا اسناد بننے میں صرف کر دیا۔ ممکن ہے اس کے حسن میں ہم نے اضافے کیے ہوں مگر حرفوں ساختیاتی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہ لاسکے۔

جسٹس نے ادیر کہا ہے کہ خطاطی جس نے کوئی ہوی قوموں کا سراغ لگا با خود اس کی تاریخ مرتب کرتے ہو ہیں شدید ایو سی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور لے دے کر جو معلومات ہم تک پہنچتی ہیں وہ مغربی اسکالرز کے وسیلے سے گریہ کیلتا ان پر اعتماد بھی نہیں کر سکتے کہ مغرب کی تہذیبی صفت ان کے اپنے مفادات سے متصف ہے۔ چنانچہ مشرق کی عظمت کے اصلی جوہر تک وہ کیوں کند لگانے لگے۔ شاید اسی لیے مغرب کے بہت سے اسکالرز نے خود تحقیق کی بجائے مصلوبوں پر نقد کیا۔ اور نمونوں کو جمع کر کے پہلے کی کہی بات دہرائی۔ جس کے سبب تاریخ کے بہت سے مہلک مہلک ہو کر رہ گئے ماسوائے چند ایو سی اسکالرز کے جنھوں نے فن خطاطی کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی اردو میں شدید کم مائی کا احساس ہوتا ہے اور مریضہ ہندو پاک میں شہرچا لکھا لطیفہ سمجھنے فن خطاطی کے رجحانات، ارتقاء اور مزاج وزوال کی تاریخ سے آشنا نہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ خطاطی جس نے مردہ تہذیبوں کی دریافت میں اہم کردار ادا کیا ہے اسے اسلامی دور میں اگر اہم مقام حاصل ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے فن خطاطی اوج شربا پر نظر آنے لگی۔ بہر کیف فن خطاطی میں بری طرح تاثر ہوا۔ اور اگر آج اس کی حفاظت نہ کی گئی تو آنے والے زمانوں میں جب شیخ انسان کی جگہ لے لے گی تو محض فن تحریر رہ جائے جس میں سے مسلمانوں کی عظیم روایات کی روح مر جائے۔

لہذا دور رسم الخط اور خطاطی اردو زبان کے ساتھ ہی وارد ہوئی جس طرح زبان کا تاریخ زیادہ قدم نہیں لگا اردو میں فن خطاطی کی عزت زیادہ نہیں۔ مگر یہ دلچسپ بات ہے کہ عربی رسم الخط جسے پورے عالم اسلام نے اپنا ہتھیار اردو کی آمد سے صدیوں پہلے ہندوستان میں داخل ہو چکا تھا۔ اور جب اردو زبان نے آکھ کو کوئی تو اسی رسم الخط میں تفصیل تو حیرت من فارسی و سرائیکی میں مل رہی تھی۔ چنانچہ فارسی کے مروجہ خط نستعلیق، نسخ، تعلیق اور شکستہ اردو خطاطی کو روز ازل



خطِ قدیم لونی، حیرہ یا حیرہ کہتے ہیں۔ یہ دراصل ایک ہی خط تھا اور اسے اسلام کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ارتقاء کی وہ منزلیں نصیب ہوئیں کہ تاریخ خطاطی کا سب سے مقبول خط بن گیا اور اسلامی قلم کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی وسعت اختیار کرنا چلا گیا۔ اس خط کی ایجاد کہاں کی ہے اور کس کے ہاتھوں ہوئی۔ اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کیوں کہ تاریخ کے صفحات پر دھند چھا گئی ہے مگر مختلف ادوار کے والے سے ہم صحیفے کے قریب تر چلے جاتے ہیں اور نئے خطاطی کی تاریخ کی کڑیاں ایک سلسل میں نظر آنے لگتی ہیں۔

خطِ خطی کے بارے میں اور تفصیلاً ذکر آچکا ہے کہ نہ صرف دوسری صدی کے اوائل میں رومن کے ہاتھوں سپاہیوں کے بعد اس قوم کے اداۓ مسک دوسرے علاقوں کا رخ کیا مگر اسلام کی ایک دمشق آئے تھے جس کا سب سے سلی قوم کے یہی لوگ وہ ابراہامی بھی آکر آباد ہوئے۔

مختصاً ابراہامی بھی اس نام اہلار ملنا ہے کہ خطاطی حیرہ میں پہلے بیج گنا تھا اور حیرہ سے اس اور کو نہ پہچان لو اس میں جہد خط کے نام انہماک آچکے تھے

جاسچہ نہ نام۔ ہوا ہے نہ سلی خط۔ مادہ خوبصورت اور دلکش پہلے حیرہ میں رائج ہوا کہ اب کی ادنی تاریخ سے سہارا طلب کریں وہ حال کہ اس یقین کو لغویہ سمجھی ہے کہ عرب اقوام اور خصوصاً ابراہامی حیرہ اور حمال کی رہائشوں اور شہروں میں ادب کا اثر چھایا تھا اور خطاطی کی پوری تاریخ پہلے عربی ادب کا خطاطوں کے خط سے سے متاثر رکھا تھا اور یہ ان زبانوں سے حاصل کیا گیا تھا جو درمیان کے ہاتھوں بنیادی کے بعد سبنا، پلہ، لہرہ اور حیرہ سے آکر مہال آباد ہو گئے ہیں۔

گو سادی طور پر یہ خط خطی ہی سمنا مگر معنی رنگ کی آمیزش سے بہت اہم خط ابراہامی حیرہ اور حیرہ کہلا اور اسلام کی آمد اور کوفی آبادی کے بعد کوفی کے نام سے متعارف ہوا۔ اب حال یہ بھی طار کیا جاتا ہے کہ خطِ مند حیرہ اصل خطِ خطی اور خطِ سطر خطی کی آمیزش سے ایجاد ہوا، اور یہی آگے چل کر خطِ کوفی کہلایا ہے۔ لیکن اس کو یمن والوں نے اہل حیرہ کی وساطت سے ہی حاصل کیا تھا، اور بعد ازاں ممالِ مغربی رنگ کے بعد اب خط کی صورت سامنے آیا مگر غری خط کے قدیم نمونے دستِ باب ہوئے ہیں اس سے ایک طرف تو بات تابہرٹی ہے کہ غری رسم الخط دوسری صدی عیسوی میں رواج پا چکا تھا اور دوسری طرف اس کی مشابہت خطِ خطی سے ہوتی ہے اور خطِ خطی کی طرح ہی یہ رسم الخط غیر معیوب غیر عربی اور عراقی تھا۔ یہ خط خطوں کے خطِ کوفیوں نے مغربی رنگ میں رنگنے کے بعد رواج دیا اگر روایات کا سہارا لیا جائے تو روایات کے مطابق غری خطاطی دوسری صدی کی ابتدا میں آغاز پائی تھی اور خطِ خطی پر قیامت ٹوٹ چکی تھی۔ کائنات کا سہارا لیا جائے تو روایات تاریخِ مسمیہ صدی عیسوی کے وسط تک پہنچ جاتی ہے۔ اُمّ الجہال کی شاعری جس کا زمانہ ۶۵۰ء کے لگ بھگ کا ہے۔ اس اعتبار سے غری رسم الخط کی مائیت سے خطِ حیرہ باقیدم کوفی سے ہوئی ہے تیسری صدی میں عرب میں رائج ہو چکا تھا اور یوں لگتا ہے بیچ حیرہ اندازِ بنا کی ابتدائی صورت مگر دوسری صدی کے اواخر میں پہلی بھی

پانچویں صدی عیسوی میں مولانا العنبرؒ کی تصانیف خطِ حشرہ کی مکمل شکل میں ملتا ہے۔ جو چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا میں  
عس غمار (تاریخ تخریر ۲۸) کی تمام خصوصیات کا حامل تھا۔  
نقشِ زہد اور نقشِ حراں ایک طلب اور زہد راجل الماروز کے گرجے کے دروازے سے آہر ایل طے ہو  
ایسویں صدی کے آغاز سے اعلیٰ رکھے ہیں

**خطِ کوفی کا ارتقاء** اس میں کوئی شک نہیں کہ خطِ کوفی کو قرآنِ حکیم نے عروج تک لے مانے میں بنیادی  
کردار ادا کیا ہے۔ ابتدائی دور اسلام میں جب قرآن کی مدون کے بعد اسے عام  
مسلمانوں تک پہنچانے کا عمل شروع ہوا جو کئی فتومات نے اسلام کا دائرہ لامحدود کر دیا جیسے عہدِ نبوی کے  
سب قرآن پڑھنا، قرآن لکھنا اور اسے پھیلانا ایک مقدس و فضیلت کا کام سمجھا گیا۔ چنانچہ جہاں اس خطِ قرآن پڑھنے میں حسنِ ذرا  
مال کو پہنچی دین قرآن کی خطاطی نے بھی کمال فن حاصل کیا۔ چنانچہ قرآن کی خطاطی میں یورپی توابوں کا مظاہرہ  
اور اسی طرح فرض اور مقدس مانا گیا جس قدر کہ کلام اللہ، چنانچہ ایک طرف تقدس اور مذہبی عقیدے اور دوسری طرف  
بنالیاقی حسنِ کاری کے خطاطی کو تحقیقی توانائی سے ہم نگر کر دیا۔

اب خطِ کوفی روایتی انداز اور ناعدول کے نگہانے سے کل کر منہاجِ رمعت پر مبنی نکلا۔ اور ارتقاء کے کئی مرحلے طے  
کرے اور آئینہ کی نئی راہیں تراشنے لگا۔ اب خطِ کوفی کھجور کی چھال، پیچر کی تختیوں، لکڑی کے صفحات، کوال  
درہ کی قرطاس سے آگے بڑھ کر کاغذ پر اپنے فن کا مظاہرہ کر لے لگا تھا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خلافتِ علوی میں اسلامی مملکت کی مرکزیت مدینہ منورہ سے علیٰ کوفہ کی سمت  
ہو چکی تھی اور دورِ رومیہ میں اس کا رخ دمشق کی طرف ہوا۔ چنانچہ کوفہ، مدینہ، کوفہ کے بعد علی، ادنیٰ مرکز بھی تبدیل ہو کر  
سنتین پہنچے لیکن خطاطی کے حوالے سے کوفہ کی حیثیت مرکز سی ہونی جاری تھی۔ دورِ امیہ میں خطِ کوفی قرآنی خطاطی کے  
امور اور مملکت میں اہمیت پانے لگا تھا۔ سابعیوں صدی عیسوی تک بلاشبہ کتبِ غیر سے مذہبی اور غیر مذہبی بھی  
تحریر کرتے رہے۔

خطِ کوفی کے بارے میں ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ اسے خدا کی طرف سے قرآن کی خطاطی کے لیے مختص کیا گیا ہے جب  
کہ کوئی کسی دور میں جو صرف قرآن کے لیے مختص نہ تھا اور نہ ہی اسے آخری خط سمجھا گیا جو کہ زوالِ قرآن کے زمانے میں  
بخطِ مزج تھا اور اس دور میں نہ صرف قرآنی بلکہ خطِ کتابت کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس دور کے خطاطی ایک اہم مسلم  
کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اس میں اناسی اور معتز نے مثال پیدا ہو چکی تھی کہ مسیحی کے ادا سناء اور دوم نے اپنے تاجیوسی  
لیا جس کا آخر ہم مدار حلیہ پر خطِ کوفی میں کلمات تحریر کر لیے تھے چنانچہ جب عباسی دور شروع ہوا تو خطاطی کے ذیل  
میں ایک توانا و اہمیت ورثہ میں لای۔

ابتدائی عباسی دور میں پہلا استاد فن، اگرچہ خجلاں نظر آتا ہے اس نے قطب بن المحرز کے بار قلموں کا مدد

نوٹ: پبلک سنواری بلکہ اصلاح کر کے اس کے نئے نئے زاویے تلاش کیے۔

منصور عباسی کے دور میں اسحاق بن حمار کا بڑا چرچا ہوا۔ اس نے ضحاک قلموں میں اصلاح کے ساتھ کوئی کبر کئی طرز میں لکھنے کی کوشش کی۔

اسحاق کی تقلید کرنے والوں میں یوسف لغویہ اور ابوالعزم کا بڑا نام ہے۔ اسحاق ہی کے شاگردوں میں شہرہ آفاق الجبار، رومی، شمرانی، عروس سعد، الابنیں، سلیم، نادم، جعفر برکی کے علاوہ ایک خانوں شار نے بھی اسحاق کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ ابن ندیم الفہرست میں اسلام محمد بن اسحاق کے حوالے سے ذکر کرنا ہے کہ ہمدی عباسی کے اواخر تک اسلام بن ہار خطابہ وضع ہو چکے تھے۔ مٹی، گلی، بھری اور کوئی بگر جب ہم ال خطوط کا جائزہ لینے ہیں تو بھی ان میں ماسوا قدرے تمنا کی رنگ کے جذبے میں محسوس نہیں ہوتا۔ یہ قدیم کوئی ہی تھا جو اساتذہ من کے کمالات سے متنبہ ہو چکا تھا۔ بہر کیف خط کوئی کا جذبہ ذوق و رغبت ہاروں و رشید کی خلافت سے قدرے پہلے شروع ہوتا ہے جب خلیل بن احمد بخوی نے نہ صرف کوئی خط میں اصلاحات کے وسیلے سے اسے زیادہ دل آویز بنایا ہے بلکہ رسم الخط ارباب اور منقوط حرفوں کو از سر نو ترتیب دیا۔

اسحاق بن حمار کے شاگردوں میں دو نام ایسے بھی ممتاز ہوئے جنہوں نے فنی خطاطی کو کمال فنی عطا کیا۔ یہ ابراہیم السحری اور یوسف السحری تھے۔ النیشی ابراہیم السحری کا بیٹا جس کو خط کوئی نام طرز کی نسبت سبک رفتار قلم کہا گیا ہے۔ اس میں ہر لفظ کا منہ جو تمنا لکھا جاتا تھا اور غالباً اس نے آگے بڑھ کر خط لٹ کی صورت اختیار کی ہے جسے عربی میں خطاطی میں بڑی شہرت ملی۔

ابراہیم کے سہمی یوسف نے التلیش سے بھی زیادہ سبک سلم ایجا کیا جسے توفیقات کے نام سے موسوم کیا گیا اور اسی قلم میں نام زامین سناہیہ لکھے جانے لگے، اور دوسرے نام امور کے لیے اسے ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

خط کوئی شہرہ طرز کی نسبت سے ممتاز ہے اور کوئی جو طلوع اسلام کے بعد لکھ دیا گیا تھا۔ حقیقتاً میں ثقافت جبہ کا ذرہ تھا، اور میرہ ایک زمانہ تک ایک طاقتور علمی، ادبی اور ثقافتی مرکز رہا۔ چنانچہ خط حیرہ اس کی بزمیہ کی رنگی کا حصہ بن چکا تھا اور جو قبل از اسلام حجاز میں داخل ہوا، تو بالآخر خطِ امد کی حیثیت سے مصحف کی تحریر میں آنے کا اولین شرف بھی اسے ہی حاصل ہوا۔

شہرہ کے بعد فنی خطاطی میں خزیم کا آرائشی رویہ سامنے آیا۔ اور ۱۹۱ھ میں ایک نئے روزگار خطاط خالد بن الباج نے فنی خطاطی کا مظاہرہ کیا اور پہلی بار مسجد نبوی میں مصورت الشمس کی خطاطی برائے مصورانہ خطاطی کی اصلاح بنیاد رکھی خالد بن الباج نے یہ صورت خط کوئی میں لکھی تھی چنانچہ خط کوئی کی مصورانہ حیثیت ۱۹۱ھ کا گروہ بن گئی۔ خالد نے طبرہ خول مصورت انداز میں قرآن کی کتابت بھی کی جب عمر بن عبدالعزیز نے ان کے کمال فنی کو دیکھا تو اپنے لیے ایک قرآن لکھنے کی فرمائش کی مگر جب خالد سونے کے پانی سے قرآن کی کتابت کر کے قرآن لایا تو عمر بن عبدالعزیز اس خط

متاثر ہوئے کہ انھوں نے قرآن کو جو کم کر دیا پس کر دیا کہ وہ خالد کی محنت کا معاوضہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔  
خالد نے جہاں قرآن کی کتابت میں اپنا لہجہ منوایا دیا اس اشعار کی وصلیوں کی خطاطی میں بھی ایک ماہر کی حیثیت رکھتا تھا اور اس نے اس ضمن میں بڑا کام کیا۔

دوبارہ کہتے ہیں کہ اس خطاطی میں رجسٹری پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے مارے میں بہت مشہور ہوئی کہ انھوں نے خط کو فی سے چار قلم اسحاق کی تھی انھوں نے خط کو فی کو مزید طریقے پر لکھنے کے بجائے چار سے بڑھ کر اسحاق کی لکھنے والی خط کو فی کی طرح لکھنے کی کوشش کی تھی اور اس دور میں منصف کی کتابت کے لیے ابھی مالک میں دسار، ساجد بن یوسف، ابی سہب سے خط کو فی میں لکھنے میں کمال حاصل تھا۔

**عباسیوں کی خطاطی** بغداد کی راجدہ صفیہ ————— ابراہیم السحری کے سگوردوں میں

زوال المحرر نے بڑا نام پایا۔ صرف یہی کہ اس نے خط کو فی کی معرفت قلم الیاسی میں اصلاحات نافذ کیں اور اسے سب زبردست بنا دیا۔ اس کے بغیر سے ایک ایسا نام سامنے آیا جس نے خط کو فی کے سارے نظام کو متنبہ کر کے رکھ دیا۔ اور خط کو فی سے خطاطی کے ایسے نظام ایجاد کیے جنہوں نے جہاں کہیں خط کو فی کا عالم اسلام کا طرہ انبار بنایا وہیں یہاں سے فن خطاطی کو دنیا کے واحد خط، خط کو فی کی ملاستی جیسے کہ اسے ختم کر دی۔ یہ مجموعہ صفت سخفیت مشہور عالم فاطمہ، سحر، ریاضی دال، طیبہ صرف نحو کے اہل اور اپنے عمر کے مفکر سیاست دان ابو علی محمد بن حسن بن عبد اللہ بن مغلہ بنیادی تھا۔ جو نہ صرف خطاطی اور دوسرے علوم کا استاد تھا بلکہ حدیث، فقہ، علم لغہ، انشاء و ردائی، تجوید، شعر و ابجدی دینی علوم کے ساتھ فین الحیف میں کتنا سے روزگار تھا۔

اس مسئلہ ۲۸ سوال ۲۷۲ بعد میں پیدا ہوا۔ علم و ادب اور خطاطی کا فن اسے وراثت میں ملا۔ وہ اپنے وقت کے مورخ طاط الاحوال المحرر کا شاگرد تھا جس سے یہ نہایت زبردست اور ذہین تھا۔ جو انی میں مذکور رکھتے ہی انی فہم و اس کے باعث ممتاز ہوا۔ بغداد میں علم و ادب کے گہوارے میں جہاں وف کے بڑے بڑے عالم موجود تھے وہاں نے جو فی میں ہی جگہ پائی وہ تین عباسی خلفاء کے اذکار میں دوبرہا اور بالآخر سازس کا سب سے بزرگ مل کر آیا گیا۔

حرب بن امیر سے لے کر الاحوال المحرر کے زمانے تک خط کو فی ہر وہ امکانی ترقی کر چکا تھا جس کی کسی نے گمانے یا نہیں کی تھی۔ مگر ابھی خط کو فی سے آگے ایک جہاں باقی تھا جس کا آغاز بن مغلہ کے قلم سے ہوا والا تھا۔

ابن مغلہ کا باپ ایک ماہر خطاط اور صاحب علم شخص تھا۔ اس کا استاد المحرر اپنے زمانے کا صاحب اختیار تھا۔ مغلہ بن مغلہ بن مغلہ کے ساتھ استاد کے بغیر نے ابن مغلہ کو فن خطاطی میں اس منہب سے دیکھا۔

کرایا جس نے خطاطی کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

ابن مقفل سے قبل خطاطی کے لیے کوئی خاص قواعد و ضوابط نہ تھے۔ چنانچہ فنکار جو چاہتا تھا جس خطاطی میں ایک نظم نہیں رہا تھی اور قواعد و تناسب کے بغیر فنکار کی ذرا سی چونک خط کے حسن کو معرض حاکم دیتی تھی چنانچہ ابن مقفل نے سب سے پہلے خطاطی کے قواعد و ضوابط وضع کر کے خطاطی میں نظم کی ایک بنیاد رکھی۔ حروف ابجد کی ترتیب متعین کی جواب تثنیج حروف وغیرہ موجودہ طرز ہے۔

گرامر کو از سر نو ترتیب دیا۔ اعراب، ملا، جزم، تشدید و تنوین کے ساتھ فرہنگ درست کیا۔ پہلا آخر ۳۱۰ عیسوی میں لکھا۔ وہ کارنامہ انجام دیا جس کے سبب اس کا نام تاریخ سے کبھی خارج نہ ہو سکے گا۔ وہ جو نئے خطوں کی ایجاد تھا۔ تلم، ریحان، نسخ، توفیق، رقاع اور محقق اس معاملے میں چھ خط ایجاد کرنے کے بعد ان کے قواعد بھی وضع کئے اسے محمد بن مفاہد سے نکال کر اسلامی فنون الجہ کا ایک طاقتور حصہ بنانے میں اجتہاد کیا۔

خطاطی میں ایک تنظیم قائم ہونے سے عربی خط میں ایک حسن کاری کے ساتھ صوری موسیقی پیدا کر دی جیسے پہلوں کے امیر نے والے شہر ایک دوسرے کے فوازل کے آئینہ دار ہو گئے ہیں۔ اسی طرح ابن مقفل نے عربی خط میں نوازل و تناسب کا ایک ایسا نفاذ منہ فیاض کر دیا جو اس کے صوری حسن میں نے پناہ جس کا باعث بنا۔

ابن مقفل نے محض اجتہاد نے فن خطاطی کو نئے جہانوں سے روشناس کرایا۔ چنانچہ اس کی نئی روایات کو روح تک پہنچانے کے لیے ابوالحسن بن لعل البواب، زبیت احمد، الہرایی، یاقوت اول۔ یاقوت دوم، باقوت سوم، مستہر بھی باقوت سوم، ہمایون بن عبداللہ ریختی، قسیمی ایک ایسا اساذن تھا جس نے خط نسخ میں کمال فن حاصل کیا۔ اس کے ناماء، اسناد، دانش گاہ کا بڑا چرچا ہے جس میں اثران بن عبداللہ کامل، یوسف شاہ متہدی، سید میر حیدر علی نوبس، شیخ زارہ احمد، سر دردی، مارک شاہ بن قطب بنیر، میر عبداللطیف، صدر اقی، وہ صاحب قلم خطاط تھے جس سے آگے سلسلہ خطاطی دراز ہوا۔

یاقوت سوم آخری جاسم خلیفہ کے درمیان سے وابستہ تھے۔ چنانچہ آثار یوں نے جب بغداد کو تباہ کر دیا تو زبیر مکرزیہ مختصر مکملوں میں بٹ کر رہ گئی اور اس طرح ایک نیا مرکز ایران بنا۔

**ایران کا جدید دور** | بارہویں صدی ق م فنیقیوں نے عرب بھی اختیار کر کے فن تحریر کی دنیا میں انقلاب آفرین دور کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ آریوں نے اسے سنوار کر پھیلایا۔

اور اس سے بے شمار شاخیں چھوئیں۔ ان میں جدید ایرانی، عربی، کوشی، ایرانی کے ساتھ ساتھ پہلو کی رسم الخط بھی تھا۔

کسی بھی تہذیب کی شرقی یا غریبی ہر شکل دلیل اس کے رسم الخط سے ظاہر ہوتی ہے اس لحاظ سے ایران اپنی روایات میں ایک طاقتور ثقافتی ملی، ادبی، تہذیبی مدنی ممالک ہے۔ اسلام کے ایران پر غلبہ اور سامانی

حکومت کے خاتمے سے جاں آتش پستی کے نہ ہب کو دیں نکالا ملا۔ وہیں قدیم پہلوی رسم الخط بھی رخصت ہوا اور پہلوی زبان کے لیے عربی رسم الخط اختیار کر لیا گیا۔

عربی رسم الخط کی تیزی سے قبولیت کے پیچھے بھی دی فلسفہ کا رفاستنا جس کے تحت دوسرے علاقوں میں عربی کے ساتھ عربی رسم الخط قبول ہوا۔ ایران میں اسلام کے پھیلنے زادوں میں قرآن کی تعلیم کا رجحان بھی بڑھا اور قرآن کی تعلیم کے بنیادی غام میں خلائی کا فنی اتنا ہی اہم ہے جتنا طرہ عنا۔ چنانچہ عربی خطاطی نے بہت ملہ ایران میں اپنے لیے جگہ بنالی اور آٹھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے نہ صرف عربی رسم الخط پوری ایرانی زندگی پر محیط ہو گیا بلکہ اس میں اصلاح کی طرف توجہ دی جانے لگی۔

قلیغہ ناموں الرشید کے زمانے میں خراسان علم و فن کا مرکز بن گیا مینا اور آہستہ آہستہ تمام علوم و فنون کے ماہر خراسان کا رخ کرنے لگے تھے۔ یہاں ان تمام ملاقوں میں مشترک نظر آتی ہے کہ جہاں جہاں اسلام گیا وہاں وہاں اخلاقی مساوات اور تعلیم کا امتیاز رنگ و نسل مسلم ثقافت کے ایک واضح رجحان کو ظاہر کرتی چلی گئی۔

ایران میں بھی یہی ہوا مسلمانوں کی آمد سے صرف ان کا مذہب متاثر نہیں ہوا، زبان، رسم الخط، ادب اور ثقافت بھی نئے رنگ نئے رنگ اختیار کرنے لگی۔ چنانچہ فارسی کا سلاشری نظام عربی سے مستعار ہے۔ عربی رسم الخط کے تمام ارنمانی سرطے مدد مدد ایران میں مقامی رنگ اور ذوق کے اعلیٰ مذاق کے سبب زیادہ تیزی سے طے ہونے چلے گئے، چنانچہ چوتھی صدی میں جب عرب میں خط ایجاد ہوئے تو ساتویں صدی میں ایران نے زبان اور نوعیت کی آمیزش اور قلم برد سے ایک نیا خط ایجاد کر لیا جس کا نام تعلیق ہوا۔ یہ خط جس بن جس علی فارسی کے قلم کا کارنامہ تھا عربی حروف فارسی آوازوں کے لیے ناکافی سمجھے جانے تھے اور کئی آوازیں اسی تھیں جس کے لیے عربی میں حروف نہ تھے۔ چنانچہ عربی رسم الخط میں اصلاح کی پہلی کوشش خواجہ عبدالعالی بک نے کی اور پ، یح، ژ، وگ ایجاد کیے اور ساتھ ساتھ ہی خط تعلیق میں اصلاحات کیں۔ نئے حروف کی ایجاد سے جہاں ایک طرف عربی حروف فارسی آوازوں سے ہم آہنگ ہوئے وہیں تعلیق کے حسن میں بھی اضافہ ہوا تعلیق میں سلسل اصلاحات کے سبب محققین کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے خواجہ عبدالعالی کو خط تعلیق کا مجدد لکھنا شروع کر دیا۔ تعلیق کے سلسل میں مولانا درویش کا نام بھی بڑا اہم ہے جس کے علاوہ تعلیق کے ضمن میں خواجہ عبداللہ صرہنی، ملا علی الدین تیرازی، ملا عبداللہ آتش پرہیزی، ملا ابوبکر صرہنی، ملا شیخ محمود، حافظ حفیظ اور خواجہ عبداللہ مردوار بھی آگے چل کر اہم دور ماہرین تعلیق بنے ہیں، اور ان متاثرین کو اساتذہ ہفت قلم کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اسی دوران ترکیہ میں ان خطاطوں سے دمشق، دیوانی اور فارسی قلم ایجاد ہوئے۔ ایرانیوں کو جب منگولوں کے حملوں سے نجات ملی اور امیر تیمور منہ اقتدار پر پہنچا تو خطاطی کی دنیا میں انقلاب آفرین تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ مگر ابھی یہ فن کسی قدر زمان کی نظر کرم کا منتظر تھا۔

تعلیق ایران کی سخی زندگی اور نسخ مذہبی کتب کی کتابت کے لیے مخصوص ہو چکے تھے۔ ثلث، آرائش اور دوسرے



خط بھی کہیں کہیں نظر آتے۔

تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے وسط تک ایرانی خطاطی غروج پر نظر آتی ہے۔ اب بھی اس کا فائدہ معاصف کی خطاطی میں ہوتا ہے۔ مگر اس کی آرائشی اور فن تعمیری مشارکت سے نئے رجحانات نمایاں ہونے لگے تھے۔ اس دوران معاصف کی کتابت میں شاندار ارتقاء نظر آتا ہے۔ کیونکہ تاناریوں کے قبول اسلام کے بعد انھوں نے فن مصوری اور خطاطی کے اختلاط سے آرائشی اور مصوری خطاطی کے رنگ ظاہر ہونے لگے جو بصورت رنگوں آمیزہ سے قرآن کی خطاطی ایک نئے دور میں داخل ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

قرآن کی جدید خطاطی اور نئے رنگ و دھنگ آئے کے لیے ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں۔ جو اہل مانی دور اس سے ذرا قبل کی خطاطی کے بارے میں کئی سوالوں کا جواب دیا کرتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر تفصیل سے بات کی تھی کہ ایران کے قبول اسلام کے بعد عربی رسم الخط بھی ایرانیوں میں آیا۔ اس وقت عربی خط میں خط کوئی مستقل ہوتا۔ اور ابھی اس نے نیا نیا معاصف کی خطاطی کا ذریعہ بننا شروع کیا۔ پھر جب خط کوئی ایران میں آیا تو اس کے افقی اور طویل زاویوں کی نسبت عمودی حصوں پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خط کوئی کی ایران میں قدرے مختلف شکل سامنے آئی اور اس کے آرائشی پہلو میں آہستہ آہستہ توجہ مرکوز ہوئی کہ جب حرف جملے میں بدلتا تو ایک غیر محسوس منظم صورت اس کے حسن کو دوبالا کر دیتی۔ یہ ابتداء تشکیلات تھیں اور اس خط میں لکھا ہوا قرآن جو چرخی کاغذ پر ہے اسے دیکھ کر بہت بعد میں سامنے آنے والے عباسی دور کے آرائشی خطوط سے مشابہت ایرانیوں کے ذوق کمال کی داد دیا کرتی ہے۔

چھوٹی قطع پر لکھے ہوئے ایک چرخی قرآن کے چند اوراق پیر و طین میوزیم نیویارک میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان کی ورہ عوامانہ کی ملک کاری ماسیور کے نقش و نگار سے مشابہت رکھتی ہے۔

پانچویں صدی ہجری کے اوائل سے چھٹی صدی ہجری کے اواخر تک اس دور میں خط کوئی معراج کی ابتدا میں نظر آتا ہے۔ خط اس دور میں صرف مصحف کی خطاطی میں کمال نہ رہا بلکہ آرائشی خطاطی اور دوسری خطاطی میں بھی حسن و تہذیب کی اس بارگاہ بنیاد بنیاد کے گرد حاشیہ اور نقوش بنائے گئے۔ کئی کئی کمال دکھائی دیتے ہیں۔ پھر شمس میوزیم میں اب تک دیکھے گئے صفحات موجود ہیں جن کو دیکھ کر سب جویوں کے تصور میں اندر خطاطی کا داد دینی ٹیڑھی ہے ان معاصف کو ابو القاسم بن ابی اسیم نے کتابت سے آراستہ کیا تھا۔ اس ۴۲۷ھ (۱۰۲۹ء) کا تاریخ درج ہے۔ اسی دور کے دو صفحات پیر و طین میوزیم نیویارک میں بھی محفوظ ہیں۔ یہ ایرانیوں کی میں اب اور سلفیوں کے ذوق نقش نگاری سے کما حقہ آراستہ ہیں۔

ایک ذوق پرست کا خیال لکھا ہے دو سے دو تین پر متعدد رنگوں (خصوصاً سنہرے رنگ کے ساتھ سورہہ کی کتابت کی گئی ہے۔ اور اس صفحہ پر سورہہ کی ابتدا سبزی روشنائی سے جلی حروف میں تحریر دکھائی دیتی ہے۔

بعد ازاں تعلیق اور نسخ کی خوبیوں کو یک جا کر کے خواجہ میر علی تبریزی نے تسلیق کو ایجاد کیا۔ نسخ اور تعلیق کی نسبت تسلیق کی پیوند کاری میں سبک اور زراعت پہلو ہو گئی اور لفظ کے صورتی حسن میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

علامہ ابوالفضل نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور ان کا خیال ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے ابتدائی دور میں تسلیق کے نمونے دکھائی دیتے ہیں مگر اس صدی ہجری کے ابتدائی دور میں تسلیق کے نمونے دکھائی دینے کی کوئی دلیل دکھائی نہیں دیتی۔ میر کیف اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ خط کسی لاشعوری اور بغیر نام کے پہلے موجود بھی تھا، تو خواجہ میر علی تبریزی کی اجتہادی حیثیت مجروح نہیں ہوتی کہ اس اشیا و تو بہر حال پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ موجود انھیں قاعدے اور کلیہ کے ساتھ متعارف کرتا ہے۔ اس نسبت سے خواجہ میر علی تبریزی کی حیثیت موجودہ تسلیق کی ہی ہے اور محققین نے ان کی اس حیثیت کو بلیغ نہیں کیا۔ خواجہ میر علی تبریزی سے کسب فیض کرنے والوں میں مولانا جعفر تبریزی، مولانا ظہار و سلطان علی شہیدی کا نام اہم ہے۔ سلطان علی شہیدی ہرات میں سلطان حسین مرزا کے دربار سے وابستہ تھے۔ اور مرزا سلطان علی شہیدی کو سلطان حسین مرزا نے قبلہ الکتاب سے خطاب دیا تھا۔ ۶۰ سال کی عمر میں ۹۱۹ھ (۱۵۱۲ء) میں وفات پائی۔ ان کے شاگردوں میں سادہ خطاط جنھیں اسناد خان خن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تسلیق کے صاحب طرز خطاط تھے۔ ان میں سلطان محمد خندان، سلطان محمد نور، علاء الدین محمد ہروی، زین الدین محمود، عبدی نیشاپوری، مولانا محمد ناسم شادی شاہ، مولانا محمد عبداللہ ہرزی اور میر علی الکاتب ہروی شامل ہیں۔ سلطان علی شہیدی نے ہم نام چار خطاط بھی تھے۔ سلطان علی فانی، سلطان علی خراسانی مشہدی، سلطان علی قرظی، غنی ال چارنل کی دہلیاں ہندوستان میں بھی مشہور ہیں۔

تیموری دور میں کتابوں کی آرٹس میں فن خطاطی نے بڑا عروج حاصل کیا۔ حرفوں میں یودول، جانوروں کی سیسہیں بھی نظر آنے لگیں تھیں۔ ان کے رنگوں کی آمیزش سے نہ صرف حرف بکھر کر خوب شرمیلی دکھانے لگے بلکہ پورے صفحہ کا حسن انہی طرف کھینچ لیا تھا۔ اور ان کے عمدہ ذوق کا اظہار ہوتا تھا نہ سنہرے، نہ خرمزی و آسمانی دسرح اور سبز رنگوں سے حرفوں کی بڑبڑ کرنے اس ضمن میں امیتور کے بیٹے شاہ روح اور بانسقر مرزا کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے اور تزیینات قہر بریں بہترین مثال ہیں۔

ہرات کی خطاطی کے دبستان کا لغیس نرس فلمی نسخہ ۱۴۲۹ء کا ہے جس میں اس دور کے معروف رنگ اور ڈبچک نظر آتے ہیں۔

تیموری دور کے بعد صفوی دور میں بھی فن خطاطی کو بہ دستور عروج حاصل ہوا، اس دور میں کمال الدین ہزارا، سلطان محمد نور (سلطان علی شہیدی) شاہ محمود نیشاپوری، میر غیاث حسین گوہر تاج، بیگم علاء الدین تبریزی، ہزارا احمد تبریزی اور محمد ہاشم تبریزی کا نام بڑا درجہ ہے۔

صفوی دربار (تبریز) میں سلطان محمد نور کو بڑا مقام حاصل تھا۔ ۱۰۱۲ھ کا ایک نسخہ اب تک اس کے فن کا شاندار اظہار ہے۔

شاہ محمود دوسرا حسین شاہ اسماعیل ماز شاہ طہاسب کے دربار سے منسلک تھے۔  
اس دور میں ملا محمد حسین تبریزی، میر سید احمد شہیدی، ملا حسن علی شہیدی، ملا شاہ محمد نیشابوری، میر معز کاشانی اور  
مرزا ابراہیم اصفہانی قابل ذکر خطاط تھے۔

اس کے علاوہ میر علی الکاتب کے تلامذہ میں حواجر اسحاق شہبانی، سید احمد الحسینی شمع ریز، جبرئیل حسینی، علی رضا تبریزی  
بابا شاہ اصفہانی اور قاجاری دور کے خطاطوں میں مرزا کوچک زحال شیرازی، زین العابدین اشرف الکتاب، علی رضا رتو  
اور نامور ماتون مہم بانو باجی کے ذکر کے بغیر تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

اب میں ایلاں کے باب کو اختتام تک لانے کے لیے میر غلام الحسینی سیفی قزوینی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے سارے  
زندگی نو درویشانہ بسر کی مگر فن کی دنیا میں انہیں جو مقام حاصل ہوا اس کی فیکر بہت کم دیکھائی دیتی ہے۔ میر غلام کو  
استادان فن خطاطی میں سے ایک سمجھا جاتا ہے جنہوں نے نستعلیق کی بلند و بالا عظمت سکھائی کی۔ ہندوپاک میں شاید  
کوئی خطاط ایسا ہی جس کا سلسلہ تلامذہ میر غلام سے جا کر ملتا ہو۔

میر غلام کو نستعلیق کے استاد تھے مگر انہیں ہفت تلم اہر خطاط کا بھی درجہ موصول تھا۔ تبریزی کی اکثر عمارتوں  
اس کے لکھے ہوئے کتبات اور وصلیاں اب تک محفوظ ہیں۔

میر غلام کی شہرت اس کی زندگی میں اس قدر ہو چکی تھی کہ ترک ہند اور عرب ملک اس کے نام کے چرچے تھے۔  
میر غلام نے گنا باز میں عیسیٰ رنگ کا راز تبریزی ملا محمد ضیے تبریزی سے تربیت حاصل کی۔ میر غلام جو نستعلیق  
بھاری کے ضرب النعل میں شاہ عباس صفوی کے دربار سے وابستہ تھے۔ ایک بار شاہ عباس نے حکم دیا کہ شاہنامہ فردوسی  
کو خط نستعلیق میں تحریر کیا جائے اس سے آگے کئی روایات ہیں۔ چنانچہ خود دوزیادہ حوالے کے طور پر آتی ہیں ان کا  
تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے دربار میں ایک کاتب مصطفیٰ عباسی اس سے دشمنی کی حد تک حد کر رہا تھا جب ایک سال بعد وہ  
نے بجام پہنچا کہ شاہنامہ لکھا جا چکا ہے کہ جس اور ساتھ ہی سر فرما بھی ارسال ہے۔

میر غلام نے جواب دیا کہ ستر اشعار لکھے ہیں اور سفام دیا کہ سہ ہزار بھی اس سے زیادہ کفایت نہیں کرتی۔ شاہ نے سنا  
نودہ بہت ناراض ہوا اور اس نے بہ استعارہ لڑا دیے پہلے شاہ کی مارا لگی کی مرزاہ کیے بغیر انہیں اپنے شاگردوں  
میں تقسیم کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جب میر نے سنہ شعر دے نو شاہ نے سنہ لوال مطا کے تو میر نے طواف شمال سمجھ کر  
واپس کر دیتے جس سے شاہ نے اپنی قوم میں حسرت کی۔

تیسری روایت یہ ہے کہ جب شاہ عباس نے میر غلام کو یکام سپاہی تو اس نے شاہ سے کہا کہ اسے ایک باغ دیا جائے  
جس میں ایک خوبصورت تالاب ہو جس میں غرق گلاب بھر دیا جائے۔

شاہ عباس نے مطالبہ پورا کر دیا مگر ایک سال کے بعد جب شاہ نے شاہنامے کے بارے میں پوچھا تو میر نے

بایا کہ صرف ستر بیت کتابت ہوئے ہیں۔ سناہ صحیح ناراض ہوا، اور اس نے میر سے کہا کہ دو اب تک لاکھوں تو ان میں خرچ کر چکا ہے ایک دن کے اندر لوٹائے۔

میر عادیو! پس آیا۔ اور اس نے نہ ہی ستر استعارہ فروخت کر کے آدھے دن میں رقم لوٹا دی۔ جسے سناہ نے اپنی توہین سمجھا اور وہ سخت ناراض ہوا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ میر عادیو العقبہ تھا اور سناہ تنیدہ تھا۔ چنانچہ رضا عباسی نے حسد اور انتقام میں شاہ کے سامنے ایسی باتیں کہیں کر دیں کہ وہ ناراض ہو گیا۔

اس میں سنی حقیقت کچھ بھی رہی ہو، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میر عادیو جس کی عمر اس وقت ۶۲ سال تھی ایک شام حمام گیا وہاں سے وہ باہر نکل رہا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔ محققین اس بات متفق ہیں کہ اس کو قتل کر دیا گیا محض اس لیے کہ وہ میر عادیو سے اس پر بھی معنی ہیں کہ اس کے قتل میں سناہ عادیو کا کنبہ شامل تھا اور اس طرح میں خطاطی اپنے اسناد وقت سے محروم ہو گئی۔

**مغل دور کا آغاز** | سلجوقیوں کے امصار نے ملوک کے انزلیہ اصلہ ختم کر کے اسے علامتی طلیف بنا دیا تھا لیکن معلول کی آمد غلیف کی۔ حشمت بھی مافی نہ رہی اور ملوک حوالے ۱۲۵۸ء میں آخری

عباسی طلیف کا اختتام کر کے اسی ایک ہی ریاست کی بنیاد ڈالی جو ملوک کی طلیف سلطنت کا پیش جیمہ ثابت ہوئی۔ معلول کے بڑھتے ہوئے تقاضی سلاب نے اسلامی دنیا پر تسلیم ہونے، اسلامی علوم و فنون کے آگے بڑھنے کے واسطے ہی کو نہ روکا بلکہ ان علاقوں میں اس کے ارتقاء کے احکامات بھی ختم کر دیئے۔ اہم نمبروں میں ایسی نام ترقی و حشمت و تربیت کے باوجود اپنی طرز کے اسلامی آرٹ کی نشوونما کے لیے بڑا کام کیا۔

سولہویں صدی میں معلول نے ہندوستان کا رخ کیا۔ اہل اور ہمالیوں کے ادوار میں ابرانی اتراب ہند کی بروج فنی اصناف پر چھائی رہی۔ مگر اگر کے دور میں آکر ابرانی اتراب کم ہونے لگے، اور رفتہ رفتہ ہند میں معلول کی آباد تقاضی لہر پیدا ہونے لگی۔

اہل کو فنون لطیفہ کے مرنی کی حقیقت حاصل ہے۔ معلول نے فنی مصوری فنی تعمیر اور فنی خطاطی پر بڑی توجہ دی۔ فنی خطاطی اس کے اجداد کا بندہ نہ فنی تھا۔ چنانچہ اس نے اس فن کو سیکھا اور بہت قلم کھلا۔ اہل عرب ہندوستان آیا اور حال وہ مصوروں سنگ تراشوں، ماہرین تعمیرات، شاعر، ادیب اور مورخ لایا اور اس خطاطوں میں خواہر بہرہ مہر سب ملے شیخ زین خوافی بھی اس کے ساتھ آئے۔

اہل کے بعد ہالیوں ۹۶۲ھ کے تخت سمن ہوا۔ مگر سہ شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر ابراہان ملایا اور برسوں کی جلاوطنی کے بعد جب دلی کے پایہ تخت پر فائز ہوا وہ قابل استادان فنی خواہر عبدالعزیز سوری اور میر علی کو دربار میں بلوایا اور ان سے مصوری اور خطاطی کے چارہارے تخلیق کروائے۔

اہل نے فنی خطاطی کی جس طرح بنیاد رکھی ہمالیوں نے بھی اس اس ان از سے اس کی آبیاری کو نہ چاہی

مگر وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا۔

ہمایوں کے دربار میں غیاثی کے علاوہ چند ہالونی کے امور خطاط خواجہ سلطان علی بھی تھے جنھیں بعد میں اکبر نے افضل خاں کا خطاب عطا کیا تھا۔

میں اوپر بال کر چکا ہوں کہ خطاطی باعث عزت پیشہ گردانا جانا تھا چنانچہ ملکہ گلبدن نے جہاں ہمایوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے وہیں فی خطاطی میں اس نے کمال حاصل کیا اور اس کا نتیجہ تھا کہ نوری جہاں آرا اور زینب النساء، یعنی نے جہاں شعر و ادب میں ایسا سکھایا وہیں فی خطاطی میں جو ہر دکھائے۔

اکبر دور صف میں منزل لطف کے باب میں سبزی دور ہے۔ یہاں فی خطاطی نے ایشیائی، آصفی، سائل طے گیر اکبر معصوم کا دلدادہ بھی کیا جبکہ فی معصوم میں آرائشی خطاطی نے ایک نئے انداز سے پرمیلائے۔

اس دور میں استعلا، معصوری کہنے کا رجحان رواج پا رہا تھا۔ چنانچہ لے سار کتب آرائشی خطاطی اور معصوم کے ساتھ ساتھ آنے لگیں اسٹائلز اور ہمارے اور ہمنندی کے قوسہ دکھا رہے تھے اس دور کی معصوماء خطاطی کے بہتر نمونے آج بھی دنیا کی مختلف لائبریریوں میں حاصل طور پر پتھر و پلٹیں موزیم ادبیکس میں موجود ہیں۔

مغلیہ دور میں لے شمار نامور خطاط پیدا ہوئے جن میں محمد قس قسٹری، خواجہ عبدالصمد بسادی، دست موہا عبدالعزیز، خواجہ محمد شریف، عبدالرشید و ملی، امانت خاں شیرازی، مرزا عبدالرحیم خاں ماناں، میر معصود خاں باری اور مولانا معصود بہروی، میکس کالی، احمد حسن حسنی، علی احمد بہرکتا، مرزا محمد حسن، میر عبداللہ شیرازی، خسرو شاہ سلطان پرویز شیرازہ، محمد دین اسحاق، احمد علی ارشد، عبداللہ قیہ دار، سارف باخوت رقم، میر محمد کاشی، سید علی جیسی اور دوسرے بہت سے نامور خطاط گزرے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم  
قطع  
کتاباں را بہت خط باشند بطرز مختلف  
تحت و ریحاں و محقق نسخ و توفیق و رفاع  
بجداراں تعلیق ایں خط است  
از خط توفیق استنباط کردہ اختراع  
از دست مولانا جی  
کتب خانہ سید علی نقی حیدرآباد  
میرزا قاسم علی خان حیدرآباد



جس کی ڈیجلیس — نسبی اور معرہ کی روپ میں ظاہر ہو جس نسبی نے آگے چل کر نویں صدی عیسوی میں خط نسخ کی شکل اختیار کی۔ اس خط نے عباسی دور میں کافی ترقی کی۔ اس کا سب سے بڑا مآبہ حال الدین یا قوت المستنصری (المتوفی ۱۱۹۸ء) ہے۔ ہرمن و ہنر مسترقیہ کے مخطوطات اس خط میں دستیاب ہیں۔ عباسی دور طویل ہونے کی وجہ سے خطاطی، جلد سازی، فہرست کاری اور معرہ کی لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہارون رشید کے حکم سے کاغذ کا استعمال عام ہوا۔ خط کو فی کتب، نمازات اور غاروں کی مالکوں کے لیے مخصوص ہو گیا۔ خزان اور سرہر لوح ایجاد ہوئے۔ لاجوری روشنائی تیار کی گئی۔ یا قوت سے پہلا ابو علی محمود بن علی المستہر ربان غفرلہ اور ابو الحسن علی بن ہلال المعروف — اس تواب نے کافی تہرن حاصل کی۔ ثلث اور نسخ خطوط نے اپنا ایک مستقل مقام نالما طرز مرصع بھی مقبول رہا۔ یا قوت کے سامعہ ہی مرقعات کا دور بھی شمرع ہوا۔ عربوں صدی عیسوی تک خط نسخ ساری دنیا کے اسلام کا خط تھا۔

۱۲ویں قمار کے بعد اسلامی تہذیب کا گہوارہ ایران قرار پایا۔ ہدائن خطاطی کا مرکز بھی ایران قرار پایا۔ گہواروں صدی عیسوی کے لگ بھگ — اسلامیوں نے فارسی راہ — ادب کے لیے خطاطی کا ایک — خط بھی لیے کھلے جو تصویر کی وجہ سے رازہ مقبول نہیں ہوا۔ عربوں صدی عیسوی تک اس کا رواج رہا اور عربوں صدی عیسوی کے سب سے مکمل اور بہترین خط، خط نستعلیق کو جنم دیا۔ دستاویں چھٹا کاری اور دائریل و لغاط کا ماہر انہ استعمال اس خط کی خصوصیات ہیں۔ نستعلیق کے معاز کا تب ہیں میر علی خوزنی، جعفر و نظم بیری، سلطان علی مشہور، سلطان محمد نور، خنداں، میر علی ہرقی اور میر غاد و فہرہ۔ ایرانی خطاطی و معرہ نے اسلامی مخطوطات کو جو تصویر کی اور دمار سجا۔ ایران کے معازر کی لیے یہ زماں و ادب کے لیے خط دیوانی ایجاد کیا جو نہاب دقت اور نہایتی سجا اسی کو آسان بنانے کے لیے خط رقعہ معرہ ظہور میں آگامیزوں کی اہم ایجاد طرہ مراہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عربی طرہ طرہ کی زری بافتہ شکل ہو لیکن طرہ کی ایجاد کی تاریخ متعین نہیں جب کہ خط دیوانی و رقعہ عربوں صدی کی ایجاد ہیں اس کے بعد طرہ طرہ بھی ملے لگتا ہے۔ اس میں کسی کسی رسم الہ کو اس طرہ سے لکھا جاتا ہے کہ یہ عبارت سر سرہی نظریں دیز ابن اعلیٰ بالصدیر نظر آتی ہے۔ اسی طرہ سے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی اور آج تک رائج ہے۔ اس کے مختلف شکلوں کے مختلف نام ہیں جیسے طرہ اس، ہلال اور مکو سر وغیرہ۔ ترکی طرہ سابق طرہ والے کی دہی نکر کا امتحان ہے اور اس کی اگلی شکل طرہ معمرہ ہے۔ نستعلیق کی خوبصورتی اور چھٹا کاری نے کاتبوں کو مجبور کیا کہ وہ زود نویسی کے لیے کوئی خط اپنائیں۔ خط حکمریہ جو سترہویں صدی عیسوی کی پیدائش ہے، اسی مشق کا نتیجہ ہے۔ خط شکریہ کی اصل واریخ شکل خط شفیقہ ہے جو ایران میں مقبول ہے جب کہ خط شکریہ نے ہندوستان میں ترقی کی۔

نفر یا بارہویں صدی عیسوی سے خطاطی کا مرکز ہندوستان منتقل ہونے لگا۔ فاناں غلامان کے عظیم الشان ادنا نے کھلے دل سے اس فن کی سرپرستی کی۔ کہتے ہیں خود سلطان ناصر الدین فاج بہترین خطاط تھا۔ قطب الدین ایبک — امیر اور رضہ دغمرہ نے بھی اس فن کو ابھرنے کے مواقع فراہم کئے۔ قطب، غفرلہ، اور لودی سلاطین نے بھی خطاطی کی ترقی میں





سلطنتِ ہند کے زوال پر دکن یا پنج راستوں میں تقسیم ہو گیا مگر ان میں بجا پور کے عادل شاہی اور گولکنڈہ کے قطب شاہی ایسی طوئیں تھیں جنہوں نے مغلوں سے اپنا لوہا منڈا لیا۔ ان کے خاندانوں کے متعلق خصوصاً بے کزاد ہواد نہیں ملتا۔ رسم پجیاں کا استعمال ان تمام سلطنتوں میں ملتا ہے جنہوں نے بے کزاد ہواد کے لیے مخصوص طرز ہے۔ عربی مذہبی زبان تھی نو عاری سرکاری۔ عادل شاہوں نے بہ دن (مرثیہ یادگاری) کو بھی تسلیم کیا۔ اسراہم عادل شاہ اول، ابراہیم عادل شاہ ثانی اور علی مابشاہ دوم نے اس سلسلے میں عملی قدم اٹھائے۔ ابراہیم اول نے اسے عربی زبان اور عربی رسم لکھا۔ اسراہم ثانی نے صرف فارسی و سنسکرت کی جگہ اور بعض شعراء کی بھی مرثیہ کی عملی دوم نے بعض شعراء مرثیہ کو ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ سلطانین، تکت، نسخ، رسال اور شک نہ راجح الوقت خطوطا سے۔ عادل اور مرععات کا بھی استعمال ہوا۔ بعد بھی جو سوسائٹی کا اہم مرکز رہا۔ محمول اس دور کا مشہور دکنی مصور خطوط ہے جو بہ سالانہ جنگ میوزیم کی زینت ہے احمد نگر کے مغلوں کی وجہ سے زیادہ مواقع ہیں لیکن مہر علی اہلس چار ماہ شاہوں نے جس خطاطی کی بھرپور مدد ملی اس کے علاوہ یہاں کی صورتی بھی ماضی ہے

اس سب سے زرخیز کی آخری گڑھی ہے مغلہ قطب شاہیہ گولکنڈہ کے اور حیدر آباد میں قطب شاہی بادشاہوں نے عرب فارسی دکنی زبان واد۔ اور خطاطی کو اجاگر کیا مگر قومی مہم جوئی اور آدمیت کی عملی تعلیم دی۔ ان عظیم سلاطین نے اپنی زبان کی ہندو کو محکمہ لکھایا۔ اسراہم علی شاہ کا معبد ماس، آب۔ زمیں رائے رائے سمیت ملا تھویر تھویر نیشاپوری اسی کے دور کا پہلا خطاط ہے۔ اس کا فرزند اول عبدالعزیز علی درجے کا خوش نویس تھا۔ انی مہر آباد و جابینا محمد علی قطب شاہ نے علوم و فنون کی جس طرح فدا و فرائی کی اس کی نظیر میں کراہی مشکل ہے کہنے میں کہ وہ مغلہ بھی جابینا سمیت اس کا فارسی طام بھی ملتا ہے مگر اس کا سب سے اہم کارنامہ دکنی کتاب ہے میزبوس اسراہم آبادی اس کے وزیر اور زبردست عالم و خطاط محمد علی قطب شاہ تھے۔ ان کے دکنی دیوان محمد اور میزبوس کی تحریر کے نمونے سالار جنگ میوزیم کے کتب خانہ میں دیکھے جاسکتے ہیں مختصر یہ کہ یہ قطب شاہی نے کئی اہم کتاب دیئے جیسے روح الامین، حسن العرش، لال خوشدل، محمد قطب شاہ، محی الدین، بادشاہ قلم، خوشنویس خاں، غریب الکاتب شہزادی، ان فاتوئہ علی بنخشاہ عبدالعلی طالقانی، ملا اویس خوشنویس اور احمد راؤ دیہہ زفرہ، خطا تکت، خطا تعلق سے زیادہ مقبول تھا دکن کے بے کزاد ہواد میں مغلوں کے ہاتھوں عبداللہ قطب شاہ کا سب سے قیمتی کتاب خانہ تباہ ہو گیا۔ اس دور کے نمونہ خطوط وافر تعداد میں ملے ہیں۔ وہ شکستہ اور طرز انفرادی معیول سے قطب شاہوں کی شکست سے دکنی تہذیب کو بے مد نقصان پہنچا، اور ایک بار پھر شمالی ہند کی روایات نے تسلط پایا۔ حیدر آباد، جیجا پور اور اندرنگ آباد وغیرہ میں علم و ادب جاری رہے مگر ان میں وہ وقار نہ آسکا۔

آصف جاہی سلطنت کے قیام کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر فارسی وارد و زبان و ادب نے ترقی کی کئی علامتیں دکھائی دیں۔ نظام الملک آصف جاہ کے فرزند ناصر جنگ شہید بہترین خطاط تھے۔ آصف جاہ ثانی کے



# آندھرا پردیش: شاندار ماضی کی بازیافت کی طرف رواں دواں

آندھرا پردیش اپنا شاندار ماضی رکھتا ہے۔ بہ علاقہ زیریں اور ترقی یافتہ رہا ہے اور یہاں کے لوگ بہادر اور حوصلہ مند رہے ہیں۔ اس زمانہ میں صنعت و صنعت نے نمایاں ترقی کی تھی۔

ستھیا واپان، انڈیا ٹو، کاکتیا اور جے نگر کے سلاطین کے دور حکومت میں تلگو زبان ملک کے کونے کونے میں پھیل چکی تھی۔ نئی حکومت جو سٹر این ٹی راما راؤ کی زیر قیادت قائم ہوئی ہے، چاہتی ہے کہ دوبارہ وہی ماضی کی خوشحالی اور بہتری لوٹ کر آئے۔ اس سلسلے میں ۳ ماہ کی قلیل مدت میں نئی حکومت نے بڑے اہم فیصلے کیے ہیں۔ ریاست کے کانوں کے لیے ۲۰ روپے فی کنٹنل کے حساب سے سب سیدی کا کاغذ ہوا ہے۔ ۲۵۳ لاکھ مکانات کمزور طبقوں کے لیے تعمیر کیے گئے ہیں اور غریبوں کے لیے ۲ روپے فی کیلو چاول بھیا کیا گیا ہے۔ اسمبلی میں ایک تہہ در تہہ کے ذریعہ خواتین کی فلاح و بہبود کو پس نظر رکھتے ہوئے جائداد کے مساوی حقوق پر زور دیا گیا ہے۔ آئندہ پچاس سال سے ترقی میں حواتین کے لیے ایک بونی ورٹی کے قیام کا منصوبہ رد عمل لایا جائے گا۔

۶۲ لاکھ اسکول کے طلباء کے لیے دوپہر کے مفت کھانے کا انتظام بھی رو بہ عمل ہے۔ اسمبلی میں ایک قرارداد کے ذریعہ جلیلو کونسل کے اس حکم کو منسوخ کیا گیا ہے جس میں کسان رکن اسمبلی کو وظیفہ نہ دینے جانے کی سفارش کی گئی تھی۔ سرکاری ملازمین کے وظیفہ کی عمر ۵۸ سال سے گھٹا کر ۵۵ سال کر دی گئی ہے تاکہ بے روزگار افراد کو روزگار جہاں ہو سکے۔

ریاستی کارپوریشنوں کی تعداد کو گھٹایا گیا ہے۔ دوسرا جائزہ آئس کے قیام کے ذریعہ عوامی زندگی سے کہیں کو ختم کیا جائے گا۔ تلگو سکریٹ کی سطح تک دفتری زبان ہوگی۔ تمام عوام کی فلاح و بہبود بہ جتنی ترقی کے لیے ایک ۵۱ کاتی پروگرام کو رو بہ عمل لایا گیا ہے جو ترقی کے آفاق روشن کرے گا۔ جس کے تحت پنے کے پانی اور غریب طبقہ کی فلاح و بہبود اور ان کے مکانات نیز دیہی علاقوں میں بجلی کی فراہمی اور زرعی اصلاحات پر زور دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ سارے نعرے ایک پائیدار اور عوامی حکومت کی ترقی کے منظر ہیں اور یہ حکومت عوام کی امیدوں اور خواہشوں کو پورا کرنا چاہتی ہے۔

ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش



# The "SABRAS" Urdu Monthly

rgan of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Awwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)

# اسلوب اور اقتصاد



## بال حمیر

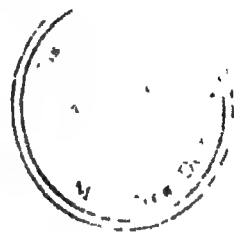


فرض کیم

# مکاتیب رشید

# سنگ دلی

نویسنده: *[Signature]*  
۱۳۸۲





سن اجراء : ۱۹۳۸ء

فون نمبر : ۲۸۴۶۹

## بیادگار ڈاکٹر محی الدین و تادری زور

ماہنامہ



# سیر

حیدرآباد

مجلس مشاورت:

صدر : محمد علی عباسی

نائب صدر : ہاشم علی اختر

مستند : ڈاکٹر مفتی تبسم



ارکان : پروفیسر سید علی اکبر۔ عابد علی خاں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ محمد اکبر الدین صدیقی۔

رمن راج سکینہ۔ پروفیسر مہراج الدین۔ محمد منظور احمد

● سید علی اکبر ایڈیٹر پبلشر پرنٹرنے نیشنل ہاؤس

برفنگ پریس چارکان میں چھپو اگر حیدرآباد۔ ۴

سے شائع کیا۔



مدیر اعزازی : مفتی تبسم

معاون مدیر : وقار خلیل

جلد (۴۳) نمبر ۱۹۸۳ء شماره (۱۱)

قیمت : ۲ روپے ۲۵ پیسے

ادارہ ادبیات اردو۔ پنجگٹ روڈ حیدرآباد۔ ۴۰۰۰۵

ذرا لاندہ : ۲۵ روپے کتب خانوں سے : ۲۰ روپے

یرونی ملکوں سے : ( بندیلو رجسٹری : ۴۵ روپے )

ہوائی ڈاک سے بحری ڈاک سے

ترقی دہلی : ۱۲ ڈالر ۵ ڈالر

امریکہ : ۱۶ ڈالر ۶ ڈالر

پاکستان برائیلون : ۸ ڈالر ۳ ڈالر

نگہستان : ۷ پونڈ ۳ پونڈ



# وفیات

وفیات

دکن خلیل - ۲

تمس الحق عثمانی - ۳

مصطفیٰ اقبال توصیفی - ۱۲

ڈاکٹر حفیظہ صدیقی - ۱۳

قطب سرتازہ رؤف غیر - ۲۰

سراج منیر - ۲۱

سید شاہ سکندر - ۲۶

سوپر لال ہادی ساغر کریمدی - ۳۲

سیدہ طیبہ بیگم - ۳۳

اردو نامہ

دکن خلیل - ۳۶

وفیات

نظیر کی ستاغت

ایک نظم اور غزل

شاہدانی سلطان کی

حیات اور تصانیف

در نظمیں

اردو شاعری کی

ایک نئی آواز

حالی کی رباعیاں

غزلیں

تعلیم کا مقصد

ادب اور تہذیبی قمریں



۱۳ اگست ۱۹۸۳ء کو حیدر آباد کے قادر الکلام مخدوم حضرت آوج یعقوبی قلوب پر حملہ کے باعث انتقال کر گئے شہر غزل حیدر آباد کی عصری شعری محفلوں میں ان کے دم قدیم سے بڑی رونق دہا کرتی۔ کتنے ہی شائقین شعر کو انھوں نے شاعر بنا دیا۔ چار منیار کے ادھر کی شعری انجمنیں مدتوں آوج کو یاد کرتی رہیں گی۔ علم ستراد شعری کلاسیک پران کی استادانہ نظر نے ایک نڈاویہ فکر کو روشن کیا۔ حضرت آوج کو ریاستی حکومت نے اردو کے ملک الستراد کا اعزاز اور وظیفہ بھی مقرر کیا تھا جس سے آخری دنوں میں وہ کمی حد تک معاشی دشواریوں سے عہدہ برار رہے۔ جب نئی حکومت نے اقتدار سنبھالا تو اعزاز اور عہدہ سے محروم کر دیے گئے زندگی کے ہر موڑ پر مسکرا کر حالات کا مقابلہ کرتا آوج خوب جانتے تھے۔ جیسے تیسے انھوں نے اپنے شعری مسن کو جاری رکھا۔ کثیر العیال فرد تھے، معاشی طور پر فراغت سے محروم، ریاستی حکومت پر یہ دامن عاید ہوتا ہے کہ وہ سماج اور معاشرہ کی بہتری کے لئے کام کرنے اور سوچنے والوں کے افراد خاندان کی ضرورتوں کا مدد و اکرے۔ حضرت آوج نے مختصر مدت ادارہ ادبیات اردو میں ملازمت بھی کی اور ان کی صلاحیتوں کا بانی ادارہ ڈاکٹر زور محرم کو بڑا پاس دے لحاظ تھا۔ خدا مغفرت کرے۔

جناب آوج کی وفات کا زخم تازہ تھا کہ قزاق اہل نے ۲۷ ستمبر ۱۹۸۳ء کو نامور دانشور مفکر اور عالم

۱) سلیم احمد کی یاد میں،

طبع نول کشور سے تاریخ شدہ سارے نوائے لمبی اور سات اپر جوڑی کلیات نظیر نے لکھا جس سو  
نوائے صحت میں سے نو سو ۹۵۹ صحت پر رابطہ کلام عجل ہوا ہے۔ ان نو سو اسٹھ صفحات کی  
سیاحی کے دوران ایک سوال ماوراء ذہن و دل کا دایہ تھا مانتا ہے۔ سید ولی محمد بن آخر وہ کوں سی قوت  
تھی جس نے اسے نظیر و کبر آبادی خادیا ۱۰۰ سادہ ہے کہ اس کے جواب پر سماجی علم اور فلسفوں  
کا رنگ بہ آسانی چڑھایا جاسکتا ہے اور داخل کی جاتی ہے، لیکن چونکہ مطلقاً لے بولانا محال کی  
راہ پر بے تیشہ نگاہ چلنے والے ناقدین کے ہاتھوں بیستہ گز کی ساعری کے ایسے ہی سیدھے  
مادھے سوالوں کے جوابات پر چڑھایا گیا رنگ دروغ مارجلا ہے اس لئے حقیقت پسندی کا  
قاضی ہی ہے کہ کلام نظیر سے براہ راست اور بے لاگ رشتہ استوار کیا جائے کہ ادب کی حقیقی  
ناخت اور تفہیم کی راہ یقیناً ہی ہے۔

نظیر کی ایک غزل دیکھئے، اس کی ردیف، ہر قافیے کے بعد استعمال ہونے والا ایک لفظ نہیں، بلکہ

اس قوت کی جانب ایک مسلسل اشارہ ہے جس نے  
یہ دلی عہد کو نظیر الکبر بادی بنایا ہے۔

ہو کیوں نہ ترے کام میں جسدان تماشا  
یارب! تری قدرت میں ہے ہر آن تماشا  
لے عرس سے تافرش، نئے رنگ نئے ڈھنگ  
ہر شکل عجیب ہے ہر اک آن تماشا  
افلاک پہ تاروں کی جھمکتی ہے طلسمات  
اور دوسے زمین پر، گل وریحان تماشا  
جنات، پیری، دیو، ملک، حور بھی نادر  
اسان عجب وہ ہیں تو حیوان تماشا  
جب صن کے جاتی ہے ترقع پہ نظر آہ  
کیا کیا نظر آتا ہے! ہر اک آن تماشا  
جوئی کی گندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہے لہریں  
رکھتی ہے کہیں زلف پریشان تماشا  
کڑعتق کے کوچے میں گزر کیجئے تو داں بھی  
ہر وقت نئی لہر ہے، ہر آن تماشا  
منہ زرد، بدن خشک، جگر چاک، الم ناک  
غل، شور، تپس، نالہ و افغان تماشا  
ہم پست لگا ہوں کی نظریں تو نظیر آہ  
سب ارض و سما کا ہے ملکستان تماشا

کلیاتِ نظیر میں یوں تو قدم قدم پر تماشا کی  
معنویت اور اس سے نظیر کے بے پناہ شغف کا  
اندازہ ہوتا ہے لیکن اس غزل کے قائل میں ان کا  
یہ ایک مطلع ملاحظہ کیجئے۔

دیکھ لے اس چمن دہر کو جی بھر کے نظیر  
پھر ترا، کاہے کر، اس باغ میں آنا ہو گا

مذکورہ غزل اور مقطعے میں جس شوقِ تماشا کا  
اشارہ ہے، وہی نظیر کے شعری مزاج کا جزو اعظم ہے  
اور نظیر نے اپنی اسی دیدار طلبی کو اپنے پورے کام میں  
برتا ہے۔ یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ نظیر نے  
شوقِ تماشا اور دیدار طلبی سے حاصل ہونے والے  
تجربات کے اظہار کے لئے شاعری کو EXPLOIT  
کیا ہے۔ گویا، نظیر کا اساسی مطلع 'نظر فن شعر گوئی' =  
زیادہ، چمن دہر میں شوقِ تماشا کی نکس کرنا تھا۔  
جب انتظار حسین نے لکھا کہ:

.... غالب نے لکھا تھا، مگر نظیر نے اس  
سچائی کو اپنے شعور کا ایک حصہ بنایا ہے:  
یک ذرہ زمین نہیں بے کار باغ کا۔۔۔

(رسالہ ادب لطیف۔ نومبر دسمبر ۱۹۹۲ء۔ ص: ۴)  
تو انتظار حسین کے ذہن کے کسی گوشے میں یقیناً پہل  
رہا ہو گا کہ نظیر و غالب میں۔ کرنے۔ اند۔ کچھ۔  
کا فرق ہے۔ یعنی نظیر کا اصل امر 'شوقِ تماشا کو سدا  
لانے پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعور کا غالب  
حصہ 'تماشا' پر مرکوز رہتا ہے اور وہ فن شعر گوئی پر  
زیادہ توجہ نہیں دے پاتے۔ نظیر نے تماشا پر شعور  
انداز میں جو توجہ صرف کی ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا  
غزل کی اس تقیم سے کیا جاسکتا ہے: پہلا حصہ:-

ہو کیوں نہ ترے کام میں جسدان تماشا  
یارب! تری قدرت میں ہے ہر آن تماشا

لے بخشنے ہے جلوہ گل، ذوقِ تماشا غالب  
چشم کو چاہیئے، ہر رنگ میں وا ہو جانا

دوسرا حصہ :-

لے عرش سے تافرش نے رنگ نہ دھن  
ہر شکل مجاہد ہے ہر اک آن تماشا  
انلاک پہ تاروں کی بھمکتی ہے طلسمات  
اور روئے زمین پر لٹی وریحان تماشا  
تیسرا حصہ :-

جنات، پری، دیو، ملک، حور بھی نادہ  
چوتھا حصہ :-

انسان مجوبہ میں تو حیوان تماشا  
پانچواں حصہ :-

جب حسن کے جاتی ہے مرقع یہ نظر آہ  
کیا کیا نظر آتا ہے! ہر اک آن تماشا  
چوئی کی گندھاٹ کہیں دکھلاتی ہے لہری  
رکھتی ہے کہیں زلف پریشان تماشا  
چھٹا حصہ :-

گر عشق کے کوپے میں گزر کیجئے تو داں بھی  
ہر وقت نئی لہر ہے، ہر آن تماشا  
منہ زرد بدن تنک، جگر چاک الم ناک  
غل، شور، تپش، نالہ و افغان تماشا  
ساتواں حصہ :-

ہم پست نگاہوں کی نظریں تو نظیر آہ  
سب ارض و سما کا ہے گلستان تماشا

غزل کا پہلا حصہ :- خالق کائنات کی مجوبہ کاری کے

تین ایک (GENERAL RECOGNITION)  
ہے۔ یعنی یہ بابت ایک کلیہ کے طور پر تسلیم کی گئی ہے  
کہ خالق کائنات کے ہر عمل میں اک تجرزا غنہ لازمی

کی حد تک مجبوری دساری ہے۔ اس حقیقت کو  
تسلیم کرنے کے بعد

دوسرا حصہ :- تماشے کے اولین مظہر کے  
ذکر پر منحصر ہے۔ اس حصے کے مشمولات کی  
وضاحت منظر فطرت کے عنوان سے کی جائیگی

تیسرا حصہ :- ایسی فیروز دم زاد مخلوقات کی اہم تبار  
پر مشتمل ہے جو انسانی آنکھ سے بالعموم اوجھل رہتی ہے

چوتھا حصہ :- انسان اور حیوان کا ذکر کرتا ہے  
کیونکہ یہ حصہ ایک شعر کے مصرعہ ثانی پر مشتمل

ہے اور مصرعہ ثانی میں قافیے کا الترام ضروری تھا  
اس لئے نظیر اس مصرعے میں آنے والے انسان

اور حیوان کے ذکر کو سب فہتا ترتیب نہ دے  
سکے۔ ورنہ محسوس ہی ہوتا ہے کہ وہ حیوان کا ذکر

مصرعہ اولیٰ ہی کے قافل میں لانا چاہتے تھے اور  
اس ذکر کے بعد انسان کو "محبوبہ" کہنا چاہتے تھے

اس ذکر کے فوراً بعد : اظہر ہے انسان کے  
دم قدم سے خطہ ارض پر جلوہ ماہونے والے

دو ایسے موضوعات کو علاحدہ علاحدہ بیان کیا  
ہے جو اپنی اپنی جداگانہ اہمیت بھی رکھتے ہیں

اور ایک دوسرے سے بیوست بھی ہیں۔  
بہ الفاظ دیگر : چوتھے حصے میں نظیر انسان

کی ایک مجموعی صفت (محبوبہ) بیان کرنے کے  
بعد پانچویں اور چھٹے حصے میں اس صفت کی

دو جہات (حسن اور عشق) تفسیر کرتے ہیں۔  
اس طرح اپنے دیدار نامے یعنی کلیات کا

## ( SYNOPSIS ) پیش کرنے کے بعد

ساتویں یعنی آخری حصے میں 'قابل ہار فائدہ کے وسیلے سے اپنی نگاہوں کو' است' کہہ کر دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ارض و سما پر ظاہر ہونے والی خالق کائنات کی گونا گوں قدرت کی دید ای وقت ملے اور درست ہو سکتی ہے کہ جب اس ظہور کو اس ملکرتیاں کے تماشے کی حیثیت دی جائے۔

عزل کا مطلع واضح کرتا ہے کہ نظیر 'خدا' کے وجود اس کی قدرت و قوت اور بالادستی کے قائل ہیں۔ اور ان کا ایمان ہے کہ اس کائنات میں وقوع پذیر تمام تبدیلیوں میں ذات باری کی 'مصلحتیں' کار فرما ہیں۔ مقطعے میں حالانکہ ضیفہ جمع متکلم استعمال ہوا ہے لیکن اس کی زیریں لہر 'خود کلامی کا انداز رکھتی ہے اور اس میں استعمال کیا گیا لفظ 'آہ' اک تاسف و افسردگی کا اظہار کرتا ہے۔

اس غزل کے مطلعے اور مقطعے کو اگر 'مگر گوشتی' کے انداز میں کئی بار پڑھا جائے اور پھر ایک دو بار تمام استعارے بھی ان دونوں کے درمیان پڑھ لے جائیں تو غزل کے کئی پہلو منکشف ہو سکتے ہیں۔ عزل کی ایسی خواہش محسوس کرا سکتی ہے کہ مطلع کائنات نے اپنی ذات اور ہم انسانوں کے گرد ارض و سما کا جو ملکرتیاں سجایا ہے وہ اس کے اور ہمارے درمیان حائل اک پردہ اور کادٹ ہوتے ہوئے بھی اس کی ستاس کا وسیلہ ہے۔ یہ ملکرتیاں اس کی ہر آن تبدیل

ہوتی ہوئی قدرت و مصلحت کی بنا پر ہمارے خزاں سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ اس ملکرتیاں کی دل آویزی، ہریت اور گرم بازاری کا باعث متحرک مناظر قدرت (بیان: مذکورہ غزل کے چار مصرعوں میں) آنکھوں سے اوجھل غیر آواز مخلوقات (بیان: ایک مصرعے میں) اور گونا گوں انسانی صفات (بیان: آٹھ مصرعوں میں) ہیں اور اس سب کچھ کا اختتام 'ہم انسانوں پر ہوتا ہے کہ انسان' کائنات کا حرف آخر ہے۔

(جیسے: مقطع غزل کا اختتام ہے)۔ یہ تمام دل آویزی، یہ تمام ہریت اور یہ تمام گرم بازاری اس وقت ہر اس انسان کے لئے فتم ہو جاتی ہے۔ فنا ہو جاتی ہے۔ جب وہ اس تماشے گاہ کی تبدیلیوں کے زیر اثر فنا کے گھاٹ جا اترتا ہے اور جو باقی رہ جاتا ہے وہ اس گرم بازاری کے طویل سلسلے کو فنا و خزاں پر اختتام پذیر ہوتے دیکھ کر، گہری افسردگی میں ڈوبی ایک آہ کھینچنے کے سوا اور کوئی راہ نہیں پاتا۔ گویا ارض و سما کے تمام مظاہر ایک بدظاہر محمی لیکن عیاں انداز میں آمدورفت کے اسیر ہیں۔ مظاہر کی یہ لمحہ بہ لمحہ نمو اور فنا، ذوق تماشا سے محروم آنکھ کے لئے تو کسی معنویت اور تاتر کی حامل نہیں لیکن حصار آب و گل کے بیچ خود کو روشن و بیدار رکھنے والی ایسی آنکھ جو منظر کے ظاہر اور باطن کی تہوں میں پیوست ہونے کی قوت رکھتی ہو، مظاہر کی صورت اور معنی سے



کامل، خود مختار، غیر مابند اور مطلق العنان سوال ہے اس سوال کے ذریعے شاعر نے روح کے حسین لفظ کو ایک استفہامی وجود (INTERROGATIVE EXISTENCE) عطا کر دیا ہے۔

نظیر نے مذکورہ غزل کے ہر قافیہ اور ردیف کے ساتھ استعجاب کی ایک ایک کیفیت کو کچھ یوں نمایاں کیا ہے کہ زندگی کے بے شمار واقعات اور بے شمار سفر اور بے شمار تماشے، ایک ناگفتی سوال کا پیش فیہ بن کر ہم سے مقہوم ہوتے ہیں۔ تو پھر کیا؟ میں عیش و عشرت اور غم میں بسر شدہ اوقات بھی ہے اور شرق سے غرب تک سفر اور تماشے کی بے حاصلی بھی، میان نظیر ارض و سموات چھان لینے کے باوجود بھی سفر کو منزل سے بے تعلق پاتے ہیں اور کسی بھی گوہر مقصود کے حصول کو مقصد اور منزل نہیں بلکہ سوالوں کے سفر کی اذیت کا پیش فیہ تصور کرتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک تمام تر تخلیقی احساس ایک سفر کا کرب ہے جو ان تمام سے گذرتا ہے جن سے ہوم کا اوڈلی پس گزارا تھا اور دنیا جہاں کی خاک چھاننے کے بعد منزل پر پہنچ کر ایک نئے کرب اور نئی اذیت سے دوچار ہوا تھا۔ اوڈلی سبب کی جوی، اپنے عاشقوں کے ہجوم میں گھر ہوئی، کچھ اور ہی ذہنی اذیتوں سے دوچار تھی۔ اور ان دو افراد کی لہریں ایک لمبے سفر اور وقت کی پرچھائیوں میں نئے سوالات سے دوچار تھیں۔

نظیر کا سفر آگے ایسی ہی تعداد انگیز اذیتوں کا بیطلہ عریض محسوس ہے جس میں میان نظیر دنیا کی تمام لذتوں، تمام مسرتوں اور تمام کھفتوں کے مقابل ایک تنہا مسافر اور تماشائی کے روپ میں اپنی گزشتہنی کا احوال سناتے نظر آتے ہیں۔

نظیر نے اپنی گزشتہنی کا احوال بیان کرنے کیلئے جو اسلوب وضع کیا ہے وہ اپنی انفرادیت کی شناخت ایک ماورائی زاویہ نظر کے واسطے سے قائم کر رہا ہے مشرق و مغرب کے مناظر، استیاری اور انسانی واردات کو آنکھوں میں سمیٹ لینے کے باوجود نظیر کے یہاں جو ایک بے تعلق اور غیر جذباتیت کا فرما ہے وہ ایسی ماورائی۔ یا بے تعلق و ناوابستہ زاویہ نظر کی دین ہے۔

مظاہر کائنات کو دیکھنے، چھونے، چکھنے، برتنے اور سننے کے لئے نظیر جس قدر بے تاب و وارفتہ رہے ہیں اور اس دوران میں انہوں نے جس جس طرح اپنی آنکھوں کو ہر دو جانب۔ ظاہر و باطن۔ کے لئے کھلا رکھا ہے وہ کسی ایک فلسفے، کسی ایک دبستان فکر یا کسی ایک مشروط و محدود نقطہ نظر کی اصطلاحوں میں مقید ہونے والی شے نہیں ہے یعنی ان کا ذہنی سفر افقی اور عمودی دونوں سمتوں میں رہا ہے اور ایک سمت میں دوسری سمت کا ادراک شامل رہا ہے۔

سماجی انتشار، لاپرواہی اور نجی حالات کی غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہوتے ہوئے بھی کلام نظیر سے جس پُر اعتماد، چاق و چربند اور ہمہ جہت

شخصیت کے حامل: نظیر، کا خاکہ مرتب ہوتا ہے وہ یقیناً ایک پورے آدمی کا تعارف نامہ ہے۔

’پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں‘

(نظیر)

یہ پورا آدمی، زندگی کے ہمہ رنگ کھیلوں اور مظاہر و رسوم سے گہرے شغف کے باوصف اگر ان کے پس منظر سے احساسی طور پر ہم آہنگ محسوس نہیں ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بار بار پورے آدمی کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور کیونکہ نظیر کے نزدیک پورے آدمی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ عاشق کے روپ میں اس دل بر کی پہچان کرنا چاہتا ہے، جس کا ذکر ’عاشق نامہ‘ میں آیا ہے:

’ہمانہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان

ہر بارغ میں، ہر دشت میں ہر رنگ میں پہچان

بے رنگ میں، بارنگ میں، نیرنگ میں پہچان

منزل میں، مقامات میں، فرنگ میں پہچان

زنت روم میں اور ہمد میں اور رنگ میں پہچان

ہر راہ میں، ہر ساقہ میں، ہر رنگ میں پہچان

ہر عزم ارادے میں، ہر آہنگ میں پہچان

ہر ہجوم میں، ہر صلح میں، ہر جنگ میں پہچان

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر دھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دل بر کو ہر اک رنگ میں پہچان

تماشے کے ذریعے شناخت کے لال میں بلدا اس

دل بر کا عمل دخل اور پھر تحقیق کے مدبب زامرا

ایک دوسرے میں آمیز ہو کر اسی امر کی تصدیق کرتے

ہیں کہ شوق تماشے سے لیریز نظیر کی آنکھ صرف خلدی

ہی، تمام جہات میں نہیں بلکہ باطن کے تمام ابعاد میں

بھی محو نظارہ اور نظارہ طلب، ہے۔ کلام نظیر سے

مستفیع ہونے کے دوران، ایک ہا سحر و قاری کو

زندگی سے قربت اور یگانگت کا جو احساس ہوتا

ہے وہ یقیناً خارج و باطن کی اسی وحدت کا زائید ہے

ہمارے ادب کی تاریخ میں ایسے سحرارہ اور تحریکات

کا ذکر موجود ہے سمعوں نے زندگی اور معاملات زندگی

کے تئیں ایک رُخا دیہ اختیار کیا، ایسے سحر اور ایسی

فزیجات سے مغلوب ہونے والوں کی تحریریں،

انہی لئے زندگی کو ایک وحدت کے طور پر خلق کرنے

میں کام رہی ہیں کہ انھوں نے اپنی آنکھوں کی کسی

ایک ہی قوت کو سب کچھ حاما اور باقی ماندہ دوسرے

قوت کو بروئے کار نہیں لائے۔ یا ستاؤ وہ اس

کوت کے تھے ہی نہیں، کم از کم یا غی حواس کو

بروئے کار لائے۔ یا اھیں علم ہر تا کہ اعلا علیقی

دہن، چھٹی جس کا بھی حامل ہوتا ہے۔

کلام نظیر کی برکھ اور عا یرے کے دوران،

زادہ تر، ہی ماقدین اپنی ماکواری و ناپسندہ گی کا

اظہار کرتے رہے ہیں، سمعوں نے کلام نظیر کو یا تو

صرف سماجی اخلاقیات کی کسوٹی پر استایا یا پھر

اس کے ادبی مرتبے کے تعین میں صرف ادبی

نظریات کو بروئے کار لائے ہیں۔ تاریخ ادب

میں نظیر کے مرتبے کا صحیح تعین صرف اسی صورت

میں ممکن ہے نہ نقاد بھی زندگی اور فن کی اسی

وحدت کو ملحوظ رکھے جو نظیر نے اردو شاعری میں



یہ جلی بار قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

”ہماری مشرقی تنقید“ ہمارے تہذیبی

تصور کا عطیہ ہے۔ جس میں جاگیردارانہ

۱۰ کی سام خصوصیات جلوہ گر ہیں اس

کا تہذیبی تصور تہذیبوں اور ان کی ایک

خصوصیت ہمارا ہی تک محدود تھا۔ اس

کے فن کا تصور رہاں کے ایک ادھورے

تصور کا غماز ہے۔ تنقیدی تصور تو تخلیقی

تصور کے ساتھ ساتھ چلتا ہے مگر تنقیدی

کارنامے ہر دور میں تخلیقی کارناموں

کے نیچے نیچے چلے ہیں۔ غنائیہ ہمارے

تذکرے اور تنقید، ماں اور من کے

حواس بند تصور سے عرصے تک

آزاد ہو سکے۔ قبر کم اور نظیر زیادہ

۱۱ تصور کا سناں ہوئے مگر تیر اور نظیر

میں جو تعلق ہے اسے بھی نظر انداز نہ

کرنا چاہیے۔ قبر کی غزلوں میں ہماری

مترک تہذیب و تمدن کا وہی جلوہ

صدر نگ ملتا ہے۔ حلیہ کی لہروں

میں پہنچ کر ایک مخصوص آہنگ اور

کے اعتبار کر لیتا ہے اور نظم کے فارم

کی سہولتوں کی وجہ سے زیادہ روشن

ہو جاتا ہے۔ آزاد نے غلط نہیں کہا تھا

کہ نظیر کے کچھ اشعار ”قبر سے پہلو

مارتے ہیں“

(آل احمد سرور مسرت سے بصیرت نمک ص: ۲۱)

یہ بات درست ہے کہ نظیر نے متعدد مواقع پر

فنی آداب اور سانی نزاکتوں کو ملحوظ نہیں رکھا۔ لیکن

بہت سے عظیم فن کاروں میں قواعد اور عاملوں کی

یورثہ واری اصول پسندی سے بغاوت کی روش

عام رہی ہے یہ بات بھی غالباً اتنی اہم ہے کہ نظیر نے

اپنے عہد کے انتشار و ابتلا اور خون آشامی کے باوجود

ہر موقع پر زندگی کے رتبے کو بالا ہی رکھا اور کسی

بھی مرحلے میں اس کو حقیر نہیں جانا۔ اپنے اس علی

میں نظیری سب سے بڑی سیائی اور حلوس یہ ہے

کہ ہم کلام نظیر اور نظیر اکبر آبادی کا علاحدہ

علاحدہ تصور کرتے ہیں قطعاً ناکام رہتے ہیں یعنی:

جب ہم نظیر کی شخصیت کا تصور کرتے ہیں تو کلام

نظیر کے عناصر محتم ہو کر ہمارے سامنے آکر کھڑے ہوتے

ہیں اور جب ہم ان کے فن سے دوچار ہوتے ہیں

تو فن کے وسیلے سے تعمیر ہونے والی ان کی شخصیت

نگاہ ذہن پر حاوی ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ

کلام نظیر کی صحیح تنقید و تحسین غالباً اسی وقت ممکن

ہے کہ جب نظیر اور کلام نظیر کے جیسے بحرے

رہنے کے بجائے اس کی آئینہ اور پست آئینہ

جیسی وعدت کا احترام کرتے ہوئے اسے ہمہ جہتی

کے ساتھ قبول کیا جائے۔ — یہ بات عرض

کرتے ہوئے مجھے احساس ہے کہ خالصتاً فنی و جمالیات

اصولوں اور عہد نظیر کے صرف خارجی عوامل کی روش

میں کلام نظیر کے پرکھنے والوں کو میری یہ بات شاید

پسند نہ آئے، کیونکہ وہ تو ہر سزا اور ادیب کو کسی

ایک یعنی اپنی پسندیدہ، کسوٹی پر ہی پرکھنا چاہیں گے

کہ سید ولی محمد نظیر اکبر آبادی کو آزاد بھابھوں سے ہم کنار کیا جائے تاکہ یورے اور علم، نظریہ و شناخت کیا جاسکے۔ ۵۵

(ایضاً: اردو بھابھوں سے)

میرٹا پور، ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء  
 وزیر مسرار احمد نے صدارت کی اور خطاب  
 'صلوات' میں مددی کے نظامت کے اہل علم، انعام، نہ  
 ۳۳ اکتوبر ۱۹۸۳ء، دہلی و حیدرآباد، حیدرآباد  
 مائیں محمد عمر خان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حیدرآباد  
 اور چائے، صدارت لاہور کے علمی معامیں سندھ کے  
 اور شہزادہ کے علم میں کیا۔ جناب صلاح الدین یار نے  
 نظامت کی اور تشریف ادا کیا۔

### مہتاب حیدر آبادی

کہ، نہ رائے مقامی، ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء، دہلی  
 مہتاب حیدر آبادی کے علمی معامیں سندھ کے  
 میں دہلی اور پاکستان کے اہل علم، انعام، نہ  
 ۳۳ اکتوبر ۱۹۸۳ء، دہلی و حیدرآباد، حیدرآباد  
 مائیں محمد عمر خان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حیدرآباد  
 اور چائے، صدارت لاہور کے علمی معامیں سندھ کے  
 اور شہزادہ کے علم میں کیا۔ جناب صلاح الدین یار نے  
 نظامت کی اور تشریف ادا کیا۔

قیمت : ۱۵ روپے

دفعہ دوم: قسط تادمہ و تہیہ ۱۵ روپے

سب سالکتاب گھر

لاہور، ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء

لیکن میں کہہ تفصیل کے بغیر دریافت کرنا چاہوں گا  
 کہ اس بات کی حقیقی وجہ کیا ہے کہ مورخین ادب  
 نے نظیر اکبر آبادی کے ذکر کو کسی ایک بعد یا رجحان  
 سے مشروط کرنے کے بجائے ان کے لئے تاریخ  
 میں ایک جداگانہ گوشہ مخصوص کیا ہے؟

میرٹا پور، ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء  
 تو یہی ہے کہ کلام نظیر کی اہمیت، مغز خصوصیات  
 نے مورخین ادب کو اس عمل پر مجبور کیا۔ دوسری  
 اور غالباً اہم ترین وجہ یہ ہے کہ مورخین ادب کو  
 غیر شعوری طور پر صرف کلام نظیر، ایک  
 ناقابلِ تقیم وحدت محسوس ہوا ہے، ایک ایسی  
 وحدت جس میں خارج و باطن، بلند و پست،  
 خوب و بد، خیال و عمل، پیاز و پیاز،  
 جزا و مزا، برابری و تباہی، دنیا و آخرت،  
 نظم و سنبل وغیرہ بے باجم آمیز ہو کر ایسے شعلے  
 اختیار کر گئے ہیں کہ اسے قادی کے دروازے پر  
 کے لحاظ سے اس پر مہلہ۔ ۱۱

گویا، حیدر آبادی و باجم کلام طہ  
 یہاں تک نکتہ چینی کے دستہ، 'مہتاب' کو  
 بھی غصے نہیں لگاتا۔ یہی شعرا و  
 پارکھوں کے قیرو غالب کے بارے میں دکھائی  
 مدت کے بعد اس حقیقت کا اظہار کیا کہ اس کی سائے  
 کسی ایک عہد کی اسیر نہیں لیکن انھوں نے نظیر اکبر آبادی  
 کو اسی انوکھی دیکھنے عظمت کی یاد اس میں ابھرتا  
 اپنی عدالت کے کٹھن سے سے بری نہیں کیا ہے  
 نتیجہ : ابھی ہمارے عہد کے سر پر یہ فرس ماتی ہے

## مصحف اقبال تو صیفی

ایک نظم

سا بھ ہوئی

نیلے آکاس سے اڑتے پنہیں

پیڑوں کی ناخنیں لڑ لڑتے

میں بھی اس ابلنے تہر کی بھیر سے ہٹ کر  
مڑ لوں گے اس پھیلے کھرے جال سے کٹ کر

اپنے گاؤں کی گاڑی میں بیٹھوں

دُنا مڑ ڈبے کی کھڑکی سے —

اپنے گھر کا آئین

ایسی ٹکلی کا منظر سوچوں

بابا کے ہونٹوں کی دیوار پہ

اپنے نام کا سایہ دیکھوں

اینا جہرہ یاد نہ آئے

اپنے حال و خد

ماں سے پوچھوں

○

شاید میرے عہدِ گزشتہ کی نوید

پامال کتابوں میں کوئی

ایسی تحریر ہو۔ ایسا لفظ ہو، حرف کوئی

جو گہری سید سے آنکھیں ملتا اٹھتا ہے:

میر، 'اچکن' بالوں والی تو پی پڑنے

مجھ کو لینے۔

اسٹیشن پر آئے "

## مصحف اقبال تو صیفی

نظم

اپنے گھر دستک دیتا ہوں

ہر اتوار کو اب تا ہوں

تیری کھوج میں نکلا ہوں

میں جنگل کا راستہ ہوں

اک ساحل کی آس لے

ایک ہی لہریہ بہتا ہوں

تو نے اتنی دیر میں جانا

غیر نہیں ہوں — اپنا ہوں

چوم لے میری بھگی بھگی

رخصت ہوتا لمحہ ہوں

باسی پھول کی خوشبو ہوں

بیتی رست کا جھونکا ہوں

لوگ مجھے حیرت سے دیکھیں

تجھ سے پھر کر زندہ ہوں

بھگی بھگی نیند سے بوجھل ہیں

میں صدیوں کا جاکا ہوں

ڈاکٹر رضیہ صدیقی

## شاہ ثانی سلطان کی حیات اور تصانیف

شاہ ثانی سلطان کے حالات زندگی اب تک بالکل تاریکی میں تھے، بلکہ مخطوطات کی دو ایک توضیحی نوٹوں میں انھیں گو لکندہ کا شاعر بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جب میں نے جہان میں کی تو پتہ چلا کہ سلطان کا تعلق گو لکندہ سے نہیں بلکہ قدیم اردو کے دو سر اہم کوزہ بجا پر سے ہے۔ وہاں سلطان کے حالات مخطوطات کا سہ مجھے جبراً باذمل گڑھ اور بعض خانگی کتب خانوں میں ملا۔ سلطان کے حالات زندگی کا یہ چلانا اور اس مفقود کے لیے دوسری ٹری یا حیوثی تصانیف کی تلاش میں جہان میں کی گئی تو ذرا کئی سہرا میں سلطان کا تعلق اس کے دو سہرا طے سس کی اہم یا غیر اہم تصانیف اور جیدہ و جیدہ غزلوں، مرثیے و غزلیں مخطوطات کے ذریعہ میں کچھ ہوئے ملے ہیں۔

سلطان کے خاندانی حالات سید اکبر صاحب سجاد شمس دہگاہ حضرت سید شاہ سلطان کے ذریعہ دستاویز ہوئے جو دہلی میں مرقوم ہیں۔ پھر کچھ حالات سید عثمان جیسی، متولی مانغا، سید شاہ مس اللہ محمد الجیسی بدہری کے ہاں دستاویز ہوئے جو ماری میں ہیں۔ مجملہ حالات سے یہ چلنا ہے کہ سلطان کا تعلق سادات جیسی سے ہے آپ کے والد کا نام سید فخر سلطان جیسی اور آپ کا اصل اہل سید سلطان غالب جیسی ہے آپ اپنی سلطان گمانی کے ام سے بھی معروف ہیں۔ آپ کے والد دروم کے کسی علاقے کے حکمران تھے۔ جب ال رعدیہ الی طاری ہوا اور ال رعدیہ کہہ کر دے اپنے حامد الے سامعہ والا جبر سورت میں داخل ہوئے۔ شاہ ثانی سلطان کے بعض استعارے ال کے تابی سے دستبردار ہوئے کی بعد ہی ہوئی ہے۔

اسٹخا سلطان سو شاہی جو معشوق کی خاطر لیے ویناگ لوی پھر کر خوشی سول دل لگا لگا کیا بندر سورت سے یہ لوگ گجرات، سیجا پور اور گلبہرگ سے ہوئے ہوئے بدہری تھے۔ آپ کے والد الی الوہب کا خاندانی سہا، اس لیے تلاش پیر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان دنوں سید میں حضرت شاہ محمد اکبر جیسی کا درجا تھا، جو حضرت خواجہ بندہ نواز کی اولاد سے ہیں حضرت فخر سلطان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، بیعت سے مشرف ہو کر سیرخ کے بنائے ہوئے شغل میں معروف۔ بعد تکمیل سلوک خلافت سے مشرف ہوئے وہاں سے شہزادہ میں مدبر اس چلے آئے اور اسد و فضیہ اگر میں امامت کی۔ اس وقت شاہ ثانی سلطان کی عمر ۱۳ سال تھی اس لحاظ سے سہ ولادت ۱۵۹۶ء ہمارا مانا ہے حالات سلطان "مملوک سید اکبر صاحب میں لکھا ہے کہ شاہ سلطان نے ۱۱ رمضان ۹۷۵ھ میں وفات پائی اس لحاظ سے شاہ ثانی سلطان کی عمر ۱۶۸۵ء کی عمر ۸۹ سال متعین کی جا سکتی ہے۔ ثانی سلطان کا مزار "درگاہ پور" میں

علامہ مدراس میں ہے حوالے والد سید فخر سلطان کے دربار میں متصل ہے۔

سید فخر سلطان کے بعد شاہ سلطان نے سند ارشاد بطورہ افروز ہو کر ہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا شاہ نانی

سلطان نے سبقت بھی کی تھی، چنانچہ ایک شعر میں اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ

بہت کے بدل سٹ دیس کوں و بنا گئے میری پس کلا      جا کر گدا انی ہمیں کوں گری نگر جو نا بھلا

آپ کے مریدوں کے تعداد میں روز افزوں اعجاز ہو نا رہا میرا اہل خانہ ان سے مرتضیٰ گمانی اور جلال علی شاہ

ہر دو کو بعد تکمیل سلوک خلافت بختی سید شاہ مرتضیٰ گمانی سے اس سلسلہ کا کافی سہارا ہوا۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی

خواجہ ساء حبیب اللہ تھے جس کا اسم سال ۱۹۰۳ء میں ملینا میں ہوا۔ کلا اُردو دینی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ نانی

سلطان صاحب اولاد صحیح سحرہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو ایک لڑکا بھی ہوا جس کے نام کی صراحت نہیں ہے اللہ آک

کی ایک صاحبزادی مسماہ صاحبانی صاحبہ تھیں جن کا خدیوہ احمد خن جہم صاحب سے ہوا۔ شاہ سلطان کا نسب نامہ

انھماک کوشنس کے باوجود دیباہ نہ ہو سکا۔

سید فخر سلطان حبیبی صرف حقیقیہ سلسلے کے مرید و خلیفہ تھے، چنانچہ سلوک اور اذاجیب<sup>۲</sup> مع سحرہ ہائے

سلاسل کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بعضی گمانی موزی ۹۰۰ء نے سلسلہ چشت میں نانی سلطان سے سبقت کی ہے

نیز سلطان کی ایک تصنیف "عنوان" زنجیرہ "خود ارادہ ادب" اردو اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے

اس میں انھوں نے لاہور، بامپوت اور جبروت کی اصطلاحات استعمال کی ہیں جو فائزادہ چشت سے منتقل

ہیں اور جس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ نانی سلطان سلسلہ چشت کی خلافت سے مستثنیٰ تھے۔

سلطان کا شمار دہستان بجاویر کے آخری زمانہ کے شعرا میں ہوا ہے اس زمانے میں دکنی زبان پر

صرف بولی جاتی تھی بلکہ ایک متمدن اور ادبی زبان بن چکی تھی اور اسی دور میں فارسی شاعری کا سایہ نمایاں

طویر پر دکنی شاعری کے کارناموں پر پڑنے لگا تھا فارسی کا مشہور ادیب ملاظہوری بجاویری میں مفہم ہما کوئی

موجب تھیں کہ شعرا نے یہ ال کی موجودگی اور بزرگ علمی و ادبی احوال سے دکنی شاعروں کو فارسی سنام

کی ان مخصوص خصوصیات کی طرف مائل کیا جو اس زمانے میں شاعری کا جوہر سمجھی جاتی تھیں۔

دیوان سلطان چارسوا سنی (۴۸۰) غزلیات پر مشتمل ہے جہاں میں تین ہزار دو سو سینتالیس اشعار

ملے ہیں سلطان کے کلام کا آغاز عشق مجازی سے عشق حقیقی میں منتقل ہوا ہے۔ ابتداً بجائے حمد و نعت کے

وہ دالہانہ اور عاشقانہ انداز میں عشق حقیقی کے وجدانی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں

کے مطالعہ سے ان کی کیفیات عشق کا اندازہ ممکن ہے۔ جہاں سلطان کا ضخیم دیوان نصوص سے پُر ہے وہیں

اس دیوان میں بیشتر غزلوں میں عشق مجازی کا بھی واضح اظہار ملتا ہے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ حبیب کو مجازی پر اس میں بیان کیا جیسا کہ اکثر دکنی شعراء کا اسلوب رہا ہے۔

سلطان کے کلام میں فارسی راہ اور فارسی ساعی کا اثر بہت نمایاں ہے کلام سلطان کا بھی سخن کرنے کے لیے ان میں معارف کو ملحوظ رکھا ہو گا جو سلطان کے بعد میں سامی کا زبور سمجھے جانے سے مثال کے لیے ان کا ایک خاص فارسی شعر ملاحظہ ہو جو کہ دکنی دیوان میں ہے۔

یہ بڑے زلف مستکبت دامن خوش معطر نہ زراج بادہ لعل ہوا اس نہ لب نرسد

سلطان کے کلام میں بے شمار فارسی آمیز دکنی غزلیں بھی ملی ہیں۔ مثلاً یہ

گفتم کہ گاہی ہر کسب بار کی گل سوں لگا گفتم کہ ایسی بات ہر مایول ہر نگاہ دراج

پیالہ تجھ کو ادھر کا خوش اسے سانی ہو میں بجا حانچو وہ دیکھ کون سگل ادا ہے راجنا  
حبیب سے شکوہ کا انداز ملا دلہ ہو یہ

گھڑ میں دے تو نہیں سزا سارا نہ بھی نہیں کر دے بھی کہیں اکہ میں دور کج اب

ان کی شاعری میں طر و مزاج کی جھلک بھی نظر آتی ہے

تجھ کو کہے کوٹ مہالے مٹی کا ریت جڑے یاد رہم میں نہ مجھ جیوئے ملڑا رہے

راہ دیکھ ہے مجھ یوں سو وہ نہ ادا رہا بچہ لیاں اس روز دیکھے نہ تھوڑا دن بچلے

اب قابل ذکر خصوصیت یہ ہے ان کے اسعار میں نرم اور لٹکا کا عنصر بھی ملتا ہے۔

ہم بے رنگ رہاں کوئے - مازوں مثال کول

مرا سحر نے سو خوراں کول بھی ادا کاراں بے کلاس

مستحق ترے ماز میں نہ ختم ہے ختم ہے آوار میں لے حرم بے حکم

اکثر صاحب ہنر شعراء اور فنکاروں کی طرح کلام سلطان میں بھی جو دستانی ہیں اسعار ملتے ہیں مثلاً

اسعار گمراہ توں سمجھ سلطان میں بھولم کیں ہر حرف میں بار بک ہے معنی اسرار

سلطان کے اسلوب بیان کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعر میں ایک اجنبی اس سوال و جواب کے پیرائے میں پیدا

ہوے ہیں مثال کے طور پر ایک غزل ملاحظہ ہو۔

گفتم کہ میرم جو کہن آفتاب کہیدے ماں میں گفتم تر افراں ہے - تاکہ کی فریاں ہیں

گفتم کہ میرم جو کہن آفتاب کہیدے ماں میں گفتم تر افراں ہے - تاکہ کی فریاں ہیں

گفتم کہ میرم جو کہن آفتاب کہیدے ماں میں گفتم تر افراں ہے - تاکہ کی فریاں ہیں

گفتم کہ میرم جو کہن آفتاب کہیدے ماں میں گفتم تر افراں ہے - تاکہ کی فریاں ہیں

گفتم کہ میرم جو کہن آفتاب کہیدے ماں میں گفتم تر افراں ہے - تاکہ کی فریاں ہیں

گفتم کہ از بہر بہت سلطان گوشتم گدا  
جیسا کہ سلطان کی شاعری مجازی و خفی شاعری کا امتزاج ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں تصوف کے مضامین سے پُر ہیں  
دن میں وہ انیت کو مشن کیا گیا ہے عزل و اذلتہ پر

جگل و گلزار میں واحد اللہ واحد اللہ میوہ و گل خار میں واحد اللہ واحد اللہ

کعبہ و بت خانہ کراسم جدا ہے اما دین و کفار میں واحد اللہ واحد اللہ

مسی و مشکالہ عالی دیگر جبال دت مجنوں و ہشیار میں واحد اللہ واحد اللہ

تاہد و مشہود ایک روپا سے دوزخ دیکھ محو ہونے والے میں واحد اللہ واحد اللہ

مسکین و سلطان کیوں زبر و زبر نا سمجھ حسنہ و حقار میں واحد اللہ واحد اللہ

انگریز سلطان کا سارا کلام کیف و مستی میں ڈوبا ہوا ہے اور بہ کیف و مستی عتق مجازی نہیں بلکہ عشق حقیقی کے واردات کا بین ثبوت ہے۔

دیوان سلطان کا ذکر سب سے پہلے ڈاکٹر زکریا نے اپنے مخطوطات کی جلد اول مطبوعہ ۱۹۴۲ء میں اس طرح کیا ہے۔

”یہ ایک طبرے صوفی شاعر ہے سلطان میراں شاہ معروف کے

خلیفہ تھے۔ چنانچہ افضل نے محی الدین نامہ میں لکھا ہے کہ:

”میراں شاہ معروف او دستگیر“

”کہ دل میرا کہرا کہ روشن ضمیر“

”دے دست پیچہ مرے سات میں“

”دے منجھ کو سلطان کے ہاتھ میں“

ان اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی معروف نے افضل کو اپنے خلیفہ سلطان کے سپرد کیا تھا لیکن مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں ڈاکٹر زکریا کا خیال کہ میراں شاہ معروف کے مرید سلطان ہیں اور انہوں نے افضل کو اپنے مرید شاہ سلطان کے حوالہ کیا تھا درست نہیں کیونکہ اولیاً کا یہ دستور رہا کہ اپنے مرید کو اپنے مرشد کی جانب تسویکات اور دعا رجوع کیا کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار میں میراں شاہ معروف کے مرید افضل کو شاہ سلطان کے تفویض کرنے کا ظاہر کیا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ میراں شاہ معروف خود سلطان کے مرید میں جنہوں نے اپنے مرید افضل کو اپنے سے اوجھی شخصیت (شاہ سلطان) کے حوالے کیا تھا۔

شاہ سلطان کو میراں صاحب معروف کا محی الدین نامہ مصنفہ افضل کی بنا پر قرار دیا گیا ہے لیکن محی الدین نامہ میں لفظ ”سلطان“ سے جو مخاطب ہے وہ شاہ سلطان سے نہیں بلکہ حضرت غوث ایک سے ہے اور تصنیف کا عنوان محی الدین نامہ اس بات کا شاہد ہے کہ اس سے متعلق تمام اشعار حضرت غوث اعظم عی سے منسوب ہوں گے۔ محی الدین نامہ کے

جن اشعار جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محی الدین نام غوث اعظم کا مدح میں لکھا گیا ہے اور جس لفظ سلطان کا  
مقابلہ غوث پاک سے کیا گیا ہے۔ درج ذیل میں سہ

محی الدین سلطان سو بیر ہے      دما دیں میں وہ جا نگیر ہے  
محی الدین سلطان قادر قبول      لہو سے گو د میں آکر آل رسول  
دوسے یہ سلطان غوث الاعظم      اسے عشق کا پیا لہو ہے ختم (مہتمم)  
نوں حضرت محی الدین سلطان ہے      لہو سے مرے مران مران ہے  
میرا شاہ معز و مفضل ہے      محی الدین کے باغ کا میو ل ہے  
محی الدین دریا ہے مو فی ہے جان      سجا ساہ معز و مفضل میراں سوجاں  
محی الدین نامہ کے ایک مخصوص شعر میں افضل نے اپنے مرشد میراں شاہ معز و مفضل اور مہتمم کو  
دونوں کو ”ایک دو“ سے محال کیا ہے۔

تصدیق کیا جیو اوس دو آپر      کیا ختم افضل تا سر بسر  
مندرجہ بالا اشعار میں لفظ سلطان سے ذکر کردہ شاعر ہوا ہے لہذا سلطان کا سلسلہ سبع ساہ  
معز و مفضل سے قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ ساہ معز و مفضل ان کا مرید قرار دیا جاسکتا ہے  
دوسرے تذکرہ نگار جباب نصیر الدین اسماعیلی نے ”دکن میں اردو“ مطبعہ ۱۹۶۶ء اردو  
مکر لاہور میں سلطان کا ذکر اس طرح کیا ہے

”شاہ سلطان قطب شاہی دور کے شاعر ہیں۔ آپ کے متعلق یہ یلدا ہے کہ ایک  
صوفی بزرگ شیخ میراں شاہ معز و مفضل کے مرید تھے۔ صلاف محی الدین“

موصوف کو لقب خانہ آصفیہ کے مخطوطات کا۔ صحنی ہر سب کے دوراں اس کا ایک مخطوط مل سکا اس میں  
محی الدین مصنف میں کوئی اضافہ نہیں ہے۔ اسی صاحب کا ساہ سلطان کو قطب شاہی دور کا نام دیا دینا  
میں بنیادوں پر مبنی نہیں۔ چونکہ افضل معنی ”محی الدین نامہ“ قطب شاہی دور کا شاعر تھا اور اس نے اپنی تصنیف  
میں حضرت غوث اعظم کو لفظ سلطان سے محال کیا ہے جو سکتا ہے کہ اسی صاحب اس لفظ ”سلطان“ کو شاہ  
سلطان اور افضل کو مرید تصور کرتے ہوئے شاہ سلطان کو محی الدین قطب شاہی دور کا شاعر قرار دیا ہو۔ رافضی طور  
نے غالب میں شاہ سلطان کو قطب شاہی دور کا شاعر قرار دینے کے بجائے دہلی کے شاعر قرار دیا ہے اور اس میں سلطان  
مالاں زندگانی کی گہرہ کھل جاتی ہے۔ اس قصہ میں میں نے جو حقائق بیان کیے ہیں اس سے یہ ثابت ہے کہ سلطان  
نامہ اشعار نگار مرید اسماعیلی اور آخری زمانہ دارالافتاء دہلی کے مرید ہیں۔ ۱۔

شاہ سلطان کے دو نثری تصانیف ہیں (۱) درالاسرار (۲) ترجمہ ۱۰۔



درالاسرار سے متعلق ڈاکٹر زوردار ادارہ ادبیات اردو کے مخطوط نمبر (۲۱۸) میں تحریر فرماتے ہیں۔

”یہ اردو نثر کا ایک رسالہ ہے جس کا مصنف مشہور صوفی شاعر

سلطان کامرید تھا۔ اس سلسلہ کا تاؤں درالاسرار رکھا ہوا۔“

ادارہ کے ایک اور نسخہ درالاسرار نمبر (۱۱۱) کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

”زیر نظر کتاب بھی اردو نثر میں ہے لیکن ٹھیک طور پر نہیں

کہا جاسکتا ہے کہ یہ خواجہ بندہ نواز ہی کی زبان ہے۔“

نصیر الدین ہاشمی تذکرہ مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ مرحوم میں درالاسرار کے مخطوطہ نمبر (۲۱۸) کے نقل سے لکھتے ہیں۔

”اس رسالہ کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوا۔ لہذا

غالب ہے کہ خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی گیسو دراز کے

سلسلہ کے کسی بزرگ نے لکھا ہے۔“

ڈاکٹر روت کے فہرست مخطوطات ادارہ ادبیات اردو میں ایک مقام پر درالاسرار کو خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے اور اس فہرست کے دوسرے اوراق میں درالاسرار کا مصنف ”مرید سلطان“ کو قرار دیا ہے اور نصیر الدین ہاشمی نے بھی اپنی وضاحتی فہرست میں اسے شاہ سلطان کی تصنیف ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے اور ”دکن میں اردو“ میں صاف و صریح طور پر شاہ سلطان کی تصنیف قرار دے دیا ہے لیکن نصیر الدین کی نسبت ڈاکٹر زور کا خیال کہ وہ درالاسرار کو ”مرید سلطان“ کی تصنیف قرار دیتے ہیں چونکہ شاہ تانی سلطان اپنے والد فخر سلطان کے مرید و پیغمبر تھے اس لئے انہوں نے اپنی تصنیف کا آغاز لفظ ”سلطان“ ہی سے کیا ہے۔

میرے خیال میں یہ تصنیف نہ تو خواجہ بندہ نواز کی ہے اور نہ ہی مرید سلطان کی بلکہ معروف شاہ چشتی ہند کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصنیف شاہ سلطان تانی کی ہے اس کی پہلی دلیل ”تاہات ۱۹“ کشف الاسرار مصنف خواجہ معروف چشتی میں یوں ملتی ہے :

”پس نقیر حقیر خواجہ معروف چشتی ہند حضرت فرد حقیقت

الہی اویا خواجہ شاہ عارف باللہ چشتی قدس اللہ اسرارہ

کے صدقے سوں سال کاں ہو رطلایاں کے واسطے اس صورت

(سورت) ہند میں عشق کا بازار کر کر عاتقاں کوں دکھلانے

یو مخفی کنہی (منج کلم) باٹ کھولتا ہے۔ بموجب فاسلو اہل الذکر

ان کسٹم لاء تعلیموں یعنی بوجوں میں باٹ جانتے سولو گان  
 کون کہ نہیں جانتے ہیں تو ہور اس رسالہ کا ناں  
 کشف الاسرار رکھا ہوں جواب سلطان کے بودر الاسرار  
 کا دیا ہوں تا مرید کو مراد حاصل ہو۔"

دوسری دلیل مترج در الاسرار ۳۷۷ تصوف تاملات جلد دوم صفحہ ۱۲۹۱: یعنی ہے

"آخری رسالہ میں بودر الاسرار حضرت سلطان  
 ثانی صاحب فرماتے ہیں سو اسی کا مترج فقیر صغیر نعمت اللہ  
 اپنے سمجھ کے موافق کے ہیں۔ مرشد خواجہ محمد والدین  
 حسینی کے صدقہ سوں کہا؟

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے سلطان کے حالات زندگی اور تعارف پر جو کچھ کام اب تک ہوا ہے  
 وہ حرف آخر نہیں بلکہ اس سلسلہ میں مزید تحقیق کے لئے میدان کھلا پڑا ہے جو کوئی بھی اس  
 بحرِ قنار کی غواصی کرے گا تو "دارم الحین کہ باندہ من در بے بہارا"۔ ●

### بقیہ سلسلہ تعلیم کا مقصد: صفحہ ۱۲۵۱ سے آگے:

بچے تو ایسے ہی ہوتے ہیں کو یا عید دور ایک سولہ اطمینان ہے کہ میں بدیر یا یا جائز' نثریاں  
 جائز' اور بدعنوانیاں ناگزیر ہیں۔ تربیت کی ضرورت نہیں، اخلاق کی ضرورت نہیں، کرار کی ضرورت  
 نہیں اسی لئے ہماری نئی پود (FRUSTRATED) ہے۔ ایک ذہنی بے اطمینانی ان میں پائی جاتی ہے  
 تہذیب و تمدن کی دیواریں گرتی جا رہی ہیں۔ کیا ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہماری اولاد میر (MORALS)  
 اور اعلیٰ اقدار کے زندگی گزارے؟ کیا تہذیب و تمدن، اخلاق و آداب کا فقدان کسی ملک یا قوم کی ترقی  
 کا ضامن ہو سکتا ہے؟

موجودہ طریقہ تعلیم میں کیا کمی ہے؟ لڑکے لڑکیوں کا رجحان رستی کی طرف کیوں جا رہا ہے؟ کیا  
 اس کا مشاہدہ کرنے کی ابھی ضرورت ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا ہم ذمہ دار اسے؟ اطمینان نہیں  
 کر سکتے کہ تعلیمی اداروں کا جائزہ لیں اور نصاب میں تبدیلی لائیں؟ ہمیں اپنے حق کی صحیح پہچان  
 کرنی ہے انھیں اجالوں میں لا کر اگر نکلے اور اندھیروں میں گم نہیں ہونے دیتا ہے۔ یہی ہے  
 کہ ایک صالح معاشرہ کی ابتداء ہوتا کہ ہمارے بچے سراسر اچھا کرچی سکیں۔ ان کے کردار کی توثیق کر کے  
 ہمیں اچھا شہری بنانا ہماری پہلی ذمہ داری ہے اور ان کو اچھا انسان بنانا ہمارا پہلا فرض ہے ●

قطب ہرشار

## نقطۂ اتحاد

عمود کائناتی

ہر طرف اک سر و سہائی

کوئی تو گرم منظر ہو

ٹھٹھرتی بامبرہ کو کچھ توانائی بٹے

لیکن

ہمالہ کی طرح ہر پیکر ترخ بستہ

اپنی اونچی قامت پر اکڑ تلہ ہے

ادھر وہاں کے پردوں میں سورج

منہ پھپھائے پھر رہا ہے

پرندے

آشیانوں میں

پردوں میں منہ پھپھائے

برق کی آواز پیا سن رہے ہیں

گماں کی نرم روندی کاسیل خوش ادا

ساکت کھڑا ہے

غلت رہو در و شب میں

بیشتر الفاظ

اپنی گرم معنی آفرینی کھو چکے ہیں۔۔۔!!

پروغ خیر

## صبح کا ذب

یہ سچ ہے

جھوٹی حکایتیں من گھڑت لطیفے سنانے والے نے یہ کہا تھا

کہ لومڑی — باز کی بہن ہے

جو شاخ زیتون شوق سے نوش کر رہی ہے

تمام نابستہ شیر برکس کے اپنے پنجرہ میں جا چکے ہیں

جتا رب و جمال ایک ہمدی کے روپ میں

لامہ مشرق میں گام مغرب میں جلوہ فرما ہیں

اوس و خورج میں پھر لڑائی ٹھنی ہوئی ہے

فراٹ گنگائی مل رہا ہے

نشان ہر شہر ہے فلسطیں بے نشان کا

گماں کیا کیا ہے بد گماں کا

پھر اس روایت کے بعد راوی نے یہ بھی چپکے سے کہہ دیا تھا

کہ ذکر اس کا کہیں نہ کرنا

یہ جھوٹ ہے سب یقین نہ کرنا

پھر اس قدر زور کا ہتھم پڑا تھا

جو دیدہ تریں آکے ٹوٹا

یہ سچ ہے

## سردار منیر

# اردو شاعری کی ایک نئی آواز

عہدِ جدید میں شاعری کے انسانی منصب کی تعریف سینٹ جان پرس نے بہت خوبصورتی سے کی ہے۔ پرس کا کہنا ہے کہ تاریخ کے ایک ایسے لمحے پر جب فلسفہ مابعد الطبیعیات کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے ہانپ جاتا ہے صوفی شاعری سے اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اعلیٰ ترین حقایق کے ظلم کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اس منصب کے پیش نظر شاعری کو بجا طور پر حیرت کی بیٹی قرار دیا جاسکتا ہے اگرچہ اس امر کو تسلیم کر لیں تو شاعری انسانی حیات اور کائناتی وجود کے درمیان ایک مسلسل ربط کا زندہ اور پورا لمحہ ہے اعلیٰ شاعری کی یہ تعریف ذہن میں رکھتے ہوئے اردو شاعری کی پچھلی کچھ دہائیوں پر نگاہ کرنا ایک پُر افسوس تجربہ ہے۔ اس استثنائی مثالوں سے قطع نظر پچھلی دہائیوں کی شاعری حیرت کے زوال اور ادبی فریب کاری کے فروغ کا عبرت انگیز قلعہ ہے۔ کسی اجتماعی تجربے میں شرکت کے عدم احساس نے شاعری کے میدان کو یوں بھی تنگ کر دیا اس لئے کہ بہت سے قوی شعراء بھی اپنی تہذیب کی مختلف کیفیتوں میں پوری طرح شریک نہ ہو سکے اور انفرادی طوع پر ہی انہوں نے اپنے تجربے کو ایک شکل دی۔ لکھنے والا اپنے لوگوں کے ساتھ مل کر لکھتا ہے چنانچہ کسی بڑے تجربے میں نہ اتر سکنے کی مجبوری نے ان کے کینوس کو بہت تنگ کر دیا۔ اس تنگ مائیلی نے اچھے شعرا کو بے شک پیدا کیے لیکن بڑی شاعری سامنے نہ آ سکی اس لئے کہ بڑی شاعری غیر معمولی وسعت کی طلب گار ہوتی ہے اور جو شعرا اپنے انفرادی آشوب سے مضمون آفرینی کرنے میں راج ہو گئے ہیں ان سے کسی نئی سطح کی دریافت کی توقع کرنا یا اپنے شعری منظر میں کسی کثیر الجہات طرز احساس کو برتنے کی امید رکھنا فضول ہے۔

فی الوقت شاعری ایک بغاوت طلب کرتی ہے۔ اپنی اصل، اپنی مٹی، اپنے بچپن، قلب اور لہو کے آہنگ کی طرف ایک مکمل اور ثمر دار بغاوت! اس بغاوت کے بغیر شاعری متوسط الحال فم کے لوگوں کی سماجی اور انفرادی فرسٹریشن کا بے رس و زنا پیم بن کر رہ گئی ہے۔ اس کیفیت میں

شعری منظر پر صلاح الدین پرویز کا سامنے آنا 'اصل' کی طرف پلٹ پڑنے کے وزمینیاتی عمل کی ضرورت ہے۔

رد و قبول سے قطع نظر اس امر میں تو کسی کو کلام نہیں کہ صلاح الدین پرویز کی شاعری ایک مختلف ڈھنگ کی تیر ہے۔ اس میں مذہبی بلکہ سائنس کا غلبہ اسے فوری طور پر دوسری شعری کاوشوں سے ممتاز کرتا ہے لہذا اس شاعری کو سمجھنے کے لئے اسی عنصر کے مطالعے سے آغاز کرنا مناسب ہوگا۔

بہت سے لوگوں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ صلاح الدین کی شعری کائنات کے مرکز میں نور و رسالت سے والہانہ محبت ہے، مطہروں کو تخلیق کرتی اور نئے لہجوں کی بنیاد اٹھاتی ہے۔ وہ اسی مرکزی روشنی میں کائنات اور استیلا کو دیکھتا ہے۔ "اپنی ہی وجہ ہے صلاح الدین کی نفیس مروجہ لغتوں سے بدیہی طور پر متعلق ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک تاریخی اور تاریخ ساز شخصیت کی نہیں بلکہ ایک سنت والہ و دیہ والی روحانی واردات کی ہے۔

اسے بلاؤ کہ ٹوٹ جاؤں میں اس کی آنکھوں میں نیندیں کے

اسے ملاؤ کہ پھوٹ جاؤں میں اس کے سینے میں بوندیں کے

اس میں روحانی تجربے کی کیفیت ہے۔ اس کی شدت اور گہرائی میں حیران کن سچائی بولتی ہے اور حقیقت محمدیہ اور محال رسالت کی تجلیوں میں کھوجانے کی عمر متی اتنی عظیم اور قوی ہے کہ اس کی حدیں جذب سے مل جاتی ہیں۔ اس مرحلے پر شاعری حیرت اور شوق کا ایک سرشار بیان بن جاتی ہے۔ شیخ ابوالرضا محمد نے حقیقت محمدیہ علی صاحب الصلوٰۃ والحمیات کے بارے میں ایک بہت جامع رقم لکھا ہے۔ "حقیقت محمدیہ بزرگ کبریٰ ست درمیان خالق و مخلوق"

یہ صلاح الدین کی یہ سرشاری دراصل تلوین کے راز کے روبرو ایک قدیم سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں شان رسالت کے ساتھ ساتھ کائنات کی نظرت کے امر اور بھی کلام کرتے ہیں یہ صورتحال ہمیں عموماً سلوک بالمشق کے طریق سے تعلق رکھنے والے صوفی شعرا کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ اردو میں اس کی مثالیں یوں تو جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں لیکن اس طرح مربوط تجربے کے طور پر اس کا ظاہر ہونا ایک نادر رحمت کی نشاندہی کرتا ہے۔ صلاح الدین پرویز کے ہاں پورے شعری منظر پر

رسول اکرم کی ذات مبارک کا برتو پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں ایسا عموماً ہوتا رہا ہے کہ مجاز حقیقت کے کٹاؤں سے جمال کے استعارے اس ذات کی طرف راجع ہوں لیکن پچھلے ایک طویل عرصے سے اردو شاعری اس طریقہ کار سے روگرداں رہی ہے لیکن صلاح الدین نے اسے ایک نئے آہنگ میں زندہ کر دیا ہے۔ مذکورہ لغتوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ عموماً شاعری

کی مروجہ لفظیات سے ہٹ کر لکھی گئی ہیں۔ ہیں اس بات کی رمز مجھ لینا ضروری ہے۔

رسول اکرم سے عشق اور ان کے لئے والہانہ شہیدانہ شہادت کی فطرت کا خاصہ ہے۔ یہ ایک قدیم اور بے تغیر جوہر ہے لیکن وہ روح جو اس سمت بڑھتی ہے اس کی ہمت میں ہمدرد جدید کا سارا کرب موجود ہے۔ چنانچہ صلاح الدین کے ہاں رسالت کی طرف رخ کرنا دراصل ایک سطح پر زمانی روح کا اپنے اذلی سوتے کی طرف پلٹنے کے مائل ہے۔

عشق رسالت کے اس مرکزی استعارے کے گرد صلاح الدین پرویز کی شعری کائنات رنگارنگ منظموں کے درمیان دور تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اس پورے منظر نامے کی سب سے بڑی خصوصیت جو اسے اردو کے موجودہ شعری جہان میں غیر معمولی افتخار بخشی ہے اس کی وسعت اور بے کناری ہے اس منظر نامے میں نعمتیں ہیں، تقدیری نظمیں، وصال و ہجر کے قصے، لوریوں، جدید شعری اسالیب، اور زبان کے قدیمی لہجے، ہر عنصر موجود ہے۔ اس طرح یہاں شاعری شخصیت کے کسی ایک پہلو کی نہیں بلکہ مکمل شخصیت کا اظہار بن جاتی ہے۔ یہی چیز فی الوقت اردو شاعری کی اہم ترین ضرورت ہے صلاح الدین کے شعری مزاج کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں ایک بے حد سیال کیفیت پائی جاتی ہے۔ ذات کی مختلف سطحوں تک بیک وقت کلام کرنا، کبھی بے بعد دیگرے تیزی سے، ان سطحوں کو ایک ہی نظم میں اظہار دیتے چلے جانا، ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ اس طرح اکثر ایک ہی نظم میں بہت سے لسانی مزاج یکجا ہو کر سامنے آ جاتے ہیں اس قدر تیزی سے بدلتے ہوئے منظموں میں سفر کرنا، قادی کیلئے ایک حیران کن اور پُر لطف لیکن مشکل تجربہ ہے اسی لئے ایک جہت سے اپنی تمام تر سادہ کاری کے باوجود صلاح الدین مشکل شاعر ہیں ان سطحوں کے رنگ قاری کی فعال شرکت سے ابھرتے ہیں اور اس طرح یہ شاعری ذوق کی باطنی کائنات میں ایک پُر تاثیر تجربہ بن کر ابھرتی ہے۔ اگر ہم اس تاثیر کے پس منظر کا سراغ لگانے چلیں تو ہمیں فوراً یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ شاعری انفرادی تجربے سے نہیں بلکہ اجتماعی حافضے کی ایک عظیم یلین لم شدہ جہت سے نمودار ہو رہی ہے۔

صلاح الدین پرویز کے شعری مزاج کا باطن لکھے ہوئے لفظ کی بجائے، بولے ہوئے لفظ کی شعری روایت سے ترتیب پاتا ہے۔ اس میں گھروں میں گائے جانے والے گیتوں سے لے کر صوفیاء کی محفلوں میں پڑھے جانے والے اشعار اور مجلسوں کے نوحوں اور سوز تک کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس تہ دار روایت سے تعلق نے صلاح الدین کے شعری مزاج میں ایک غیر معمولی والہانہ پن اور تازگی پیدا کر دیا ہے۔ اس امر کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ پچھلے کافی عرصے سے اردو شاعری نے اپنے ان سوتوں سے روگرداں ہو کر اپنے رجحانات کے تعین کے لئے مغربی شاعری کے ادنیٰ تر اہم پر قناعت کر رکھی ہے۔

اب اس آواز سے اس بات کی امید بندھتی ہے کہ اردو شاعری کا کم شدہ منظر ایک نئے لہجے سے طلوع ہوگا۔ اس لہجے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سرشاری اور وارفتگی ہے جو جذبات کی ایک پراسرار کیا سے ترتیب پاتی ہے۔ یہ کیفیت صلاح الدین کے ہاں تقدیری نظموں، ساقی ناموں اور وصال و جمال کے منظروں میں بہت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس وارفتگی میں وہ آپرچ ہے جو اظہار کے سانچوں کو نگہلا کر انہیں باہم مدغم کر دیتی ہے اسی لیے صلاح الدین کے ہاں ایک ایک نظم میں خالص ہندی مزاج سے نادر اور عربی موسموں تک مختلف کیفیات ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک پیچیدہ اور رنگارنگ منظر ترتیب دیتی ہیں۔ الفاظ کی مروج ترتیب اسی آپرچ سے نگہل کر نئے تلازماتی دائروں میں دھلتی اور ایک نئی حیات کی بنیاد رکھتی ہے۔ اس مرحلے پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ لسانی سانچوں کی طرف صلاح الدین کے اس رازِ نظر کو پھیلی دہائی میں چلنے والی لسانی تشکیلات کی مصنوعی اور ناکام تحریک سے غلط فہم نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک مابہ الامتیاز اثر تو یہ ہے کہ صلاح الدین کے ہاں نئے لسانی سانچے ایجاد بندہ کی ذیل میں نہیں ہیں بلکہ یہ گفتگو اور ہم کلامی کی فضا سے فطری طور پر پھوٹتے ہیں اور اس طرح اجتماعی حافطے کی یوری قوت ان کے پیچھے ہے۔ دوسرے یہ کہ سکر کی وہ کیفیت جو ان میں متکرر ہو گئی ہے وہ ان نئے تلازماتی دائروں کی تشکیل کے لئے وافر حواز ہے اور روایت میں حضرت امیر خسرو سے لے کر آج تک اس کی بہت بڑی مثالیں موجود ہیں۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو اب صلاح الدین کی شاعری میں ایسے، اپنے اچھے اچھے لگے ہیں جو تہذیبی دائروں کے درمیان سفارت کرتے ہیں۔ اس شاعری میں ہندی تہذیب کی حیاتی رنگارنگی اپنے عروج پر ہے۔ فارسی تہذیب کی نزاکتیں، وہم و خیال سے پیدا ہونے والے نازک اور نفیس دائرے بھی موجود ہیں اور پھر جگہ جگہ عربی اشالیب کی جھلک بہت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ان سب سے الگ اور ایک سطح پر مربوط جدید شری اشالیب کے زندہ عناصر ہیں۔ اس طرح ایک مکمل شخصیت کے شری تجربے میں ایک بہت وسیع تہذیبی پس منظر سمٹ رہا ہے۔ مختلف مزاجوں اور عناصر سے ترتیب پاتا ہوا یہ تہذیبی جہاں عکس و سالت سے ایک وحدت میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ یہ امر شری تاریخ میں توجیرانی جگہ ایک اہمیت کا حامل ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ شخصیت کے باطن سے پھوٹتا ہوا تہذیبی تجسس بہ بھی ہے۔

صلاح الدین پرویز کا شری جہاں اتنا متنوع اور پُرآواز امکانات ہے کہ اس کے بارے میں سرسری باتیں نہیں کہی جاسکتیں یہ شاعری اپنے قاری سے وسیع ذوق اور شری آہنگ کو بی سکنے کی صلاحیت کا تقاضا کرتی ہے اور آہستہ آہستہ اپنے دروازہ کرتی ہے اس کے پیچھے محض انفرادی آشوب نہیں

بلکہ ایک زندہ لکچر کا پورا تجربہ رہا ہوا ہے اور تجربہ حیات کی بازی گاہ میں جہاں اردو شاعری سے انسانی کیفیات معدوم ہوتی جا رہی ہیں اور آہنگ مردہ مشینیں تکرار میں ڈھلتا جاتا ہے۔ صلاح الدین کی شاعری ہمیں اجتماعی حافظے میں کسی جہانِ زندہ کی خبر دیتی ہے اور اپنے آہنگ اور مثالوں میں اس جہان کے عکس دکھاتی ہے۔ یہ بات بہت ذمہ داری سے لکھی جاسکتی ہے کہ فی الوقت تہذیبی نقطہ نظر سے صلاح الدین پرویز کا شعری تجربہ ہندوستانی تہذیب کی بھرپور نمایندگی کرتا ہوا، ذات کی اکائی سے مختلف سطحوں پر بازیافت کے ایک عمل کو جنم دیتا ہے اور ہم سے مانوس اور رچی ہوئی تہذیبی لفظیات میں کلام کرتا ہے اس لیے میں اتنی قوت ہے کہ یہ ہمارے لبوں میں رواں منظروں کے عکس سے ترتیب پاتا ہے۔

کنفیٹین کے عنوان سے صلاح الدین کی طویل نظمیں ایک الگ مسطر ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ سیاسی اور سماجی مسائل کے اظہار کے سلسلے میں ایک نئی صنف کا درجہ رکھتی ہے اور اس میں لہجوں کے مختلف رنگ، ایک گہرے آئینہ میں گندہ کرتا ہوا سے سامنے آتے ہیں۔ یہ معاشرے سے ہم کلام ہونے کا نیا اسلوب ہے اس لیے میں خطابت غم کے ساتھ غلوٹ ہوئی ہے۔ صلاح الدین پرویز کا شعری جہان اپنے منظروں کے تنوع میں ایک غیر معمولی قوت کے ساتھ کسی نئی شعری حیثیات کو تخلیق کرتا ہے اور ہمیں ایک نئے تجربے کے رُخ دکھاتا ہے۔ اس تجربے کو ہمارا اپنی باطنی کائنات کی ترتیب نو کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ترتیب نو ہماری شعری تاریخ میں ایک اہم روحانی واردات ہے۔ ●

(حصہ ۱ کے پڑھیے) پرویز عالم جو مرنے کو سہایا انھیں گردوں کی حوائی کا عمارہ لاحق تھا، بلاس وفیات کے کرب سے گزرا، ان ملک علاج حال بھی ہوا، کارطیبی نے انھیں اپنے پاس بلایا۔ پرویز عالم خود میری جہان، ان ہی ہیں برصغیر ہندوستان کے دانشور عالموں میں شمار ہوتے تھے ان کے لکچرس اور مقالوں کی شہرت میں الاقوامی حدود کو تسخیر کر چلی تھی۔ اسلامیات، اثنائیا، خرواد کے مارکی نظریات اور عصری ادبی رجحانات پر ڈاکٹر عالم کی نظر ان کی نوعیت کی رہی ہے حیدرآباد میں ان کا وجود علم و ادب کے کتے ہی طالب علموں کیلئے فیضان کا باعث رہا۔ یہ ہے عالم صاحب ایسے عالموں کی موت ایک علم نے اور دوسری موت، ہوتی ہے۔ جن دن عالم صاحب کا انتقال ہوا اسی شب حیدرآبادی روایات کی ایک بزرگ شخصیت، دکر راؤ دیتیکہ دکن نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۸۴ سال عمر تھی تین شعری مجموعے ان کی یادگار ہیں۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو ایک بزرگ شاعر غائب ہو گیا جس کا نام بھی رخصت ہو گیا اپنی وضع کی آپ مثال تھے کسی میں موضوع پر افانوی پیرایہ میں داستان گوئی کا ہنر ادیب مرحوم کا وہ وصف تھا جو ان پر ختم ہو گیا۔

۱ وقتِ زخلیل



## سید شاہ سکندر

# حالی کی رباعیاں

صنف غزل کے بعد ستاعری جو رباعی کا بھی بہت  
 ۱۹۵۰ء ہے۔ یہی وہ صنفِ سخن ہے جو غزل سے بھی  
 ہے غزل میں عموماً ۵، ۷ یا ۹ شعر ہوتے ہیں  
 رباعی میں کل دو شعرا چار مصرعے، اس کی کل  
 ۱۰ ہے رباعی کو شعرا عموماً اس صنفِ سخن کو  
 اذیت کے لئے استعمال کرتے رہے۔ اپنی  
 ت اور موضوع دونوں کے لحاظ سے چونکہ یہ صنف  
 اور بصیرت کے لئے سب سے زیادہ کارگر ہے  
 لئے حالی نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے  
 اردو کے اولین پیامی ستاعری تھے اور یہ صنف  
 ان کے مزاج اور ان کی عصری آہنگی سے خوب  
 مست رکھتی تھی اس لئے حالی کی تمام رباعیاں ان  
 پیام و اصلاح کے مقصد کے لئے جس طرح کارگر  
 ت ہوئیں اسی طرح حالی کی رباعیاں فنی معیار پر پوری  
 ہیں۔ حالی نے فنِ رباعی کے سلسلے میں ایک  
 دوستی یہ اختیار کی ہے کہ بعض ایسے اقوال جو  
 الہی میں یا کسی حدیث میں آئے ہوئے ہیں ان کو  
 نہوں نے رباعی کی شکل میں کامیابی سے پیش کیا  
 ۔ مثلاً یہ رباعی ۵

دنیا دنی کو نقش فانی سمجھو  
 رو دادہاں کو ایک کمانی سمجھو  
 رجب کرو آغز کوئی کام بڑا  
 ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

رباعی کے فن میں حالی کی کامیابی کی ایک وجہ یہ  
 بھی ہے کہ انہوں نے صداقت اور واقفیت ہی کو  
 اپنا موضوع بنایا ہے اور ان ہی کیفیات کو پیش کیا ہے  
 جو ان پر گزری ہیں۔ یہاں بھی ان کا اخلاقی پہلو وہی  
 سماجی بھلائی اور اجتماعی بہبودی ہے۔ حالی کی رباعیوں  
 پر ڈاکٹر سلام ندیلوی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:  
 'حالی کی رباعیوں کا مطالعہ ہم کو ۱۸۵۷ء کی پہلی  
 جنگِ آزادی سے قریب تر کر دیتا ہے۔ اگر کوئی مورخ  
 اس دور کی معاشرتی اور تمدنی تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنا  
 چاہے تو اس کو حالی کے کلام اور ان کی رباعیات سے  
 کافی مدد ملے گی۔'

حالی کی رباعیاں صرف مسائل کو پیش نہیں کرتیں  
 بلکہ ان کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مسائل کا حل  
 بھی پیش کرتے ہیں۔ ان اعلیٰ قدروں کو پیدا کرتی ہر  
 جو انسان کو دنیا میں باعزت اور باوقار بناتی ہیں۔ یہ بات

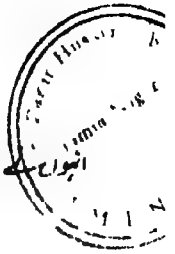
حالی کے پیش نظر تھی کہ وہ اس فن کو اپنے پیامی اور اصلاحی مقصد کے لئے خوب استعمال کریں اور انہوں نے یہی کیا۔ حالی کو زندگی کی چند قدریں بہت عزیز تھیں۔ حالی کے عہد کا سب سے بڑا مطالبہ نفاذ آزادی اور ترقی کا مطالبہ تھا۔ جماعتی صلاح اور فلاح حالی کی ادلیں اور اہم ترین ضرورت تھی اس کی خاطر حالی نے جن نذروں کو اپنایا اور اجبا کر کیا ان سب میں سب سے بڑا پہلو جماعتی صلاح اور فلاح اور معاشرت کی بہبودی سب سے اہم اور اعلیٰ قدر ہے جنہیں خصوصیت سے اجاگر کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر سلام سدیوی لکھتے ہیں ”حالی کی رباعیات کو صرف قوم کا مریہ ہی نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ وہ قوم کے لئے پیغام بھی ہیں۔ ان کی رباعیات میں ہر جگہ اصلاح کا پہلو نمایاں رہتا ہے انہوں نے قوم کی پست حالت کو ابھارنے کی کوشش کی، جو ان طبقہ کو تحریک و عمل کی ترغیب دی ان کو تحصیل علم کے لئے آمادہ کیا۔“

گداگری کے پیشے کی مذمت کی، ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد ڈالی، نہ جان کو مار داری عشق کے بُرے اثرات سے آگاہ کیا۔ ان کو محنت و مشقت کی طرف مائل کیا، ان کو ایسے سیراں پہ کھڑے ہوئے کہ درس دیا۔ اس طرز حالی نے اپنی رباعیات نے درویش قوم کے محبوب کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ایسا، میر مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے حالی کو رباعیات سے حالی نے دیا ہے میں انہی کے مامور وطن پرست، ساعر کار و دشتی، سیدین دی اور لکھا ہے۔ کار و دشتی نے زندگی کو وقف کر دیا اس نے ملک سے، وفات کو چاک کیا اور مرزین وطن کے ذرہ ذرہ کو منور کر دیا اس نے چرچ کی بیت حالت پر حملہ کیا اور تعلیم و قیادت پر حق کا ممکنہ اڑایا وحید الدین سلیم نے یہی خوبیاں حالی میں ہم تائی ہیں۔ حالی کی زندگی بھی ہندوستان کی لٹریچر کی زندگی تھی اور انہوں نے بھی روشنی کی طرح ملک و قوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔

”حالی کی بعض رباعیاں عام میں مقبول ہیں۔ اکثر رباعیات اصلاح کا پہلو لئے ہوئے ہیں اور بعض پر تو پند و موعظت کا دھوکہ بھجاتا ہے“

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے اپنی رباعیات سے ہندوستان کو دھوکہ بھجاتا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں قوم کی فلاح و بہبود کا جذبہ اور سرسید کا عقائد وہ اپنے پیغام کو اپنے طریق بیان پر ترجیح دیئے تھے۔ اصل حالی یہاں پر ہے مجھے اور ساء بعد ان کی بصیرت سے۔ یہ حال کے آئینہ میں استقبال کو واضح کر دیا تھا۔ ایسا ہے کہ ان میں موضوعات اور مسائل ایسی رباعیوں کا مرکز اور محور قرار دیا وہ مسائل ہر عہد میں زندگی کے بنیادی مسائل ہیں۔ حالی نے ان ہی مسائل اور موضوعات کو اہمیت دی جن کی اس وقت قوم اور ملک کو سب سے زیادہ ضرورت تھی یہ موضوعات جتنے اہم اور قابل قدر ہیں، قدر ان میں ایک طرح کی خشکی اور سادگی بھی ان کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ شاید اسی پہلو کے پیش نظر لی نے اپنی شاعری کو ابالی پکھڑی کہا ہے۔

حالی نے جس عہد کو خاک و خون میں ات پست دیکھا تھا اس کا احساس اور اس کا مکمل اظہار ان کی رباعیوں میں جاتا ہے۔



آیا کو زمین و ملک پر اطمینان اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان  
 بچے آوارہ اور بے کار جوان ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے جہان  
 انجواں کے عیش و عشرت کو قوم کے لئے معذور نہ پا کر قرار دیا ہے  
 عشرت کا تر تلخ سد ہوتا ہے ہر قبیلہ پر عینام بکا ہوتا ہے  
 جس قوم کو عیش و دست پاتا ہوں میں لکنا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے  
 اس عیش و عشرت نے دنیا، بابل، بغداد اور قرطہ جیسی عظیم استان سلطنتوں کو تباہ کر دیا تھا۔ حالی نے اسی تاریخی  
 گواہی کو بطور ثبوت پیش کیا ہے۔

اے عیش و طرب تو نے جہاں رائج کیا سلطان کو گدا، غنی کو مستلاج کیا  
 حالی نے اسی وجہ سے عشق کو بھی معیوب بتایا کیونکہ اس سے گھرانوں میں لگن لگ جاتا ہے اس نے قوموں کو تباہ کیا ہے۔  
 اے عشق کیا ہے تو نے گھرانوں کو تباہ بیروں کو ضعیف اور جوانوں کو تباہ  
 دلچا ہے سدِ اسلامی میں تیسری قوموں کو ذلیل، حادہ انوں کو تباہ  
 حالی نے گڈاری کے خلاف بھی اپنی ہمدردی کی جو قومی تباہی کی علامت ہے۔  
 اک مرد توانا کو جو سائل پایا کی ہیں نے علامت، دم بہت سترمایا  
 بولا کہ ہے اس کارن کی گردن پہ دیاں دیے کی جھوٹوں نے مانگنا سکھایا

یہ اور اس قسم کی رباعیات اپنے ماحول کی آئینہ دار ہیں، ان زمانے کے افراد جن حرایروں میں مبتلا تھے ان کی عکاسی حالی  
 نے اپنی رباعیات میں کی ہے اور اس طرح سے ان مراض کو اس کے مرض سے آگاہ کیا ہے تو ساتھ ہی حالی نے ایک ہمدرد  
 معالج کی حیثیت سے مرض کے لئے علاج بھی تجویز کیا ہے۔ انہوں نے ان تمام امراض کو دور کرنے کے لئے تحصیلِ علم پر  
 زور دیا ہے اور پورے معاشرے کو سائنس رکھا ہے۔

اے علم کیلئے تو نے ملکوں کو ہمال غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال  
 ان پر ہوئے غیب کے چراغ نے مفتوح جن قوموں نے ٹہرایا تھے اس سال  
 اس کے علاوہ حالی نے قوم کی ترقی کے لئے فوجوانوں کو محنت و مشقت کرنے کی بھی تلقین کی ہے جو ان کے  
 خیال میں ہماری قومی زندگی کی بنیاد ہے۔

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں محنت ہی کی برگتیں ہیں ہر خرمن میں  
 موسیٰ کو ملی نہ قوم کی پاس بانی! جب تلک نہ چسرایں بکریاں مدین میں  
 حالی کی ہمیشہ غری پیامبری کی ہم پلہ ہے ان کی یہ سادہ ایک طرح سے قومی بھلائی کا صحیفہ تھی، یعنی ہر بہت  
 حرقہ زندگی کے لئے ضروری ہے وہ حالی کا موضوع ہے۔ پروفیسر وحی الدین احمد کی روایت ہے کہ ان کے استاد  
 حضرت عبید اللہ سندھی جب ہندوستان سے چلا وطن ہو کر افغانستان، ترکی اور دوسرے ملک میں گئے تو اس زمانے  
 میں روس میں انقلاب ہوا جس سے انھیں دلچسپی پیدا ہوئی وہ افغانستان سے روس پہنچے اور روس میں ایک نمائش ہوئی

یہ دکھایا گیا تھا کہ انقلاب کے بعد اب جو زندگی کا دور شروع ہو رہا ہے وہ کتنا اچھا ہے اب ہر شخص کو محنت کرنے کا حق ملے گا اور محنت کرنے سے پورا ماحول جنت بن جائے گا۔ اس نائیش میں محنت کی عظمت اور بڑائی کے بارے میں ہندی مفکرین کے ارشادات مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے نائیش میں خاص طور پر آدراں کے لئے تھے۔ نائیش دکھانے والے نے حضرت سندھی سے پوچھا کہ کیا آپ کی زبان میں بھی کوئی ایسا شاعر یا ادیب ہے جس نے ایسی کام کی باتیں شعر میں یا نثر میں پیش کی ہوں۔ سندھی صاحب نے سوال کر کے والے روسی کو فوراً جواب دیا ہمارے ایک شاعر مولانا۔ حالی تھے جنہوں نے ایک مشہور نظم ”مسدس“ بدو حرد اسلام لکھی، میں اس میں سب اسی طرح کی باتیں ہیں، جو قہاری نائیش میں دکھائی جا رہی ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ مسدس کا کوئی ایسی بد سنائیے جو اس معیار کا ہو۔ سندھی صاحب نے محنت کے بارے میں مسدس سے ایک بد سنایا چنانچہ، وہی زبان میں اسی کا ترجمہ کرایا گیا اور پھر حالی کے نام سے یہ بد روسی مفکرین کے اقوام کے ساتھ نائیش کی ریت بنا رہا۔

غرض حالی کی رباعیات قومی بھلائی کا ایک ایسا لائحہ عمل ہیں کہ کوئی بات جو قومی زندگی کے لئے لازمی ہے ایسی نہیں ہے جس کا حالی نے حوالہ نہ دیا ہو۔

حالی نے سماج کی اصلاح کے علاوہ مذہب کی بھی اصلاح کی۔ ان کے جہد میں نوجوان طبقہ مذہب سے بے گناہ ہوتا جا رہا تھا اور انگریزی تعلیم و تہذیب کے دیر اثر اسلام کے اساسی اصولوں سے ناواقف ہونا عادی رہا تھا۔ اسی ناواقفیت کی بنا پر ایک طبقہ خدا کے وجود سے بھی انکار کرنے لگا تھا وہ طبقہ تخلیق کائنات کا سبب پھر کو تسلیم کرتا تھا۔ حالی نے جو شش عقیدت میں آکر ان نیچریوں اور دہریوں کو ایک مغرب کاری لگائی۔ ان کی یہ دو رباعیات ملاحظہ ہوں:

ہندو نے منم میں جلوہ پایا تیرا      آتش پر مغالے راگ لگایا تیرا  
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے      انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا  
کاشا ہے ہر اک جگہ میں انکار تیرا      حلقہ ہے ہر اک گوشہ میں لٹکا تیرا  
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور      بھٹکے ہو۔ دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

حالی کو نیچریوں کے علاوہ مولویوں اور راہدوں پر بھی وار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ان میں بھی پختگی ایمان کی کمی تھی۔

زاہد کہتا تھا جان ہے دین پرستہ بان      بر آیا جب امتحان کی زد پر ایمان  
کی عرض کسی نے کہے اب کیا ہے اصلاح      فرمایا بھائی جان، مجھے ہے توجہ بان

ایران میں معدی کو صوفیوں کی نیت پر شبہ ہوا ہے

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں      سیلی میں شکس، لے کوئی لایا ہی نہیں

ہوئے راج میں بھی اس کے کوئی کھوٹ      پر اس کو کسی نے پایا ہی نہیں

حالی کو واعظ کے وعظ میں بھی خامی نظر آئی۔ انہوں نے اس کو درشتی کا اسے باز آنے کی تلقین کی ہے

اک گہرنے پوچھے جو اصول اسلام      واعظ نے درشتی سے کیا اس سے کلام

دولا کہ حضور مقدس ہوں جس کے ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام  
حالی نے یہ بھی محسوس کیا کہ مسلمانوں میں باہمی اختلاف اور نفاق ہے یہ اختلاف اور نفاق اسلام کی بیخ کنی  
پر آمادہ ہے۔

پکنا تھا اعلیٰ انشا و سخن و شہر کیا لیں گے یہ اہل قبلہ باہم لڑ کر !!  
کچھ دم ہے میدان میں آئیں در نہ کتابھی ہے شیر اپنی ٹکلی کے اندر  
اسی باہمی نفاق کی مذمت اور بھی رباعی میں سنتی ہے کی ہے اس کالب و لہجہ رباعی سے زیادہ طنزیہ ہے۔  
جب تک کہ نہ بود سخن اخوان یسکا ہوتا نہیں مومن کا دیو بیجاں پکنا  
ہم قوم کی تیر مانگتے ہیں حق سے سستے ہیں کسی کو جب مسلمان پکنا  
حالی کی مندرجہ بالا رباعیاں اس دور کے مسلمانوں کی کمزوریوں کو لے نقاب کرتی ہیں۔ حالی کے لب و لہجہ میں  
خلوص بھی ہے اور طنز بھی مگر جو کچھ ہے سراسر صداقت پر مبنی ہے۔ حالی کی رباعیت کے آئینے میں اسلام کے اصل  
حد و خال نظر آتے ہیں ان کی دور باعیاں ملاحظہ فرمائیے :-  
پستی کا کوئی حد سسکا، ماد کچھ اسلام کا کر نہ ابھرنادیکھے  
ما نہ نہ کبھی مد ہے جذر کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان بوسات میں بھرے کا نہ تھا جس پہ نشان  
مابوس تھے جو تنے سے دھقال یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی نشان  
حالی نے اسلام کے تشرل کو ایک چٹیل میدان سے تعبیر کر کے مسلمانوں پر ایک زبردست طنزیہ وار کیا اور یہی  
دار مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے کافی ہے۔ اسی وار نے ان کو گراں خوار سے جو نکایا اور ابھرتی ہوئی صبح کے  
جلوؤں سے ہم کنار کیا۔

حالی کی شاعری کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شاعری سے سحر کے تقاضے پورے  
کرتے ہوئے قوم کی رہنمائی کا مقدس فریضہ بھی ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین نے حالی کی شاعری کی تعمیری حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور ساتھ ہی اکبر اور حالی کے نظریات  
کا فرق بھی بتایا ہے۔ ہیں فرق حالی اور اکبر کی بیباکیات پر بھی منطبق ہوتا ہے ایک، حالی نے سوز داروں کے لہجے میں  
ملت اسلام کو اس کے عروج و زوال کی داستان سنا کر گزشتہ عظمت و اقبال کی یاد تازہ کر دی اور موجودہ پستی و  
نکبت پر غیبت دلائی۔ دوسرے اکبر جس نے ظرافت کے پیرائے میں مسلمانوں کو غیروں کی ذہنی غلامی کی  
ذلت سے آگاہ کیا اور ان کی نظریں اپنے مذہب و تمدن کا احترام دوبارہ قائم کر دیا۔

حالی جدت پسند تھے قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے اور جدید تہذیب کی خوبیوں کو  
اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے، اکبر قدیمت پسند تھے نئی روشنی کی ہر چیز پر ہنستے تھے۔ اور پرانی روشنی کی ہر چیز کو

سراہتے تھے مگر دونوں نے مسلمانوں میں غیرت قومی کے جذبہ کو ابھارا اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ دیا اور یاس کی تاریکی میں امید کی ایک جھلک دکھائی۔

ڈاکٹر عابد حسین نے حالی کے کام کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان کی جھلک صاف طور پر ان کی رباعیات میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور ان کا سوزِ دروں اور ان کے دل کی تپش ان کی بہت سی رباعیات میں ملتی ہیں۔ اسی لئے ان کی رباعیاں قوم کا مرثیہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً 'حالی نے ایک رباعی میں کاہلی اور سستی کی مذمت کی کیونکہ یہ بُری عادتیں ہر گھڑنے کے لئے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ حالی کی تمام رباعیاں اپنے موضوع اور مقصد کے لحاظ سے حالی کی شاعری میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں ان کو بجا طور پر ہر فرد اور ہر قوم کی زندگی کا دستور العمل قرار دیا جاسکتا ہے۔

حالی کی رباعیاں ان کے مقصد اور پیام سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور ان کی پیامی شاعری کا سب سے کامیاب اور اچھا نمونہ ان کی رباعیوں کو کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ حالی کا ذہن یکسر تعمیری تھا اس لئے انہوں نے رباعیوں کے ذریعے صورتِ حال کو یوری طرح سمجھنے اور بہتر کرے کی کوشش کی ہے۔ اکثر کی طرح انہوں نے محض طنز و ظرافت کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ حالی کی شاعری میں اعلیٰ اخلاقی اصولوں کا براہِ راست بیان ان کی رباعیاں ہیں۔ ان کے اعلیٰ مقاصد اور ان کے بہترین ہونے میں کسی کوشش نہیں لیکن حقیقت اگر ستر کے چائے میں دل نواز نہ ہو اور صداقت شعر کے آئینے میں خوش گوار نہ ہو تو اس کی ادبی اور شعری حقیقت محروم ہو جاتی ہے۔ اس بناء پر حالی کی رباعیوں میں جس شریعت کی کمی کا اظہار کیا گیا ہے وہ درست ہے۔ 'والرؤی ہی ہو تو اسے کھانا پڑتا ہے لیکن ساعرِ دوا کی کوڑا ہٹ کو ستر کی سیرینی سے اگر بدل دے تو وہ حکیم اور مفکر سے بڑھ کر شاعر بن جاتا ہے۔

حالی نے ان موضوعات اور مسائل کے پیشِ قوم کو خوب خوب لکھا ہے۔ ان کی لکاریں گھن گرج کی سی کیفیت ہے لیکن یہ تاثیر سے بھر پور ہے۔ ...

— ادارہ ادبیاتِ اردو میں حاضر ہو کر میں بہت مسرور ہوا۔ نوادر کا آثارِ دہرہ ایک چھت کے نیچے پستان

میں شاید ہی کہیں ہو۔ خدا مرحوم زور صاحب کے درجات اعلیٰ کرے، ۱۲/۱۱/۱۳۱۰ء سے لے کر ۱۰/۱۰/۱۳۱۰ء

کے مابین مضبوط کرے تا کہ اس میں دن دو گنی رات چو گنی ترقی ہو۔ (سرس الرمن ناروتی، ۵ جولائی ۱۹۸۰ء)

— محی الدین زور کے نام کے ساتھ ساتھ کب سے میں 'ادارہ ادبیاتِ اردو' کا نام سن رہا ہوں، رہے نصیب اس ادارے میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ درود یوار کو دیکھا، مخطوطات اور مطبوعات پر نظر ڈالی۔ تعاون و فروغ میں، نوادر نو ایک نظر دیکھا، حق

ہوا اور ایک روحانی بالیدگی حاصل ہوئی۔ (استغفار حسین، ۱۱/۱۱/۱۳۸۳ء)

## منہ و ہلال چٹائی

## سآغر مکتوری

مانگاجب ایک اُمید شوق مراد نے  
ذوقِ رفو دیا دل بہت نثار دے  
دانشِ عمیق جز تذبذب میں غرق ہے  
بے تے دکھا دیا اتے جو بھٹکانے  
یہ کیا کیا ضمیرہ دیمپ بھٹکانے  
دل پر برس برس کے سحاب غمانے  
خاکِ تھا خاک کا دس بے نگاہ بھٹکانے  
نوری بنا دیا مجھے نورِ جماد نے  
آتا تھا ور نہ مجھ کو بھی ساگر کھنگالنے  
بے حوصلہ کیا نفی اعتماد نے  
آئی نہ مرگ بارِ قیامت ابھی مگر  
رستہ دکھا دیا اسے ماہِ عناد نے  
سوئے شبِ تل اٹھے سانوں کے قافے  
کیسا دما جراغِ دل بد نہاد نے  
تیرا پتہ بتانہ سکا ناطقہ ہنوز  
پل میں بتا دیا نگہِ اعتقاد نے  
ہم نے تو کی غمی اصلِ حقیقت بیاں مگر  
مغور کر دیا اُسے تحسین و داد نے  
چھلا دیا ہے زیرِ لابلِ سمدج میں  
اندازِ فکر عام کے ٹٹک فساد نے

تفہ میں پیش کی مجھے تاریخ کی کتاب  
ہادی بصدِ سلو مری روڈِ راد نے

اب اس منزل میں لے آیا ہے ذوقِ عاشقی مجھ کو  
بہت یاد آئے تے تڑپائے تے تیری گلی مجھ کو  
نر زکرتوں سے بچھ گئے آنکھوں میں حبات  
وہاں پردل کے داغوں سے ملی ہے ریشی مجھ کو  
سفرِ یوں کاٹ کر آیا ہوں لمحوں کی کشتی میں  
خدا کے واسطے تم مت سمجھو نا ولی مجھ کو  
ہوا کے زہر پر ہڈ لارہا تھا کل سرور پر جو  
اُسی تھمے سے تھکے سے ملی ہے سرکشی مجھ کو  
مرے ہاتھوں نے یوں تو چھوڑ کو جس بختا ہے  
مگر یہ موڑیرڈستی رہی تیسری کمی مجھ کو  
ڈوبو دیتا میں اپنی زیست کو کالے سمندر میں  
ذرا بھی حوصلہ دتا جو احساسِ خودی مجھ کو  
سہارا پائے تیرے آج میں خواہ تے بھی بڑا بھول  
طلب کی راہ میں اسے زندگی تو کیا مہی مجھ کو  
جلن آنکھوں میں اجڑے دل میں سوطوفانِ جہول  
میری شعلہ مزاجی بخش دے وہ بے گلی مجھ کو  
گلوں سے زخمِ کانٹوں سے غلش جب سے ملی سآغر  
بڑی حسرت سے آسکتی ہے چمن کی ہر گلی مجھ کو

تعلیم کا مقصد

## تعلیم کا مقصد

تعلیم کلاسیکی نتیجہ کردار اور خیالات کی بجائے 'ذہن و شعور کی آبیاری ہے۔ تعلیم ہماری سوچ و فکر کو بلند بنانے کے لئے ہے۔ تعلیم سے ہمارا کردار 'ہمارا اعلیٰ اور ہماری شخصیت بکھر سنور کر عام آدمی کی سطح سے بلند ہو جاتی ہے۔ آدمی وہی ہوتا ہے جو وہ سوچتا ہے اگر مریضی مشکل ہے کہ: *A MAN IS WHAT HE THINKS*۔ چنانچہ جس قدر ہماری سوچ و فکر اونچی ہوگی اُسی قدر ہمارا اعلیٰ احسن واعلیٰ ہوگا۔ فکر بلند ہو، نظر بلند ہو تو یہی کردار کو بلندی عطا کرتے ہیں اور جس کا کردار بلند ہوتا ہے زمانہ اس کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے وہ فاتح عالم کہلاتا ہے یہی انسان کی عظمت ہے اور ہمیں پہنچ کر اقبال نے کہا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے: بتا تیری رضا کیلئے؟

اپنے وجود، اپنی شخصیت اور عظمت کو جاننے اور پہچاننے کے لئے ہمیں صحیح تعلیم کا حاصل

لانا ضروری ہے۔

تعلیم اور تربیت کے لئے ہمیشہ ماں کی گود ہی تلاش کی جائے گی۔ ماں ہی بچے کو تخلیق دیتی ہے۔ اس کی فطرت کو سنوارتی ہے، ماں ہی بچے کی نشوونما اور تربیت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ الفاظ دیگر بچے کی زندگی ماں ہی کے ترتیب دیئے ہوئے سانچوں میں ڈھلتی ہے اس لئے تعلیم سوان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایک پڑھی لکھی بھٹی ہوئی ماں ملک و سماج کو اچھے اور بدہ دار شہری دے سکتی ہے، ایک منظم قوم تیار کر سکتی ہے۔ عورت کو قوم کا معیار کہا گیا ہے۔

زمن کی آبادی یا بربادی کا اعصاد عورت پر ہے۔

قدرت نے نہ صرف عورت کو تخلیقی قوت بخشی ہے بلکہ اس کی انفرادیت، اہمیت اور عظمت



اور بلند مقام کا بھی تعین کر دیا ہے۔ اقبال اور حالی نے عورت کو 'آسمان کا تارہ' اور 'قوموں کی عزت' سمجھا۔ عورت 'شعروں کے زمزمے' گلوں کی ہلکی سی 'صرف ایک احساس بن کر جینے کا نام نہیں' وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ ایثار و قربانی اس کا شیوہ رہا ہے۔ اس نے دنیا کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیا، لیکن بدلے میں کسی چیز کی خواہش نہیں کی۔ اس کی عتابی غرض، اس کا پیار جہاں ہے اسی لئے قدرت نے اسے مان بنایا کہ اس سے بڑھ کر پیار و محبت، مہر و برداشت اور علم و عمل کا منبع کوئی نہیں، اس سے بڑھ کر شکتی اور طاقت کوئی نہیں۔ اس سے بڑھ کر معلم کوئی نہیں۔ وہ مٹ کر دوسروں کو زندگی دیتی ہے اور زندگی کی قیمت سمجھاتی ہے۔ سمجھنے والے کے لئے عورت کی ذات خود ایک ایسی کھلی کتاب ہے جن میں اسے زندگی کا ہر سبق ملتا ہے۔

آج کے زوال پذیر ماحول میں امید کی ایک کرن صرف بچے ہیں، جنھیں صحیح تعلیم و تربیت اور پاکیزہ ماحول دے کر ہم ان کی زندگی اور مستقبل کو تابناک بنا سکتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر کر کے انھیں 'آدمی' سے انسان بنا سکتے ہیں۔ جب وہ انسانیت کے دائرے میں داخل ہوگا تو امن و محبت کا پیام پھیلا سکے گا۔ معاشرے کو بہتر بنا سکے گا۔ اچھی نسل کی تعمیر ہر اس ماں باپ اور استاد اور سماج کا فرض ہے جو تہذیب و سائنس کی اور اعلیٰ انسانی اقدار کو عزیز رکھتا ہے۔ جس طرح 'علم بغیر عمل' کے ادھر رہا ہے انسان بنا تہذیب کے نامکمل ہے۔ اخلاق و آداب سے آدمی مہذب کہلاتا ہے، 'شائستہ' کہلاتا ہے اور مہذب اور شائستہ آدمی ہی مہذب قوم کو پیدا کر سکتا ہے اور مہذب سوسائٹی میں رہنے کے قابل بن سکتا ہے، تہذیب کے چراغ روشن نہ کھ سکتا ہے۔

زندگی میں چند قدریں یا (VALVES) ہیں۔ چند اخلاقی اور سماجی قدریں، جنھیں ہر قیمت پر قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ اعلیٰ روایتیں اور قدریں جو کبھی ہماری معاشرت، ہماری تہذیب و تمدن اور زندگی کا جز نہیں، ہرگز فراموش کر دی گئی ہیں۔ ان کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اہمیت آج کل دولت کی ہے، رتبہ، کرسی یا پوزیشن کی ہے۔ ہر کوئی اسی کا طلب گار نظر آتا ہے، کیوں کہ اس میں طاقت ہے، یہ ہر برائی کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ یہ ضمیروں کو خریدتی اور سچائی کو طیامیٹ کرتی ہے۔ آدمی کی ذہنیت اس قدر پست ہو گئی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ کرسی ہی اس کا خدا ہے، اس کا کھانا، پینا اور ٹھکانا، پھوٹنا ہے۔ عزت سے جینا ہے تو کرسی کو تھامنا چاہیے۔ کرسی ہی کو پوجنا چاہیے۔ آدمی یہ کیوں بھول گیا کہ عہدہ، رتبہ، یا پوزیشن کی بلندی آدمی کو بڑا نہیں بناتی بلکہ آدمی کو اپنے بلند کردار، نیک عمل، راستبازی اور حق گوئی سے اس عہدہ یا پوزیشن کو بڑا کرتا ہے، جس پر وہ فائز رہتا ہے۔

سویچ و فکر میں اس قدر انعطاف آچلا ہے کہ آدمی اپنی خودداری کا بھی سودا کر چکا ہے، بھڑکی چمک دمک کے سہارے، کرسی اور طاقت کے بن بوتے پر، چند خود غرض لوگ سچائی کو مسنگ کر کے موصوموں لپیٹے گناہوں کی زندگیوں سے بھی کھیل لیتے ہیں لیکن کسی کی آواز نہیں اٹھ سکتی۔ دولت کی طاقت، پرچ کی آواز کو کھیل دیتی ہے۔ شاید اسی لئے کچھ لوگ دولت کو خدا کا مرتبہ بھی دیدیتے ہیں۔

زندگی اور اس کی قدروں کو جاننے کے لئے، بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے اور بصیرت حاصل علم ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ تعلیم وہ نہیں جو آج کل اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے۔ نصائی کتابیں ذہن و شعور کے دروازے ضرور کھول دیتی ہیں لیکن اچھی بری باتوں کی تمیز تو صرف ایسا ماحول دے سکتا ہے جس میں اخلاقی و سماجی اقدار و اصول ہیں۔ یہ اصول موجودہ تعلیمی اداروں میں بتائے نہیں جاتے۔ یہاں ان کی اخلاقی تربیت نہیں ہوتی یہاں بزرگوں کا احترام نہیں سکھایا جاتا جو نسل یا قوم اپنے اسلاف کے کارناموں کو جان کر ان سے سبق حاصل نہیں کر سکتی، جو قوم اپنے بزرگوں کا احترام نہیں کر سکتی، ان کی بنائی ہوئی تعلیمات سے مستفید نہیں ہو سکتی، وہ قوم و نسل کھوکھلی ہے۔ ہر حال کا ایک ماحول ہوتا ہے اور ہر ماحول حال ایک مستقبل سے منسلک ہوتے ہیں۔ ماحول کو فراموش کر کے ہم مستقبل سے ناتہ ہیں جوڑ سکتے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بے اصولی، بے راہ روی، بے ادبی، چھپر چھار، غنہ گردی، پتھراؤ، ٹھیراؤ اور دوسری نازیبا حرکتیں، ایٹھ ماحول سے دوری کا نتیجہ ہے، یہ تعلیم کا مقصد نہیں۔ کوئی قوم، سماج یا ملک ایسے غیر محفوظ اور غیر منظم ماحول میں پل نہیں سکتا۔ یہ انسانی عظمت کے خصلات ہے۔

ہمیں بچوں کو بتانا ہے کہ اچھی چیزیں اور اچھے اقدار ہر زمانے میں اچھے ہوتے ہیں، انھیں اینا نا چاہیئے۔ چند اصول ہوتے ہیں جو دنیا میں رہنا اور جینے کے ڈھنگ سکھاتے ہیں۔ انھیں ہم مولے الفاظ میں، قوانین کہہ سکتے ہیں، یہ ہمیں اپنے حقوق و فرائض بتاتے ہیں تاکہ ہم دوسروں کے ساتھ اپنے حقوق کی بھی حفاظت کریں اور اپنے فرائض کا صحیح استعمال کریں تاکہ سماج میں امن و امان رہے اور شیطان صفت لوگوں کی ہمت افزائی نہ ہو۔

دورِ جدید کی جدیدیت کے اچھے اور برے دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔ اس کے اچھے پہلوؤں کو اپنا کر برائیوں کو چھوڑنا ہوگا۔ دورِ جدید میں ایک تصویر بہت نمایاں نظر آتا ہے کہ بچوں کو رہائی کی ضرورت نہیں، وہ اپنے بزرگوں سے زیادہ جانتے ہیں، اخلاق و آداب کی اہمیت نہیں، یہ سب فیوڈل سماج کی دین ہیں، یہی نہیں بلکہ دورِ جدید کا نام لے کر ماں باپ اپنی ذمہ داریوں سے منہ پھیر لیتے ہیں اور سارا الزام زمانہ پر مقوی دیتے ہیں کہ اس دور کے (بقیہ صفحہ ۱۹ دیکھئے)

وقار خلیل

## اردو نامہ

اردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

اگست ۱۹۸۳ء

خصوصی کی حیثیت میں شرکت کی۔

۱۰ اگست: دکن کے کثیر القاصد

ڈرامہ نویس، ادیب اور فن کا مجاہد

مجتہد قمرید اللہی کا طویل علالت کے

بعد انتقال ہوا اور حیدر آباد ایک

کلاسیکی ڈرامہ شناس عالم اور مصنف

سے محروم ہو گیا۔ حق خدا بخش ہے

سی خوبیاں تھیں۔۔۔۔

۱۳ اگست: محفل خواتین کا

ادبی و شعری اجلاس یلگم ڈاکٹر اراء

پرستاد کی صدارت میں منعقد ہوا

عظمت عبدالقیوم اور ساجدہ عابد

نے مضمون اور کہانی پیش کی۔

خواتین شرار نے اپنا کلام سنایا۔

۱۴ اگست: ملک الشعراء حضرت

ادب یعقوبی کا اورنگ آباد ہزارہ

میں ۱۳ اگست کی صبح حرکت قلب

بند ہو جانے کے باعث اچانک

انتقال ہو گیا۔ حضرت آوج ایک

عرس کے مشاعرہ میں اپنے افراد

خاندان اور تلامذہ کے ساتھ آٹھ

گئے ہوئے تھے۔ بیت حیدر آباد

لائی گئی اور ہزاروں آوج شناسوں

نے جلوس میت اور تدفین میں

شرکت کر کے دلائع مغفرت کی

حیدر آباد کے شعری، علمی اور سماجی

قدروں نے مقالوں اور مباحث

کے ذریعہ اقبال شناسی کا فریقہ انجام

دیا۔ خواجہ ناظم الدین نے نظامت کی۔

۱۶ اگست: ادارہ جدید فکر و مواعی

ادبی رجحانات کے زیر اہتمام یلگم ہلر

جھون میں ممتاز اور شہرت یافتہ

مصنف عزیز آرٹسٹ کے پیشنگز کی

عصری نمائش نذر پرو فیروز عالم

خند میری کا جناب سیدما شرم علی اختر

والس چائلز عثمانیہ یورپی نے افتتاح

کیا۔ اس موقعی نمائش میں عزیز

کی فروخت شدہ پیشنگز سے ۱۲ ہزار

روپے کی آمدنی ہوئی جسے پرو فیروز

عالم کے معالجہ کیلئے استعمال میں لایا

گیا۔

● بزرگ شاعر حکیم داؤد حسین مرحوم

کی یاد میں 'نہزم داؤد' کا افتخاری مشاعرہ

رحمان جاتی کی صدارت میں منعقد

ہوا۔ نظیر علی عدیل اور نواب محمد بن

صلاح (شیریار جنگ) نے ہمانین

یکم اگست: صدر جمعیہ ہند سردار

گمانی ذیل سنگھ نے راسٹر پی پلگم

میں ممتاز تقاریر کا کر مضمون تبسم بیڈر شجہ

اردو عثمانیہ یونیورسٹی ورجوائنٹ

سکرٹری ادارہ ادبیات اردو کی نئی

تعمین 'آواز اور آدنی کی رجم احراء

انجام دی۔ آپ نے اس موقع پر

جامعہ عثمانیہ اور ڈاکٹر مضمون تبسم کی

دیرینہ علمی اور تعلیمی خدمات پر

ستائشی کلمات ارشاد فرمائے۔ یہ

خوشگوار تقریب ایڈورس کونسل

آف انڈیا کے زیر اہتمام آراستہ

ہوئی تھی۔

۲ اگست: اقبال یڈی کی طرف

سے علامہ اقبال کے فلسفہ شعرو حکمت

پر علمی محفل پرو فیروز سید مران الدین

کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر وحید

اختر بیڈر شجہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ کے علاوہ یوسف اعظمی،

ظہیر الدین احمد، مصباح الدین سعدی اور

- حلقوں میں رعلتِ اوج پر گہر سے  
درغ و غم کا اظہار کیا گیا اور ان کی رعلت  
کو ساتھ ساتھ ردا دیا گیا۔ گرفتِ نظر  
اور غنیمتِ لب بستہ، دو شعری  
مجموعے حضرت اوج کی یادگار ہیں۔
- بزمِ مہمانِ اردو کی طرف سے  
’اردو گھر‘ میں غزل کے معتبر شاعر  
جناب داؤد نصیب کی خدمات  
کے اعتراف میں ۱۲ ہزار ریاضِ سودے  
کا کیمہ نذر کیا گیا۔ جناب سید  
مکتر شاہ صدر ریاستی لیبلیو کونسل نے  
نے صدارت کی۔ ڈاکٹر یعقوب عمر  
جناب میثرا محمد اور جناب صادق نقوی  
نے داؤد کی شعری حیثیت اور ان کی  
سادہ اور پُرکار شخصیت پر اظہارِ  
خیال کیا۔
- ۱۶ اگست : ریاستی اردو اکیڈمی  
کی طرف سے حضرت اوج کے  
پسندوں کی خدمت میں ۲ ہزار روپے  
منظور کئے گئے جسے اکیڈمی کے  
مہمے داروں نے بزمِ اوج کے  
حوالے کیا اور اکیڈمی کی طرف سے  
اظہارِ تعزیت کیا گیا۔
- ۱۸ اگست : نامور طنز و مزاح  
نویس، مصنف اور ریاستی آئی اے  
ایس ہمدیدار جناب نریندر لوہر کو
- ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں  
’ہمارا دو اکیڈمی‘ کی طرف سے ادبی  
ایوارڈ دے دیے جانے پر حیدر آباد کے  
علمی اور ادبی حلقوں نے اظہارِ مسرت  
کیا۔
- ۲۴ اگست : مشہور طنز و مزاح  
نویس جناب مسیح انجم کی تیسری نکاحی  
تصنیف ’جناحہ‘ ذمہ دارانِ حیدر آباد  
کی طرف سے شائع ہوئی۔
- ۲۵ اگست : فضا کا جنگ  
جلیں یادگار بین کھیتی تفریحی و  
تفریحی مقابلوں کے انعامات کا  
جلد ڈاکٹر مفتی تبسم کی صدارت میں  
بمقام ’اعظم ہال سٹی کالج‘ منعقد ہوا  
ڈاکٹر یوسف سرمست ریڈر  
شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی جہان  
خصوصی تھے۔ ڈاکٹر مرزا اکرم علی  
بیگ، ڈاکٹر سرمست اور ڈاکٹر تبسم  
نے حضرت جلیں کی شہری خدمت  
پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے تقریری  
و تفریحی مقابلوں کی افادیت پر  
روشنی ڈالی، عجلِ شعر میں علی احمد جلیلی  
ڈاکٹر تبسم، ڈاکٹر مہر جہاں،  
ڈاکٹر بیگ، عبدالسلام جاوید اور  
تاج تبسم نے کلام نایا۔
- ۲۶ اگست : جامعہ عثمانیہ کے
- فارغ التحصیل جناب مقبول خاں دوتی  
حوان دنوں آندھرا یونیورسٹی وائس  
چیر اور دو کے لکچرار ہیں اور عمری  
شاعری کے نمایندہ بھی ہیں اپنے  
پی ایچ ڈی کے مقالہ ’اردو شاعری  
میں ہندی عروض کا استعمال‘ کی  
تکمیل پر آندھرا یونیورسٹی سے  
ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے  
مستحق قرار پائے۔ ڈاکٹر مقبول خاں  
نے ڈاکٹر مفتی تبسم عثمانیہ یونیورسٹی  
حیدر آباد اور ڈاکٹر سیخ محمد اقبال  
(لکچرار ہندی آندھرا یونیورسٹی وائس  
چیر) کی نگرانی میں مقالہ سیرِ قلم کیا تھا۔  
۲۸ اگست : اردو مجلس کی  
طرف سے اردو ہال میں بصدات  
محرمہ جیلانی بانو، ستام اسانہ  
کا اہتمام ہوا۔ جناب عوض سعید  
جناب نسیم ویری، محرمہ بانو طاہرہ  
سعید اور محمد صاحبہ نے کہانیاں  
سنائیں۔ صلاح الدین بتر مستعد و مجلس  
نے نظامت کی اور ٹکے لوائے۔
- ۳۰ اگست : یونیورسٹی  
نیشنل الدین صدر شعبہ ہنرمند عثمانیہ  
یونیورسٹی کے قلمی ہندستانی  
سیفر کی حیثیت سے ناگزری پر  
’بزمِ کہن‘ کی طرف سے

بہادر یار جنگ ہاں میں جلتی تھنیت  
بہداریت ڈاکٹر نگہ ڈاکٹر نگہ سالار  
جنگ میوزیم کا اہتمام کیا گیا۔ سرز  
بہدور الحسن صدر بنیم، شمیم نعیمی  
اور سید علی برتر نے پروڈیوٹر  
کی خدمات کو خراج ادا کیا اور  
مختلف تنظیموں کی طرف سے  
موصوف کی لپیوشی کی گئی۔

۱۳ اگست : آل انڈیا ریڈیو  
حیدر آباد کے شعبہ اردو کا محترمہ  
ثریا بیگم سعید نے جناب مرزا  
الہ انسر سے پروگرام ایگزیکٹو کا  
جائزہ حاصل کیا۔ جناب آفر نے  
اپنی مدت ملازمت کا اختتام  
پر سکدوشی حاصل کر لی ہے وہ  
ان دنوں تعینات و تالیف اور  
حیدر آباد میں ریڈیائی ڈراموں  
اور ادب اطفال پر تخلیقی انہماک  
میں مصروف ہیں۔ محترمہ ثریا سید  
کو ایک استقبالیہ تقریب میں  
کارکنان شریاست نے خوش آمدید  
کہا اور ریڈیو کے اوردو پروگراموں  
کی بہتری کی توقعات وابستہ کیں۔

سرز تیتونکن، بشیر قربان علی،  
اسلم فرخودی، باقر مرزا اور عبد سلطان  
شاہین نے مخاطب کیا۔ محترمہ ثریا بیگم

نے حیدر آباد کو میزبانوں کا شہر قرار  
دیجئے ہوئے تمام اصحاب سے بھرپور  
اشتراک و تعاون کی گزارش کی۔

### ستمبر ۱۹۸۳ء

۴ ستمبر : علامہ و آرج شناسوں کی  
طرف سے 'اردو گھر میں جلتی تعزیت'  
حضرت اوج بیوقوفی بعد ازلت سلطان  
صلاح الدین اوسلی (ایم ایل اے) منعقد  
ہوا۔ مرحوم شاعر کے افراد خاندان  
کے لئے 'ضلعی و بلیغ فنڈ' کے قیام کا  
کرمی صدارت سے اعلان کیا گیا،  
جس کے اراکین سرز عابد علی خان،  
ایڈیٹر سیاست، محبوب حسین جگر،  
جوائنٹ ایڈیٹر سیاست، سید  
لطیف الدین قادری، ایڈیٹر رہنما  
دکن، محمود انصاری، ایڈیٹر نصف،  
عبدالمجیب خاں، ایڈیٹر اسوسی ایٹڈ  
نور مردیس، رضا حسین اور تید  
عابدی منتخب ہوئے۔ سرز محمد علی  
ذیرک اور الہ رشتہ شرفی معتمد خازن  
بنائے گئے ہیں۔ حضرت آرج کی  
شخصیت اور شاعری پر محمود انصاری،  
جمعی حبیب، صادق نقوی نے الہادیں  
کیا اور سترائے نذرانہ سخن پیش کیا۔  
ایک قرارداد کے درپور ریاستی حکومت

سے مطالبہ کیا گیا کہ حضرت آرج کے  
افراد خاندان کی گذر بسر کے لئے وظیفہ  
جاری کرے۔ محمد علی ذیرک نے  
نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۷ ستمبر : ڈاکٹر سید عبدالننان صدر  
ریاستی انجمن ترقی اردو نے ریاستی  
وزیر اردو الہدیٰ مسٹر عمر شاکر کو ایک  
مکتوب کے ذریعہ اس جانب توجہ  
مبذول کرائی ہے کہ سرکاری دفاتر  
میں اردو کے رواج کے لئے ۱۵ فیصد  
تہادی کی شرط قطعاً نامناسب ہے۔  
● جرم لکشاں کے زیر اہتمام ہونے  
والے ادیب جناب مجتبیٰ حسین کی  
صدارت میں کاروائی ہوئی جناب  
فریدر لوتھر صدر زندہ دلاں حیدر آباد  
ہماں خصوصی رہے۔ مسٹر مجتبیٰ اور  
مسٹر لوتھر کے علاوہ جناب میراج  
جناب طالب خوندیری اور جناب برہان  
حسین نے اپنی مفصّل تخلیقات پیش  
کیں۔ متاعہ میں طنز و مزاح کے  
علاوہ پیچیدہ طرز فکر کے شاعروں نے  
بھی کلام سنایا۔

۱۱ ستمبر : نامور ترقی پسند شاعر اور  
سیاسی رہنما محمد دمحمی الدین کی ۴۷ویں  
برسی کے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے

۱۲ دین کی تالہ بندی کے بعد عدالت  
العالمیہ کے جسٹس مڑنی بی جیون ریڈی  
کے احکامات پر اشاعت پذیر ہوا  
جسٹس ریڈی نے فیصلہ دیا کہ

”آزادی صحافت سے زیادہ  
اہم کچھ نہیں ہے۔“

۶ اکتوبر : بزرگ ماہر تعلیم  
الشور یونیورسٹی کے ریسرچر علی اکبر صاحب

سابق صدر ادارہ ادبیات اردو کی  
گزشتہ خدمات کے اعتراف میں  
ادارہ کی طرف سے ایوان اردو میں  
جلسہ اعتراف خدمات منعقد ہوا۔

پروفیسر عذیب الرحمن سابق صدر  
سیاستی انجمن ترقی اردو نے صدارت

کی جناب محمد علی عباسی صدر  
ادارہ ادبیات اردو نے فیصلہ

خطاب کیا جناب عابد علی خان  
ایڈیٹر سیاست، نواب شاہ

عالم خاں صدر ادارہ علوم، یو کے کینٹن  
سوانی ڈاکٹر رحیم الدین کمال اور

جناب سید عالم نے تعلیم اور اطمینان  
نسق کے لئے ریسرچر علی اکبر صاحب

کی خدمات کو حیدر آباد کلچر اور تعلیم  
کے ارتقاء کا سہارا بن کر دیا۔

ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے  
پروفیسر علی اکبر کی خدمت میں مونسو

ادارہ ادبیات اردو کے امیدواروں کا  
مسٹر ابو العین محمد عارف ناظم بورڈ نے  
آٹھویں اور سال اول میں دے اے اے طلباء  
و طالبات کو داخلہ دیا گیا۔

۳۳ ستمبر : کنستریبل نے اردو  
روزنامہ ”منصف“ کے دفتر کی تالہ بندی  
کی جس کے خلاف عمومی طور پر احتجاج  
کیا گیا۔

۳۴ ستمبر : نامور مفکر اور دانشور  
پروفیسر سعد المرحوم ندیری لاہور  
کی حجابی کے باوجود طویل علالت  
کے بعد انتقال ہوا۔ ڈاکٹر عالم نے

بعض معالجہ امریکہ اور کینڈا کا بھی وارہ  
کیا تھا حیدر آباد کے علی ”ابی“

سیاسی اور سماجی حلقوں کی طرف  
سے متعدد تحریکیاں تھیں۔

پروفیسر عالم کی وفات پر اظہار رنج  
والم کیا گیا۔

● برائے ناظر جناب وکراؤ  
دستک دکر، ڈاکٹر کمال طویں

علالت کے بعد ۸۴ سال کی عمر  
میں انتقال ہوا صاحب دنگر کے

تین سہری بھائی کی یادگار ہیں۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء

۵ اکتوبر : روزنامہ ”منصف“

سابق چیف مسٹر مڑنی اقبیانے فرقہ وارانہ  
فسادات کی شدید مذمت کرتے

ہوئے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ اور قسطنطنیہ  
کا یہ شہر بڑا رز و جو صدیوں سے اپنے

خیر کے اقدار اور امن کا گہوارہ رہا ہے  
اس کی روایات کو پروان چڑھانے

کا عہد لینا ہی محنت کی حقیقی یاد ہے  
”پسٹل“ نے اس تقریب کا اہتمام کیا تھا

جناب منور راج سکینہ، ترناست مڑنی  
پر تاب کشود اور ہندی شاعر مڑنی

دست نے بھی خطاب کیا۔

۱۲ ستمبر : ”صور نظام منصف“ سابق  
کے فرزند اور ممتاز غزل گو شاعر

حضرت پرنس معظم جاہ شہجہ محمود  
کلام جدیہ کی تصنیف کی رسم اجرا علم

دہشتوں اور شعرائے موجودہ میں  
جناب محمد علی عباسی صدر ادارہ

ادبیات اردو نے انجام دی ڈاکٹر  
سید عبدالنہاں، نواب کاظم نواز ملک

ڈاکٹر مفتی یحیٰ اور مسٹر منور راج سکینہ  
نے شہجہ کی غزلیہ شاعری پر اظہارِ حال

کیا۔ کتاب کے ناشر مسٹر نصیر احمد  
قاسم خاں (حسانی بکڈ پور) نے ہمانوں

کا خیر مقدم کیا۔

۱۳ ستمبر : ترقی اردو بورڈ حکومت  
ہند کے زیر اہتمام مرکز خوشنویسی

جناب عابد علی خاں نے نذر کیا اس موقع پر جناب عابد نے صدر ادارہ کو ادبی ٹرسٹ کی طرف سے دیر ۷ لاکھ روپیوں کا چک ادارہ ٹرسٹ کے لئے حوالہ کیا۔ جناب رمن راج سکینہ معتمد اعزازی ادارہ نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ صاحب قید آبادی اور ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے پروفیسر علی اکبر کو منظم نذرانہ سخن ادا کیا۔ سب رس کا علی اکبر نمبر ستمبر اکتوبر ۱۹۸۳ء) بھی اس موقع پر شائع ہوا ہے۔ پروفیسر علی اکبر کی نمائندہ علمی اور تعلیمی اداروں کی طرف سے بکثرت مخلصی بھی کی گئی۔

۸ اکتوبر: ممتاز مفکر اور دانشور پروفیسر عالم خوند میری کی یاد میں مختلف علمی و ادبی اداروں 'لسانی' تنظیموں کی طرف سے اردو ہال میں ایک نمائندہ تقریبی جلسہ جناب ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر میر اکبر علی حاکم سابق گورنری پولی کیونٹ رہنما کامریڈ رومی ناراین دیٹی، شریجی اندرا دھن راج گز، صدر ریاستی ہندی اکیڈمی، ڈاکٹر معنی

تبسم شریک معتمد ادارہ ادبیات و اردو جناب اختر حسن، شریک معتمد ریاستی اردو اکیڈمی، ڈاکٹر حسینی شہاب معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو، جناب پیرالدین احمد معتمد اقبال اکیڈمی، اور ڈاکٹر افتخار محمد شعیب اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی اور تلگو، ہندی اور انگریزی کے دانشوروں نے پروفیسر عالم کی علمی خدمات اور دانشورانہ بصیرت و بصارت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی وفات کو دنیا سے علم و ادب کا نقصان عظیم قرار دیا۔

۱۲ اکتوبر: بزرگ ساعر اور داستان گوئی کے ماہر جناب محمود حسین ادیب کا محقر علالت کے بعد انتقال ہوا۔

۷ اکتوبر: حیدر آباد کی ایک مثالی اور قدیم علمی تنظیم انوار العلوم ایمو کیٹل اسوسی ایشن کے انتخابات میں نواب شاہ عالم خاں صاحب دوبارہ صدر منتخب ہوئے۔ اس اسوسی ایشن کے زیر انتظام ڈگری کالج، ایوننگ کالج، وینس کالج اور ہائی اسکول چلائے جارہے ہیں۔

۲۰ اکتوبر: ڈاکٹر نصیب الدین، ڈائریکٹر خدائش پبلک اور ٹیلی۔

۵ ستمبر: پٹنہ اور مشرقی بے شہر، ڈپٹی ایجوکیشنل ایڈورٹیزر ذراہت تعلیم حکومت ہند نے ادارہ لوبیا اردو کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔ ہر دو اصحاب نے ادارہ کے شعبہ کتب خانہ (مخطوطات و مطبوعات) اردو میوزیم اور شعبہ امتحانات کی کارکردگی پر اظہارِ طمانیت کرتے ہوئے حکومت ہند کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اس علمی ادارے کی بھرپور اعانت کرے۔ ڈاکٹر معنی تبسم جوائنٹ سکریٹری ادارہ نے جہانوں کا خیر مقدم کیا اور ادارہ کی سرگرمیوں سے تعارف کرایا۔

۲۰ اکتوبر: اقلیم ادیب کے زیرِ اہتمام حضرت اراج یعقوبی اور ڈاکٹر عالم خوند میری کی وفیات پر تقریبی جلسہ ڈاکٹر معنی تبسم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب رحمن جانی اور قدیر نقوی کے علاوہ دوسروں نے بھی مرحومین کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔

۲۶ اکتوبر: بین الاقوامی شہرت یافتہ اسکالر اور اقبال شناس و فنش ڈاکٹر پروفیسر انامری شل (امریکہ) نے اقبال اکیڈمی کی طرف سے آراستہ (بقیہ صفحہ ۴۲)





# The "SABRAS" Urdu Monthly

rgan of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)

اسلوب اور انتقاد

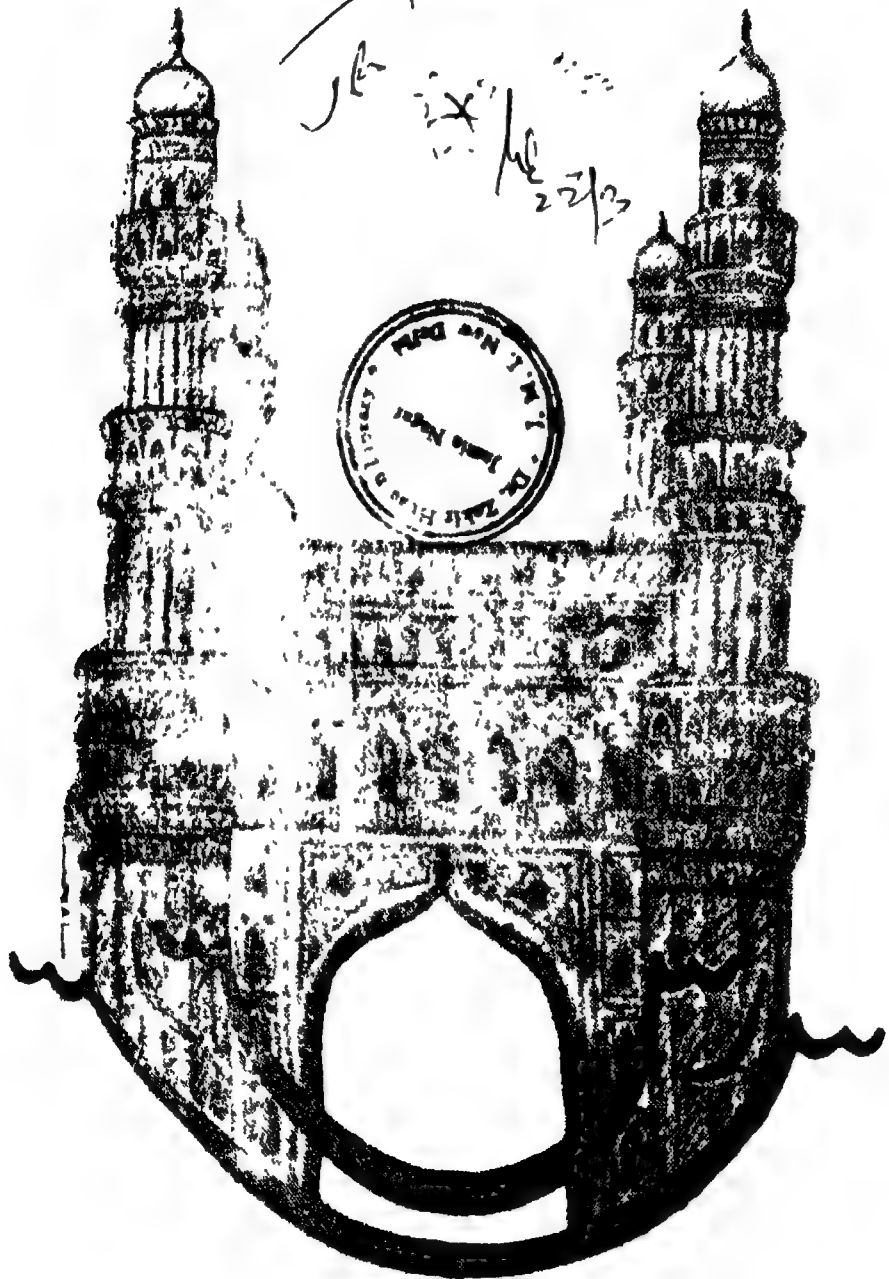
بالِ جوہر



ضررِ کلیم

مکاتیبِ رشید

سید





سنہ ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۶۹

بیان گارڈ اکثریت محمد الدین قادری زون



# سب نامہ

مدیر اعلیٰ : مفتی تبسم  
معاون مدیر : وقار خلیل

جلد شامیت :  
صدر : محمد علی عباسی  
نائب صدر : ہاشم علی اختر  
مفتی : ڈاکٹر مفتی تبسم

جلد ۴۳، شماره ۳، ستمبر ۱۹۸۲ء

قیمت : ۲ روپے ۲۵ پیسے

ادکان :  
پروفیسر سید علی اکبر  
عابد علی خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ  
محمد اکبر الدین صدیقی  
رمن راج سکسینہ، پروفیسر سراج الدین  
محمد منظور احمد  
○ سید علی اکبر ایڈیٹر نیشنل  
پبلشرز نیشنل فائنڈیشن پریس  
یارکان میں چھپوا کر حیدرآباد-۲ سے شائع کیا۔  
کتابت : رفیع الدین اقبال

در سالانہ : ۲۵ روپے، کتب خانوں سے ۳۰ روپے  
بیرونی ملکوں سے : (بدویہ و مشرقی) ۲۵ روپے  
ہوائی ڈال سے  
مشرق وسطیٰ : ۱۲ ڈالر  
امریکہ : ۱۶ ڈالر  
پاکستان : ۸ ڈالر  
برما نیلون : ۳ ۱/۲ ڈالر  
انگلستان : ۷ پونڈ  
۵ ڈالر  
۶ ڈالر  
۳ پونڈ

ادارہ ادبیات اردو، پنجہ گڑ روڈ، حیدرآباد-۲، ۵۰۰۰۰۴

## ترتیب

|                             |    |                     |                               |                    |    |
|-----------------------------|----|---------------------|-------------------------------|--------------------|----|
| اپنی بات                    | ۲  | مغنی تبسم           | اردو کا مسئلہ افسانہ          | ڈاکٹر معین شاہ     | ۱۶ |
| دو نظیں                     | ۳  | قاسمی سلیم          | ترانچیلے اور غزل              | ڈاکٹر مقبول فاروقی | ۲۵ |
| دکنی ادب - حقیقی کام        | ۴  | ڈاکٹر محمد علی اختر | ڈاکٹر زہرا یادگار زمانہ شخصیت | رحمن راج مکینہ     | ۲۶ |
| عرل                         | ۹  | نغلابی فیض          | نذر محمد علی قلیب شاہ (نظم)   | رحمن بجاوی         | ۳۰ |
| سندھ کی تہذیب و تمدن کا اثر | ۱۰ | ڈاکٹر محمد علی بیگ  |                               |                    |    |
| غزلیں                       | ۱۵ | منظفر حفیظ          | اردو ماسہ                     | وقار حلیل          | ۳۱ |

## اپنی بات

اس مہر کرناٹک اردو ایڈمی نے سو مالی تخصیص کے بغیر بہتان کے مختلف حقائق سے نتائج ہونے والے اردو کے علمی ادبی رسالوں کے لیے سالانہ گرانٹ منظور کرنے ایک مثال اقدام کیا ہے۔ کسی زبان کو فروغ دینے میں علمی ادبی رسالوں کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ رسالوں کی اشاعت سے تخلیقی سرگرمیاں بڑھتی ہیں۔ قاری سے ادیب کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ نئے رجحانات فروغ پاتے ہیں اور عمومی طرز پر ادب کا معیار بلند ہوتا ہے۔ علمی مضامین اور تراجم کی اشاعت سے زبان نئے افکار و خیالات سے مالا مال ہوتی ہے۔ عرض علمی ادبی رسالے تہذیب و تمدن پر کئی طرح سے اثر ڈالتے ہیں۔

گذشتہ دس بیحد برسوں میں اردو کے متعدد رسالوں کی اشاعت مسدود ہو گئی ہے، 'خورسائے شائع ہو رہے ہیں ان کی اشاعت علمی محدود ہوتی جا رہی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کتابت اور طباعت کی اجرتیں بڑھ گئی ہیں۔ فنانس سہولت گراں ہو گیا ہے علمی ادبی رسالوں کی اشاعت کم ہونے کی وجہ سے انتہا پرست متعلقات سے ملے ہیں اور وہ کاروباری سیار پر نتائج ہونے والے رسالوں اور ڈائجسٹوں کے ساتھ مسابقت میں ٹھہر نہیں سکتے۔ ان حالات میں سروری۔ یہ کہ معیاری علمی ادبی رسالوں کو مالی اعانت دی جائے اور اردو کے دارالطالعوں اور کتب خانوں کے لیے یہ سالانہ خرید کران کی توسیع اشاعت میں مدد کی جائے۔ رسالوں کو مالی اعانت دیتے وقت علاقائی عہدیدوں کو ملحوظ نہیں رکھنا چاہیئے۔ علمی ادبی رسالے خواہ کسی مقام سے شائع ہوں ان کے پڑھنے والے سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں ہر علاقے کے ادیبوں اور ستاروں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں کوئی ایک ایکڈمی تمام ادبی رسالوں کو خاطر خواہ مالی امداد نہیں دے سکتی ہر ایہ چاہیے کہ ملک کی تمام اردو ایکڈمیاں اپنی گرانٹ کا ایک حصہ علمی ادبی رسالوں کی مالی اعانت کے لئے مختص کریں جو ملک گیر سراسر پر شائع ہوتے ہوں یعنی جن کے لکھنے اور پڑھنے والے سارے ہندستان میں پھیلے ہوئے ہوں۔ تعداد اشاعت سے زیادہ رسالے کے معیار کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ تمام ایکڈمیوں کی مختص کردہ رقموں سے ایک مشترکہ فنڈ قائم کیا جائے اور ایک کمیٹی ان رسالوں کا انتخاب کرے جو معیار کے اعتبار سے اعانت کی مستحق ہوں۔

مغنی تبسم

# ایک نظم

## قاضی سلیم

بھی کچھ  
اچانک ہوا  
ایک ہی ثانیے میں  
سردعات بھی

خاتمہ بھی  
جگر بھی نہ پائے تھے دنیا  
کہ وہ جا چکی تھی  
جیسے مٹی میں کوئی

ہوا کو پکڑنے کی کوشش کرے  
موت کا اک بلاوا  
کہ ٹپکلی ہوئی برف نمی خواہتے  
تیز جھکڑ سے

اچھا کھنڈر زندگی  
بھولے بسرے زمانوں کی کوئی کہانی  
گنا ہے سارا سفر  
بے حاصلی کے سوا کچھ نہیں

کسی موت پر  
کوئی رگڑا نہیں  
اپنے معمول پر ٹھومتی ہے دین  
اس طرح سے گپ لڑاتے ہیں لوگ

خدا مغفرت اس کی کرے  
لوگو  
جلدی جلدی دعائیں پڑھو  
ہم کو جانا ہے

اپنی اپنی لمحہ کی طرف

## پینٹ

آج موسم کی پہلی چواریں  
لتی سٹھدی ہیں  
سورج کو ترچھو گنا سے کون  
عودہ لوہاں پر

جانے والوں کی بوباں سب جانتے ہیں  
ٹکرائی مٹی میں  
لوہاں کیسے پکڑ پائے گے  
اس سے پہلے تو شاید بھی ان کی جھلک

اچانک وہ ہیں  
اچانک کچھ ہیں  
اک چھپا کے ہیں اطہروں سے اونچا  
دیکھتے دیکھتے

گھٹے بیڑوں سے  
چھتی ہوئی جامہ کی ہیں  
مادوں لے بیڑوں میں ادھیں ہوئے  
گھر کے آنگن میں

دوڑتا، چلتا، لوٹی، مدموسم، بی  
ہماری طاقت  
لوٹ لے لے  
— اطر بھر کے دیکھے  
— تو سب لال انھیں  
"اے"

یہ تو وہی ہے  
وہی گھیر چہرہ  
دیکھو، وہی امداد ہے، ہو رہا  
وہی رنگ روپ

پکے مال تارہ حوڑیں یا جگے  
دانت کچھ تھے  
یہ ٹوٹ کر آ رہے ہیں  
یہی کیا کم ہے

جانے والوں کو ہم  
خداوند سے نہیں  
ایسے آنگن میں لے آئے ہیں  
آج آنگن میں سارے فرشتے

دوڑتے کھلتے پھر رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی انصاری

## دکنی ادب پر تحقیقی کام

تھی۔ یہ کتاب مطبع حیدری سے ۱۸۵۷ء میں چھپی دیوینی ولی مطبع حیدری سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ اسی طرح مدراس کے مطبع سرنیز اور نورٹ سینٹ جارج کالج کے مطبع سے محمد باقرؒ کا لہ کی تصنیف ”ہشت بہشت“ اور محمد ابراہیم بیجاپوری کی ”دکنی انوار سہیلی“ علی الترتیب ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۴ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ گارساں دتاسی کا زیادہ تر کام فرانسیسی زبان میں تھا اور بمبئی یا مدراس کے چھاپہ خانے سے جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان کی حیثیت مخطوطات کی نقل سے زیادہ نہیں ہے۔

قدیم دکنی ادب کے موضوع پر پہلا تعارفی مضمون حکیم شمس اللہ قادری نے ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ کے رسالے ”برسان العصر“ میں شائع کیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ”کلیات محمد قلی قطب شاہ“ سے متعلق ایک تحقیقی مضمون ”رسالہ“ ”اردو“ اور ”نگار“ میں شائع کیا۔ ان مضامین کی اشاعت ”اردو زبان کی عمر“ میں چھاپی صدیوں کے اضافہ کا باعث ہوئی اور دینائے اردو اس امر سے آگاہ ہوئی کہ ولی دکنی صدیوں پہلے ہمیں ”قطب شاہی“ اور عادل شاہی سلطانین کے دور حکومت میں گلبرگ ”بیدرزگوں“ کا تذکرہ اور بیجاپور کے علاقوں میں اردو شعرا و ادب کا ایک مقلدستان موجود تھا۔

قدیم اردو ادبیات پر تحقیقی کام کی ابتداء کاہرہ مشہور مستشرق گارساں دتاسی کے سر ہے اس محسن اردو نے ۱۸۲۵ء سے اس کام کا آغاز کیا تھا اور زندگی بھر وہ اردو کے قدیم ادب کی تحقیق و تنقید میں مصروف رہا۔ کلیات دکنی لوہب سے پہلے گارساں دتاسی نے نو مخطوطات کی مدد سے ۱۸۳۷ء میں مرتب کر کے ”ایک عالمانہ مقدمہ“ کے ساتھ ”پیرس“ کے شاہی مطبع سے شائع کیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے سو سال بعد احسن مارہروی کا مرتبہ کلیات دکنی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ گارساں دتاسی پہلا شخص ہے جس نے اردو ادب پر تحقیقی کام کا آغاز کیا تھا اور ہمارے شعرا اور ادیبوں کی خدمات کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا اور فرانسیسی زبان میں ایک مبسوط تاریخ قبلند کر کے تین جلدوں میں شائع کی۔ اس کے کتب خانے میں دکنی ادب سے متعلق قلمی کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود تھا۔

جہاں تک دکنی ادبیات کی اشاعت کا تعلق ہے انیسویں صدی کے ربع دوم میں بمبئی کے مطبع محمدی اور مطبع حیدری نے قدیم ادبیات سے متعلق متعدد کتابیں شائع کیں۔ اس سلسلہ میں یہاں چند دکنی کتابوں کا تذکرہ دلچسپی سے غالی نہ ہوگا۔ وجیہ الدین وجدی کی مثنوی ”پنجی“ باجھا ”یا“ ”پنجی نامہ“ مطبع محمدی سے ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی

۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر محمد علی الدین قادری زور کی حرکتہ الآثار

کتاب اردو شہ پارے، منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب دکنی ادب کی تاریخ میں ایک شائبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۳۵ء میں نواب سالار جنگ کی سرپرستی میں سٹی کالج میں ’یوم دلی‘ کا شاندار پریمیائیہ پر انعقاد عمل میں آیا تھا۔ اس موقع پر تدمر غلطوہات کی تلاش بھی کی گئی۔ نواب سالار جنگ افتدائی اجلاس کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں ان غلطوہات کی اشاعت سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس خصوص میں ایک مجلس اشاعت دکنی غلطوہات کی تشکیلات میں آئی جس میں سٹی کالج کے پرنسپل سید محمد اعظم، ڈاکٹر نذر اور پروفیسر سید محمد کوثر بالترتیب صدر، نائب صدر اور معتد بنایا گیا۔ اس مجلس کی جانب سے ڈاکٹر زور نے محمد علی قلی شاہ کا ضخیم کھیات مرتب کیا۔ پروفیسر سردری نے ابن ناطلی کی متوی پیمول بن، مقیمی کی قصہ بے نظیر اور سراج اورنگ آبادی کا کھیات مرتب کیا۔ پروفیسر سید محمد نے نصر قلی کی گلشن عشق و جدی کی پیچھی باچھا، خانزکی، رضوان شاہ و روح افزا اور عبداللہ قلی شاہ کا کھیات تدرج کیا۔

میر سعادت علی رضوی نے غوامی کی دو متویوں ’سیف الملوک و بدیع الجمال‘ اور طوطی نامہ مرتب کیا۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی نے نصر قلی کی علی نامہ، کوثر عبداللہ صدیقی نے مقیمی کی چند بدن و مہیار، اور خواجہ عبداللہ شاہد نے شفیق اورنگ آبادی کی متوی ’تصویر عاناں‘ کو مرتب کر کے شائع کیا۔

تحقیق کی ان اولین کاوشوں کے نتیجے میں دکنی ادب کی جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں تحقیق سے زیادہ تدمر کی جانب توجہ کی گئی۔ یہ کوششیں بنیادی طور پر مافذ کے تحفظ پر مرکوز تھیں، اور اگر تحقیق و تنقید اور تدمر میں متن کے جہد اصولوں کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا تو دو چار

مشتات سے قطع نظر یہ کام غیر تشفی بخش اور غامیوں سے پر نظر آئے گا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کتابوں کی اشاعت سے آنے والی نسلوں کے لئے تحقیق و تنقید کی راہیں کافی آسان ہو گئیں۔

اسی دوران مولوی جہد الحق نے حضرت خواجہ بندہ نواز کے رسالے ’معراج العاشقین‘، ’دجہی کی‘، ’سب رس‘، ’قلب فستری کو مرتب کر کے شائع کیا۔ بیجاپور کے ملک اتوار نصر قلی پر ایک تحقیق کتاب لکھی اور قدیم ادب سے متعلق متعدد تحقیقی مضامین قلمبند کیے۔ جو قدیم اردو کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا، میں ’معراج العاشقین‘ کو بعد میں ڈاکٹر محمد علی چند مارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

۱۹۵۹ء میں محمد بن عمر نے ’کلیات غوامی‘ مرتب کیا تھا۔ جس میں ڈاکٹر زور کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب ملک الشعرا غوامی کے منتخب کلام کی جہت رکھتی ہے۔ محمد بن عمر نے ’وجہ الدین و جدی‘ کے نام سے بھی ایک کتاب مرتب کی تھی۔

۱۹۶۲ء میں علی عادل شاہ تانی شاہی، طیات ڈاکٹر زینت ساجدہ نے ’دجہی‘ کے جہد آباد اور داکٹر محمد علی کی جانب سے شائع کیا تھا۔ شاہی کے کھیات کو پروفیسر مبارز الدین رفعت نے بھی اسی سال مرتب کر کے انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شائع کیا

دکنی ادب پر تحقیق کام کے دوسرے مرحلہ کا آغاز ۱۹۶۵ء میں ہوا جب کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں جو اس وقت صدر شعبہ اردو تھے، نے اپنے رفقاء کے تعاون سے ایک تحقیقاتی مجلس ’قدیم اردو‘ کا اجراء عمل میں لایا۔ اس طرح پہلی بار قدیم ادب کی منتخب تخلیقات کے متون کو مختلف نسخوں کے باہمی مقابلہ کے بعد، متنی تنقید کے



کے مقالوں میں درج ذیل شائع ہو چکے ہیں۔

اردو نثر کا آغاز و ارتقا (ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ) اردو مہینے کا ارتقا گو لکھنؤ اور بیجاپور میں (ڈاکٹر چراغ علی) مین الدین اعلیٰ حیات اور کارنامے (ڈاکٹر حسینی شاہد) بیجاپور کی اردو مثنویاں (ڈاکٹر قیوم صادق) سب رس کی تنقیدی تدوین (ڈاکٹر حمیرہ جلیلی) مدراس میں اردو (ڈاکٹر افضل اقبال) تاج الحقائق کی تنقیدی تدوین (ڈاکٹر نور السعید اختر) پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالوں میں ڈاکٹر محمد ہاشم علی کا مقالہ "شاہ صدر الدین حیات اور اردو خدمت" ڈاکٹر زینت ساجدہ کا مقالہ "نومر ہار کی تنقیدی تدوین" ڈاکٹر عبد النساء کا "دکنی اردو کا آغاز و ارتقا" ڈاکٹر فرزانہ بیگم کا "دکنی نثری داستانیں" ڈاکٹر سید محمد قادی کا "نثر عشق کی تنقیدی تدوین" ڈاکٹر رفیعہ صدیقی کا دیوان سلطان کی تنقیدی تدوین" ڈاکٹر عقیل ہاشمی کا "دیک پکنگ کی تنقیدی تدوین اور راقم الحروف" دکنی غزل کی نشوونما کے نام قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک دکنی ادب کی تاریخ کا تعلق ہے اس موضوع پر پہلی کتاب مولوی نصیر الدین ہاشمی کی "دکن میں اردو ہے" جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں حکیم شمس اللہ قادری کی کتاب "اردو سے قدیم" منظر عام پر آئی۔ ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر نذیر کی کتاب داستان ادب حیدر آباد اور ۱۹۵۸ء میں دکنی ادب کی تاریخ شائع ہوئی۔ زور صاحب کی موزوں کتاب قدیم اردو ادب کی تاریخ کے موضوع پر اپنے وقت کی جامع کتاب تھی۔ اسی سال پروفیسر مرید نے "اردو کی ادبی تاریخ" شائع کی۔ ۱۹۶۲ء میں آل احمد سرور کی ادارت میں، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کی پہلی جلد

بندید اصولوں کی روشنی میں، صحت کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ اس جگہ کی پہلی مثنوی غواہی کی پھیلاست دیکھئے۔ جسے ڈاکٹر غلام عمر خاں نے نوٹ لکھوات کی مدد سے تحقیق و ترتیب کے سائنسی اصولوں کی روشنی میں ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس مثنوی کے علاوہ "قدیم اردو" میں ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی نے شاہ معظم کی دو مثنوی "لغز عشق و عقل" "سچ محفی" اور ایک قصیدہ کو مرتب کیا ہے۔ محمد ابوالدین صدیقی نے شاہ داؤد کی مثنوی "کشتہ بارہ" کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے فیروز بیدری کی "تہناتہ" کو مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بالترتیب حسن سوقی کی "غزلیں" اور دکنی رباعیاں کے موضوعات پر مقالے لکھے ہیں۔

قدیم اردو کا دوسرا شمارہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا جس میں ڈاکٹر غلام عمر خاں نے عاجز کی مثنوی "بیلی بچوں" کو بدیع حسینی نے میراں یعقوب کی شامل لائقیت کے انتخاب کو انور الدین صدیقی اور مبارز الدین رفعت نے علاؤل کی "ابلیس نامہ" کو مرتب کیا ہے۔

قدیم اردو کا تیسرا شمارہ ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آیا، اس میں ڈاکٹر سعید حسین خاں نے عبدل کی مثنوی "ابراہیم نامہ" کو ایڈٹ کیا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں قدیم اردو کا ایک اور شمارہ ڈاکٹر روبہ بسملہ کی ادارت میں شائع ہوا جس میں انور الدین صدیقی نے خاتم کی تصنیف "ارشاد نامہ" کو مرتب کیا ہے۔

۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر محمد ہاشم علی کی کتاب "معنر مغرب چار شہادت" شائع ہوئی۔ اور "میراں جی شمس الحقائق کے نام سے ایک اور کتاب ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آئی۔ دکنی ادب سے متعلق پی ایچ ڈی کے لئے قلمبند کے

برٹش میوزیم۔ انڈیا آفس لندن۔ شیپو سلطان اور

شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کے مخطوطات کی توضیحی فہرستیں انگریزی میں شائع ہو چکی تھیں۔ اردو میں تسلی کتابوں کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کا ہر پروفیسر

مہر قدوسی کے مرتب ہے، جنہوں نے ۱۹۲۹ء میں جامعہ

عثمانیہ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب

کی تھی۔ اس کے بعد مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ۱۹۳۲ء

میں 'یورپ میں دکنی مخطوطات' مرتب کی اس

کے علاوہ نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالار جنگ

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، بمبئی، فائن، حاکم، ونگل

اور سنٹرل ریکارڈ آفس کے مخطوطات کی فہرستیں بھی

مرتب کیں۔ ڈاکٹر زور نے ادارہ ادبیات اردو کے

مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کے نام

کا آغاز ۱۹۴۳ء میں کیا تھا اور ۱۹۵۹ء تک ادارہ

نے (۱۱۵) مخطوطات کی توضیحی فہرستیں پانچ جلدوں

میں نہایت تفصیل کے ساتھ مرتب کیں۔ انجمن ترقی

اردو گریجویٹ کے اردو مخطوطات کی فہرست مولوی انور

صدیقی امر دہوی نے سید سرفراز علی رضوی نے

تعاون سے پانچ جلدوں میں شائع کی۔ اس کے بعد

مختلف کتب خانوں کی توضیحی فہرستوں کی اساعت کا

ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور جامع مسجد ممبئی کے اردو

مخطوطات، ٹونک کے اردو مخطوطات، دہلی کے

اردو مخطوطات، خدا بخش لاہور، سری پٹنہ کے اردو

مخطوطات، سہیل دہلی، سری علی گڑھ کے اردو مخطوطات

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مخطوطات، پیرس

کے مخطوطات، جرمنی کے مخطوطات، انڈیا آفس لندن

کے مخطوطات، اور کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ

احمد آباد کے مخطوطات کی فہرستیں شائع ہوئیں۔

شائع ہوئی تھی جس میں بے شمار خامیاں درج پائی گئی

تھیں۔ ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی سرکردہ ادارہ کتب خانہ

ادب اردو (جلد اول) مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع

ہوئی۔ آٹھ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں دکنی ادب

کی تاریخ کا مفصل جائزہ دیا گیا ہے۔

دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلہ میں ڈاکٹر حفیظ قتیل

اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ

قتیل نے نہ صرف یہ کہ ہاشمی بیجا پوری کا دیوان مرتب

کیا بلکہ 'مسلمی خدا نما' اور 'معراج العاشقین' کا مصنف

کے نام سے دو تحقیقی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ڈاکٹر سیدہ

جعفر نے شاہ ابوالحسن قادری کی مفتوی، سلیمان شاہ ربا

کی 'من بھٹاون' اور حال ہی میں احمد گجراتی کی 'یوسف

زلیخا' کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

دکنی ادب سے متعلق دیگر تحقیقی کتابوں میں ڈاکٹر

محمد باقر کی 'اردو کے قدیم دکن اور پنجاب میں سخاوت

مرزا کی کتابیں، 'من لکن' اور 'دیوان قاسم' میر سعادت

علی رضوی کی 'عادل شاہی مرثیے' انسر صدیقی امر دہوی

کی 'بیاض میراثی' ڈاکٹر نصیر الدین مدنی کا 'اردو غزل ولی

تک' اور 'ولی عجراتی'، ڈاکٹر نذیر احمد کی کتاب 'نورس'

ڈاکٹر جاوید و ششٹ کی 'غزل رنما'، وجہی کے 'انٹیلی

'روپ رس' اور 'قصہ حسن و دل'، ڈاکٹر ہبیل بکری

کی 'سب رس پر ایک نظر' ڈاکٹر منظر آغلی کی 'سب رس

کا تنقیدی مطالعہ' بدیع حسینی کی 'دکن میں ریختی کا ارتقاء'

محمد اکبر الدین صدیقی کی 'بکھتہ چراغ'، ڈاکٹر نذیر الدین

'نقوش دکن' ڈاکٹر حمیرہ جمیلی کی 'کلمۃ الاسرار' اور

قدیم صادق کی 'دکنی غالب ملا وجہی' کے نام قابل ذکر ہیں۔

قدیم ادب پاروں کی توضیح اور تحسین کے سلسلہ

میں وضاحتی فہرستیں شائع ہونے لگی ہیں۔

چھٹی جلد مرتب کی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ دکنی ادب سے متعلق راقم کی کئی کتابیں اور کتابیں خواہی شخصیت احمد فی، دبستان گوگنڈہ اور دکنی ادب و کثافت شائع ہو چکی ہیں۔

دکنی تحقیق و تنقید کے ارتقاء کے سلسلہ میں بعض مسائل نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ اس خصوص میں سب رس، اردو، اور نوائے ادب کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ دکنی ادب کی ترویج و اشاعت میں سب رس کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔

دکنی ادب کے موضوع پر چند رسائل کے خاص شماروں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ۱۹۳۵ء میں بی بی کالج میگزین "الموسیٰ" کا "یادگار ولی" شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں طلبات جامعہ عثمانیہ کا "نذر ولی" ۱۹۴۲ء میں مجلہ عثمانیہ کا "دکنی ادب نمبر" شائع ہوا اور شعبہ اردو بیٹھور یونیورسٹی کے ترجمان فکر و ادب کا "شعوی نمبر" ۱۹۸۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔

دکنی ادب سے متعلق یہ جائزہ نامکمل رہے گا اگر اس میں دکن کے مورخین اور تذکرہ نگاروں کا ذکر نہ کیا جائے۔ دکن کی ادبی تاریخ اور دکنی تہذیب و تمدن کے آثار کے تحفظ کے سلسلہ میں جن مورخین اور تذکرہ نگاروں نے بے مثال خدمات انجام دی ہیں ان میں: عبد الجبار خاں صوفی، ملا پوری، مولوی بشیر الدین احمد، سید ہایوں مرزا، محمد عبدالعزیز، محمد سلطان، سید علی بلگرامی، محمد حسین خاں، پروفیسر مارون خاں شیروانی، پروفیسر عبدالحمید صدیقی، ڈاکٹر زور، مولوی نصیر الدین ہاشمی وغیرہ کے نام لائقِ ذکر ہیں۔ ●

دکنی تحقیق کے سلسلہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی ایک تعداد شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے نہ صرف قدیم اردو ادب کی تاریخ کے تاریک گوشوں کو روشنی میں لایا ہے بلکہ ملک الشعراء نصرتی اور حسن شوقی کے دو ادین کو مرتب کر کے شائع کیا ہے بلکہ اردو کی پہلی مقنوی کدم ایدم راؤ کو مرتب کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا ہے۔ دکنی قواعد اور فرہنگ نویسی پر بھی قابلِ لحاظ کام ہوا ہے۔ دکنی کی اب تک سات فرہنگیں مرتب کی گئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

- ① دکنی زبان مرتبہ: عارف العلانی
- ② دکنی لغات مرتبہ: سید ابوتراب خطائی
- ③ دکنی لغت مرتبہ: سید سجاد احمد ہاشمی
- ④ دکنی فرہنگ مرتبہ: امیر عارفی
- ⑤ دیوانے معانی مرتبہ: ڈاکٹر جاوید و ششٹ
- ⑥ قدیم اردو کی لغت مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی اور
- ⑦ دکنی اردو کی لغت مرتبہ: ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر غلام مرزا خاں۔

دکنی قواعد کے موضوع پر ڈاکٹر حبیب ضیاء کی کتاب "دکنی زبان کی قواعد" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

۱۹۸۰ء میں پروفیسر غلام مرزا خاں، صدر شعبہ کی ادارت میں شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے اساتذہ اردو کے مقالین اور مقالوں پر مشتمل ایک مجلہ "جدہ تحقیقات اردو" کے نام جاری کیا گیا تھا جس میں دکنی ادب سے متعلق پروفیسر غلام مرزا خاں، ڈاکٹر محمود قادری، ڈاکٹر محمد ہاشمی، ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور راقم الحروف کے مقالے شامل ہیں۔ راقم الحروف نے حال ہی میں محمد اکبر الدین صدیقی کے اشتراک سے ادوارہ ادبیات اردو کے اردو مخطوطات کی

## فضا میں فیضی



مرے ادھر سے دھوکا عکس ہیں یہ بکیر نئے پرانے  
تئے پرانے تمام منظر، تمام منظر سے نئے پرانے

ہر ایک چہرے پر بشت ہے، لیکن اپنا اپنا ساخت نامہ  
چلے تو ہیں ساتھ ساتھ اک دوسرے سے مل کر نئے پرانے

یہ بیچ میں ان کے ہے جو گہری خلیج اسے کوئی باٹ دیتا  
رکے ہیں صدیوں سے ایک لمحہ ودفاع پر نئے پرانے

ہر ایک چہرے پر بشت ہے، لیکن اپنا اپنا ساخت نامہ  
چلے تو ہیں ساتھ ساتھ اک دوسرے سے مل کر نئے پرانے

زرا بھی چو کے، تو بھر نہا جائیں گے خود اپنے لہو میں ہم سب  
کہ وہ یہ عصری تعمیر توں کے ہیں اب ہندوستان پرانے

ہر ایک چہرے پر بشت ہے، لیکن اپنا اپنا ساخت نامہ  
چلے تو ہیں ساتھ ساتھ اک دوسرے سے مل کر نئے پرانے

نہ اب دیکھیں تورات میں سے پانڈی پر جسے چاہیں  
ہمارے خوابوں کی ریت میں جب ہیں سمندر نئے پرانے

ہر ایک چہرے پر بشت ہے، لیکن اپنا اپنا ساخت نامہ  
چلے تو ہیں ساتھ ساتھ اک دوسرے سے مل کر نئے پرانے

جواب روایت ہے، عہد میں اپنے، تجربوں کی کھینچاؤ  
نکستی سطح پر نہیں، فکر و فن کے محور نئے پرانے

اسی گلی میں بیچ کے ہم، آج کٹ گئے ایک دوسرے سے  
وہی گلی، جس میں آگے ملتے تھے دوسرے اکثر نئے پرانے

وہی دیکھوں سے جھانکتی شوق فائز نئی پرانی  
وہی منڈیروں پر رقص کرتے سیر کبوتر نئے پرانے

## ڈاکٹر صفدر علی بیگ

# ہندوستانی تہذیب و مسلمانوں کا اثر

ہندوستان اور مسلمانوں میں سب سے پہلے روطہ وسط جنوبی ہند میں پیدا ہوئے لگاتار جب کہ ساتویں صدی عیسوی کے درمیان ہمارے میں عربی مسلمانوں کی ایک بڑی قاعدہ، غزواتی اراضی سے ہندوستان کے جہانستان پہنچی۔ رفتہ رفتہ مہراجن جنوبی ہند میں آئے۔ کہ انہیں ساحلی علاقوں پر قوطہ، اچھیا کب، وہ مذہبوں، راجا، بارہرہ، جیہ ملک تمام اُنہوں کو سوریہ اور سندھ کے سرے کی طرف تک پہنچ گئے جہاں انہیں جمہور قیام کرایا۔ بہت جلد ہندوستانی سے انہیں طرہ واقف تھے اور اس کا سامان فراہم کرتے تھے۔ جب ساحلی علاقوں پر ان کی کثرت ہوئی تو مسلمانوں نے ہندوستان کے تین حصوں میں علی آبادیاں قائم کیں۔ انہوں نے ملکوں کے حالات بیان کرتے ہوئے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہ "یہ ملک بہت تنہا ہے کہ سالوں میں صدیوں میں ایرانی اور عربی تاجرستان کے مغربی ساحل کی مختلف صدیوں میں ہندوستان میں آباد ہوئے اور انہوں نے ہندوستان کی حالتوں سے متاثر ہو کر، اس کے بعد مسلمانوں کا اثر تیزی سے بڑھنے لگا۔ تاجروں کی حیثیت سے ان کا غیر معدوم باوجود تاجرانہ کام آتا رہا اور اپنے مدد سے۔ یہ اپنے تعلق مدد سے۔ اس لیے تبلیغ مذہب کی کوششوں کی اور ہندوستان نے عزت و توقیر بھی حاصل کر لی تھی۔ نویں صدی کے اوائل تک وہ ہندوستان کے سارے مغربی ساحل تک پھیل چکے تھے۔ ان کے مخصوص مقامات اور طریقہ عبادت کی وجہ سے ہندوستانی میں بھی ایک محسوس جذبہ اور بل چسپ پیدا ہوئی تھی۔ اس دور میں ہندوستان میں یہاں کے مدنی معاملات میں کافی کشمکش پیدا ہوئی تھی۔ کیونکہ یہ ان کا جدید مذہب اپنی فوقیت کیلئے بدھ متوں اور جینوں کے مقابلے کی پوری جدوجہد کر رہا تھا۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ دور تغیرات اور انتشار کا تھا۔ نئے نئے حکمران خاندان حکومتیں کر رہے تھے۔ لوگوں کے دل و دماغ حیران و پریشان تھے۔ وہ نئے تعزیرات و تبدیلیات کو خواہ وہ کس سے آئیں، قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ ڈاکٹر تارا چند کا خیال ہے کہ "اسلام ایمان کے ایک سادے سے اصول، معنی و

1948

مرتب عقائد و رسوم اور سماجی نظام کے جمہوری لطیفہ کے ساتھ منظر عام پر آیا تھا۔ اس سے مقامی فضا پورے طور پر متاثر ہو گئی۔

عرض اس زمانے میں مسلمانوں نے یقیناً بہت احمیت حاصل کر لی تھی ان کو اور بھی متفق و موافق ہو گئے مثلاً ایک مسلمان "نام بودری رہیں" کے برابر بیٹھ گیا تھا۔ راجہ موریں کی سرحد سے اندر ہوا۔ یہ افراد۔۔۔ عرب تاجر کثیر تعداد میں اس کی سلطنت میں آباد ہوئے اور ایسی تجارت سے کہ صرف اس کی دولت، دواں میں اضافہ کیا غلط اس کی مہمانی میں بھی اس کی مدد کو۔ روس میں مسلمانوں کی اتنی زیادہ عزت کرتا تھا کہ وہ حکم حکم لہوؤں کو بھی مسلمان ہو جانے کی ہمت افزائی کرتا تھا۔ اس نے حکم باغیاہ اس کی سلطنت کے اندر مسلمانوں کی سی تربیت کی جائے۔

رفتہ رفتہ مسلمانوں کا اثر بڑھتا گیا تھا اگرچہ یہاں اور ماسریہ، مغز اعلیٰ سہادت سے ظاہر ہوا ہے۔ مسلمانوں نے ہندو راہبوں میں، ریشورہ، سایدرا، یانغا، مسلمانوں کے اس دور کے سکائیہ، ملے ہیں اور ان کے گھونے پر کتابتیں، درس، تہذیب، مذہب، تہذیب کے گہرے تصور، صاف، رنگ ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں مسلمان تاجر یا مسلمانوں کی ٹوئیں جاتی تھیں ان کے ساتھ ساتھ اور وہیں لوگ بھی بیٹھتے تھے۔ ان کے لوگوں میں ناست، دول، الو، قص، الاسد، والہ، (جو موسمی اور عمدت تھے) ترمیا، یل، اور، صاف، دیو، گے، دسویں صدی میں منصور، حمان کے سمسد کے درجے ہاستان کا سفر کیا اور ان کے راستے سے شمالی ہندوستان ہوتے ہوئے وہیں اپنے وطن کو لوٹے۔ ان کے ادھر صوبہ صوبہ میں، ماماریہاں کے ٹھکانے کے راہب کے لڑکے کو اسٹان لیا۔

اسی زمانے میں یعنی ۱۰۶۷ھ میں تھوڑے روزہ بنی نو عمرہ رادری نے مدہ ہی بیستہ انہی سے  
گجرات آئے اور یہاں ہوئے۔ ان مصوبہ بنی نو عمرہ رادری ہی طرح سے آئے الہ آباد میں  
تو طین اختیار لیا اور وہاں احوال دیا۔ فرید الدین قیام نے اور مصوبہ صدیقی سے سارستان کا دورہ کیا۔  
خواجہ معین الدین چشتی اور جلال الدین فارسی بھی جہاں تھے اس کے کچھ بعد بعدہ الکبیر بنی  
نے بھی ہندستان کا سفر اختیار کیا۔ پھر سبہ محمد بن حیدر نے پورا اور بکام کے اصلاخ میں لوگوں کو مسلمان کیا  
اسی طرح قطب الدین بھیماراکھن کاہار دہلی میں ہے اور جس کے نام سے قطب بھمار خسوب ہے اور  
بہاؤ الدین زکریا اور دیگر مشہور عوفیا ہندستان گئے۔ ان سب نے ہندستان کو ایما طین نکالیا اور ان کے  
ذاتی روابط اور اسے اسلامی نسے اور تقویٰ کے ذریعہ ہندستان میں ایک سرے سے دوسرے  
سرے تک پھیل گئے۔

ڈاکٹر تارا چند نے یہ بھی میل ظاہر کیا ہے کہ جنوبی ہند کے عقیدے اور فلسفے کے مختلف مکاتب خیال

کے بیشتر عناصر کا اگر مطالعہ الگ الگ کیا جائے تو وہ قدیم مکاتیب خیال ہی سے ماخوذ نظر آئیں گے لیکن ان تمام عناصر کا ان کی مجموعی حیثیت میں تجزیہ کیا جائے اور ان میں جس مخصوص چیز پر رد دیا گیا ہے اُسے سامنے رکھا جائے تو اُس عقیدے سے غیر معمولی مماثلت ظاہر ہوتی ہے اس لئے اسلامی اثر کی جو دلیل دی گئی ہے وہ قرین نیکس معلوم ہوتی ہے۔

البیرونی کے نزدیک سدوؤں کی قوم خود داری تھی وہ بیرونی تصورات کو جذب تو کر لیتی ہے لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ عبودیت کی تقلید سے اس کی خود داری کو ٹھیس لگے۔ ابتدائی مدارج میں اسلام کا اثر بالواسطہ اور خاص خاص جیسوں میں تھا۔ ڈاکٹر تارا چند کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ اسلامی لٹریچر کے مطالعے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ مذہبی روایتوں کی رباں سے سُنی ہوئی تعلیمات اور ان کے رسوم اور دستور کے مشاہدے کا اثر تھا۔ ہندوستانی مذاہب جنہیں جنوب میں سری شنگر آچاریہ اور ان کے جاسٹینوں نے فروغ دیا مسلم دینیات و تصوف کے مکاتیب خیال سے نہ بردست مماثلت و مشابہت رکھتے ہیں۔ وحدانیت کے تصور کو تنکرائے فلسفے کی مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی اور وحدانیت کے اس رحمان کے استحکام کو ایک پختہ وحدانیت اسلامی سے بردست تہہ ملی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوؤں میں بہت سے عناصر اسلام سے براہ راست روابط کے ذریعے حاصل ہوئے۔ ان عناصر پر اسلام کی چھاپ نمایاں ہے۔

مسلمان درویش یہاں کے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے اور بہتوں کو مسلمان بنا چکے تھے۔ اور ہندو راجہ متلا کون یا مذہب مسجدیں بنانے کے لئے جاگیریں اور روپیہ میسر دے رہے تھے۔ راجا مالوہا کے فلسفے میں ایک اچھے صفات والے خدا کو مانا گیا ہے اور ایمان و عقیدت کے ساتھ اس کی عبادت کی تلقین کی ہے۔ اس نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا ہے کہ مذہب کے دروازے ان طبقوں کے لئے بھی کھول دیئے جائیں جو اب تک اس سے محروم تھے۔ محبت کو صرف خدا اور انسان کے رشتے میں نہیں بلکہ انسان اور انسان کے رشتے میں بھی جگہ دی جائے۔ دسترسوامی، تمبار کا اور مادھوا کے یہاں خدا کی صفات اور انسان کی حقیقت کے تعلق سے جو مابعد الطبیعیاتی مباحث پائے جاتے ہیں ان میں کسی قدر نظام اشعری اور انفرالی کے مباحث کی محکم نظر آتی ہے۔

بہر حال نویں صدی کے بعد سے جنوبی ہند کے انداز میں بعض خصوصیات ایسی ملتی ہیں جو اسلامی اثرات کی طرف بڑھ رہا اشارے کرتی ہیں۔ یہ خصوصیات وحدانیت پر بڑھتا ہوا امر ہے۔ جذباتی پرستش، خود سپردی، معلم کا احترام سے گرد بھلکی کہا جاتا ہے، ذات پات کی سختیوں میں پلنگ اور نرمی اور ظاہری رسوم سے بے پروائی، یہ سب اسلامی اور صوفیانہ اثرات کو واضح کرتی ہیں۔

ان تمام لوگوں کا مذہبی عمل یہ تھا کہ نیک اعمال اور قسربانیاں کی جائیں، ذہنی اور روحانی تربیت یا یوگ (ڈسپلین) پر عمل کیا جائے۔ دھرم شاستر، ہابھارت اور سکھیا، یوگ، فلسفے کی خاص تعلیم پر مبنی ہیں۔ اسی طرح رامانوجا نے شردوں کو کچھ قیود کے ساتھ مندروں میں داخل کیا اور ان کی روحانی صلاح کیلئے خود پُروٹی (پراپتی) اور گرو کے اہتمام (ایجاد یہ اسمیان) کا مسلک رائج کیا۔ ڈاکٹر ناراجد کا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں عناصر اسلام سے ہی گئے ہیں، کیوں کہ یہ دونوں خصوصیات اسلام ہی میں نمایاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لفظ اسلام کے معنی ہی سیردگی ہیں (یعنی تسلیم کرنا) اور اپنے آپ کو رضائے الہی کے سیرد کر دینا، اپنی مملکت کے مدد ہی شعور کا ایک داری جزو ہے۔ رامانوجا نے یقیناً اسے اسلام سے لیا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ گرو کے احترام کا تصور، ہندوستان میں قدیم زمانے ہی سے ہے اور گرو اور رہا چاری (جیلا) کے تعلقات کے بارے میں قواعد مقرر کئے گئے ہیں۔

صوفیا کا یہ تصور کہ مرشدِ خدا صفت کا حامل ہوتا ہے قرونِ وسطیٰ کے بدوؤں نے ایسا یا اسٹیکر نے "سٹکر" کو "ستو" کا اقرار مانا ہے۔ یہ تصور کہ دستو اور اس کی معائنہ کے اوتار ایجاد یہ ہیں، یہ تمام صوفی طرز کے تصورات ہیں۔ صوفی ہند میں اور دو فرقوں پر اسلام اثر انداز ہوا۔ یہ فرقہ لگایت اور مہار ہیں۔ کٹر لگایت لازم کا آغاز بارھویں صدی میں ہوا۔ لگایت ایک خدا (پجنتو) کے پرستار ہیں جو لامحدود، غیر مرئی اور خود مختار ہستی ہے۔ ان کے یہاں خدا کے تقریباً ہی صفات ملنے جاتے ہیں جو اسلام میں بتائے گئے ہیں۔ صرف یہ کہ وہ روحِ انسانی کے رہنما اور نجات دلائے والے ستو کی حیثیت سے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے یہاں قربانیاں، رت، ضیافتیں اور یا ترائیں نہیں ہیں۔ ان کے لئے کوئی مدی بات کرنے والی ہیں ہے۔ ان میں ذات پات نہیں ہیں۔ اگر کوئی جھوٹ فرقتے کا ہے تو بھی برہمن سے کم نہیں ہے۔ سب ہی آدمی برتر ہیں۔ شادی مرضی پر منحصر ہے۔ خادوں سے پہلے دلہن کی مرضی ضروری ہے بالکل اسی جس طرح اسلام میں ہے کم بنی کی خادوں بُری بھی جاتی ہے، طلاق کی اجازت، بیواؤں سے عزت کا سلوک، انھیں دوبارہ شادی کی اجازت اسلام ہی کی طرح ہوتی ہے۔ مردے جلائے نہیں جلتے بلکہ دھن کے جاتے ہیں، مرد کو ہلایا جاتا ہے۔ لگایت لوگ تناسخ یا آواگن کے عقیدے کو ہیں مانتے، وہ اپنی سیرت کے لحاظ سے یار سا، سخت عطا اور جنگ خور ہوتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ ڈاکٹر ناراجد کا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی تمدن کے ارتقاء میں مسلمانوں کی فتوحات کا بھی زبردست اثر ہے۔ مسلمان چاروں طرف ہندوؤں سے گھرے ہوئے تھے، دونوں نے تقریباً ایک راہ اختیار کی اور آپس میں برہمنوں کی طرح رہنے لگے۔ دونوں کے مابین شادی بیاہ کے رسومات وغیرہ



میں یکسانیت پیدا ہو گئی۔ مسلمانوں نے ہندو رسوم بھی اختیار کر لئے۔ دونوں نے ایک نئی زندگی کی تلاش کی اور ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جو نہ خالص ہندو تھی اور نہ خالص مسلم۔ ایک ہندو مسلم تہذیب پیدا ہو گئی۔ ہندو عورتیں پردہ بھی کرنے لگی تھیں۔ نہ صرف ہندو مذہب 'ہندو آرٹ' ہندو لٹریچر اور ہندو سائنس نے مسلم عناصر کو جذب کیا بلکہ ڈاکٹر تارا جتدے کے بیان کی رو سے خود ہندو تمدن کی روح اور ہندو ذہن میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ ہندو مصنفین بھی ماحرم کو 'حرم تریف' اور قرآن حکیم کو 'کلام پاک' لکھنے لگے۔ اپنی تحریرات کو 'بسم اللہ' سے شروع کرنے لگے تھے۔ خود مسلمانوں نے بھی جو اب ہر شعبہ زندگی میں تبدیلی پیدا کر لی۔

جنوب کے ہندو فرقوں پر اسلام کے اثر نے سال تک تبدیلیاں پیدا کیں۔ جو تحریک دکن میں پیدا ہوئی وہ شمال میں ترقی کرتی گئی اس طرح ہندو اور مسلم مذہب کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کے ہندوستان آنے سے پہلے تک یہاں کپڑے کو سی کر پہننے کا تصودہ تھا۔ مرد لوگ ایک کپڑا باندھ لیتے تھے اور ایک کپڑا کندھوں پر ڈال لیتے تھے اسی طرح عورتیں بھی صرف ساریاں باندھتی تھیں۔ اس زمانے کے ہندوستان میں فنِ تعمیر میں بھی اسی امتزاج کا روحان ظاہر ہوتا ہے۔ نہ صرف فنِ تعمیر کے مسلم عناصر کام میں لائے گئے بلکہ قدم جمالیاتی انداز کی حد تک بدل گئے تھے۔ یہ میری حاضری پر راجپوتانہ اور وسطی ہند کی ہندو ریاستوں اور محقر اور بدراہن اور غلطس کے مقدس مقامات میں نظر آتی ہیں اور کھمبڈ اور جنوبی ہند میں مدورا تک اس کا اثر ہے۔ ہندوستانی مصوری خواہ محل ہو یا راجپوت اس کا بھی وہی حال ہے جو فنِ تعمیر کا۔ اجڈا کے اور دہلی اور جئے پور کے طرز میں بڑا فرق ہے۔ خطوط رنگ اور تناسب پر ہر چیز بدلی ہوئی ہے لیکن اس میں ایک انفرادیت بھی ہے جس کے سبب سے اُسے مسلم ہندو آرٹ بھی کہا جاسکتا ہے۔

جہاں تک ادب کا تعلق ہے شمال میں ہندی، مغرب میں مرہٹی اور مشرق میں بنگالی ترقی کر کے ادبی زبانیں بن گئیں اور ہندو مسلمان دونوں اس کامیابی کے افتخار میں شریک ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کے افلاطون کا سب سے بڑا ثبوت خود زبانِ اردو ہے۔ ہندی کے کثرتِ مسلم شعرا اور اردو کے کثرتِ ہندو شعرا اور نثر نگار اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

## منظرِ حنفی

## غزلیں

لازم ہے کاغذ بن جو مرے یاد دیکھ کر  
چلتا ہے کارواں تری رستار دیکھ کر  
ہم ہیں وہ کج گلاہ نہ کی بے دل پر نیگاہ  
سارا بسو نیوڑ دیا خسار دیکھ کر  
ہم یہر وجود و وقت کے اسرار کھل گئے  
دربائے یاد رہیں نہ ہی دیوار دیکھ کر  
اے لہ لہ گندہ نہ ہوں لون سنگت میں  
تیرا اٹھائیں مجھ پہ بریا کار دیکھ کر  
دلی میں ایک نفرتی تری منزل سا نہیں  
ہم لوٹ آئے کوچہ و بازار دیکھ کر  
نارے لہ رہے ہیں ان آہ نالوں میں  
دروں کی آسمان بہ یلغار دلہ کر

جو جانتے نہیں ہیں نظم کو۔۔۔ میں ہیں!  
غالب کی اس دہس میں استعارہ دیکھ کر

اور مان ہے مرنے کا 'خیرات' میں کیا دینا  
درویش کا پیشہ ہے 'جینے کی' عادی دینا  
محفوظ کنارہ تو اک ریت کی دلال ہے  
اے مروج بلا تو ہی اس پار لگا دینا  
ان سادہ مزاجوں کی ہر بات نرالی تھی  
نیکی جو کوئی کرنا 'دربائیں' بہا دینا  
گل ریزی موسم کا شہرہ ہے رمانے میں  
دھوکے بھر مری جانب دو پھول بڑھا دینا  
گھر ہی میں خرابی کے امکان نکل آئے  
لازم ہوا صحرائے دیوار ملا دینا  
اے شمع سحر دیدہ راتیں ہی غنیمت ہیں  
یادوں کا مہک جانا زخموں کا مزا دینا  
عص میں مظفر کے حالی تو ہزاروں ہیں  
بس یہ ہے کہ تم پہیلی آواز اٹھا دینا

## ڈاکٹر معین شاہ

# اُردو کا مسئلہ اور مسلمان

اُردو کا موجودہ مسئلہ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے اگر ملک کی تقسیم نہ ہوتی تو اردو کا مسئلہ اس کی موجودہ شکل میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ جدوجہد آزادی کے دوران یہ بہت تسلیم کر لی گئی تھی کہ ”ہندوستانی“ کو دو طرح کے رسم الخط (اردو اور دیوناگری) کے ساتھ ملک میں رابطے کی زبان کے طور پر اختیار کر لیا جائے گا۔ قیام پاکستان اور اس کے ساتھ کی فرقہ وارانہ تباہیوں نے پورے ماحول کو بدل دیا۔ دستور ساز اسمبلی نے لاندھی جی اور کانگریس کے طے شدہ رابطے کی زبان کے اصول کو نظر انداز کر دیا۔

تقسیم کے بعد اردو کو ہندوستان کی تعلیمی اداروں، انتظامیہ اور دوسری تہذیبی انجمنوں سے بیدخل کر دیا گیا۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے اردو خود اپنے ہی ملک میں غیر ملکی بن کر رہ گئی۔ مخالف اُردو احساسات کی جڑیں بہت گہری ہیں کیوں کہ اس سے ہندو مسلم دشمنی کا اظہار ہوتا ہے جو ہمارے فرقہ وارانہ منافرت کے درشنے کا حصہ ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کی روش سے اردو بولنے والوں کی تعداد دو کروڑ تین لاکھ سے زیادہ ہے۔ دستور ہند کی آٹھویں جدول میں اردو کو ہندوستان کی پندرہ زبانوں میں سے ایک نہایت کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اس کے ہندوستانی ہونے میں کمی شدہ کی گنجائش نہیں ہے پروفیسر مسعود جی خواں کہتے ہیں: ”ایک ایسا شخص جو ہند۔ آریہ زبانوں کی تاریخ سے واقف ہو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اردو کا مسئلہ

اس وقت سے جاری ہے جب آریہائی لوگ ہندوستان میں داخل ہوئے تھے یعنی تقریباً ۱۵۰۰ء قبل مسیح میں۔ یہ زبان اس وقت بھی ہندوستان میں موجود تھی گو کہ اس کی حیثیت اور نام مختلف تھا۔ اس زبان کا دھارا ہمارے ملک میں زمانہ قدیم سے رواں دواں ہے اور اس کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ ترقی پسند اثرات قبول کئے اس لئے اسے ہند۔ ایران تہذیبوں کا امتزاج کہا جاسکتا ہے۔ اس کی سادگی، اس کی ترکیب کی لچک اور الفاظ کا ذخیرہ قابل قدر ہے اس کے علاوہ یہ ان چند زبانوں میں سے ایک ہے جنہیں بجا طور پر جدیدیت کہا جاسکتا ہے کیوں کہ اس کی نشوونما کسی مذہبی علم یا رسومات

کے زیر اثر نہیں ہوئی بلکہ ابتداء ہی سے اس کے ادب اور خصوصاً شاعری میں 'اسان دوستی' وسیع الطبیعت  
امن و ایشیائی کا قابض فخر سرمایہ رہا ہے۔ اردو ادب ہمیشہ سے غیر مدہبی اور ہر قسم کے تعصب و تنگ نظری سے پاک  
رہا ہے۔ اردو شعروادب میں متصوفانہ نظریہ تمام مہمیب کے احترام اور تادکامی ہے اور اس  
کی روح یکو لزم کی حامی ہے۔ یہ کتاب بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ سماجی تبدیلیوں کی تمام نئی لڑائیاں یا تو اردو کے  
ذریعہ لڑی گئیں یا انھوں نے اس پر اپنا گہرا اثر چھوڑا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی، مرید احمد کی تحریک  
اصلاحات، آریہ سماج، خلافت اور امدین یسٹنل کانگریس کی تحریکات، بحالی سولہ کی لڑائی، ان تمام  
تحریکات میں اردو کو استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ایم یا سہسان کے بعد بھی جہاں دونوں طور سرکاری طور پر  
کر لیا گیا ہے۔ یہاں بدستار میں اردو کی مقبولیت کی واقعی وجہیں ہوتی ہیں۔ ان کے لئے رجسٹرار اور  
کے مطابق اردو پروگراموں کی تعداد ۶۸ ہے۔ صرف بدی سے کم ہے اور ان کے بعد دارالحدود  
پندرہ روزہ، ماہنامے، ماہی اور شش ماہی رسالوں کی مجموعی تعداد ۷۲ ہے۔ صرف انہی نئی  
اور ہندی سے کم ہے۔ صرف ایک اردو رسالے کی اشاعت ۸۷،۰۰۰ ہے۔

اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہرگز نہیں ہے، گوکہ اردو مسلمانوں کے مابین ایک رابطے کا کام انجام  
دیتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر صوبہ کا مسلمان ایذا، ماری اور علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ عام طور پر اردو  
بھی سیکھتا ہے۔ غیر مسلم یعنی ہندو، سکھ، جیس اور عیسائی بھی اردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں اور اردو ان کے لئے  
کے لئے اور ترقی پلئے ویسا ہی کردار ادا کرتا ہے جس جیسانہ مسلمان کرتے ہیں۔ اس طرح اردو کی لغات کا مسلم  
مسلم اور غیر مسلم دونوں کا مسئلہ ہے اور اسی طرح ہونا بھی چاہئے۔

ملک کی تقسیم کے بعد لسانی اساس پر صوبوں کی تنظیم جدید اردو کی موجودہ مدحالی کی سب سے بڑی وجہ  
ہے کیوں کہ اردو کسی بھی صوبہ میں اکثریت کی زبان نہیں ہے اس لئے یہ اپنے ہی گھر میں لے کر ہو رہا ہے۔  
(عام کشمیریوں کی زبان اردو نہیں ہے) اردو ہر صوبے میں لولی اور سمجھی جاتی ہے اور کسی ایک صوبے کی  
محدود میں محصور نہیں ہے۔ نتیجتاً اسے کسی صوبائی حکومت کی سرپرستی میسر نہ آسکی۔ صرف اردو میں تعلیم  
کو کسی صوبے میں ملازمت نہیں مل سکتی۔ کئی صوبوں میں اردو مادی زبان رکھنے والے عوام لوارد میں تعلیم  
حاصل کرنے کی دستوری سہولتیں مہیا نہیں ہیں اردو کے عظیم وسیع کردار کے مادحہ اسے کسی قسم کا ناہ  
حاصل نہ ہو سکا۔ اور اس کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ اس تلخ حقیقت کو ہندوستان کی صوبائی حکومتوں دریاغصوں  
یو۔ پی اور پنجاب میں اردو کی موجودہ کمبری کے پس منظر میں دیکھا جائیے۔ جہاں اردو کے ساتھ سوسلی  
اولاد کا سلوک روا رکھا گیا ہے جیسے اس کا ہندوستان پر کوئی حق نہیں رہا۔ پنجاب میں جہاں عام بول چال  
پنجابی میں اور نوشتہ و خواندہ اردو میں ہوا کرتی تھی وہاں اب ہندی کو مادی زبان قرار دے دیا گیا ہے۔

اسی طرح کاروبار سابق صدر کانگریس پر شرم داس ٹنڈن، یو پی کے سابق وزیر اعلیٰ جی پی پنٹ، یو۔ پی کے سابق وزیر تعلیم سمجور ناتھ، بہار اعلیٰ کے سابق سپیکر ایل این سمدرشن نے بھی اپنا ہاتھ لگایا تھا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک اردو اور ہندی دونوں زبانیں فوقانی مدارس میں ذریعہ تعلیم تھیں، انتظامیہ کی نجلی سطح پر ان کے استعمال کی احکامات تھی۔ اعلیٰ ثانوی امتحانات میں بھی انھیں استعمال کیا جاسکتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ہائی اسکول بورڈ کے امتحان میں اردو زبان میں امتحان دینے والے طلبہ ۴۸ فیصد تھے۔ ٹیپن ماٹھ سہا (اردو کنونشن میرٹھ جون ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۱۹۴۵ء) کا کہنا ہے کہ "آزادی کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اس صوبے میں ترقیاتی منصوبے میں ہلاکام اردو کو تباہ کر دیا تھا۔ ۱۹۴۹ء۔ ریر تعلیم کی طلب کردہ کانفرنس نے تسمانی تعلیم اور مادری زبانوں کے تعلق سے ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں سانی اقلیتوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا تھا لیکن حکومت یو۔ پی نے اسے منظور نہیں کیا اور نہ اردو کے تعلق سے کانگریس ایک کمیٹی کی قرارداد پر توجہ دی۔ اس طرح اردو سے یو پی سرکار کا غیر ہمدردانہ رویہ اور مرکزی حکومت کی نااہلی بے اثر پروٹیسٹ سے اردو کو بے دخل کر دیا۔ اس بات کی توثیق سانی اقلیتوں کے کنٹریکٹ کی رپورٹ سے بھی کی جاسکتی ہے۔ پانچویں رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۶۱، ۱۹۹۰ء میں گورکھ پور میں اردو مدارس کی تعداد ۴۵ تھی، دوسرے ہی سال وہاں ایک بھی اردو مدرسہ باقی نہ رہا تھا۔ ضلع عاری پور میں ۶۱، ۱۹۹۰ء میں ۳۶ اردو مدارس تھے، دوسرے سال یہ تعداد ٹھٹہ ۳۰ ہو گئی۔ ضلع فخر پور میں ایک ہی سال میں ۲۸ سے ٹھٹہ کر ۲۳ رہ گئی تھی۔

حوا، اصلاخ میں نسبتاً بہتر انتظامات روا رکھے گئے تھے تسمانی جماعتوں میں اردو طلبہ کی تعداد میں ۶۱ اضافہ ہوا۔ مثال کے طور پر مراد آباد ضلع میں اردو تسمانی مدارس کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ مثال کے طور پر مراد آباد ضلع میں اردو تسمانی مدارس کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ہی ۱۹۹۲ء میں تسمانی جماعتوں میں اردو طلبہ کی تعداد ۱۸، ۶۱، ۱۸، ۶۱ تک پہنچ گئی تھی۔ یہی حال بارہ بنکی کا بھی تھا جہاں مدارس کی تعداد ۲۹ سے بڑھ کر ۲۷ تک پہنچ گئی تھی اور دیگر کئی مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی طلبہ کی تعداد ۲، ۱۵۶ سے بڑھ کر ۵، ۵۸۵ ہو گئی تھی۔ انتظامی سہولتوں اور مدارس کے خاتمے کے ساتھ ہی طلبہ کی تعداد بھی ٹھٹہ کشر کی ساتویں رپورٹ میں جو اعداد و شمار دیئے گئے تھے وہ اہمیت کے حامل ہیں:

| ۱۹۵۰ء | تسمانی مدارس | متعلقہ جماعتیں | طلبہ کی تعداد | مدرسین کی تعداد |
|-------|--------------|----------------|---------------|-----------------|
| ۱،۳۸۵ | ۶۲۷          | ۱۰۰۰،۴۶۵       | ۲۵۲۵          |                 |

یو پی

| ۶۰-۱۹۵۹ء | تمامی مدارس | متعلقہ جماعتیں | طلبہ کی تعداد | مدرسین کی تعداد |
|----------|-------------|----------------|---------------|-----------------|
| بہار     | ۳, ۲۸۵      | ۱, ۲۲۴         | ۱۹۶۲۹۶        | ۵۵۹۱            |
| ہزاراشتر | ۱, ۲۷۳      | ۵۶۵            | ۱۹۲۷۲۵        | ۵۲۳۷            |
| میسور    | ۱, ۸۲۲      | ۱۹۶            | ۶۶۲۸۷         | ۱, ۶۲۳          |
| <hr/>    |             |                |               |                 |
| ۶۱-۱۹۶۰  |             |                |               |                 |
| یو۔ پی   | ۱, ۲۱۱      | ۲۳۸            | ۱۱, ۷۷۷       | ۵۳۵             |
| بہار     | ۳, ۵۹۵      | ۱, ۲۶۱         | ۲۰, ۹۲۳       | ۱, ۰۱           |
| ہزاراشتر | ۱, ۳۱۰      | ۱۲             | ۳, ۱۰۰        | ۵۸۸۶            |
| میسور    | ۱, ۸۹۰      | ۱۶۷            | ۱۷, ۱۸۰       | ۱, ۰۱           |
| <hr/>    |             |                |               |                 |
| ۶۲-۱۹۶۱  |             |                |               |                 |
| یو۔ پی   | ۱, ۹۰۲      | ۷, ۱۰۱         | ۱۲, ۱۵۷       | ۳, ۹۷۳          |
| بہار     | ۳, ۲۳۷      | ۱, ۵۷۷         | ۲۱, ۳۹۳       | ۵, ۵۷۷          |
| میسور    | ۵, ۳۲۱      | ۱, ۷۷          | ۲۱, ۲۰۹       | ۵, ۷۵۰          |
| ہزاراشتر |             |                |               |                 |

اعداد و شمار مل جیسے ہیں۔

یہ حقائق یو۔ پی کے اردو بولنے والے ۱۹ لے تمام کی شکایات کی توثیق کرتے ہیں کہ ان علاقوں میں جہاں اردو کی تعداد زیادہ ہے ان کے لیے کوئی ایسی پالیسی دستیاب نہیں ہوئی ہے جو اردو کو بچا کر رکھے۔

کمتر کی یہ جو رپورٹ مل گئی ہے کہ ۶۰-۱۹۵۹ اور ۶۱-۱۹۶۰ میں ان علاقوں میں اردو مدرسہ باقی نہیں رہا تھا جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد اس قدر کم ہو گئی تھی کہ اسے چھوڑ دیا گیا۔

۱۹۶۱ء میں حوسہ لسانی دارمولا اینا گیا تھا اس سے پہلے اردو بولنے والوں کو کسی طرح کی توجہ نہیں ہوئی اور انگریزی کے ساتھ تیسری زبان سنسکرت تھی نہ کہ اردو۔ اردو بولنے والوں کے مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اردو بولنے والوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن اردو طلباء کی تعداد گھٹتی رہی اور ان میں سے بہت کم تھے۔

یو۔ پی میں یہ تعداد آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔

جہاں تک اردو زبان کے مدرسین کا تعلق ہے ۶۳-۱۹۶۳ کے دوران ۳۳۴ اور ۶۵-۱۹۶۵

دوران ۹۲ اور ۶۶-۱۹۷۵ء میں ۲۵۰ اردو مدرسین کا تعزیر کیا گیا تھا اس کے مقابلے میں سنسکرت کے مدرسین کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ جدا اور مشکلات جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) مارادوں میں اردو کی کمی میں دستیاب نہیں ہوئی۔

(ب) اختیار میں مضامین کے لئے حواد و کتب مقرر کی جاتی ہیں ان پر نظر ثانی نہیں کی جاتی، طلبہ کی استعداد کے لحاظ سے ان کتابوں کا معیار بہت بلند ہوتا ہے۔

(ج) داخلے کے فارمولوں میں مادری زبان سے متعلق کوئی کام نہیں ہے۔

د) اسلامی مکتب اور مدرسوں کے معائنے کی رپورٹ ہندی میں لکھی جاتی ہے جو ایک ناخاسب طریقہ ہے

۱ھ۔ سرمدی کے بعد معائنہ کرنے والے غلطے اور عہدہ داروں کا جو تعزیر ہوا ہے ان میں اکثریت ایسے

لوگوں کی ہے جو قطعاً اردو جانتے ہی نہیں۔

سیاسی سطح پر بھی اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ارکان کو ان کی اپنی مادری زبان میں حلف لینے کے دستوری حق

سے محروم کر دیا گیا ہے۔

ڈی۔ ای۔ اُسٹھ لے دستور کی دفعہ ۲۹ جس میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ اگر کسی اقلیت کی اپنی

ایک زبان رسم الخط اور تہذیب ہے تو اسے اس بات کا حق ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے کے تعلق سے

اظہار حیا کیا ہے کہ 'علی طور پر اس ضمانت کی کوئی گاہمیت نہیں ہے۔ ہندوستانی مسلمان کس طرح اپنی تہذیب

کی حفاظت کر سکتے ہیں جب کہ ان کے بچوں کی مادری زبان کو تحتاً نوی مدارس سے محروم کر دیا گیا ہے۔ تمام شمالی

ہندوستان یعنی یو۔ پی، بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں اردو کو مدارس میں درجے تعلیم کی حیثیت سے

محروم کر دیا گیا ہے۔ وسطی ہند میں جو بعد میں مدھیہ پردیش کا علاقہ بن گیا ۱۹۵۱ء میں ایک قانون کے

ذریعے دیوناگری رسم الخط میں بجز ہندی کے کسی دوسری زبان کے استعمال کو جرم قرار دے دیا گیا تھا۔

پنجاب میں انتظامیے اور عوامی تعلیمی اداروں میں اردو کے استعمال پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مئی ۱۹۴۸ء میں

یو۔ پی سرکار نے ایسے قوانین جاری کیے کہ بچوں کو صرف ہندی کے ذریعے ہی تعلیم دی جائے گی۔ نئے

نصاب کے مطابق ایک ایسا پتہ جس کی مادری زبان اردو ہو اپنی زبان سیکھ ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ

چھٹے درجے تک نہ پہنچ جائے، جہاں اردو بحیثیت اختیاری مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ نتیجتاً آزادی کے

بعد اردو نے بہت کم ترقی کی ہے۔

اردو کے مستقبل کے تعلق سے مسلمانوں کی بے چینی بجا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اردو ایک ایسی

بد قسمت زبان ہے جو اپنے بچپن ہی میں یتیم جوانی میں بیوہ اور بوڑھاپے میں ناگوار مصیبت ہی کر رہ گئی۔

اسے اپنے پیدائشی مقام ہی میں تسلیم نہیں کیا گیا اور عمر سے بے محسوس کر دیا گیا اس معاملہ میں جمہوری جماعتوں

کی بے اعتنائی سے مسلمانوں کو دمچکا لگا ہے اس سلسلہ میں جی سنگھ کا روٹیہ بہت واضح ہے، حوادو کے خلاف زہر اگلنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتی۔ بلراج مہسوک کے مطابق 'اُردو فرقہ واریت کے متعلو کو ہوا دیتی ہے اور مسلمانوں کو قومی دھارے میں شریک ہونے سے روکتی ہے۔' جی سنگھ یہ الزام عائد کرتی ہے کہ یو۔ پی اور بہار میں اُردو کیلئے جو تحریکات چلائی جاتی ہیں ان کیلئے پاکستان سے امداد آتی ہے تاکہ اس سے ملک کی مزید تقسیم کی جائے۔ اس کے علاوہ 'اُردو کو ایک عام معام دے کر اسے کسی صوبے میں دوسری زبان کا درجہ دینے کا مطلب علیحدگی پسندی اور مخالفت قومی یک جہتی و جمہانات کی ترغیب دینا ہوگا۔

صرف کیونسٹ پارٹی نے غیر متروک طور پر اردو کی حمایت کی ہے۔ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۱ء کے انتخابی نتائج میں کیونسٹ پارٹی نے اردو کی شکایات کو دور کر کے پروردیا ہے۔ کیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مرکز مجلس عاملہ نے صدر جمہوریت اقدامات کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

۱۔ تھانوی سطح پر ایسے یوں کے لئے اُردو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے جن کی مادری زبان اردو ہے۔  
(ب) جن علاقوں میں اُردو بولنے والے کافی تعداد میں رہتے ہوں، وہاں اُردو ذریعہ تعلیم کے قوانین مدارس قائم کیے جائیں۔

(ج) جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے ان کے لئے یونیورسٹی کی سطح تک تعلیمی اداروں میں اُردو ذریعہ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

(د) جن علاقوں میں اُردو داں عوام کی قابل تعداد آباد ہو ان علاقوں کی عدالتوں اور دیگر دفاتر میں اُردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول کی جائیں۔

(۱) تمام اہم نوٹسوں، سرکاری گزٹوں اور اسٹہنڈارڈ وغیرہ کو اردو میں ہی جاری کئے جائیں ایسے کاغذات جو عام طور پر عوام کے استعمال کے ہوتے ہیں مثلاً انتخابی فہرستیں، راشن کارڈ وغیرہ اُردو میں بھی شائع کئے جانے چاہئیں۔

(۲) تمام سائن بورڈ اور دوسری چیزیں جو حکومت کی جانب سے عوام کی سہولت کیلئے تیار کی جاتی ہیں اُردو میں بھی لکھی جانی چاہئیں۔

(۳) ایسی تہذیبی و ادبی انجمنوں کو جو اردو کی ترقی اور اشاعت کے کام اہم دیتی ہوں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی جانب سے خاطر خواہ مالی امداد ملنی چاہیے۔

(۴) صوبائی اور مرکزی حکومتیں سیکور اور جمہوری ذہنیت کے لوگوں کی کمیائیں تشکیل دیں تاکہ وہ مندرجہ بالا اقدامات کے نفاذ کی ٹکرائی کر سکیں۔





ہیں اور ان کا یہ یقین ہے کہ اگر دستور میں دی گئی ضمانتوں کا نفاذ عمل میں لایا جائے تو اردو کے ساتھ کی جائے والی نا انصافی ختم ہو جائے گی لیکن اس گد اگر نہ طرز عمل سے کسی طرح کی کامیابی نہیں ہوئی۔ محرومی اور ماکانی کے احساس کے رد عمل کے طور پر اردو بولنے والے عوام کے کچھ طبقوں نے مظاہرے کرنا شروع کر دیے۔ اردو عداوت نہ مظاہروں کی افادیت پر یقین رکھتا ہے۔

یہاں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ اردو آج بھی ہندوؤں کے طبقے کی محبوب زبان ہے۔ پنڈت مند لال کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر میسر ہی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں اردو اور اسلام کے مفادات کی حفاظت کی خاطر اپنی جان دے دوں۔ اس طرح تعمیلات کی بجائے اس سانس حمایت کی حمایت کا حصول زیادہ مفید ہوگا جو اردو کے فروغ کے کام کی جگہاں ہیں یعنی ان افراد کی تائید و حمایت کی جائے جو ملک میں حقیقتاً سیکولرزم لانا چاہتے ہیں اس طرح دو مقاصد پورے ہوں گے۔ اردو اور ملک کی وحدت سے مسلم سیاست کا غیر ترقی پذیر کردار، مسئلہ کو اس پہلو سے دیکھنے سے تمام پر واضح ہو گا۔ سب سے آسان حل مسلمانوں کا اتحاد ہے۔ ریڈیو سس "منہ کرتا ہے کہ

"ہمیں اردو کے تحفظ کیلئے اپنی تمام قوتوں کو ایک نئے انداز سے اتار کر اچانک امتحان خود کی قومی یاد دہانیاں اردو کے لئے مددگار بن جائیں۔ اس سے اردو نہ صرف جاری رہے گا بلکہ کامیاب ہو جائے گا۔ اردو کا مسئلہ فردو، نہ سیاسی مقاصد کے لئے اٹھایا جا رہا ہے۔"

مسلمانوں کو جو کام احام دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ضمنی سیاسی امور اور طوائفہ دارانہ سلوکوں کے ساتھ صدق دلی سے تعاون کریں۔ قومی رد ملی میں جبر و جبروت ہیں اور سیکولرزم پر نیچے لیجیں کو مستحکم بنائیں۔ دوسری بات یہ کہ یو۔ پی کے اردو نو لائن والوں کا طریقہ کار غلط طرز کا ہے۔ اردو کو ایک نئے مادہ نرائی ملنا چاہیے ہے کہ "ہندوستان کی صرف ایک ہی زبان جوئی جاتی ہے" یہ بات نہ صرف اردو کے لئے نقصان دہ ہے بلکہ ملک کے ہندوستان مستقبل کیلئے بھی خطرناک ہے۔ ایک زمانہ کی ماہ اور اہمیت و قوت کے مفادات کی حفاظت کیلئے کام کرنے کی نوعیت کسی طرح ایک میں ہو سکتی۔ صرف ہندو میں ملک کی قومی زبان نہیں ہے اردو تحریک نے قایدن اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ خدی کے ادیبوں کی حمایت کے لئے اردو کا تحفظ ممکن نہیں۔ لیکن یہ حمایت اردو کی قربانی دے کر حاصل ہیں لی حال میں ہے اردو کے اردو کے اردو اور ہندی ادیبوں کے ایک دستخط شدہ بیان (۱۹۶۷ء) میں یہ بات قلمبندی کی گئی تھی کہ نہ صرف ہندی ہی صوبہ کی سرکاری زبان ہے۔ ان میں سے کچھ نے اردو کا رسم الخط بدلنے کی وکالت بھی شروع کر دی تھی جو بدست گت خرد کی بدترین مثال ہے۔ اردو والوں کی ماکانی اور محرومی کا تجربہ لے رہے ہو۔

ریال منل نے کہا تھا کہ انھیں اردو کے تحفظ کی خاطر آواز اٹھانے کے لئے اپنے آپ جوائنٹ پیدا کرنی چاہیے۔ اس لئے جمہوری طریقہ یہ ہے کہ وہ لسانی اقلیتوں سے تعاون حاصل کر کے ایک مشترکہ مقصد کیلئے کام کریں اور جب وہ محسوس کریں کہ مختلف زبانوں کے لئے اور ایک زبان کے تصور کے خلاف لڑنا ہندستان کی روایت کے عین مطابق ہے۔ تو انھیں پتہ چلے گا کہ ان کی تحریک فرقہ وارانہ بنیادوں پر نہیں ہے۔

سری لنکی امریت کے خلاف آواز اٹھانا ملک کی صحیح خدمت کرنے کے برابر ہے۔ لیکن گوپال منل کا رویہ بھی پورے طعیر صحیح نہیں ہے انھوں نے ان عناصر کو پچاننے میں غلطی کی جو ہندی کے خلاف لڑ رہے ہیں اور انھوں نے دوسری لسانی اقلیتوں سے تعاون حاصل کرنے کا کوئی طریقہ بھی نہیں بتایا۔ ان کا یہ فیصلہ کہ ایک سیکولر اور سوشلسٹ حکومت کا قیام اردو کے تحفظ کی ضمانت نہیں ہے اب اور ریاست میں ان کے غیر ترقی پسندانہ رویہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہندستان کے عوام کو مذہب آمیز سیاست سے جھٹے رہنا چاہیے۔ اردو کے تحفظ کا ایک ہی نقطہ پر سیکولر اور مخلوط ہندوستان کا ترویج و استاعت کا سوال ہے۔ صرف ایک سیکولر

ہی ہے دستور میں دی گئی ہے۔ تین دہائیوں سے یہ مسئلہ جاسکتا ہے۔

## ادارہ ادبیات اردو کے اردو امتحانات

ادارہ کے امتحانات اردو زبان، ادب اور لکچر کا سہرا ذوق سی نہیں، اعلیٰ تعلیم اور روزگار فراہم کرنے کے تقریباً (۴۰) سال سے ایسا کردار ادا کر رہا ہے، انکشاف میڈیم طلباء و طالبات کے لئے ابتدائی امتحانات اردو و دینی اور اردو زبان و ادبی اردو نوشتہ و خواندہ کا کامیاب ذمہ ثابت ہو چکے ہیں۔

اردو عالم کو عثمانیہ یونیورسٹی نے انٹرنس کے مابقی قرار دیا ہے۔

○ (نان میٹرک طلبہ و طالبات شرکت کر سکتے ہیں)

اردو فاضل کو عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈپ او، ال کے مابقی تسلیم کیا ہے۔

○ کتابچہ قواعد و ضوابط کے لئے ایک روپیہ ۲ پیسے مجبوا ہے۔

خط و کتابت کا پتہ:

ڈاکٹر مفتی تبسم، معتمد اعزازی، اردو امتحانات، ایوان اردو،

پنجہ گٹ روڈ، حیدرآباد، 500004

## ڈاکٹر مقبول منار دتی

### تراپہ



ہستی پہ اپنی سایہ فگن چہند چار۔ تھے  
جھلسا رہی تھی دھوپ، ورنہ تیرات کی  
منظر بھی سار۔ ہے آنکھوں پہ اپنی عذاب تھے  
بہی پہ اپنی سایہ فگن چہند چار۔ تھے  
چپتے سفر میں جیسے مہروں پر سایہ تھے  
مدھم تھی جن کے دم ہی سے لوحات کی  
ہستی پہ اپنی سایہ فگن چہند چار۔ تھے  
جھلسا رہی تھی دھوپ ورنہ تیرات کی

آنا جو تجربہ بھی مستغنی ہی رہا ہی لکھنا  
کل کو جب میں نہ رہوں میری کہانی لکھنا  
تم مجھے یاد رکھو، کوئی بھی عواں سہی  
دوست اگر لکھ نہ سکے، دشمن جانی لکھنا  
اپنی تحریر کو بسم خود ہی بدل لیتے ہیں  
کوئی آساں نہیں جہول میں ہے ٹھانی لکھنا  
یہ کوئی رسم ہی پر ہمیں منظور نہیں  
دھوپ کو چاندنی اور آگ کو یانی لکھنا

اپنے بے کیف سے حالات کہاں تک لکھیں  
جی تو چاہے کوئی پریوں کی کہانی لکھنا

## رمن راج مکینہ

# ڈاکٹر زور — ایک یادگار زمانہ شخصیت

میرزا سید علی، بنیادوں میں جو ممتاز شخصیتیں دکن میں پیدا ہوئیں، ان میں بجا طور پر ڈاکٹر سید غنی الدین کو ہی زور کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر زور ایک ٹھیکہ دار و سہادی تھے اور انھیں اس کی ہر چیز سے پیار تھا۔ ۱۹۵۵ء میں حیدر آباد کے ایک قدیم اور اس زمانے کے یادداشتوں سے ستارہ کج میں پیدا ہوئے اور رہا۔ یہیں ان کے وسیع اور شاندار ایوانات اسی ملکہ ساہنجی میں واقع تھے۔ ڈاکٹر زور کا مسلک سب سے بہتر سید شاہ علی ساکنوں سے سلطان سے ملتا ہے۔ ان کے والدین نے مامی گرامی صوفی حضرت سید شاہ غلام محمد قادری زعم کے فرزند تھے۔ صوفیانہ روایتیں، ڈاکٹر زور کو درشتہ میں ملی تھیں۔ سینہ بہ سینہ اور تعصب سے پاک تھا۔ رواداری و وحدانیٰ اعلام، دائرہ کار کا پیکر تھے۔

بچپن کا زمانہ حیدر آباد کے قدیم مدرسوں یعنی حسینی علم کے کاسٹھ پانچ سالہ اور کوٹلہ عالی جاہ کے مفید الانام ملٹی اسکول میں گزرا۔ پھر سٹی کالج میں زندگی کے کچھ سال گزارے۔

جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر وحید الدین سلیم نے ان میں ایسا شعر ادبی ذوق پیدا کر دیا کہ گریجویشن کے ذریعہ ادبی تنقید پر اپنی پہلی کتاب ”روح تنقید“ پیش کی۔ اس کتاب کی استاعت کے وقت ان کی عمر بیس یا اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے پہلی ادبی پیش کش تھی۔ ارباب جامعہ عثمانیہ نے زور صاحب کی قابلیت اور صلاحیت کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں یورپ میں اسکالرشپ دے کر مزید تحقیقی کام کے لیے جامعہ لندن میں داخلہ دلایا۔ اس زمانہ میں عام خیال یہ تھا کہ پروفیسر وحید الدین سلیم کی سیکورٹی کے بعد ڈاکٹر زور ہی ان کے جانشین ہوں گے۔

تین سال کی مسلسل تحقیق کے بعد ڈاکٹر زور نے عادل شاہی الاقطاب شاہی دور کے مخطوطات پر جو یورپ کے مختلف کتب خانوں میں یہاں وہاں محفوظ تھے اور برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں

ایک ذرہ یادگار ہے۔

ڈاکٹر ذور اسی خاکسود کن کے فرزند تھے۔ وہ یہاں کے لوگوں کی صلاحیتوں اور کمزوریوں سے خوب واقف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دکن کے لوگ بڑے عمیق ہوتے ہیں اور جب ارادہ کر لیں تو بڑے سے بڑے کام سر انجام دے سکتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ یہاں کے لوگ ضرورت سے زیادہ

امکساری سے کام لیتے ہیں۔ ایسا برونگڈڈہ اور ایسا بڑا بڑا سندھیں کرنا اور ایسے کہ یہاں انہی صاحبان علم و فن سے رہا ہو سکتا ہے لیکن انہی سے امکساری نہ ہوتی تھی۔ وہ ایک عمدہ حلقہ تک متعارف رہے اور اپنے کمال فن کو عام طور پر پروا نہ کرتے تھے۔ ہندوستان کی تہذیب حاصل نہ ہوئی۔ ڈاکٹر ذور کن والوں کی اس کمزوری سے ہم واقف تھے کہ یہ لوگ کسی نئے کام کو شروع کرنے سے پہلے الا ان نام کو ملے تو دیکھنا یا پھر مال دینا پسند سمجھتے ہیں اور ہیرا آباد کی کل "ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اپنے جیتے شاندار پروفیسر حفیظ قنیل سے انہوں نے فرمایا کہ

"کوئی قلم اٹھاتے ہی نوبل پرائز بولڈر نہیں بن جاتا۔ برسوں قلم کھٹا پڑتا ہے تب کہیں ایک معیار پیدا ہوتا ہے مگر یہ بات ہم دکنیوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ لکھیں گے تو معرکہ کی کہانیاں لکھیں گے ورنہ نہیں لکھیں گے

رکھے ہونے تھے انھیں پیش نظر رکھ کر ایک کتاب "اردو شد پارے مرتب کی۔ جامعہ لندن سے پی ایچ ڈی کا طیلان حاصل کیا اور جامعہ بیرس سے لسانیات کا ڈپلومالے کروٹس واپس ہوئے۔

تین چار سال بعد جب وہ یورپ سے حیدرآباد واپس ہوئے تو اس مختصر عرصہ میں جامعہ عثمانیہ کا علمی ماحول کافی بدل گیا تھا۔ معیشتی اور دواں اصحاب میں عجب ایسا کٹری پیدا ہو گیا تھا۔ دکنی نوان لوگوں نے ماں لہجہ کہنا شروع کر دیا جنھیں اپنی طلبہ اس کی تعریف کن کے پڑے تھے اصحاب ایسی علمی صلاحیتوں کے مابوجود کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے تجلی تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت استاد اپنے تقرر کے بعد ڈاکٹر ذور نے پہلا کام تو یہ کیا کہ باصلاحیت طلبہ سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھوانے

اور انھیں چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت میں شائع کرتے رہے۔ اس طریق کار سے مقامی لوگوں میں جو احساس کٹری پیدا ہو گیا تھا وہ ہاتھ مارا۔ ڈاکٹر ذور نے ایک ایسے ادبی مرکز کے قیام کی شدید ضرورت محسوس کی جس کے ذریعہ دکن کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت ممکن ہو سکے۔ اس طرح ۱۹۳۱ء

میں محض چار سو روپے کے خالص عطیہ کے ساتھ "ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالی گئی جو گذشتہ نصف صدی سے دکن میں ریسرچ سنٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اور اپنے بانی کی

نتیجتاً اسی طرح کٹائی میں مر جاتے ہیں۔

ڈاکٹر زور اس بات کے قائل تھے کہ یہ کام فوری شروع کیا جائے اور ایک ہی وقت میں وہ کئی کام کرنے کے قائل تھے وہ جلد سے جلد کام کی تکمیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں اپنی کئی کتابوں کا مواد فراہم کرتے جاتے تھے اور کئی کتابیں ایک ساتھ ترتیب دیا کرتے تھے۔

تعمیم ہند اور انضمام حیدرآباد کے بعد کچھ لوگ بے حاشہ شہر کی بنا پر پریشان تھے لیکن ڈاکٹر کے حوصلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ لہا کرتے تھے کہ اب جو تہ لپی آئی ہے اس کے باعث کام کرنے کے مواقع اور میدان بدل گئے ہیں ہم اردو والے اب تک حکومت کے زیر سایہ کام کرتے تھے اب اردو والوں کو اپنے عزم اور عمل کی بنا پر آگے بڑھنا ہے اور کام کرنے کا بھی تداصل وقت ہے۔

۱۹۵۶ء میں حبلسالی ریاستیں قائم

ہوئیں اور ریاست حیدرآباد کے کئی بار دفتروں، اطلاع ہمسایہ ریاستوں میں شامل کر دیئے گئے تو دکن کے کئی صاحب فہم حضرات ان ہلسانی ریاستوں کے آئندہ کام کاج سے متعلق طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھے لیکن اس ہلسانی انقلاب کا ڈاکٹر زور پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اس بات سے خوش اور مطمئن تھے کہ آندھرا پردیش کی موجودہ ریاست کے حدود وہی ہیں جو کبھی گوکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کے حدود تھے وہ اپنی جگہ سمجھ رہے

تھے کہ گوکنڈہ کی قدیم سلطنت، ریاست آندھرا پردیش کے روپ میں اب پھر سے قائم ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر زور کو گوکنڈہ کے قطب شاہی تمدن سے ہمیشہ دلچسپی رہی اور ان کی اس دلچسپی کا اظہار ان کے افسانوں سے ہو سکتا ہے جو "سیر گوکنڈہ" اور "گوکنڈہ کے میرے" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

قیام آندھرا پردیش کے بعد ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر زور نے بانی شہر حیدرآباد اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی یاد میں ایک شاندار جلسہ شہر حیدرآباد سے تقریباً بارہ میل دور "محمد قلی قطب شاہ کی گنجیدہ کے قریب گوکنڈہ میں منعقد کیا۔ اس جلسہ کی صدارت اس وقت کے ہر دل عزیز گورنر، المائے مجسم سین پھر نے سرائی تھی۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کی یہ تقریب گزشتہ اکیس سال سے ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام بڑی یا بندی سے منائی جا رہی ہیں اور دکن کے ایک قومی تہوار کا درجہ رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر زور نوابہ آں ہاں سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ہوا خوری کے لئے بھی وہ موٹر پر جاتے تھے بس میں انہوں نے کبھی سفر نہیں کیا البتہ ایک مرتبہ جب وہ دہلی تشریف لے گئے تھے تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد اور حسن نعیم نے ان سے بہ اصرار کہا کہ کنات پریس سے بس یونورسٹی کو روانہ ہوتی ہے اس لئے وہ بس سے تشریف لے جائیں ٹیلیس میں روپیہ حملہ خواہ برباد ہوگا۔ وہ اس اصرار کی بنا پر کنات پریس سے بس کے ذریعہ

کہتے ہیں کہ آخری زمانہ میں ذیابیطس کا عارضہ ہو گیا تھا مگر انہوں نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا اور نہ سنا سے پرہیز کیا۔ کام اس قدر تھے آرام لینے کی ہمت ہی نہ تھی۔

ڈاکٹر ددو کے جوش میں ۷۵ سال کی محقر رہا گی، لکھی تھی اس قدر دور حیات میں ڈاکٹر ددو نے وہ وہ کام سر انجام دیئے ہیں جو شاید ایک انجن سے بھی یا یہ 'ٹیکنیکل کو بیورج' نہ سکتے 'وہ بلکلہ' 'متر کا' ادیب، 'ساعر' 'نقاد' 'مورخ' 'ادب نگار' اچھے معلم اور غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

ڈاکٹر ددو کو انتقال کیے دو برسے ایس سال ہوئے ہیں، ان کی حقیقی جائی تصویر آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ان کی تازہ اور توانیاد ہم سے بار بار کہہ رہی ہے۔

موت سے بھی مرچکے ۲۲ سالہ ہم زندگی میں جو کچھ کام کرنا چاہتے تھے یا پھر یہ کہ  
زندگی سانس لیتی رہ چکی ہوں ہی  
زخمہ دل ہستے ہستے گزر جائے گے ●●

دکنیات برڈاکٹر ددو کی اہم تحقیقی تصنیف

دکنی ادب کی تاریخ

قیمت

۱۰ روپے

ایوان "دو" حیدر آباد ۳

۱۹۹۳ء

۶/ روپے

یونیورسٹی روانہ ہوئے۔ دوسرے دن جب ڈاکٹر کوئی چند روز تک نے ڈاکٹر ددو سے رسماً پوچھا کہ میں یہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ میں ڈاکٹر ددو ان پر بوسے پڑے اور کہنے لگے۔

"آپ سب نااہل ہیں۔ بالکل نیکے" میرے بار بار منع کرنے پر بھی آپ لوگوں نے مجھے بس یہ بھٹا دیا۔ یونیورسٹی کا ہے کو ہے، 'جنگل بے جنگل' مجھے کیا معلوم مکان کہاں ہے۔ رات کے بارہ بجے تک ڈھونڈنا پھر تار پھا۔

دور صاحب بڑے خوش و خرم اور خوش مزاج انسان تھے۔ وہ بہت جلد ٹکڑے اور جلد ہی ماں جاتے تھے۔ ان کی حلقی میں بھی خلوص کا رنگ ہوتا تھا۔ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ مہاراجہ کا کوئی کام نہیں کرتے، بالکل بے کار آدمی ہو میں نے تمہارے متعلق بہت کچھ سنا تھا، مگر جو چیز انوکھ قطرہ حوں نہ نکلا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ میرے خیاب میں دوسروں سے کہتے کہ زمین راج اور دوسرے نوجوان ادارہ کام کرتے ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے اور دو کا کام اب یوٹھوں کو نہیں، نوجوانوں کو کرنا چاہیے۔

دور صاحب ایک باغ و بہار انسان تھے، نثر غزور اور خود پسندی انھیں چھو کر بھی نہیں کی تھی ہر کسی سے برابر کا سلوک کر کے خاست ہوتے۔ خود کسی سے مرعوب ہوتے اور نہ کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اچھے تن و توست کے انسان تھے۔ کھلا ہوا رنگ، پان کے تان۔



رحمن جانی

## نذر محمد قلی قطب شاہ

نئی تیرا کن خرم د آباد رہے  
نہ وہ کام کیا ہے کہ سدا یاد رہے  
یہ محکوم تو ہے دور میں آزاد رہے  
ہر حال میں مسرور رہے شاد رہے  
حیدر آباد حسین شہر بسایا تو نے  
پیار ہی پیار کا احساں بگایا تو نے

قوی یکہن ترے دود کی تہذیب رہی  
بات ثانی نہ لگی بھاگ متی نے جو کہی  
رود موسیٰ بھی ترے عزم کے ہمراہ ہی  
تو نے ہنس ہنس کے محبت کی ہر اک چوٹی  
زندگی تمہے ادا تو ہے جوانی تو ہے  
منقریہ کہ محبت کی کہانی تو ہے

د تیری محبت ہی محبت تہری  
و تیری محبت ہی محبت تہری  
و تیری محبت ہی محبت تہری  
تیرا محبت ہی محبت تہری  
تو نے بھی اپنی محبت کی نشانی دی ہے  
چارمینار سنی عظمت کی نشانی دی ہے

آج آئے ہیں تیری یاد منانے کے لئے  
دل میں سونپے جذبات جگانے کے لئے  
اپنی بگڑی ہوئی ہر بات بٹلانے کے لئے  
عزم کرتے ہیں تیرے در پہ نبھانے کے لئے  
زندگانی کی کبھی رات نہ ہونے دینگے  
شہر میں تیرے فسادات نہ ہونے دینگے



۱۰ اوصاف حمیدہ میں گناؤں کیا کیا  
تصویر زمانے کو دکھاؤں کیا کیا  
ٹٹیرتا ہے خزانہ میں پھیلاؤں کیا کیا  
مریہ کہ تری بات بتاؤں کیا کیا  
پہلا اورد کا ہے تو صاحب دیوان شاہ  
اہل دل اہل ذوق یعنی کہ انسان شاہ

## وقتِ تحلیل

یہ تہہ کے یومِ پیرا ہے تو یہ سدا  
شاہِ مہار و مہار سزا خند سلو جی  
سار تہا میں مہار سزا خند سلو جی  
تاد تکتکت کو اے سدا کو اے سدا  
توتی مایو ظاہرہ عید اوم برکاس دس  
اور طیم پر وارنہ طام مایہ

## اردو نامہ

### اردو لٹریچر، علمی ادبی اور تہذیبی مہمیں

۹ نومبر: ریاچی ایجنسی ترقی اردو  
کے ریڈیو ایڈیٹر اور ڈائریکٹر  
کا اردو ہال میں قیام علی کیا۔ جناب  
سید مکتبہ شاہ صدر نقشبندی ریاچی  
کوئٹہ سے اتفاقاً رسم انجام ریاچی ڈاکٹر  
سید عبدالمنان صدر ریاچی انجمن نے  
اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔  
پروفیسر فضل الرحمن سابق وائس چانسلر  
اسلام یونیورسٹی علی گڑھ اجلاس غلام  
بردائی، ایڈووکیٹ، اور ڈاکٹر مبینہ  
شاہد معتمد ریاچی انجمن نے مخاطب  
کیا۔ مسٹر میر اسحاق لاہوری معتمد دوم  
ریاست انیس نے خطاب کیا اور  
شکریہ ادا کیا۔

● ترقی اردو بورڈ حکومت سندھ  
کے ریڈیو ایڈیٹر اور ڈائریکٹر  
اور ایڈیٹر اردو کا سالانہ سیمینار  
کیلئے جاری کیا گیا جس کے بموجب  
محمد رفیع صاحب ریڈیو ایڈیٹر  
کے ریڈیو ایڈیٹر اور ڈائریکٹر  
کا اردو ہال میں قیام علی کیا۔ جناب  
سید مکتبہ شاہ صدر نقشبندی ریاچی  
کوئٹہ سے اتفاقاً رسم انجام ریاچی ڈاکٹر  
سید عبدالمنان صدر ریاچی انجمن نے  
اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔  
پروفیسر فضل الرحمن سابق وائس چانسلر  
اسلام یونیورسٹی علی گڑھ اجلاس غلام  
بردائی، ایڈووکیٹ، اور ڈاکٹر مبینہ  
شاہد معتمد ریاچی انجمن نے مخاطب  
کیا۔ مسٹر میر اسحاق لاہوری معتمد دوم  
ریاست انیس نے خطاب کیا اور  
شکریہ ادا کیا۔

۱۰ نومبر: اردو لٹریچر، علمی ادبی اور تہذیبی مہمیں  
کے ریڈیو ایڈیٹر اور ڈائریکٹر  
کا اردو ہال میں قیام علی کیا۔ جناب  
سید مکتبہ شاہ صدر نقشبندی ریاچی  
کوئٹہ سے اتفاقاً رسم انجام ریاچی ڈاکٹر  
سید عبدالمنان صدر ریاچی انجمن نے  
اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔  
پروفیسر فضل الرحمن سابق وائس چانسلر  
اسلام یونیورسٹی علی گڑھ اجلاس غلام  
بردائی، ایڈووکیٹ، اور ڈاکٹر مبینہ  
شاہد معتمد ریاچی انجمن نے مخاطب  
کیا۔ مسٹر میر اسحاق لاہوری معتمد دوم  
ریاست انیس نے خطاب کیا اور  
شکریہ ادا کیا۔

۱۱ نومبر: اردو لٹریچر، علمی ادبی اور تہذیبی مہمیں  
کے ریڈیو ایڈیٹر اور ڈائریکٹر  
کا اردو ہال میں قیام علی کیا۔ جناب  
سید مکتبہ شاہ صدر نقشبندی ریاچی  
کوئٹہ سے اتفاقاً رسم انجام ریاچی ڈاکٹر  
سید عبدالمنان صدر ریاچی انجمن نے  
اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔  
پروفیسر فضل الرحمن سابق وائس چانسلر  
اسلام یونیورسٹی علی گڑھ اجلاس غلام  
بردائی، ایڈووکیٹ، اور ڈاکٹر مبینہ  
شاہد معتمد ریاچی انجمن نے مخاطب  
کیا۔ مسٹر میر اسحاق لاہوری معتمد دوم  
ریاست انیس نے خطاب کیا اور  
شکریہ ادا کیا۔

۱۲ نومبر: اردو لٹریچر، علمی ادبی اور تہذیبی مہمیں  
کے ریڈیو ایڈیٹر اور ڈائریکٹر  
کا اردو ہال میں قیام علی کیا۔ جناب  
سید مکتبہ شاہ صدر نقشبندی ریاچی  
کوئٹہ سے اتفاقاً رسم انجام ریاچی ڈاکٹر  
سید عبدالمنان صدر ریاچی انجمن نے  
اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔  
پروفیسر فضل الرحمن سابق وائس چانسلر  
اسلام یونیورسٹی علی گڑھ اجلاس غلام  
بردائی، ایڈووکیٹ، اور ڈاکٹر مبینہ  
شاہد معتمد ریاچی انجمن نے مخاطب  
کیا۔ مسٹر میر اسحاق لاہوری معتمد دوم  
ریاست انیس نے خطاب کیا اور  
شکریہ ادا کیا۔

۱۳ نومبر: اردو لٹریچر، علمی ادبی اور تہذیبی مہمیں  
کے ریڈیو ایڈیٹر اور ڈائریکٹر  
کا اردو ہال میں قیام علی کیا۔ جناب  
سید مکتبہ شاہ صدر نقشبندی ریاچی  
کوئٹہ سے اتفاقاً رسم انجام ریاچی ڈاکٹر  
سید عبدالمنان صدر ریاچی انجمن نے  
اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔  
پروفیسر فضل الرحمن سابق وائس چانسلر  
اسلام یونیورسٹی علی گڑھ اجلاس غلام  
بردائی، ایڈووکیٹ، اور ڈاکٹر مبینہ  
شاہد معتمد ریاچی انجمن نے مخاطب  
کیا۔ مسٹر میر اسحاق لاہوری معتمد دوم  
ریاست انیس نے خطاب کیا اور  
شکریہ ادا کیا۔

# کتابیں ملیں

تبصو کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔

ورد کے پتے (مکتبہ ناول)

میر جی اماناے ترمیم: بلات ورم

ڈیمائی سائز - ۲۳۵ صفحات

آفیش طباعت: قیمت ۲ روپے

عصری طبائع (مترجم: ایم کنڈن)

کہا نیاں (مترجم: عبدالحق)

اٹھارہ طبائع کہانیاں ڈیمائی سائز

۲۱۷ صفحات: قیمت ۱۸/۵۰

گوتم بدھ مصنف: ایلا جارج

ترجمہ: سید نصیر حسین - باتسویر

مضامین: ۶۴ صفحات

قیمت: ۲ روپے پچاس پیسے

جب ندی (باتسویر)

بولی تھی (مصنف: کلاناثر)

ترجمہ: سیدی مجاز: ۶۴ صفحات

قیمت: ۲ روپے پچاس پیسے

ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ

۵/۸ گرین پارک، نئی دہلی

(۱۱-۱۶)

Accession Number

8473

Date

4.7.81

دے رہے ہیں۔

۲۶ نومبر: بزرگ نعت گو شاعر

الحاج فخر الدین رازی، جن کا نتیجہ مجتہد

کلام تجلیاتِ حرم کے نام سے چھپ

چلا ہے محققہات کے مددِ تعالیٰ ہوا۔

۲۷ نومبر: اوردو مجلس کلاماتہ

ادبی اجلاس بناب بھارت چند کھہ

کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب

ہاتم حسن سید پرنسپل کالج آف لیٹریچر

ہم اور ہمارا انسانی شعور کے زیرِ عنوان

مقالہ اور جناب رشید الدین نے

حالِ لا تنقیدی شعور پر مضمون سیا

مجلس شہر میں اسٹیمپ ایوٹی، سر سوزاس

لاہوتی اور محمد اوردو مجلس جناب صلاح

الدین نیر نے کلام سنایا۔

● اقلیم ادب کی طرف سے جلب

حبیب عبدالرحمن بافقین حبیب محو

(وفات ۲ نومبر ۱۹۸۳ء) کی یادیں

ادبی اجلاس اور متاعہ جناب نظیر علی

عدیل کی صدارت میں منعقد ہوا۔

عدیل، رحمن جامی اور مسعود منظر نے

محمی مرحوم کی شعری صلاحیتوں اور

ان کی زندگی پر تعزیتی تاثرات پیش

کے۔ مجلس شہر میں عدیل، جامی

امام راشد، صاحبزادہ کلیم، مسعود

منظرہ تاثیر صدیقی کے کلام سنایا۔

سنائی۔ مجلس شہر میں رحمت یوسف

زئی، انور الشارکین، رشید اور شد

نے کلام سنایا۔

۲۸ نومبر: ہفتہ کتب خانہ کے

موقع پراسٹیٹ سنٹرل لائبریری میں

سہلسانی متاعہ ڈاکٹر ایم واما ریڈی

ڈیٹی ڈاکٹر کٹر تلکو الیڈی کی صدارت

میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ریڈی، ڈاکٹر نگم

علی احمد جلیلی، کنڈل پرشاد کنڈل، امیر احمد

خسرو، اوم پکاس سرنل، نیپال نگم

عددا، صلاح الدین خیر، علی الدین تویہ

رئیس اختر، فیض الحسن نیل، عزیز قبا

رحمن جامی اور منیر الزماں غیر نے

کلام سنایا۔

۲۹ نومبر: علامہ اقبال کے ہم عصر

دکن کے بزرگ محمود حضرت شاہ محمد

چنداسی تاتی کوہ سولہ نظامی شاہ

پوری کا مجموعہ کلام سخن نانی مرتبہ

وقار خلیل، کرناٹک اوردو الیڈی کی

اعانت سے حیدرآباد میں طبع ہوا۔

۳۰ نومبر: جناب میر احمد علی البام

واحدی کو ان کے مقالہ 'شابارنگ پڈ'

شخصیت اور فن پر ایم فل کی ڈگری

عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے دی گئی۔

جناب واحدی ان دنوں اردو دہلی میں

اوردو تعلیمی تدریس کے فرائض انجام

1

1

CEMBER 1983

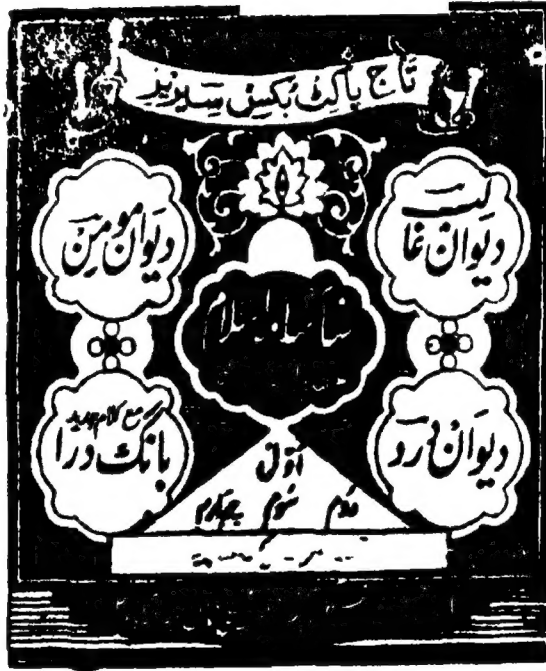
R. N. I  
Regd. H/I

# The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A.

اس  
انقشاد

بال حبشیر



ر ب کلیم

مکاتیب نشید

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.

